اولیائے کشمیر

حصّہ اوّل

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز



اولیائے کشمیر

(ہمارا ادب)

نِگراں

محمد یوسف ٹینگ

ترتیب

محمد احمد اندرابی

معاون

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر

ناشر : سیکریٹری
جموّں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز۔ سرینگر

سالِ اشاعت: ۱۹۹۸ء

مطبوعہ : جے کے آفسیٹ پرنٹرس۔ دہلی۔

قیمت :
Rs 83 00

مِلنے کا پتہ

کِتاب گھر

مولانا آزاد روڈ۔ سری نگر

فہرست

•

حرفِ آغاز

کشمیر اپنی خوبصورتی اور قدرتی مناظر کی وجہ سے تو دُنیا میں مشہور ہے ہی اور اس خطۂ ارض کو "جنت بے نظیر" کہا گیا ہے لیکن یہ سرزمین صوفیاء، علماء اور بزرگانِ دین کی آماجگاہ بھی ہے اور اسے اسی لئے "پیر وارٔ یا ریشی وارٔ" یعنی ریشیوں، مُنیوں کی پُھلواڑی بھی کہا گیا ہے۔ یہاں کے بسنے والے مختلف مذاہب کے پیرو جس آپسی مہر و محبت اور انسان دوستی کے جذبے سے زندگی گزارتے رہے ہیں اور اُن میں جو مذہبی رواداری پائی جاتی ہے وہ انہی بزرگوں کی تربیت کی دین ہے۔ انہوں نے اس گلپوش وادی کے ہر حصے میں علم و عرفان کی وہ شمعیں روشن کیں جن کے نور سے بے شمار لوگوں نے فیضان پاکر قُربِ الٰہی پایا اور انہی کی پاکبازی اور برکات سے یہ وادی سینکڑوں برس سے "پیر وارٔ" بنی رہی ہے۔

اپنے ان محسنوں کی علمی، دینی اور ملّی خدمات کا ذکر کرنا ہمارے لئے سعادت ہے کہ انہوں نے جہالت کے گھور اندھیروں میں ہمارے اسلاف کی رہبری فرماکر ہمارے لئے راہِ نجات متعین کر دی۔ نفسا نفسی اور مادیت پرستی کے اس عالم میں ان کا ذکرِ خیر ہمارے لئے باعثِ اطمینان ثابت ہوگا کہ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کا فرمانا ہے کہ اگر قرآن و حدیث کے بعد کسی کلام کو عظمت و فضیلت حاصل ہے تو وہ اولیائے کرام کا کلام ہے

کیوں کہ ان کا کلام ظاہری تصنّع سے پاک اور عشقِ الٰہی میں ڈوبا ہُوا ہوتا ہے اور اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو علمِ لُدنی سے سرفراز فرما کر وارثِ انبیاء بنا دیا ہے۔ اہلِ دِل کو ان کے کلام کی جستجو اور ایک طرح سے قلبی لگاؤ رہتا ہے اور ان کے ذِکر سے قلبِ مومن کو بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ مُشاہدے میں اکثر آیا ہے کہ ان بزرگوں کا کلام جب "دُنیا" کو قلب سے نکال پھینکتا ہے اس سے آخرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس کی برکت سے خدا دوستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور مومن میں زادِ آخرت جمع کرنے کا عزم بھی۔

ہمارا ادب کا "اولیا نمبر" ترتیب دینے کا حوصلہ ہم نے "ہمارا ادب" کے "شخصیات نمبر" کی کامیاب اشاعت سے پایا۔ اس میں قارئین کرام کے مشوروں کا بھی دخل ہے کہ ہماری تواریخ اور تذکروں میں جس انداز سے اولیاء کرام کی پاک سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے اسے ہر صورت میں ناکافی ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں عموماً زیادہ زور کشف و کرامات پر ہی دیا گیا ہے اور ان بزرگوں کی علمی، دینی اور مِلی خدمات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

"اولیائے کشمیر" میں شامل مواد دراصل "ہمارا ادب" کے "اولیا نمبر" کی پہلی تین جلدوں میں چھپے مضامین پر مُشتمل ہے۔ ان جلدوں میں ہم نے کوشش کی تھی کہ مضامین ایک تسلسل اور کرونولاجیکل طریقے سے شایع کئے جائیں لیکن ہماری کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں اور ہمیں اہلِ قلم حضرات کا حقیقی تعاون نہیں مِلا۔ ہم انہیں بھی موردِ الزام نہیں ٹھہراتے نہ ہمیں اُن سے گلہ ہی ہے کیوں کہ اس ضمن میں مواد کی عدمِ دستیابی

کا زیادہ دخل ہے کہ اکثر مورخین اور تذکرہ نویسوں نے تو کئی بزرگ
ہستیوں کے حالاتِ زندگی چند سطروں میں لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ مواد
کی عدمِ دستیابی میں گذشتہ سالوں کے نامساعد حالات کا بھی کافی عمل دخل
رہا۔ ہمیں اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ مضمون نگار حضرات کو مختلف
علمی و ادبی اداروں یا علمی خانوادوں سے مواد اکٹھا کرنے کے سلسلے میں کافی
تگ و دو کرنا پڑتی ہے لیکن اس دوران ایسا کرنا نہایت ہی مُشکل تھا۔
بہرحال جو بھی مضامین ہمیں ملے ہم انہیں سال بہ سال ایک ایک جلد
میں شامل اشاعت کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اولیاء نمبر کی
پانچویں جلد زیرِ ترتیب ہے۔ ہماری تمنّا ہے کہ اس کی کئی اور جلدیں ترتیب
دینے کی سعادت حاصل کریں لیکن اس سلسلے میں مواد کی فراہمی اس کی
پہلی اور آخری شرط ہے۔

قارئین کی حوصلہ افزائی ہمارے شاملِ حال رہی۔ پچھلے دو
تین سال میں ہمارا ادب کے اولیاء نمبر (۱-۳) کا اِسٹاک ختم ہوگیا اور
مانگ روز بروز بڑھتی رہی۔ چنانچہ ان جلدوں میں چھپے مواد کو "اولیائے کشمیر"
کے نام سے نئی ترتیب کے ساتھ زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے قارئین
کی نذر کیا جا رہا ہے۔

ہمیں آپ کی قیمتی آراء کا انتظار رہے گا تاکہ اُن کی روشنی
میں اس سلسلے کو بہتر طور آگے بڑھایا جاسکے۔

سرینگر۔ ۲۶-اکتوبر ۹۸ء — محمد احمد اندرابی

سیّد شرف الدّین حضرت بابا بُلبُل شاہ

حضرت بلبل شاہؒ کے حالات کے بارے میں ان کے وارد کشمیر ہونے کے زمانے کے بعد کے تالیف شدہ تواریخ اور تذکروں میں ان کا کچھ ذکر ملتا ہے۔ کشمیر کی تواریخ اور تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت بلبل شاہؒ کشمیر کے آخری ہندو بادشاہ راجہ سہدیو ۱۳۲۰-۱۳۰۰ء کے عہد میں وسط ایشیا سے آکر وارد کشمیر ہوئے ہیں۔
ان کا کشمیر میں داخل ہونے کا ذریعہ یہی ہوا کہ جب اسلام وسط ایشیا سے پھیل کر کشمیر کی شمالی مغربی سرحدوں، کشمیر سواد اور ضلع ہزارہ میں پہنچا، تو رفتہ رفتہ ان علاقوں میں ساتویں صدی کے وسط کے قریب اسلامی حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔ اس بات کا پتہ ہمیں میر سید علی ہمدانیؒ کے خلیفۂ خاص نورالدین جعفر بدخشی کے تالیف شدہ تذکرہ "خلاصۃ المناقب" سے ملتا ہے۔ جو انہوں نے خانقاہ ختلان میں ۷۸۷ھ میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے وصال (۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ مطابق ۱۹ جنوری ۱۳۸۵ء) کے قریباً تین ماہ بعد تالیف کیا۔ نتیجہ کے طور پہ وسط ایشیا سے کشمیر میں داخل ہونے کے لئے راستہ کشمیر کی شمالی مغربی سرحدوں

سے متعین ہوا تھا۔ اس زمانے کی کوئی تاریخ فی زمانہ دستیاب نہیں جس کی بدولت ہمیں حضرت بلبل شاہؒ کے بارے میں صحیح حالات حاصل ہوتے۔ اگرچہ حضرت بلبل شاہ کے انتقال کے قریباً ایک سو سال بعد بڈشاہ کے سرکاری سنسکرت مورخ جون راج نے کلہن پنڈت کی تاریخ "راج ترنگنی" کے قریباً تین سو سال بعد ۱۱۴۹ء میں زینہ ترنگنی تالیف کی مگر بڈشاہ کے اس سرکاری سنسکرت مورخ جون راج نے کشمیر میں اسلام پہنچنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے نہ ہی ہندو زمانے کے آخری راجہ سہدیو کے بعد رینچن شاہ کا اسلام قبول کرنے کا واقعہ تحریر کیا ہے اور نہ ہی بلبل شاہؒ کے وارد کشمیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح رینچن شاہ کا اپنے پیر بزرگوار حضرت بلبل شاہؒ کے لئے مسجد خانقاہ اور لنگر تعمیر کرنے کا ذکر بھی نہیں کیا ہے اور نہ ہی رینچن شاہ کی قبر اور اس کے پیر بزرگوار حضرت بلبل شاہؒ کے مقبرے کے بارے میں لکھا ہے جب کہ وہ اس عہد سے قریب کا تعلق رکھتا تھا۔ بدیں وجہ ہمیں حضرت بلبل شاہ کے بارے میں صحیح حالات معلوم نہیں ہیں۔

حضرت بلبل شاہؒ کے بارے میں پہلی بار ہمیں جو حالات ملتے ہیں وہ جناب بلا علی رینہ[1] کے تذکرۃ العارفین سے ملتے ہیں جو انہوں نے ۹۷۰ھ کے قریب تالیف کیا ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت بلبل شاہؒ کے حالات مختصر طور پر تحریر کئے ہیں۔ ان کے بعد ۱۰۱۳ھ (مطابق ۱۶۰۴ء) میں بابا داؤد مشکواتی نے تذکرہ "اسرار الابرار" تالیف کیا ہے۔ انہوں نے حضرت بابا بلبل شاہؒ کا نام "بابا بلال" لکھا ہے۔ انہوں نے بابا بلالؒ کو حضرت شہاب الدین سہروردی کا حقیقی فرزند بتایا ہے۔ مزید لکھا ہے کہ حضرت شہاب الدین سہروردی جن کا اصلی نام ابو حفص عمر بن محمد البکری سہروردی تھا اُن کا سال پیدائش ۵۳۹ھ اور وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی ہے اور حضرت بابا بلالؒ کو پیر بزرگوار حضرت شاہ نعمت اللہ قلندر قادری کو بتایا ہے۔

---

[1] ملا علی رینہ جناب شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ کے بھائی ہیں۔

حضرت بابا داود مشکواتی کے بعد کے مؤرخین اور تذکرہ نویسوں نے اکثر ان ہی کا تتبع کیا ہے۔ بعض مورخین نے ان کا نام سید شرف الدین بلبل شاہؒ لکھا ہے۔ بہر حال تواریخ اور تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بابا بلبلؒ سہہ دیو کے زمانے میں کشمیر میں وارد ہوئے تھے۔ جبکہ اسی دوران ذوالجو تاتاری نے اسی راستے سے جس راستے سے حضرت بلبل شاہ وارد کشمیر ہوئے تھے کشمیر پر حملہ کیا۔ اس نے تقریباً آٹھ ماہ تک کشمیر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کر کے کشمیر کی بیشتر آبادی کو ختم کیا۔ اس عہد کے نزدیک سنسکرت مؤرخ جون راج لکھتا ہے کہ ڈولچا (ذوالجو) نے اپنے حملے کے دوران کشمیر کی بیشتر آبادی کو قتل کیا' اور بہت سارے مندروں اور بتوں کو توڑا۔

ذوالجو کے چلے جانے کے بعد رینچن شاہ (رینچو) جو راجہ سہدیو کے عہد میں لداخ سے آکر کشمیر میں داخل ہوا تھا' نے سہہ دیو کے سپہ سالار رام چندر رینہ کو گگنہ گیر کے قلعہ میں قتل کر کے حکومت پر قبضہ کیا اور اس کی دختر کوٹارانی سے شادی کی۔ رام چندر رینہ کے فرزند راون رینہ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس طرح رینچن شاہ ۱۳۲۰ء میں کشمیر کا حکمران بن گیا۔ چونکہ رینچن شاہ بدھ مذہب کا پیروکار تھا اور اس کی ملکہ کوٹا رانی ہندو مذہب کی پیروکار تھی اس لئے آپس میں مذہب کے بارے میں اکثر رنجش پیدا ہوتی تھی۔ رینچن شاہ اپنے مذہب بدھ مت سے بیزار تھا اور اپنی بیوی کوٹا رانی کے مذہب سے بھی ـــ ! ۔ اس زمانے میں وادی میں ابھی اسلام نہیں پہنچا تھا اور نہ ہی اسلام کا کوئی مبلغ موجود تھا جو اس کے سامنے اسلام پیش کرتا ـــ انہی وقت وادی میں ہندو دھرم اور بدھ دھرم کے مختلف فرقے موجود تھے' جو اپنے مذہب کے فرقہ کو صحیح مانتے تھے اور رینچن شاہ کو اپنی طرف مائل کرتے تھے۔ اس لئے رینچن شاہ حیران تھا کہ وہ کس فرقے کے مذہب کو قبول کرے۔ آخر اس نے دل میں ٹھان لی کہ کل علی الصبح جو شخص سب سے پہلے عبادت کرتے ہوئے نظر آئے گا وہ بھی اسی کے مذہب کو اختیار کرے گا۔ صبح کے وقت غیبی الہام کے مطابق

بابا بلبل شاہ اس کے محل کے پاس نماز ادا کرنے لگے۔ رینچن شاہ نے ان سے ان کے مذہب و ملت کے بارے میں استفسار کیا، تو بابا بلبل شاہ نے اس کو اسلام اور اس کی عبادات وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا جو رینچن شاہ کو پسند خاطر ہوا اور اس نے اسلام قبول کر لیا اس کے بعد روز بروز وادی کے لوگ مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔

رینچن شاہ کا اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے پیر و مرشد جناب بابا بلبل شاہ نے اس کا اسلامی نام سلطان صدر الدین رکھا۔ حضرت بابا بلبل شاہ نے تنہا وادی کشمیر کا سفر کیا۔ ماسوائے اللہ سے قطع تعلق کر کے شریعت پر استقامت کر کے وہ پر خلوص دل اور سالم زبان لے کر آئے تھے۔ وہ تمام ممنوعہ چیزوں اور لغویات سے پرہیز کرتے تھے کہتے تھے کہ میں کھانے پینے کے بغیر بھی زندگی گزار سکتا ہوں، لیکن ایسا کرنا سنت نبوی کی مخالفت ہوگی۔ اور میں اپنے جسم کی ہمیشہ کے لئے حفاظت کر سکتا ہوں، اور موت کے بغیر بھی دوسری دنیا میں جا سکتا ہوں، لیکن اس سے پیروی رسول اللہ صلعم ترک ہوگی۔ میرے خیال میں سنت پر عمل پیرا ہونا ایک لاکھ انبیاء و اولیاء کے مرتبہ تقرب سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ سالک کو جب تک خاص دل، سالم زبان اور مرشد کی تربیت نہ ہو، اس راستے کے چھلاوے اس کو ایک منزل تک بھی نہ پہنچنے دیں گے۔ اس لئے حرام سے اس طرح بھاگنا چاہیئے جس طرح جنگل کی آگ سے ــــ مشکوک اور مشتبہ چیز یا عمل سے اس طرح دور رہنا چاہیئے جس طرح پہاڑ پر سانپ سے۔ حلال میں سے اتنی مقدار کھانی چاہیئے جتنی قحط اور سخت بھوک کے وقت خود مُردہ میں سے کھانے کی اجازت ہے اور وہ بھی جب تک مجبوری کی کوئی انتہا نہ رہے۔ تب تک نہ کھائے، اور جب کھائے تو ضرورت سے زیادہ نہ کھائے اور یہ طریقہ اپنی عادت بنائے۔

صاحب "تذکرۃ العارفین" وجہ تسمیہ "بلبل شاہ" یوں لکھتا ہے کہ ایک دن حضرت سید شرف الدین وضو کرنے کے ارادے سے نہر کے کنارے کھڑے تھے۔ ایک درخت

کی ٹہنی پر ایک خوش آواز بلبل دیکھی جو نہایت شیریں اور دل دکھلانے والی آواز میں گا رہی تھی۔ یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ بلبل آہستہ اُن کی طرف جا اُڑی۔ حضرت سیدؒ نے بھی اس کے پیچھے ہوا میں اڑان بھری اور اس خوش آواز بلبل کو پکڑ کر اپنی کوٹھری میں اُترے اور بلبل ان کے ہاتھ سے غائب ہوگئی۔ ایک واقف نے اس واقعے کی کیفیت ان سے دریافت کی۔ حضرت سیدؒ نے فرمایا کہ وہ پرندہ میری روح تھی، جو آسمان پر چڑھ رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے گیا۔ ہوا سے اپنی روح کو پکڑ کر لایا۔ کہتے ہیں کہ سائل نے یہ بات جھوٹ خیال کی، اور خاموش رہا۔ حضرت سیدؒ پر یہ بات روشن ہوگئی اور انہوں نے اپنے منہ کا پانی اس کے منہ میں ڈالا، پھر کیا تھا، ملکوت اور لاہوت کے حالات اس پر ظاہر ہوگئے اور حضرت سیدؒ نے جو فرمایا تھا، اس پر اقرار کیا۔ یہ بات جب لوگوں میں پھیل گئی، تو انہوں نے انہیں "بلبل شاہؒ" کا لقب دے دیا۔

سلطان ریچن شاہ (صدر الدین) نے اپنے پیر و مرشد کے لیے سرزمینِ کشمیر میں پہلی بار مسجد اور خانقاہ تعمیر کی جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ ان سے قبل سرزمینِ کشمیر میں کسی مسجد، خانقاہ اور مقبرہ کے آثار نہیں پائے جاتے ہیں۔

حضرت بابا بلبل شاہؒ کا وصال ۷ ماہ رجب ۷۲۷ھ (مطابق ۱۳۲۷ء) میں ہوا۔ اور اپنی خانقاہ کے نزدیک سپردِ خاک کئے گئے ہیں۔

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری مورخ کشمیر نے ان کی تاریخ وفات منظوم فارسی زبان میں ان الفاظ میں لکھی ہے ؎

سالِ تاریخ وصلِ حضرت شاہؒ　　بلبل قدس گفت "خاص آلہ"

(۶۹۱ + ۳۶ = ۷۲۷)

"خاص آلہ" کے حروف کی تعداد بحساب ابجد ۷۲۷ بنتی ہے۔ یعنی جناب بابا بلبل شاہؒ کا وصال ۷۲۷ھ مطابق ۱۳۲۷ء میں ہوا۔

تاریخ کشمیر "نوادر الاخبار" کے مورخ و مؤلف احمد بن عبدالصبور بن خواجہ محمد علی قم کشمیری نے اپنی تاریخ میں جو انہوں نے ۱۱۳۶ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں اس وقت کے کشمیر کے مغل صوبہ دار اعظم خان بہادر کے عہد میں بمقام شاہ جہان آباد مکمل کی ہے، جناب بابا بلبل قلندر کی تاریخ وفات خود اس طرح نظم کی ہے ؎

سال وصل بلبل گفت عقل   بلبل بستان دین کان وداد

۶۴ + ۵۱۳ + ۶۴ + ۷۱ + ۱۵ = ۷۲۷

"بلبل بستان دین کان وداد" کے حروف کی قیمت بحساب ابجد ۷۲۷ بنتی ہے۔
ان کی قبر ایک لمبے سادہ پتھر کی ہے، جو بلبل لنگر عالی کدل سرینگر میں برلب دریائے جہلم ہے۔ ان کی قبر پر کوئی کتبہ لکھا ہوا نہیں ہے۔ تواریخ کشمیر میں درج ہے کہ حضرت بابا بلبل شاہؒ کی قبر کے عقب میں بطرف مغرب ساتھ ہی حضرت علامہ احمد کی قبر ہے۔ اس قبر کو مضمون نگار نے اس وقت دیکھا جب کہ حضرت بلبل شاہؒ کے مرقد شریف کی مرمت آج سے چند سال پیشتر ہو رہی تھی۔ اسی دوران مضمون نگار نے محکمہ ریسرچ لائبریری کے فوٹو گرافر کے ہمراہ اس قبر کا چربہ اتارا اور اس کا فوٹو بھی لیا۔ اس قبر پر باضابطہ کتبہ منقش ہے اور صاحب قبر کا نام "حاجی محمد الجنید ین" لکھا ہوا ہے۔ اس قبر پر صاحب قبر کی تاریخ وفات [illegible] لکھی ہوئی ہے۔ ؎ نتیجے کے طور پر تواریخ کشمیر میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ قبر علامہ احمد کی قبر ہے، صحیح نہیں ہے۔ صاحب قبر نے شیخ و سلطان زین العابدین کے عہد میں وفات پائی ہے۔ اس طرح حضرت بابا بلبل شاہؒ کی وفات ۷۲۷ھ سے صاحب قبر پر لکھی گئی تاریخ وفات [illegible] تک قریباً ایک سو چار (۴۰۹) سال گزر جاتے ہیں۔ اس لئے حضرت بابا بلبل شاہؒ کی قبر کے مغرب میں ساتھ واقع قبر علامہ احمدؒ کی نہیں ہو سکتی۔

؎ اس قبر کے متعلق مضمون نگار نے اپنے ایک مقالہ "کشمیر کے آثار قدیمہ مزارات" میں کافی حاصل بحث کی ہے، جو چھپ چکا ہے۔

ہے۔ ممکن ہے یہ قبر علامہ احمد کے فرزند دلبند علامہ محمد علامہ کی ہو۔ تواریخ کشمیر میں درج ہے کہ علامہ احمد کے فرزند، علامہ محمد بڈشاہ کے عہد تک زندہ تھے۔ وہ مذہبی رہنما کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ راقم کی تحقیق کے پیش نظر علامہ احمد کی قبر حضرت بابا بلبل شاہ کے مرقد شریف کے بطرف شمال واقع قبرستان میں ہوگی۔

سلطان رینچن شاہ کی قبر بھی حضرت بلبل شاہؒ کے مقبرے کے ساتھ ہی مغرب میں واقع ایک مکان کے عقب میں زمانہ کے دست برد سے بچی ہوئی ایک چھوٹے زمین کے ٹکڑے پر کسمپرسی حالت میں موجود ہے۔ اس کی قبر بھی ایک سادہ پتھر ہے، جس پر کوئی کتبہ منقش نہیں ہے۔ اس نیک بخت اور سعادت مند بادشاہ کی قبر پر ایک درخت سایہ فگن ہے۔

حضرت بابا بلبل شاہ قلندرؒ پہلے اسلامی مبلغ تھے، جنہوں نے سرزمین کشمیر میں پہلی بار لوگوں کو اسلام سے روشناس کر کے یہاں اسلام پھیلایا۔ اس کے دو بواعث ہوئے۔ ایک یہ کہ جب وسطی ایشیا سے اسلام پھیلتا ہوا کشمیر کے شمال مغربی سرحدوں ضلع ہزارہ تک پہنچا، اور رفتہ رفتہ ان علاقوں میں اسلامی حکومتیں بھی قائم ہوئی تھیں۔ اس طرح کشمیر میں مسلمانوں کو داخل ہونے کے لئے راستہ متعین ہوا اور وہ کشمیر میں داخل ہونے لگے۔ پھر جب کشمیر کے بدھ بادشاہ رینچو (رینچن شاہ) نے جناب بابا بلبل شاہؒ کے اثر سے اسلام قبول کیا، تو اسلام کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی۔ بدین سبب سلطان رینچن شاہ کا اسلام قبول کرنے سے اس کے اکثر امراء نے بھی اسلام قبول کیا، جن میں شاہ صکر رام چند کا فرزند راون رینہ برادر کوٹہ رانی نے بھی اسلام قبول کیا جس کی بدولت اسلام کشمیر میں سرعت کے ساتھ ہر سو پھیلنے لگا۔

بعد کی تواریخ میں بعض مورخین نے، جو اکثر وادی سے باہر کے ہیں، کشمیر میں ورود اسلام کے بارے میں بعید العقل اور من گھڑت باتیں اور قصہ کہانیاں بیان کی ہیں کہ بابا بلبل شاہؒ سے پہلے ہی کشمیر میں مسلمان موجود تھے۔ اگر جناب بابا بلبل شاہؒ سے قبل یہاں مسلمان

ہوتے تو اُن کے آخری نشان اُن کی قبریں اور عبادت گاہوں کے آثار کسی نہ کسی صورت میں
کشمیر میں تا حال موجود ہوتے! کیونکہ ہندو زمانے کے ہزاروں سال کی عبادت گاہوں کے
آثار آج بھی کشمیر میں موجود ہیں۔

حضرت بابا بلبل شاہؒ کی قبر اور رینچن شاہ کی قبر سے قبل کوئی قبر آج تک کشمیر میں
دیکھنے میں نہیں آتی ہے' اور نہ ہی بلبل شاہؒ کی مسجد سے قبل کشمیر میں کسی مسجد یا خانقاہ کے آثار
موجود ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری اہم بات اور ثبوت یہ ہے کہ اگر جناب بابا بلبل شاہؒ سے
قبل کوئی اسلامی مبلغ یہاں وارد ہوتا' تو جب وہ یہاں کے غیر مسلموں کو بت پرستی اور
اسلام کے خلاف باتوں سے منع کرتا' تو کیا پھر یہ ممکن تھا کہ یہاں کے غیر مسلم باشندے
اُس کو تبلیغ کرنے کی اجازت دیتے اور اس کی جان بخشتے۔

سنسکرت مورخ جون راج نے اپنی تاریخ "زینہ ترنگنی" میں کہیں بھی نمایاں طور پر کشمیر
میں اسلام کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ہی رینچن شاہ کا اسلام قبول کرنے کی بات لکھی ہے۔ اس
کی یہ بات بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ کوٹہ رانی کا لڑکا "حیدر" رینچن شاہ کے انتقال کے وقت
بالغ تھا' کیونکہ اُس کے لکھنے کے مطابق رینچن شاہ نے کشمیر کی حکومت پر سنہ ۷۲۰ھ مطابق سنہ ۱۳۲۰ء
میں قبضہ کیا' اور صرف تین سال' ایک ماہ اور ۱۹ دن حکومت کر کے سنہ ۱۳۲۳ء میں وفات
پائی۔ حکومت کے دوران ہی رینچن شاہ نے سنہ ۲۲-۱۳۲۱ء کے دوران کوٹہ رانی سے شادی کی'
پھر حیدر پیدا ہوا۔ نتیجہ کے طور پر رینچن شاہ کے انتقال کے وقت حیدر کی عمر ڈیڑھ یا ڈھائی
سال سے زیادہ نہیں ہوگی گویا وہ بالکل نابالغ (بچہ) تھا۔ جون راج سنسکرت مورخ
کی یہ بات بھی درست معلوم نہیں ہوتی کہ رینچن شاہ کی وفات کے بعد کوٹہ رانی نے
اودیان دیو برادر سہہ دیو سے شادی کی جو ہندو تھا۔ اس سلسلے میں غور طلب بات ہے
کہ سلطان رینچن شاہ نے سنہ ۱۳۲۳ء میں انتقال کیا۔ اس کے پیر و مرشد جناب بابا بلبل شاہؒ
رینچن شاہؒ کی وفات کے بعد چار سال تک زندہ رہے سنہ ۱۳۲۷ء میں اُن کا وصال ہوا' اور

کوٹہ رانی کا بھائی راون رینہ جس نے اسلام قبول کیا تھا اس خاندان کا سلسلہ ابھی کشمیر میں چلا آرہا ہے۔ کیا وہ کوٹہ رانی کو پھر سے ہندو بننے میں مانع نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اودیان دیو نے بھی اسلام قبول کیا ہو۔

قرین قیاس یہ بات دکھائی دیتی ہے کہ کشمیر میں اس وقت کوئی فارسی تاریخ سوائے سنسکرت تواریخ کے جو اس عہد یا اس کے قریب تالیف شدہ ہیں موجود نہیں تھی اس لئے ہمیں اس عہد کے صحیح حالات میسر نہیں۔ سنسکرت مورخین کی تواریخ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اکثر مسلمانوں کے بارے میں صحیح حالات لکھنے سے چشم پوشی کی ہے۔ اکثر مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر سنسکرت مورخ جون راج کی اس قسم کی باتیں قابل بھروسہ نہیں کیونکہ اس نے رینچن شاہ کے اسلام قبول کرنے اور اس کے اسلامی نام بعد قبول اسلام سلطان صدرالدین کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ اغلب ہے کہ اس نے اودیان دیو کے بارے میں بھی ایسا ہی طریقہ اپنایا ہو —— ●



حضرت میر سید علی ہمدانیؒ

کشمیر میں ہندو دورِ حکومت کا آخری تاجدار راجہ سہدیو تھا۔ ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۱۹ء میں شاہ میر نام کا ایک مسلمان سوادِ کوہ میر سے نقلِ مکان کر کے اس خطۂ ارض پر آباد ہوا اور راجہ سہدیو کے مصاحبوں میں داخل ہوا۔ اسی اثناء میں لداخ کا ایک شاہزادہ جس کا پورا نام لہاچن گیالپو رینچن[1] بھوٹہ تھا، ۱۳۲۰ء بمطابق ۷۲۱ھ میں اپنے والدین کی بد سلوکی سے تنگ آکر کشمیر بھاگ آیا اور راجہ سہدیو کے سپہ سالار رامچندر کے مصاحبوں میں شامل ہوا۔ ۱۳۲۳ء میں ذوالقدر خان جو ذوالچو کے نام سے معروف ہے اور قدیم چینی مذہب کا پیرو کار تھا، نے ستر ہزار کی لشکر جرار کے ساتھ کشمیر پر حملہ کیا۔ اس نے راجہ سہدیو سے ایک خونریز جنگ لڑی، راجہ شکست کھا کر کشتواڑ کی طرف بھاگ نکلا۔ ذوالچو نے میدان خالی پا کر کشمیر کو خاک و خون میں روندا، قتل و غارت کیا۔ لوٹ مار کے بعد مال و دولت سمیٹ کر واپس چلا گیا لیکن راہ میں شدید برفباری اور سردی نے اس کی جان لی۔ اس درمیانی عرصہ میں سپہ سالار رامچندر قلعہ گگن گیر[2] میں

۱۔ کشمیری اسے رینچن شاہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ ۲۔ علاقہ گگن گیر کا [illegible]۔

شاہزادہ ریچن اور شاہ میر کے ساتھ روپوش رہا۔ ذوالچو کے واپس جانے اور یہ اطمینان ہونے پر کہ اب وہ واپس نہیں لوٹے گا، رامچندر نے قلعہ سے نکل کر راجہ سہدیو کے بھائی اودون[1] دیو کو برائے نام راجہ بنا کر ملکی انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے امن بحال کیا۔ ملک میں امن و امان قائم کرنے اور نظامِ حکومت کو چلانے میں جس کمالِ مردانگی اور حکمت عملی کا ریچن نے ثبوت دیا وہ اسکی شہرت اور نیک نامی کا باعث بنا۔ لیکن رامچندر کی آرام طلبی کاہلی اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی خواہش نے اس کے دل میں اقتدار پر قابض ہونے کی ہوس پیدا کی۔ چنانچہ شاہ میر کے اشتراک و حمایت سے اس نے رامچندر کو اقتدار سے الگ کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ ایک رات طے شدہ پروگرام کے مطابق ان دونوں نے اپنے وفادار سپاہیوں کے ہمراہ رامچندر کے محل پر کامیاب حملہ کر کے اسے قتل کیا اور ریچن نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ ۷۲۳ھ بمطابق ۱۳۲۳ء میں دستور کے مطابق شکست خوردہ غنیم کی بیوہ کوٹا رانی سے شادی کر کے شاہانِ سلف سے اپنا رشتہ جوڑا۔ درباری براہمنوں کو یہ حرکت ناگوار گزری چونکہ ریچن غیر ملکی ہونے کے علاوہ بدھ مت کا پیرو کار تھا۔ ان کے دل میں خیال گزرا، اگر اسے برداشت کیا گیا تو وہ یہاں بدھ مت پھیلائیگا۔ کشمیری برہمن شیوازم کے ماننے والے تھے۔ وہ بدھ مت کے احتمالی عروج سے خائف ہو کر اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوئے۔ انہوں نے ریچن کو ہلاک کرنے کے متعدد منصوبے بروئے کار لائے لیکن ہر بار شاہ میر اور دوستاں سے تازہ وارد ایک سنی مسلمان لنگر چاک اور اس کے ساتھیوں کی مدافعت سے یہ سازشیں ناکام ہوتی رہیں۔ ریچن شاہ میر کی صحبت سے کسی حد تک اسلامی عقائد سے متعارف ہوا تھا لیکن مسلمان نہیں بنا تھا۔

اس تناظر میں ریچن اور اسکی بیگم کے درمیان مذہبی معاملات پر بحث و تمحیص کا ہونا

---

[1] اودون دیو یا اودیانہ دیو۔

بے حد اطمینان نہیں۔ چنانچہ ایک شب دونوں کے مابین یہ عہد و پیماں ہوا کہ اگلی صبح جس شخص
کا منہ دیکھیں گے اُسی کا مذہب قبول کریں گے۔ اتفاقاً علی الصباح دونوں نے ایک ترنم ریز
اور دلکش آواز سنی۔ یہ اذان تھی جو اس عجیب و غریب آواز کو سنتے ہی دونوں غیر شعوری طور
پر اپنے محل کی بالاخانے پر نکل آئے جو عالی کدل کے قریب دریائے جہلم کے کنارے پر واقع
تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے سے اذان دینے والے کو دیکھتے ہی شب گزشتہ کا قول و
قرار یاد آیا۔ اذان دینے والے کو بلا کر اُن کا نام و مذہب دریافت کیا۔ یہ مشہور خدا شناس
عارف باللہ صوفی بزرگ حضرت سید شرف الدین عبدالرحمان عرف بلبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ
تھے جو ناصر سعید یک کے عہد حکومت میں بغرض تبلیغ دین اسلام ترکستان سے ایک ہزار
مُریدوں کے ہمراہ وارد کشمیر ہوئے تھے۔ رینچن اور اُس کی ملکہ آپ کے دست مبارک
پر مشرف باسلام ہوئے۔ رینچن کا اسلامی نام ملک صدرالدین قرار پایا اور ملکہ شعبہ کہلانے
لگی۔ دونوں تا بقیہ حیات پابند صوم و صلوٰۃ اور مسلک حنفیہ کے پابند رہے۔ ملک
صدرالدین خانقاہ بلبل شاہ واقع بلبل لنکر سرینگر کے احاطہ میں جنوب کی سمت دفن ہیں۔
ان دونوں کے بطن سے حیدر شاہ پیدا ہوا جس نے بعد از آں خانقاہ بلبل شاہ اور رینچن مسجد
تعمیر کروائی۔

ملک صدرالدین کے انتقال پر شاہ میر برسر اقتدار آیا اور شمس الدین کے لقب سے [illegible]ھ
مطابق ۱۳۳۹ء میں تخت نشین ہوا۔ شاہ بانو اُس کی نکاح میں آئی اور کئی بچوں کی ماں بنی۔ اس
طرح کشمیر میں شاہ میر سے کشمیری خاندان کی حکومت قائم ہوئی جو کم و بیش دو سو تئیس[۲۲۳] سال
اس سرزمین کی خود مختاری آزادی اور سرحدوں کی حفاظت کرتی رہی۔

سلطان شمس الدین کے جمشید اور علی شیر نام کے دو بیٹے تھے۔ ۱۳۴۲ء میں جمشید تخت نشین
ہوا مگر اس کے چھوٹے بھائی نے ایک سال بعد اس پر حملہ کر کے کشمیر سے بھگا دیا۔ اور خود
سلطان علاؤالدین کے لقب سے تخت و تاج سنبھالا۔ سلطان علاؤالدین نے بارہ[۱۲] سال

آٹھ ماہ تک بڑے ہی آب و تاب سے حکومت کی۔ ان کا مقبرہ ملک اکھن سری نگر میں ہے
سلطان علاؤ الدین کے عہد حکومت ۸۷۰ھ میں شہرہ آفاق عارف باللہ ولی اللہ حضرت
جہانیاں سید جلال الدین مخدوم بخاری جہان گشت رحمۃ اللہ علیہ کشمیر تشریف لائے۔ تین ہفتہ
قیام فرمایا۔ آپ رشتے میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کے چچیرے بھائی ہیں۔ آپ
کے قیام کشمیر کے دوران للہ عارفہ نے آپ کا فیض حاصل کیا اور آپ کا شمار مرشد کہتی ہیں۔
اس موقعہ پر حضرت سید بلبل شاہ کا تذکرہ بے محل ہوگا۔ آپ ترکستان کے موسوی
سادات سے ہیں۔ لہٰذا وہیں کافی عرصہ تک اقامت پذیر رہے۔ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی اور
اور شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید ہوئے۔ حنفی مسلک کے پیرو تھے۔
اس لحاظ سے آپ کشمیر میں حنفی مسلک سلسلۂ سہروردیہ اہل سنت و الجماعت اور ترویج و
اشاعت دین اسلام کے صحیح معنوں میں مبلغ اولیٰ ہیں۔ آپ کے قیام کشمیر سے ہی مسلم دور
حکومت کی رسم افتتاح ہوئی جبکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ
کے دنوں سے ہی مسلمان سیاحوں نے کشمیر آنا شروع کیا تھا۔ چنانچہ چچ نامہ فارسی
فتوح السندھ کے مصنف علی احمد حمید (انگریز ترجمہ ایلیٹ ڈوسن) تاریخ ہند مطبوعہ لندن
۱۸۶۷ء ایڈیشن رقمطراز ہے۔

"جب محمد بن قاسم نے سندھ کے حکمران راجہ داہر کو شکست دی راجہ
کا بیٹا جیا سنگھ اپنے مسلم دوست جیسم بن سام جو شام کا رہنے والا
تھا کے ساتھ فرار ہوکر کشمیر پہونچا۔ جیسم بن سام نے کھلم کھلا کشمیر
میں تبلیغ اسلام کا سلسلہ شروع کیا جس پر اسے راجہ نے خلعت
شاہی سے سرفراز کیا۔"

بہرکیف ایسے باخدا اصحاب نے اپنے اسفار کشمیر میں کھیں جم کر ترویج و اشاعت اسلام کے
مشن سے کام نہیں کیا بلکہ جذبہ اسلامی کے تحت جہاں پہونچے اسلامی عقاید اور سنت

خیر البشر جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہونچایا جس کے طفیل انہیں شہرت و بقائے دوام حاصل ہوئی۔ مصنف سوانح محمود غزنوی "ازل" نے لکھا ہے البیرونی پہلا مسلمان ہے جس نے سنسکرت زبان میں کشمیریوں کے لئے اسلامی لٹریچر مہیا کیا۔

کشمیر میں اسلام کی ترویج و اشاعت میں جو حیرت انگیز کارنامہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کے دست فیض بخش سے انجام پایا ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ آپ نے اپنی بے مثل روحانی وجاہت سے اس خطہ ارض کو اسلام کی نئی تعلیمات سے جس لگن سے منور کیا اس کا مظہر کشمیری مسلمانوں کی آپ سے بے پناہ عقیدت و احترام سے آشکار ہے۔ آپ کی ذات گرامی کو کشمیر کے فرزان توحید اللہ تبارک تعالیٰ کی عنایت اور بندہ نوازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لازم ہے کہ آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں ادوار بالخصوص ابتدائی حالات اور کشمیر میں آپ کی بابرکت اقامت اور مشن کے بارے میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا جائے۔ علامہ اقبالؒ حضرت امیر کبیرؒ کے بارے میں جاوید نامہ میں لکھتے ہیں ؎

مرشد معنی نگاہاں بودہ ای   محرم اسرار شاہان بودہ ای

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ اس خطہ ارض میں امیر کبیرؒ شاہ ہمدانؒ اور علی ثانیؒ کے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت سید شہاب الدین ہمدان کے امراء اور زمینداروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اسی مناسبت سے آپ امیر کہلاتے ہیں اور جو روحانی دولت اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی تھی اس کی مناسبت سے بھی آپ کو امیر کہتے ہیں۔ عجم میں سادات کے اسم گرامی کے آگے میر یا مرزا کا لفظ احتراماً لگایا جاتا ہے اور پہچان شناخت کے لئے دوسرے لوگ میر یا مرزا کا استعمال نام کے بعد کرتے ہیں جس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ وہ زمرۂ سادات میں نہیں ہیں۔ بہر صورت یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے۔ دراصل بات حضرت شاہ ہمدانؒ کے القاب کی ہو رہی تھی آپ کے مریدِ عقیدت مند اور مختلف تذکرہ نگاروں نے آپ کو ذیل کے القاب سے یاد کیا ہے۔

قطب الزمان۔ شیخ سالکان جہان۔ امیر کبیر۔ شیخ الاسلام۔ افضل المحققین۔ قطب الاقطاب شاہ ہمدان۔ سلطان السادات۔ شیوخ الکامل۔ صاحب الکشف وکرامات۔ علیؒ ثانی۔ محل العلوم الانبیاء والمرسلین۔ شیوخ الکمل۔ اکمل المدتقین۔ الوندی المولا[1]۔

آپ کا یوم ولادت بروز پیر (سوموار) ۱۲ ماہ رجب المرجب ۷۱۳ھ بمطابق ۲۲ اکتوبر ۱۳۱۳ء ہے جبکہ آپ کے ماہ ولادت کی مماثلت حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتی ہے۔ شیخ نظام الدین یحیٰ الغوری فرماتے ہیں جب سید علیؒ پیدا ہوئے اس شب میں نے رؤیا میں دیکھا حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام سید شہاب الدینؒ کے دولت کدہ کی جانب ہاتھوں میں نفیس پوشاک لئے جاتے فرمارہے ہیں۔ آج شب اس گھر میں بلند مرتبہ بیٹا پیدا ہوا ہے یہ پوشاک بطور تبرک وہاں لے جارہے ہیں۔ آپ کی ولادت سے قبل حضرت شیخ ابوسعید رحبشی طویل العمری کا تذکرہ روایات میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ جناب سیدالانبیاءؐ کے والدین جناب عبداللہؓ اور حضرت آمنہؓ کی شادی کے موقعہ پر مکہ معظم میں تھے۔ آپ کو خواب میں حضور سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نصیب ہوا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی کہ تمہاری ملاقات بہت جلد اس سے ہوگی وہ میری اولاد میں ہوگا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہؐ یہ ملاقات کب اور کہاں ہوگی۔ فرمایا میری ہجرت کے ۷۱۲ سال بعد عراق کے شہر ہمدان میں وہ ستارہ طلوع ہوگا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہؐ میری آنکھوں کی بصارت اللہ کے نبیؐ پر نچھاور ہو اُن کا نام کیا ہوگا فرمایا علی ہمدانی اور پھر حضرت ابوسعیدؒ کی یہ بشارت یوں پوری ہوئی (ہمدان کا واقعہ ہے۔ جب آپؒ دس برس کے ہوئے جناب شہاب الدینؒ کے دل میں خیال آیا سید علیؒ کو تیر اندازی سیکھنی چاہیئے استاد مقرر

---

[1] یہ لقب آپ کے وطن ہمدان کی مناسبت سے ہے چونکہ ہمدان کوہ الوندی کے دامن میں واقع ہے اس لئے آپ کو اِس لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

کیا گیا۔ ایک دن کوہِ الوندی کے دامن میں مشق شکار کرتے۔ آپ کے اتالیق نے درخت پر
سفید رنگ کا ایک خوبصورت پرندہ دیکھا۔ آپ کو اُس پر تیر چلانے کو کہا۔ آپ کے تیر
سے پرندے کا بازو زخمی ہوا وہ زمین پر آ گرا۔ لیکن پھدکتے پھدکتے پاس کی جھاڑیوں میں
چھپنے لگا۔ اسے پکڑنے کی چاہ میں آپ اس کے پیچھے دوڑے وہ ایک غار میں گھس گیا تھا
اسی دوران آپ کے والد گرامی بھی وہاں پہونچے۔ ارجمند فرزند سے دریافت کیا میاں کیا
ہو رہا ہے۔ آپ نے واقعہ سنایا اور غار میں داخل ہوئے۔ غار اندر سے کشادہ اور روشن
تھا اور ایک ضعیف العمر بزرگ جن کی سفید ابروؤں (بھووں) نے ان کی آنکھیں ڈھانپ
لی تھیں، غار میں تشریف فرما تھے۔ سید علی کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا
اے بشارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم علی ہمدانی ہو؟ اس کے بعد اپنا خرقہ آپ کے
کندھے پر ڈالتے فرمایا: اے فرزند یہ خرقہ اس امر کی سند ہے کہ تجھ سے ہمدان کی حکومت
واپس لی گئی اس کے عوض آٹھویں صدی کی روحانی حکومت تفویض کی گئی۔ اس درمیان
میں جناب سید شہاب الدینؒ بھی غار میں داخل ہوئے تھے اور بزرگ کی بشارت سے
محظوظ ہو چکے تھے۔ گھر واپس لوٹتے ہی حضرت علاء الدولہ سمنانی کو بلا بھیجا اور ان سے
کہا اب تک سید علی آپ کا شاگرد تھا آج میں خدا اور امام الانبیاء صلی اللہ علیہ آلہ وسلم
کے اسم بابرکت پر اسے کلیتاً آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

جناب سید علی ہمدانی کا شجرہ نسب اٹھارویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ
سے ملتا ہے اور آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ فاطمہ کا نسب سترہویں پشت میں جناب
خاتم النبین محمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے ملتا ہے آپ کا شجرہ نسب یوں ہے۔

سید شہاب الدین بن محمد بن علی بن یوسف بن شرف بن محمد بن جعفر بن عبداللہ
بن محمد بن حسین بن جعفر الحجہ بن عبداللہ بن زاہد بن الحسن بن علی زین العابدین بن حسین
شہید کربلا بن علی اس نسبت سے آپ کا شجرہ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔

چار برس کی عمر میں آپ کے والد گرامی نے آپ کو تعلیم و تربیت کے لئے حضرت الامام رکن الدین شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ کے سپرد کیا جو آپ کے بزرگ اور رشتے میں آپ کے ماموں تھے جنہوں نے الاشراف اور ارشمند دل کو تربیت دیکر بام عروج کمال تک پہونچایا تھا، ابتدائی تربیت کے بعد آپ نے شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ کے تین تربیت یافتہ بزرگوں یعنی شیخ اخی ابوالبرکات علی دوستی سمنانیؒ (۲) شیخ ابوالمیامن محمود ابن عبداللہ مزدقانی رازیؒ اور شیخ محمد بن اذکانی سمنانیؒ سے تربیت حاصل کی۔ شیخ مزدقانیؒ سید میر علی ہمدانیؒ کے چچا کے بھی پیر تھے۔

غرض عام بچوں کی مانند صغرسنی کی شوخیاں شرارتیں آپ میں مفقود تھیں۔ کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ برعکس اس کے آپ کا ذہن تحصیل علم باطنی کی جانب راغب اور کوشاں تھا۔ بے حد ذہین ہوشیار اور حاضر جواب تھے۔ رشد و ہدایت کا اندازہ آپ کے انداز تکلم سے ہویدا تھا۔ عہد طفلی کے ایام اپنے ماموں شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ کے زیر تربیت گزار کے قرآن مجید حفظ کیا اور بارہ سال کی عمر میں جملہ دینی علوم اور طریقت و حقیقت سے آگہی پائی۔

اس زمانے میں عراق کا حکمران سلطان ابوسعید بہادر خان ابن الجایتو سلطان بن ارغون خان بن اباقاخان تھا۔ ایک روز اس کے دل میں خیال آیا اور یہ امنگ انگڑائی لینے لگی۔ بحیثیت بادشاہ جو لوگ مجھ سے ملتے ہیں بے غرض نہیں ہوتے جبکہ خداشناس علماء و مشائخ دنیا اور اسکی لذتوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ایک ایسی محفل کا اہتمام کیا جائے جس میں ان بزرگان دین سے ملنے کا شرف حاصل ہو۔ بادشاہ نے وزیر کو دعوت نامے

۱؎ شیخ محمود مزدقانیؒ اپنے زمانے میں سر برشتہ مشائخ و صوفیہ شمار ہوتے تھے۔ اخی علی دوستیؒ ان کے طریقت میں اور شیخ علاء الدولہؒ شیخ علی دوستی سمنانیؒ کے فتوحات میں مرید تھے۔ خود حضرت مزدقانیؒ طریقت میں شیخ علاء الدولہؒ کے مرید تھے۔

جاری کرنے کا حکم دیا۔ لیکن وزیر نے بادشاہ کو صلاح دی۔ بزرگوں کو یونہی بلا کر رحمت دینا جائز نہیں۔ آپ ایک خانقاہ تعمیر کرائیں اور پھر انہیں خیر و برکت کی دعا دینے کے لئے مدعو کریں۔ بادشاہ نے وزیر کی تجویز سے اتفاق کرتے ۷۲۵ھ میں خانقاہ تعمیر کرائی۔ محفلِ مشائخ منعقد ہوئی جس میں چار سو مشائخوں، صوفیوں، بزرگوں اور علماء نے شرکت کی شاہ ہمدان رحؒ کے والد اور ماموں جو ہمدان کے حاکم بھی تھے، سید علی ہمدانی رحؒ کو ساتھ لیکر گئے۔ مجلس میں آپ کے والد گرامی نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اہل مجلس کی توجہ بچے کی جانب مبذول کراتے استدعا کی کہ بچے نے قرآنِ حکیم حفظ کیا ہے، مشائخین سے التجا ہے اس پُر وقار با برکت محفل میں بچے کے حق میں سورۂ فاتحہ پڑھی جائے اور بچے کے لئے تمام محققین ایک ایک حدیث بیان فرمائیں تاکہ وہ بطور تبرک سُنے۔ سب سے پہلے حضرت شیخ علاء الدولہ رحؒ اور اختتام پر خواجہ قطب نیشاپوری رحؒ نے حدیث بیان فرمائی۔ اس سے مراد یہ تھی کہ بچے کی توجہ جناب رسالت مآب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی جانب مبذول ہو۔ مجلس میں سید علی ہمدانی رحؒ کا انداز بیان اور آداب مجلس دیکھ کر اولیاء کرام بے حد محظوظ ہوئے۔ ان میں سے تیتیس ۳۳ نے آپ کو "ترابی دیار طلب حق" طریقت میں تعلیم و تربیت شروع کرنے کی اجازت دی۔ لیکن آپ اجازت پانے کے باوجود اس جانب راغب نہیں ہوئے۔

بارہ برس کی عمر میں حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی رحؒ نے اپنے ہونہار بھانجے کو دینی علوم طریقت و سلوک میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے لئے شیخ تقی الدین ابوالبرکات اخی علی دوستی سمنانی رحؒ کے سپرد کیا۔ جب آپ نے حضرت شیخ اخی علی دوستی سمنانی رحؒ کو اپنے نشیمن میں صبح و شام تھوڑی سی سر ہلاتے دیکھا تو دریافت فرمایا۔ کیا صبح و شام کے ذکر میں سر ہلانے کی ضرورت ہے؟ حضرت اخی علی دوستی رحؒ نے فرمایا "بیشک مجھے اپنے مرشد حضرت ابوالمعالی شیخ محمود مزدقانی قدس سرہٗ نے ایسے ہی تعلیم دی ہے"۔ اس کے بعد آپ نے

استادِ محترم سے التماس کی "مجھے ذکر کی تعلیم فرمائیے"۔ استاد نے قبول کیا۔ تین دن ان کے ساتھ ذکر میں موافقت کی، اچانک غیبت حاصل ہوئی آپ اس واقعہ کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

"چوں سہ روز با او در ذکر موافقت نمودم ناگاہ مرا غیبتی بحصول
موصول گشت و جمال جہاں آرای مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
بدیدم بر بام بلند چوں خواستم تا در آن مقام بروم مصطفیٰؐ
فرمود کہ فرزند نزد شیخ محمود مزدقانی برو تا ترا دریں مقام بیارد۔"

(تین دن ان کے ہمراہ ذکر میں موافقت کرنے سے اچانک مجھ پر غیبت طاری ہوئی، حضور فخر موجودات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال مبارک کے دیدار سے مشرف ہوا۔ آپؐ اونچی چھت پر قیام فرما تھے۔ میں نے بھی وہاں پہونچنے کی خواہش کی آپ نے فرمایا فرزند شیخ محمود مزدقانیؒ کے پاس جاؤ وہ تمہیں اس بلندی پر پہونچائیں گے)

جونہی غیبت کی حالت سے نکل کر آپ شعور میں آئے تو حضرت اخی علی دوستی سمنانیؒ کو سارا واقعہ سنا کے استدعا کی کہ مجھے شیخ ابوالمیامن شرف الدین محمود مزدقانیؒ کی خدمت میں پہونچانے کا انتظام فرمائیں۔

آپ باطنی علم و تعلیمات کے حصول کے لئے عارف کامل کی خدمت اقدس میں مزدقان پہونچے۔ جس جماعت میں ایک باہوش ذی فہم معصوم بچے پر اللہ تبارک تعالیٰ نے جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ علم غیب عطا فرمایا، ظاہر ہے اس عنایت اور جوہر بے بہا کے حاصل ہونے پر آپ دل ہی دل میں پھولے نہ سماتے ہونگے اور اسی کیف و مستی میں عارف باللہ حضرت شیخ مزدقانیؒ کی خانقاہ میں پہنچے جہاں شیخ مزدقانیؒ کی نظر کیمیا گر نے انہیں اعتدال پر لانے اور تربیت دینے کی خاطر اپنی پہلی فرصت میں مخاطب ہو کر فرمایا "اگر مزدوری کرنے آئے ہو تو میں حاضر ہوں لیکن خدمت

سے انکار نہیں۔ ہاں اگر خدمت گاری کی نیت سے آئے ہو تو خانقاہ کو صاف ستھرا رکھنے والے سیاہ فام خادم کے جوتے بلا ناغہ روزانہ اس کے سامنے رکھنے ہونگے۔ میر سید علی ہمدانیؒ نے انتہائی خندہ پیشانی اور انکساری سے مرشد کے فرمان پر تہہ دل سے اقرار اور رضامندی ظاہر کی۔ پھر حضرت مزدقانیؒ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے لیکن سال بھر عجز و انکساری، خدمت و ریاضت عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول و معروف رہنے کے باوجود توفیق کے مطابق خیر و برکت کی فراوانی نہیں ہوئی۔ میر سید علی ہمدانیؒ کا باطن بین حساس ذہن اور باطن شناس فہمیدہ روح یہ سمجھ گئی کہ شاید کمی کوئی بھی رہ رہی ہے جو توقعات کے مطابق نتائج بر آمد نہیں ہوئے۔ اس کوتاہی کا ازالہ کرنے کی خاطر آپ نے حضرت شیخ مزدقانیؒ سے استدعا کی کہ خانقاہ کے کناس (مہتر)¹ کا کام مجھے تفویض کیجئے۔ مرشد کامل ان کے دل کی کیفیت کو تاڑ گئے فرمایا۔ "کناس تو بیت الخلاء صاف کر ہی لیتا ہے۔ لیکن تم اپنے نفس کو پاک نہیں کر سکے جاؤ اور خلوت خانہ میں بلند ہمتی سے اذکار و وظائف میں محو و مصروف رہو تاکہ منزل پا سکو۔" سید علی ہمدانیؒ نے عارف باللہ کی ہدایت گرہ میں باندھ لی! وہ اپنے آپ کو انتہائی قلیل غذا پر محدود کر کے قید تنہائی کی جیسی حالت میں رکھ کر آزمائش اور امتحان کی گزرگاہ سے گزرنے کا دل میں پکا ارادہ کیا۔ گوشہ نشینی کی اس حالت کو صوفیائی اصطلاح میں "چاہ زندان" کہتے ہیں۔ اس طرح شیخ محمود مزدقانیؒ کے رشد و ہدایت امیر کبیرؒ کی سخت ریاضت و استحکام اور خلوص و گداز نے بارگاہ خداوندی سے فیض و برکت اور حضور حاصل کیا۔ تین ماہ کی مکمل گوشہ نشینی، ذکر و فکر اور نیم فاقہ کشی کی حالت میں جب آپ خلوت خانہ سے باہر تشریف لائے تو حضرت شیخ مزدقانیؒ نے

---

¹ تعلیمات وادی سے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وادیٔ کشمیر میں کناس (بھنگی) کو "واتل" شیخ کہتے ہیں اور "مہتر" جو بھنگی کے بدلے مستعمل ہے گلگت کے بادشاہوں کا لقب ہے ایسے اسلام کی دین کہئے کہ جس کے دامن میں آ کر بقول علامہ اقبالؒ : ؂

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

آپ کو خانقاہ کا منبر صاف کرنے کا کام سونپا۔ جناب امیر کبیرؒ نے یہ خدمت بڑے جوش و خروش اور سعادت مندی سے انجام دی اور وہ ڈھیلے جو حضرت شیخ مزدقانیؒ کے بیت الخلاء میں رکھے جاتے تھے آپ اپنی پیشانی سے صاف کرتے تھے حتیٰ کہ خراماں خراماں آپ کی پیشانی کی جلد گھس گئی اور زخم ڈھانپنے کے لئے آپ نے اپنی کلاہ سے جبیں ڈھانپ لی۔ جب جناب شیخ مزدقانیؒ نے اپنی بصارت غیبی سے ان کا حال مشاہدہ کیا تو آپ سے کہا۔ "سید اپنی جان کو آلام و مصائب میں ڈالنا دانشمندی نہیں۔ آج سے ڈھیلوں کے بجائے صوفیوں کی طہارت کے لئے پانی لایا کرو۔"

اسی دوران ایک شب آپ کو رؤیا میں حضرت امام شافعیؒ کے دیدار کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے ہدایت کی شافعی مسلک اختیار کرو۔ جبکہ ماقبل آپ اہل سنت الجماعت مسلک حنفی سے وابستہ تھے۔ حسب ہدایت آپ نے عمل کیا اور کبروی سلسلہ مشائخ کے بزرگوں کی اختیار ہوئے۔ آپ نے خرقہ فتوت حضرت ابوالمیامن محمدؐ بن اذکانیؒ کے دست مبارک سے زیب تن کیا۔ سلسلہ کبرویؒ کی ترتیب و تسلسل مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) سید علی ہمدانیؒ (م ۷۸۶ھ) (۲) شیخ محمود مزدقانیؒ (م ۷۶۶ھ) (۳) شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ (م ۷۳۶ھ) (۴) شیخ عبدالرحمان اسفرائنیؒ (م ۷۰۰ھ) (۵) شیخ احمد جوزقانیؒ (م ۶۶۹ھ) (۶) شیخ علی لالاؒ (م ۶۴۷ھ) (۷) عمار یاسرؒ (م ۵۸۲ھ) (۸) شیخ نجم الدین الکبرویؒ[1] (شہید ۶۱۸ھ) (۹) شیخ ابا نجیب السہروردیؒ (م ۵۶۳ھ) (۱۰) شیخ احمد غزالیؒ (م ۵۱۴ھ) (۱۱) شیخ ابا بکر نساجؒ (م ۴۸۷ھ) (۱۲) شیخ ابالقاسم الجرجانیؒ (م ۴۵۰ھ) (۱۳) شیخ ابا عثمان المغربیؒ (م ۳۷۲ھ) (۱۴) شیخ ابا علی الکاتبؒ (م ۳۴۶ھ) (۱۵) شیخ ابا علی الرودباریؒ (م ۳۲۲ھ) (۱۶) شیخ ابالقاسم جنید البغدادیؒ (م ۲۹۷ھ) (۱۷) شیخ سری سقطیؒ (م ۲۵۱ھ) (۱۸) شیخ معروف کرخیؒ (م ۲۰۰ھ) (۱۹) امام موسیٰ الکاظمؒ (م ۱۵۹ھ) (۲۰) امام جعفر صادقؒ (م ۱۴۸ھ)

---

[1] کبروی سلسلے کے علمدار ہیں۔ آپ ۶۱۸ ہجری میں شہید ہوئے۔

(۲۱) امام محمد باقرؒ (م ۱۱۴ھ) (۲۲) امام علی زین العابدینؒ (م ۹۴ھ) (۲۳) امام حسینؓ شہید کربلا (۶۱ھ) (۲۴) اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالبؓ (م ۴۰ھ) (۲۵) سید المرسلین رسول رب العالمین صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔

غرض آپ چھ سال تک حضرت شیخ مزدقانیؒ کی خانقاہ میں ذکر و فکر، درود و اذکار میں محو رہے اور خدمت انجام دیتے رہے۔ ۷۶۶ھ میں شیخ مزدقانیؒ کی ہدایت اور ارشاد کے مطابق آپ دوبارہ شیخ اخی علی دوستی سمنانیؒ کی خدمت اقدس میں ہمدان پہنچے۔ ان دنوں اخی علی دوستی ہمدان میں ایک بڑی مسجد تعمیر کروا رہے تھے جو آپ کے آنے تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی۔ ہمدان مراجعت ہو کر آپ نے بلاناغہ ہر شب نماز صبح تک اس زیر تکمیل مسجد کے لئے اینٹیں چنیں۔ آپ کی آمد کے تین ماہ بعد مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی۔

حضرت اخی علی دوستی سمنانیؒ کی خانقاہ میں ہر ایک کو اخی (میرے بھائی) کہکر پکارا جاتا تھا اور درویشوں کی جسمانی تنومندی و صحت کی جانب خاص توجہ دی جاتی تھی۔ ہر کام شیخ اخی علی دوستیؒ کی ہدایت و ارشاد کے مطابق عمل و تجربہ طے پاتا تھا۔ مقررہ اوقات پر جب درویش ریاضت، عبادت، ذکر و فکر اور اوراد و وظائف سے فارغ ہوتے تھے حضرت اخی علی دوستی سمنانیؒ انہیں ایسے کام انجام دینے کو کہتے تھے جن سے دینی فوائد مقصود ہوتے تھے اور جب کوئی ایسا وقت فراہم نہیں ہوتا تھا تو آپ درویشوں سے پتھر ڈھلواتے تھے۔ پتھروں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانا اور واپس لاکے پتھر پہلی جگہ لاکر رکھنا۔ درویش ارشادِ حکم کے مطابق عمل کرتے تھے۔ ایک دن پتھر ڈھوتے حضرت میر سید علی ہمدانیؒ نے حضرت شیخ اخی علی دوستی سمنانیؒ سے سوال کر ہی ڈالا۔ استادِ محترم ایسا کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ استفسار سنتے ہی حضرت طیش میں آئے اور غضبناک ہو کر ان کی پشت مبارک پر اتنی زور سے مارا کہ نہ صرف یہ کہ نشان پڑ گیا بلکہ کئی دنوں تک امیر کبیرؒ کے کانوں میں چوٹ کی آواز گونجتی رہی، پھر ارشاد

فرمایا۔" اسلامی تصوف میں مراقبہ اور عزلت نشینی ہی نہیں بلکہ تزکیہ نفس و قلب کے دوران بھی روحانی اور جسمانی پرداخت و پرورش لازمی ہے۔ اپاہج اور لاغر ہونے سے تندرست و توانا ہونا بہتر ہے۔"

محترم استاذ کی منطق کے اسرار و رموز سمجھنے میں حضرت شاہ ہمدانؒ کو جو کسر باقی رہ جاتی وہ حضرت اخی علی دوستی سمنانیؒ نے اپنی پہلی ہی ضرب سے درست کرلی۔ حضرت اخی علی دوستی سمنانیؒ کی خانقاہ میں دو سال رہکر جب آپ نے اذکار و وظائف، ذکر و فکر، طریقت و سلوک، تصوف، فتوحات، اطاعت و فرمانبرداری کے صوفیانہ رموز، مجاہدہ، ریاضت اور درویشانہ اصطلاحوں کا بھرپور افادہ و مہارت حاصل کی اور ان صفات سے مزین ہوئے تو حضرت اخی علی دوستی سمنانیؒ نے آپ کو ۷۳۳ھ میں دوبارہ حضرت شیخ محمود مزدقانیؒ کی خانقاہ مزدقان جانے کا ارشاد و حکم فرمایا۔ آپ نے تیاری کے لئے دس دن کی مہلت طلب کی۔ وقت مقررہ پر حضرت اخی علی دوستی سمنانیؒ اپنے خلوت کدہ سے باہر تشریف نہ لائے درویشوں اور صوفیوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ انہوں نے میر سید علی ہمدانیؒ سے خلوت خانہ میں جانے کی استدعا کی آپ نے وہاں جناب اخی علی دوستی سمنانیؒ کو ذکر کی حالت میں پایا لیکن آپ زانوں میں سر مبارک رکھ کر خالق ابدی سے جا ملے تھے۔ آپ نے بہ آواز بلند انا للہ و انا الیہ راجعون کہا۔ خانقاہ میں کہرام مچا۔ تدفین کے تین ایام گزارنے کے بعد آپ حضرت شیخ محمود مزدقانیؒ کی صحبت میں حاضر ہوئے جہاں انہوں نے آپ کو سیر و سیاحت کی اجازت دیتے ارشاد فرمایا۔ تمام عالم میں سفر کرو اور ہر ایک ولی اللہ کی زیارت کرتے ان سے حتی الامکان استفادہ کرو۔ چنانچہ اس ہدایت کے مطابق آپ نے مسلسل بیس برس تک دنیا کے مختلف ممالک اور شہروں کا تین بار سفر کیا۔ آپ کے اسفار کے متعلق تذکروں میں مندرجہ ذیل ممالک کے نام ملتے ہیں۔ مزدقان۔ بخارا۔ سمرقند۔ ترکستان۔ ماوراء النہر۔ روم۔ ختلان۔ مشہد یا طوس (ایک ہی جگہ کے دو نام ہیں)، قبچاق، جبل القاف۔

بغداد۔ خراسان۔ شام۔ یزد۔ مدینہ منورہ۔ بلخ و بدخشان۔ فلسطین۔ ختن۔ بلتستان۔ یارقند
تنگاری۔ کاشغر۔ کشمیر۔ لداخ۔ سراندیپ (موجودہ نام سری لنکا) زیتون کا شہر یعنی چین۔
مکہ معظمہ۔ ہند و پاک کے علاوہ اللہ تبارک تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ آپ اللہ کی اس
کائنات میں راہ حق تلاش کرنے اور صدائے حق بلند کرنے کہاں کہاں پہونچے۔ اپنے مرشد
کی ہدایت کے مطابق آپ نے دو تہائیوں تک دنیا کا دورہ باشترک تین بار سفر
کیا۔ آپ فرماتے ہیں:

> "سہ بار از مشرق تا مغرب سفر کردم بسی عجائب در بحر و بر دیدہ
> شد و ہر بار کہ بشہرہ و ولایتی رسیدیم رسم و عادات این آن
> موضع طریق دیگرم دیدم واحاد طلاب باو خلق را کہ در اطراف
> دنیا باشند ارشاد نمایم زیرا کہ در اقامت این نوع استفادہ
> افاضہ میسر نگردد۔"

(تین بار میں نے مشرق سے مغرب تک سفر کیا۔ سمندر اور خشکی پر بے شمار عجائبات
دیکھے۔ ہر بار جس شہر میں دوبارہ گیا وہاں نئی رسمیں اور عادتیں دیکھیں۔ طالبانِ حق جو اطراف
عالم میں ہیں ان کو رشد و ہدایت کی تعلیم دی کیونکہ قیام میں ایسی نوعیت کا فائدہ اور فیض پہونچانا
ممکن نہیں ہوتا)۔

آپ نے دورانِ سفر جہاں عجائبات عالم کی بوقلمونی کا گہرا مشاہدہ کیا وہاں دنیا
کے مختلف گوشوں میں مقیم بزرگوں، درویشوں اور مشائخوں کا ظاہری و باطنی شرف دیدار حاصل
کیا۔ آپ نے ان اسفار میں ہزاروں بندگانِ خدا کو صراط المستقیم پر چلنے کی رہنمائی فرمائی
اور لاتعداد گمراہوں کو اسلام کی منور فضا سے منور کر کے اسلامی قافلہ کے سرخیلوں کی صف
تک پہونچانے میں رہبری کی۔ ان اسفار میں آپ سے بے حساب واقعات کشف
کرامات کی تفصیل اتنی طویل ہے اگر انہیں یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں بھی کم پڑ جائیں

گی۔ چونکہ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا جائے۔ اس لئے مشتے از خروارے ذیل کے چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔

• آپ نے سراندیپ (سری لنکا) میں نقشِ پائے آدم علیہ السلام کی زیارت کی اور اس پہاڑی پر تین روز تک قیام کیا جہاں حضرت حوا سے جدا ہو کر آپ نے ایک چٹان پر قدم مبارک رکھا تھا۔ قدم مبارک چٹان میں دھنس گیا۔ اس مقام پر آپ کو خاص حضور کشف ہوا۔ لکھا ہے کہ بہت سارے مشائخ بھی سے ملنے آئے ان میں شیخ نجم الدین الکبریٰ بھی ہیں انہوں نے وصیت کی کہ اذکار میں سب سے افضل " ذکر یہ ہے۔

"سبحان اللہ والحمد للہ محمد کہ وسبحان العظیم وبحمدہ واستغفر اللہ"

آپ حضرت آدم علیہ السلام کے ایک اور عکس پائے مبارک کی زیارت کے لئے زیتون کے شہر (چین) بھی تشریف لے گئے۔

• جب آپ روم پہونچے وہاں مسلمان اور عیسائی علماء کے مابین یہ تکرار و مناقشے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ عیسائی اپنے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ کو مافوق الفطرت فضیلت بلکہ الوہیت کے قابل ہو کر اس بات پر بضد تھے کہ انہوں نے مردوں کو زندہ کیا تھا اس طرح مسلمانوں نے ان کی یہ جزوی فضیلت تسلیم کی ہے جبکہ مسلمانوں کی دلیل یہ تھی کہ یہ فضیلت رسالت مآب تاجدار دو عالم جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے بعض اولیاء اللہ کو بھی حاصل ہے۔ یہ سنتے ہی عیسائی علماء مناقشے پر اتر آئے۔ ساتھ ہی یہ تجویز پیش کی اگر کوئی ایسا معجزہ دکھائے تو ہم اسلام کی حقانیت تسلیم کرنے میں تاخیر نہیں کریں گے۔ مسلم علماء اس مطالبے سے عاجز ہوئے لیکن حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کی بر محل آمد کی خبر سنکر انہوں نے سئلہ آپ کے گوش گزار کیا۔ آپ عیسائیوں اور مسلمانوں کے اجتماع میں تشریف لائے اور کسی مردے کو پیش کرنے کی تجویز فرمائی۔ بالآخر اس اجتماع کے ساتھ ایک قبر پر گئے اور "قُم بِاِذنِ اللہ" تین بار کہا۔ مردہ زندہ ہو کر قبر سے باہر نکلا۔ یہ کرامت دیکھ کر عیسائیوں

کی ایک بڑی جماعت نے کلمہ توحید پڑھا اور دائرۂ اسلام میں شامل ہوئے۔

● مشہد شریف پہونچتے ہی آپ حضرت امام علی رضاؑ کے روضہ اقدس پر زیارت کے لئے گئے۔ نصف شب کو واقعہ میں دیکھا حضرت امامؑ اپنے مرقد مطہر سے برآمد ہوئے حضرت علی ہمدانی رحمۃ احتراماً ایستادہ ہوئے۔ امام عالی مقام نے خرقۂ مبارک اُتارا اور آپ کو عنایت کرتے فرمایا بیعت کر۔ آپ نے بیعت کی آپ نے ذکر کی تلقین فرمائی جب آپ بیدار ہوئے اہلِ مشہد نے جوق در جوق آکر آپ کے دستِ مبارک پہ بیعت کی۔

● آپ نے بدخشان میں چار چلے کاٹے۔ قبچاقی اور جبل القاف میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رح آپ کے ہمسفر تھے۔ اس سفر میں آپ حضرت شیخ اذکانی رح کی صحبت سے مشرف ہوئے۔

● ایک روایت ہے کہ سراندیپ میں آپ نے اورادِ فتحیہ تصنیف کی اِس میں وہ تمام اوراد جمع ہیں جو آپ نے چودہ سو اولیائے کرام سے دورانِ سفر سنے اور جو مناجات، حمد و ثناء، تہلیل و تسبیحات، صلوات و استغفار کا مرقع ہے۔ آپ اس کا عنوان رکھنے میں کوئی فیصلہ نہ کر پائے۔ ابھی دورانِ حج بیت اللہ کی نیت سے مسجدِ اقصیٰ کی زیارت کا بھی ارادہ باندھا فلسطین پہونچے۔ شب مسجدِ اقصیٰ میں گذاری۔ خواب میں جناب امام المرسلین رسول اکرمؐ کا دیدار نصیب ہوا آپ آگے بڑھے سلام عرض کی پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آستین مبارک سے رقعہ نکالکر عنایت فرمایا، کھولا تو لکھا تھا۔ "خذھا الفتحیۃ" یہی اوراد فتحیہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو حضرت شیخ نجم الدین الکبروی کا خواب میں شرفِ دیدار ہوا۔ آپ نے اورادِ فتحیہ پڑھنے کی عام اجازت دی۔ ایک بار آپ بادبانی کشتی میں سمندری سفر کر رہے تھے۔ جو فی الوقت کے جہازوں کی جگہ سمندروں میں رواں دواں ہوا کرتے تھے اچانک ملاح پریشان ہوا اور کہنے لگا ہم اس جگہ پہونچ گئے ہیں جہاں

"زاغ سرہ" کی کثرت ہے (ایسی مچھلی جس کا سر کوے کی مانند ہے) اور ان سے کشتی صحیح و سلامت بچ کر نکل نہیں سکتی۔ حضرت سید میر علی ہمدانی رح نے دعا فرمائی اور ملاح سے کہا خوف نہ کھا اللہ ہمارا نگہبان ہے۔ لیکن ملاح کی بے قراری نے مسافروں کو پریشان کیا۔ کشتی آگے بڑھتی گئی زاغ سرہ باہر نہیں نکلی حتیٰ کہ کشتی صحیح و سلامت منزل پر پہونچی۔

● ایک سفر میں قیام کے دوران مقامی لوگوں نے ایک مقفل حجرے کی جانب آپ کی توجہ مبذول کراتے کہا جو کوئی اس حجرے میں رات بسر کرتا ہے صبح اسکی لاش برآمد ہوتی ہے۔ آپ نے اصرار کیا حجرے کا دروازہ کھولا جائے۔ آپ حجرے میں داخل ہوئے، نصف شب کو حجرے کا دروازہ کھلا اور ایک حسین و جمیل خاتون اپنی کنیز کے ساتھ جو ہاتھ میں شمع لئے تھی اندر آئی اور حضرت شاہ ہمدان رح کے قریب تر ہوئی۔ آپ نے جونہی اس پر نگاہ کی وہ تحلیل ہوئی۔ صبح سویرے جب لوگوں نے آپ کو صحیح و سلامت پایا آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ اس نوعیت کا ایک اور واقعہ مسجد علاؤ الدین پورہ سرینگر کشمیر میں آپ سے ظاہر ہوا ہے جس کا تذکرہ آگے آئیگا۔

لہ قدیم زمانے میں انجن سے چلنے والے جہاز نہیں تھے لوگ بادبانی کشتیوں پر بحری سفر کرتے تھے بحیرۂ عرب کے بعض حصوں میں زاغ سرہ نام کی خونخوار مچھلیاں پائی جاتی تھیں، سمندر کے ان مخصوص مقامات سے ملاح کشتیاں بچا کر نکلنے کی حتی الامکان سعی کرتے تھے۔ لیکن بادبانی کشتی پر ملاح کا کنٹرول برائے نام ہی ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی کشتی زاغ سرہ کے سمندری حصے میں پھنس جاتی تھی تو دستور کے مطابق کشتی پر سوار مسافروں کے نام قرعہ ڈالا جاتا تھا، قرعہ اندازی میں جسکا نام نکل آتا تھا اسے جبراً سمندر میں زاغ سرہ کا لقمہ بننے کے لئے پھینک دیتے تھے بصورت دیگر کچھ دور چل کر اس قسم کی مچھلیاں اکٹھے ہو کر حملہ کر کے کشتی ڈبو لیتی تھیں ایک فرد کو سمندر میں پھینکنے سے زاغ سرہ اسے کھانے کے لیے آپس میں لڑتی تھیں جب تک کشتی ان کے حدود سے آگے نکل جاتی تھی۔ یہ حضرت امیر کبیرؒ کی روحانی قوت اور کرامات تھی کہ ملاح کے منع کرنے پر بھی اور مسافروں کے اصرار کے باوجود ایک بھی زاغ سرہ کشتی کے قریب نہیں پھٹکی جبکہ کشتی ان کے حدود سے تیر کر آگے نکل گئی۔

- ایک بار علماء کی مجلس میں آپ نے اقوال حق کے سو قول سنائے جن سے علماء میں بیشتر کو اپنے چہرے بے نقاب ہوتے دکھائی دیئے۔ ناراض ہو گئے اور آپ کو شربت میں زہر ملا کر پلایا گیا جب زہر نے کوئی اثر نہیں کیا تو شرمسار ہو کر معذرت خواہی کرنے لگے۔

- ایک حاکم نے آپ کو اپنے دربار میں بلایا۔ آپ کے انکار پر بربریت اور تشدد پر اتر آیا۔ غضب ناک حاکم نے تانبے کا گھوڑا بنوایا اسے آگ میں ڈالکر سرخ کیا گیا اور منادی کروائی اگر سید علی ہمدانیؒ دربار میں حاضر نہیں ہونگے اسی گھوڑے پر سوار کئے جائیں گے یہ منادی برابر چالیس روز تک ہوتی رہی لیکن آپ دربار میں نہیں گئے بالآخر حاکم تائب ہو کر خود ہی حاضر خدمت ہوا اور اپنی گستاخی پر نادم ہو کر معافی مانگی۔ یہ بھی روایت ہے جب تانبے کا گھوڑا آگ سے سرخ ہوا، حاکم نے آپ کو خوفزدہ کرنے کی غرض سے منادی کروائی۔ آپ دربار میں نہیں گئے البتہ خود ہی جاکر اس گھوڑے پر سوار ہوئے، گھوڑے پر سوار ہوتے ہی وہ خاک میں مبدل ہوا یہ دیکھکر حاکم خائف ہوا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نادانی پر افسوس کیا۔

- آپ کی چالیس غزلوں کا مجموعہ "چہل اسرار" کے شانِ نزول کا اسرار بیان کرتے حضرت ملا حیدر بدخشیؒ اپنی تصنیف "منتخب الجواہر" میں رقمطراز ہیں کہ ایک روز آپ کے چالیس مرید جن میں تیس اہل ثروت اور دس غربا میں تھے نے فرداً فرداً ایک دوسرے کو خبر کئے بنا آپ کو شام کے کھانے پر مدعو کیا۔ آپ عشاء کی نماز ادا کر کے سائیوں کے گھر پہونچے طعام تناول فرمایا اور ہر سائل کو بطور خیر و برکت ایک غزل لکھکر عنایت کی۔ ابھی عشاء کی نماز کا وقت ختم نہیں ہوا تھا کہ آپ اپنی نشیمن گاہ کو واپس لوٹے، صبح ہوئی مریدوں میں ہر ایک آپ کی تشریف آوری پر فخر و افتخار سے کہہ رہا تھا۔ کل شب مرشد کامل نے ان کے غریب خانہ کو زینت بخشی اور غزل لکھ کر سرفراز کیا۔ صوفیانہ اصطلاح اور تصوف کی زبان میں ان

کرامت کو طے مکاں کہتے ہیں جس میں صاحب کرامت بیک وقت کئی مقامات پر نظر آتا ہے۔

آپ کی ذاتِ گرامی سے ایسی کرامت کا ہویدا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں جبکہ طے مکاں کی منزل طے کرنے کا مظاہرہ آپ کے مریدوں سے بھی ہوا ہے آپ نے ہمدان اور ختلاں میں دو بڑے کتب خانے قائم کئے تھے جن کے مہتمم سید محمد کاظمؒ تھے اپنے سفر کشمیر کے دوران آپ نے ان کتب خانوں کی بیشتر کتابیں ساتھ لائی تھیں اور سید محمد کاظمؒ جو آپ کے ہمرکاب تھے کی تحویل میں تھیں۔ قصبہ پانپور کا واقعہ ہے آپ نے سید محمد کاظمؒ سے "فتوحات" نام کی کتاب طلب فرمائی جو سہواً بہ ختلاں کی لائبریری میں رہ گئی تھی آپ نے طے مکاں کرکے کتاب پیش کی۔

جناب میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ ۷۷۴ھ میں پہلی بار کشمیر رونق افروز ہوئے۔ بعض مورخین نے آپ کی پہلی تشریف آوری ۷۸۴ھ رقم کی ہے۔ اُس زمانے میں شاہ میر کشمیر کا حکمران تھا جبکہ حالات اور واقعات کے لحاظ سے بھی ۷۸۴ھ غلط ہے۔ رسالہ مستورات کے مطابق آپ نے ماتاہر سوفی کے مکان میں اقامت فرمائی۔ آپ نے کشمیر کے قدرتی نظاروں، آبشاروں، ترنم ریز ندی نالوں، چشموں، دریاؤں اور فلک بوس برف پوش کوہساروں، ہرے بھرے لہلہاتے سبزہ زاروں کو دیکھ کر اسے شمالی ایران سے مشابہت دیتے ایرانِ صغیر کہا جبکہ قدیم زمانے میں ایرانی کشمیر کو "بستی سرہ" (اونچی آبادی والی بستی) کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس زمانے میں کشمیر کا حکمران سلطان شہاب الدین[1] تھا۔ چونکہ وہ فیروز شاہ تغلق سے فیروزپور پنجاب میں نبرد آزما تھا۔

---

[1] سلطان شہاب الدین کے نکاح میں دو سگی بہنیں تھیں آپ نے اسے غیر اسلامی اور غیر شرعی فعل قرار دیا آپ کی ہدایت پر سلطان نے بڑی بہن کو طلاق دی۔

حضرت میر سید علی ہمدانی ؒ کی تشریف آوری پر نائب سلطنت ولیعہد قطب الدین ؒ[1] نے آپ کا والہانہ استقبال کیا۔ کچھ مدت یہاں قیام کے بعد آپ فیروز پور تشریف لے گئے جہاں آپ کی سعئ جمیلہ سے دونوں بادشاہوں کے مابین صلح ہوئی۔ سرہند (پنجاب) دونوں سلطنتوں کے درمیان سرحد ٹھہری۔ وہیں سے آپ نے ختلان مراجعت کی اس زمانے میں کشمیر کی خود مختار حکومت میں سارا صوبۂ سرحد (جو اب پاکستان کا حصہ ہے) اور مشترکہ پنجاب کے بیشتر علاقے شامل تھے۔ صلح و دوستی کے رشتہ کو پائیدار اور استوار رکھنے کی خاطر دستور کے مطابق فیروز شاہ تغلق کی تین صاحبزادیوں کا نکاح سلطان کے تین رشتہ داروں سے، جن میں سلطان کا بیٹا۔ ولیعہد قطب الدین اور میر سید حسین سمنانی ؒ[2] جنہوں نے شاہانِ کشمیر سے ماقبل رشتہ جوڑا تھا کے فرزند سید حسن بہادر جو سلطان شہاب الدین کی فوج کا سپہ سالار تھا سے ہوا۔

آپ بیس برس تک مسلسل سفر کرتے رہے اور ۷۵۳ھ بمطابق ۱۳۵۲ء میں ہمدان مراجعت ہوئے آپ اپنی ازدواجی زندگی کا تذکرہ کرتے فرماتے ہیں۔ میرے معلّم رہنما اور مرشد جناب شیخ محمود مزدقانی قدس سرہٗ عظیم متصوف تھے۔ میں نے بھی ان کی پیروی میں مجرد رہنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس علاقہ کے مکینوں نے مجھے ازدواجی بندھن میں باندھا۔ آپ کے اولاد میں ایک فرزند جناب سید محمد ہمدانی ؒ اور ایک دختر تھی جنکا عقد امیر آرام شاہ کے فرزند خواجہ اسحاق ختلانی ؒ سے ہوا۔

---

[1] قطب الدین اور ان کی والدہ آپ کے ارادت مندوں میں شامل تھے۔

[2] آپ نہ صرف پایہ کے بزرگ اور مشائخ تھے بلکہ امیر کبیرؒ کے مرید اور خلیفہ بھی تھے۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے آپ کو خرقہ نیابت اور جانشینی عطا فرمائی تھی۔ آپ کے والد امیر آرام شاہ رموز مملکت کے شناساؤں اور بڑے اثر و رسوخ کے مالک اور خواجہ علی شاہ کی اولاد میں تھے جنکے نام پر قریہ علی شاہ آباد ہے خواجہ اسحاق ختلانی ۸۲۶ھ میں شہید ہوئے۔

اس طرح حضرت امیر کبیرؒ نے ۷۵۳ھ سے ۷۵۶ھ تک ہمدان میں قیام فرمایا مریدوں کی تربیت اور سالکانِ حقیقی کی رہنمائی کرتے رہے اور رسالہ ذخیرۃ الملوک، رسالہ مشارب الذواق، حل الفصوص، رسالۂ تلقینیہ اور شرحِ اسمائے حسنیٰ تصنیف کی ساتھ ہی ختلان بھی جاتے رہے۔

۷۵۶ھ میں ابو مشرواں کی وفات کے بعد جب ایران میں انتشار، افراتفری، طوائف الملوکی نے سر اٹھایا اور خانہ جنگی شروع ہوئی تو یہ ماحول آپ کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا آپ نے ختلان میں مستقل بود وباش اختیار کی، تین ماہ بدخشاں میں بھی قیام کیا اور وہاں سے ختن تشریف لے گئے، جب قریہ علی شاہ واپس لوٹے حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے۔ واپسی پر قریہ علی شاہ میں مراجعت کی جہاں بدامنی اور عدم استحکام نے ڈیرہ ڈالا تھا اور امیر تیمور کے احتمالی حملہ کے تناظر میں قتل و غارت کی افواہوں کی گرم بازاری سے عوام الناس کے صبر و قرار میں خلل پڑ چکا تھا۔ اس بدامنی اور عدمِ تحفظ کے احساس سے آپ ختلان تشریف لے گئے اور نصف قریہ بارہ ہزار دینار میں خرید کر وقف فی سبیل اللہ کیا ایک مسجد تعمیر کروائی جو دینی درس گاہ بھی تھی اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی قائم کیا اور اپنی آخری آرام گاہ کے لئے یہی جگہ منتخب فرمائی۔ جسکی بنا پر آپ ختلان تاجکستان (جو اب کولاب کہلاتا ہے) میں آسودۂ خاک کئے گئے۔

آپ کی سوانح حیات کے مختلف مراحل کا سرسری مطالعہ کرنے سے یہ برہنہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ آپ کی زندگی مشکلات سے اٹی ہوئی ہے اور وعظ و تبلیغ کی مجلسوں میں تند و تیز فقرے سننے پڑے ہیں جسکی اہم وجہ یہ تھی کہ آپ حق گوئی بیباکی اور اعلائے کلمۂ حق میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے بقول علامہ اقبالؒ ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

رسالہ مکتوبات امیریہ میں آپ فرماتے ہیں۔ "یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی حق سخن کہے یا اظہار حق کے لئے کوشاں ہو تو لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔" آپ کے مخالفوں اور آلام و مصائب میں مبتلا کرنے والوں میں حاکم اور بناوٹی علماء دونوں شامل تھے۔ دور حکومت کے اساسوں کو آپ کی ذات گرامی سے یہ تکلیف تھی کہ ان کے حلوے مانڈے کی ٹھیکہ داری آپ کے وجود کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھی۔ بادشاہ و حاکم اپنی جاہ و حشمت میں اضافے کی خاطر آپ کو اپنے دربار میں بلانے کے خواہش مند تھے۔ جب آپ بلا ضرورت جانے سے انکار فرماتے تھے تو وہ اپنے غیض و غضب اور متلون مزاجی کو آنچ دیتے تھے۔

۷۵۲ھ ماوراءالنہر کا واقعہ ہے کہ آپ اپنی خانقاہ میں سالکوں، درویشوں اور صوفیوں کے حلقہ میں تشریف فرما تھے آپ نے فرمایا "بیس سال بعد اس سرزمین میں ایسا فتنہ و فساد برپا ہوگا کہ نہ بادشاہ رہیگا اور نہ عوام الناس کو امن و سکون میسر ہوگا۔ ہم جلاوطن ہونگے اور اپنی خانقاہ کو بھی دیکھ نہیں پائیں گے۔ مریدوں اور سامعین نے دریافت کیا یہ کب ہوگا۔ آپ نے فرمایا "میری زندگی کے آخری ایام میں۔" یہ آپ کی چشم بینا کا اعجاز تھا جو آپ وسط ایشیاء میں امیر تیمور کی جنگی سرگرمیوں اور قتل و غارت گری کے مناظر کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔

چنانچہ ۷۶۲ھ میں آپ نے اسی پس منظر میں حضرت سید حسین سمنانیؒ اور حضرت تاج الدین سمنانیؒ[1] کو کشمیر کے حالات دریافت کرنے یہاں بھیجا۔ تاریخ فرشتہ اور دیگر تذکروں میں مذکور ہے کہ آپ نے سلطان شہاب الدین کے نام مراسلہ بھی لکھا جس کا سلطان نے بڑے احترام اور تعظیم سے جواب دیا۔

---

[1] یہ دونوں اصحاب امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کے والد ماجد جناب سید شہاب الدین کے بھتیجے اور سید محمد کے بیٹے تھے۔

ابھی آپ امیر تیمور گورگانی کی سیاسی بوقلمونی، رنگا رنگی، قتل وغارت گری کے
نشیب و فراز، اونچ نیچ اور دست درازیوں کا چشم بینا سے مشاہدہ ہی فرما رہے
تھے کہ تیمور نے خراسان پر پہلا حملہ کیا۔ اس طرح امیر تیمور نے ایران اور خراسان پر ۱۳۷۱ء سے
۸۱ء کے دس برسوں کے مابین تین بار حملہ کیا اور جس بیدردی سے خونریزی کا مظاہرہ کرکے
ان ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجائی وہ تاریخ میں سفاکی کا عنوان بنا ہے۔ ہزاروں
لوگوں کو تہ تیغ کیا جن میں اولیاء اللہ کی ایک جماعت بھی شامل تھی۔ امیر تیمور نے شیراز
فتح کرکے مظفری خاندان کا صرف خاتمہ کیا بلکہ خوارزم کو اپنی سلطنت میں مدغم کرکے
ہندوستان[۱] کے پایہ تخت دہلی کو اپنے پاؤں تلے روندنے کا اظہار و عزم کیا۔

اسی درمیان میں درباری مفسدوں اور چاپلوسوں نے امیر تیمور کی توجہ حضرت
سید علی ہمدانیؒ کی روحانی وجاہت اور حضرت سید اسحاق ختلانیؒ کی جانب مبذول کرائی

۱؎ امیر تیمور گورگانی چغتائی نسل کا ایک تاتاری امیر تھا۔ پیدائش ۷۶۹ھ مطابق وہ
۱۳۷۰ء میں سمرقند کے تخت پر متمکن ہوا۔ خداداد قابلیت اور بہادری کی وجہ سے اس نے
ایک زبردست فوج تیار کی اور تقریباً تمام وسط ایشیاء پر قبضہ کیا۔ ہندوستان میں
طوائف الملوکی اور دولت کی ہوس نے اس ملک پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ پہلے
اپنے پوتے پیر محمد کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ پیر محمد نے ۱۳۹۷ء میں ملتان
کا محاصرہ کیا جو چھ ماہ تک جاری رہا۔ آخر کار محاصرین نے فاقہ کشی سے تنگ آکر اطاعت
قبول کی۔ مارچ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور گورگانی بذات خود اپنے دارالخلافہ سمرقند سے باسٹھ
سال کی عمر میں ۹۲۰۰۰ تجربہ کار سواروں کی زبردست فوج لیکر ہندوستان پر حملہ آور
ہوا۔ اٹک کے مقام پر دریائے سندھ عبور کیا اور مبارک خان حاکم پنجاب کو شکست دی۔
اس زمانے میں دہلی کی حکومت نہایت ابتر حالت میں تھی۔ پیر محمد کی فوج بھی دریائے
چناب عبور کرکے تیموری لشکر سے آملی۔ دسمبر ۱۳۹۸ء میں دہلی کے باہر (باقی اگلے صفحہ پر)

اور کہا سید علی ہمدانیؒ بادشاہت کا مدعی اور حصولِ اقتدار کے لئے کوشاں ہے چونکہ آرام شاہ
جنہیں تیموری قلمرو میں بڑا اثر و رسوخ اور عمل دخل تھا جیسا کہ آگے بیان کر چکا ہوں آپ حضرت

(گذشتہ سے پیوستہ) محمود تغلق اپنے سپہ سالار اقبال خان کے ساتھ مقابلہ پر دس ہزار سوار چالیس ہزار پیادہ اور ایک سو چھپن ہاتھی لیکر آیا۔ تیمور کے سپاہی ہاتھی دیکھ کر گھبرا گئے لیکن تیمور نے بڑی قابلیت اور تدبیر سے اپنی فوج کے گرد خندق کھدوائی۔ ایک خونریز جنگ کے بعد محمود تغلق فرار ہوکر پہاڑوں میں چھپ گیا۔ تیمور نہایت شان سے دہلی میں داخل ہوا اور لوٹ مار کر کے واپس چلا گیا۔ لیکن جانے سے قبل دہلی کے ملحق دوسری خود مختار حکومتوں کے بادشاہوں کو اطاعت اور خراج ادا کرنے کے لیے وفود بھیجے جن میں کشمیر شامل ہے جہاں اُن دنوں سلطان سکندر برسرِ اقتدار تھے۔ تیموری وفد میں امیرزادہ رسم، مولانا نور الدین اور سید محمد مدنیؒ شامل تھے۔ وفد سلطان سکندر سے ملاقی ہوا اور امیر تیمور کی جانب سے تقاضائے خراج کا پیغام دیا۔ جس میں تیس ہزار قبچاقی گھوڑے اور ایک لاکھ طلائی دینار فی دینار اڑھائی مثقال وزن کا ہو ادا کرنے کی فہمائش کی۔ سلطان نے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مہلت طلب کی وفد کے واپس جانے کے بعد سلطان نے خراج ادا کرنے سے اتفاق نہیں کیا۔ لیکن ولیعہد زین العابدین کو تیمور کے پاس اپنی معذوری کا اظہار کرنے بھیجا۔ تیمور نے ولیعہد کو یرغمال بنا کے سمرقند پہونچا اور زین العابدین تیمور کی وفات کے بعد سمرقند سے واپس لوٹا۔ ادھر امیر تیمور نے سلطان سکندر کے سامنے مبالغہ آمیز خراج کے اعداد و شمار پیش کرنے پر ارکان وفد سے اپنے ملال اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ سید محمد مدنیؒ جو طویل مدت تک مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے تھے کی بنا پر مدنی صاحبؒ کے اسم گرامی سے معروف ہیں وفد کے ساتھ واپس گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ اپنے اہل و عیال سمیت دوبارہ ماوراء النہر سے سرینگر مراجعت ہوئے اور رینا واری میں بود و باش اختیار کی۔ رینا واری اور نوشہرہ میں فارسی علم و ادب کے دو مکتب قائم کیے۔ سلطان سکندر نے آپ کے اخلاقِ حمیدہ کشف و کرامات اور علم و دانشمندی سے متاثر ہوکر انتہائی انکساری سے اپنے محل کے قریب آپ کی رہائش کا انتظام کیا اور آپ کیلئے خانقاہ تعمیر کروائی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہند میں مغلیہ سلطنت کا بانی محمد ظہیر الدین بابر کا باپ تیموری نسل اور ماں چنگیز خان کی نسل سے تھی [illegible]
[illegible] پیدا ہوا تھا

سید اسحاق ختلانی رح کے والد تھے اس مناسبت کی بناء پر کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی سید علی ہمدانی رح سے ارادت مندی تیموری سلطنت کی تباہی کا باعث بنے۔

امیر تیمور گورگانی نے حضرت سید اسحاق ختلانی رح کو دربار میں طلب کیا، آپ میر سید علی ہمدانی رح کا عطا کردہ سیاہ عمامہ سر پر باندھے دربار میں گئے۔ تیمور نے انہیں میر سید علی ہمدانی رح سے تعلقات منقطع کرنے کا حکم سناتے کہا یہ عمامہ سر سے اتار دو۔ آپ نے جواب دیتے کہا میں نہ تو تعلقات منقطع کر سکتا ہوں اور نہ عمامہ میرے جیتے جی سر سے اترے گا۔ امیر تیمور نے کہا اگر ایسا نہیں کرو گے تو دو ہزار قبچاقی گھوڑے جرمانے ادا کرنے ہونگے آپ نے جرمانہ دینا قبول کیا لیکن اس سے تیمور کی تشفی نہیں ہوئی۔ چند دن بعد امیر تیمور گورگانی نے اپنے ایک عزیز اور درباری امیر مرا علی جو امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رح کے عقیدت مندوں میں تھا، شاہ ہمدان کو انکی وساطت سے دربار میں ملاقات کے لئے بلایا۔

امیر تیمور کو معلوم ہوا تھا کہ آپ کبھی بھی پشت بہ کعبہ نہیں بیٹھتے ہیں۔ اس نے عمداً انہیں پشت بہ کعبہ بٹھایا اور پھر کہا میں نے سنا ہے کہ آپ کبھی بھی پشت بہ کعبہ نہیں بیٹھتے آج خلاف ایسا کیوں کیا۔ آپ نے فرمایا بیشک جو تمہاری طرف منہ کرے گا وہ قبلہ سے روگرداں ہی ہوگا۔ تیمور نے دوسرا سوال کیا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ سلطنت کے مدعی اور حصول اقتدار کے لئے کوشاں ہیں۔ آپ نے جواب دیتے فرمایا: میں ان دونوں باتوں سے بے نیاز ہوں۔ مجھ پر دنیا کا حال آشکار ہے۔ میرا حصول صرف اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔ ایک بار میں نے سلطنت کے بارے میں سوچا اور پھر خواب دیکھا۔ ایک لنگڑا کتا آیا اور لے گیا۔ ساتھ ہی آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کا یہ مقولہ دہرایا۔ "دنیا مردار ہے اس کا ... مانند ہے" (یہ بات ذہن نشین کرنے کے لائق ہے امیر تیمور بھی لنگڑا تھا اور جس بے دردی سے وہ مختلف ممالک پر حملہ آور ہوتا تھا اس مناسبت سے خلیفہ چہارم حضرت علی مرتضیٰ رض کا حوالہ برمحل تھا)۔ آپ نے مزید فرمایا ہماری طرف

نے شاہ ہمدانؒ کو بشارت فرمائی اور آپؒ کے لب نازنین پر لفظِ کشمیر آیا۔

غرض سن ۷۶۲ھ تا ۷۷۰ھ کے درمیانی وقفہ میں حضرت سید حسین سمنانیؒ نے کشمیر میں قیام فرماکر یہاں کے ملکی، انتظامی، ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی حالات کا بغور مطالعہ کیا اور حالات کا مکمل جائزہ لیکر ختلان واپس گئے اور جملہ حالات آپؒ کے گوش کئے۔ آپ نے انہیں دوبارہ کشمیر جانے کی اجازت دی۔ یہ کہنا بعید از معلومات نہ ہوگا کہ اسی درمیان میں سلطان شہاب الدین حضرت سید حسین سمنانیؒ کے مرید بنے۔

بہرکیف ۱۲ ربیع الاول ۷۸۱ھ کو حضرت امیرِ کبیر میر سید علی ہمدانیؒ سات سو سادات کے قافلہ کو لیکر پیر پنچال کی راہ سے کشمیر میں جلوہ فگن ہوئے جونہی آپ سرینگر کے قرب و جوار میں پہونچے سلطان قطب الدین استقبال کو آئے۔ آپ نے سرینگر میں محلہ علاؤالدین پورہ میں حضرت سید حسین سمنانیؒ کے ہاں قیام فرمایا۔ اُس زمانے میں کشمیر میں مسلمانوں کی قلیل آبادی تھی جنہیں راسخ الاعتقاد ہونے کے لئے تبلیغ تربیت کی ضرورت تھی جبکہ علاؤالدین پورہ میں دریائے جہلم کے کنارے اُن کی نماز و ریاضت کیلئے ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی جہاں مسلمان پنج گانہ نماز ادا کرتے تھے مگر نمازِ عشاء کے بعد مسجد کا دروازہ بند کرکے مقفل کیا جاتا تھا تاکہ کوئی ناواقف جنیات کی تکلیف کا شکار نہ ہو۔ جناب امیرؒ نے جب مسجد کے امام اور مؤذن سے یہ حال سنا تو رات اسی مسجد میں گزارنے کا ارادہ فرمایا۔ آدھی رات کو مسجد کا دروازہ ایک ڈراونی آواز کے ساتھ کھلا۔ ایک برقعہ پوش خاتون ہاتھ میں مشعل اٹھائے اندر آئی۔ آپ کے سامنے کھڑی ہوکر بے نقاب ہوئی۔ آپ کی عابدانہ نگاہیں جونہی اُس کی طرف اٹھیں وہ نابود ہوکر رہ گئی۔ اس طرح مسجد جنیات سے آزاد ہوئی۔ علی الصبح امام صاحب مؤذن اور دیگر اصحاب نے آپ کو دیکھا تو حیرت زدہ ہوکر کہنے لگے۔ یقیناً یہ کوئی باکمال صاحبِ دل ہیں۔ انہی میں کسی نے کالی شری مندر کے بڑے پوجاری شاہ پور کا تذکرہ کرتے کہا وہ بھی

کامل اور یوگ شاستر کا ماہر ہے اور عالمِ بالا کی سیر و سیاحت کا دعویٰ کرتا ہے۔ آپ اُسے دیکھنے گئے۔ شاہ پور نے آپ کو دیکھتے ہی کہا:

ہر نفس نزد حق مرا بار است

ہر دمم جذبِ حق مددگار است

یہ کہکر وہ اُڑنے لگا یہاں تک کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوا۔ دیکھنے والے متعجب ہوکر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جناب امیرؒ نے اپنے ایک خلیفہ سید کبیر بیہقی رہ کو اشارہ فرمایا انہوں نے اپنے روحانی کمالات سے نعلین کو حرکت دی اور شاہ پور شرمسار ہوکر زمین بوس ہوا۔ حضرت علی ثانیؒ کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ ان کا مقبرہ خواجہ بازار اور خانیار کے مابین زنگر شاپ میں چار دیواری سے باندھے قبرستان میں آج بھی موجود محفوظ ہے۔

آپ نے اپنی آمد کے فوراً بعد کشمیر میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا۔ وادی کے تمام علاقوں شوپیان، اسلام آباد، کوٹہار، کولگام، اوڑی، چرار شریف، پلوامہ، ترال، ڈوڈہ، سوپور، وچی، مٹن، پانپور، شانگس، بارہمولہ، پٹن، کنگن، گاندربل غرض ہر موضع اور قریہ میں باضابطہ تبلیغی مشن قائم کرکے جس کے نتیجے میں ڈھائی سال کی قلیل مدت میں سینتیس ہزار کشمیری حلقہ بگوش اسلام ہوئے اس طرح اذان کی دلکش آواز اور صدائے لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہؐ سے ساری بلدِ خن کشمیر گونج اٹھی۔ آپ کے تبلیغی مشن کی تفصیلات سے قطع نظر، ہوکر صرف "ریشی نامہ" کے ان شعروں پر اکتفا کرتا ہوں ؎

اندراں دم ز زمرہ کفار	شد ہدایت بسی و ہفت ہزار
ظلمت کفر شد بنور بدل	بسعادت سید سعید ازل
این سعادت زده اذان ستوریر	واسطہ درمیاں امیر کبیر رہ
یعنی آن بانئے مسلمانی	میر سید علی ہمدانی رہ

آپ نے جو تبلیغی خدمات کشمیر میں انجام دیں وہ روز محشر تک تاریخ کے صفحات پر آب زر سے ہمیشہ مرقوم کی جائیں گی۔ آپ کے ہمرکاب آنے والے سادات صوفیوں اور مریدوں نے اہلِ کشمیر کو علم و ہنر، نئی تہذیب، ادب و ثقافت سے روشناس کرنے کے علاوہ کشمیر کے گوشہ گوشہ میں اسلام کی نئی تعلیمات کی ضوفشانی سے امن و سکون، اتحاد و اخوت کے لافانی پرچم بلند کئے بقولِ علامہ اقبال ؒ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

عربی اور فارسی زبان و تعلیم کو رواج دیا، رہن سہن، پوشاک، خورد و نوش اور فنِ تعمیر میں انقلاب انگیز تبدیلیاں لائیں۔ ہر صبح راگ و رنگ کے بجائے حمد و ثنا، اللہ اکبر کے سرمدی نعرے سے گونجنے لگی اور ہر شب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کہتے کہتے گزرنے لگی۔ بے حیائی نے حیا کے دامن میں منہ چھپا لیا، بدکاری نے نیکوکاری میں پناہ میں تلاش کیں۔ آپ نے سلطان قطب شاہ سے ملہ کھاہ کا میدان خرید کر مسلمانوں کے قبرستان کے لئے وقف کیا۔

ایک بار نو مسلموں کی ایک جماعت نے آپ سے استدعا کی، ما قبل جب ہم پوجا پاٹ کرتے تھے تو ہماری عبادت میں راگ و رنگ اور موسیقی کی لے شامل ہوا کرتی تھی ہمیں ایسا کرنے کی اجازت دی جائے۔ آپ نے فرمایا اسلامی عبادات میں ان چیزوں کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ البتہ آپ لوگ اوراد فتحیہ جہراً اور خوش الحانی سے پڑھ کر خدائے جل شانہٗ کو یاد کیجیے۔ وہ قادر مطلق ہے اسی سے انشاء اللہ آپ کو تشفی ہو گی۔ آپ کے وصال کے کچھ عرصہ بعد حضرت سید احمد شاہ کرمانی ؒ نے جہراً اوراد خوانی کی مخالفت کی۔ اس کے چند روز بعد انہیں حضرت امیر کبیرؒ نے رویا میں آ کر جہراً اوراد فتحیہ پڑھنے کی مفید تحریک کی بے وقت مخالفت پر اپنی رنجیدگی کا اظہار

فرمایا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد حضرت سید احمد کرمانیؒ نے علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف
کرتے جبراً اورادِ خوانی کے سابق طریق پر کار بند رہنے کی تلقین فرمائی۔

جناب شاہ ہمدانؒ کے دور میں کشمیر عالموں، بھکشوؤں، راہبوں، سینیاسیوں وغیرہ سے
خالی نہیں تھا جو علم و حکمت کے زیور سے آراستہ تھے۔ چنانچہ آپ کی تشریف آوری سے
قبل سلطان قطب الدین نے خواب میں سورج کو مغرب سے طلوع ہوتے دیکھا۔ ایک
بدھ راہب نے اس کی تعبیر بتاتے بادشاہ سے کہا۔ کوئی بزرگ ماورالنہر سے آئیگا اور نئی
تعلیمات سے اس خطۂ ارض کو فیضیاب کریگا اور جب آپ تشریف فرما ہوئے تو اس
زمرہ خلائق کو کہیں بحث و تمحیص سے کہیں روحانی وجاہت سے اور کہیں کشف و کرامات
سے قائل اور لاجواب کرکے مشرف باسلام کیا۔ چنانچہ معروف کشمیری عارفہ، شاعرہ للہ دید
جنہیں ہندو مورخین للہ الیشوری لکھتے ہیں (پیدائش ۷۲۵ھ بمطابق ۱۳۳۵ء) ایک
مجذوبہ تھیں اور جو عریاں رہا کرتی تھیں، جب کبھی کوئی راہ گیر اُن کی عریانیت
پر متوجہ ہو کر دل میں خیال کرتا تھا تو آپ بڑی بے تکلفی سے کراہ کر کہتی تھیں۔ جب
مجھے کوئی مرد نظر آئیگا پردہ کرونگی۔ اسی اثنا میں ایک دن حضرت امیر کبیرؒ سے راہ
چلتے انکی آنکھیں چار ہوئیں۔ آپ کو دیکھتے ہی سرپٹ بھاگ کر ایک نان بائی کے
دہکتے تندور میں کود پڑیں۔ نانبائی نے گھبرا کے تندور پر ڈھکن رکھا۔ اُس کی بیوی
یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ ہوئی اور خاوند سے کہا کہ تندور سے ڈھکنا اٹھا کر اس کو باہر نکالو
یہ جل جائیگی۔ ڈھکن اٹھایا گیا، تندور ٹھنڈا ہو چکا تھا اور للہ عارفہ پوشاک زیب تن کئے
تندور سے باہر نکلیں، جناب امیر کبیرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئیں۔ مجذوبہ
نہیں رہیں۔ آپ کا عارفانہ کلام کشمیری کے علاوہ اردو، انگریزی اور کئی دیگر زبانوں میں
شایع ہو چکا ہے۔ فی الوقت بھی مقبول عام ہے۔

ان اڑھائی برسوں میں آپ نے خانقاہ معلی سرینگر کی بنیاد ڈالی جس کی تمام مستند

تاریخی کتابوں میں وجہ تسمیہ یوں رقم کی گئی ہے کہ جب امیر کبیر میر سید علی ہمدانی ؒ یہاں تشریف لے آئے اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و ترویج شروع کی ایک شب رویا میں حضرت امیرؒ جناب سید الانبیاء خاتم النبیین شفیع المذنبین خیر البشر رحمۃ اللعالمین صاحب قرآن حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار انور سے مشرف ہوئے۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے خانقاہ فیض پناہ کی تعمیر کے حدود کا تعین فرمایا اور بنیاد ڈالی۔ جب جناب میر سید علی ہمدانی ؒ عالم رویا سے بیدار ہوئے تو حضور پُر نور ساقی کوثر سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھینچے ہوئے نشانات کے مطابق لکیریں لگی ہوئی پائیں۔ اس طرح ارشاد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بنیاد کی تعمیر شروع کروائی۔ اسی بنیاد پر ایک حجرہ بنوایا آپ کی وفات کے بعد جب سلطان سکندر کے دور حکومت میں آپ کے فرزند ارجمند جناب میر سید محمد ہمدانی ؒ چھ سو اصحاب کے ساتھ وارد کشمیر ہوئے تو بادشاہ کے وزیر ملک سہہ بٹ نے معہ اہل وعیال آپ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور ملک سیف الدین بٹ کہلانے لگا اور اپنی بیٹی بارعہ کا نکاح میر سید محمد ہمدانی ؒ سے کیا۔ سلطان سکندر نے سید موصوف کے ہاتھ پر بیعت کی اور اُن کی فرمائش پر خانقاہ فیض پناہ اور جامع مسجد کی تعمیر کا اہتمام ۷۹۹ ہجری بمطابق ۱۳۹۵ء میں جناب میر سید علی ہمدانی رح کے ہمرکاب آئے دو خلیفوں جناب سید محمد لورستانی اور خواجہ صدرالدین خراسانی کی زیر نگرانی کیا۔ اس طرح خانقاہ معلیٰ کی ایک منزلہ عمارت کھڑی ہوئی۔ ۱۷ ربیع الاول ۸۰۰ھ کو اس سے ملحق املاک و جائیداد کو وقف کیا۔ سلطان سکندر نے وقف نامہ کی تصدیق کی۔

۸۸۵ھ میں سلطان حسن شاہ ابن حیدر شاہ کے دور حکومت میں سرینگر شہر کے وسط میں کھیادہ بازار (جو کاروباری اداروں اور بین الاقوامی لین دین کے لئے چار دانگ عالم میں معروف تھا) میں آگ لگی جس سے سینکڑوں مکانات جلکر خاکستر ہوگئے۔ اس ہولناک

آگ کی زد میں خانقاہ فیض پناہ اور جامع مسجد دونوں آئے لیکن ہر دو مقدس مقامات کو سلطان حسن شاہ نے بڑی عجلت سے دوبارہ تعمیر کرایا۔ اس تجدید تعمیر کی تاریخ مندرجہ شعر میں بیان کی گئی ہے جو خانقاہ معلی کے اندرونی دیوار پر کندہ ہے

مسجد استسی علی التقوی خانقاہ امیر ہمدان است

۸۸۵ھ

۹۹۷ھ میں سلطان محمد شاہ کے دور حکومت میں تمام شہر سرینگر ایک بار پھر آتشزدگی کے حادثہ میں تباہ ہوا جس سے خانقاہ فیض پناہ کو بھی زیاں پہونچا۔ اب کے سلطان محمد شاہ کی ملکہ صالح بی بی جو "صالح موج" کے پروقار اسم گرامی سے یاد کی جاتی ہیں (غازی خان چک جو شیعہ مسلک سے وابستہ تھا کی ہمشیرہ تھیں لیکن انہیں شیعہ عقیدے سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا بلکہ بابا اسمٰعیل کبروی کی ارادت مند تھیں) نے اپنے تمام زیورات فروخت کر کے تین ہزار روپے نقد اور ساٹھ ہزار تنگہ کے مصروفہ سے خانقاہ فیض پناہ کو دوبارہ دو منزلہ تعمیر کرا کے وقف نامہ تحریر کرایا جس پر سلطان محمد شاہ کے دستخط اور مہر ثبت ہے۔ تعمیر تجدید کا مصرعہ تاریخ یہ ہے۔ "ومن دخلہ کان آمنا" یعنی یہ جگہ امن و امان کی پناہ گاہ ہے۔ یہ مصرعہ خانقاہ معلی کی ڈیوڑھی پر اب بھی کندہ ہے۔

۱۱۴۶ھ میں کشمیر مغل حکمرانوں کے زیر بار تھا اور ابوالبرکات خان جو چوتھی بار ۱۱۴۴ھ میں گورنر کشمیر کے عہدے پر براجمان تھا۔ خانقاہ فیض پناہ میں خود بخود آگ لگی۔ ابوالبرکات خان نے اسکی نئے سرے سے تعمیر کیلئے کمر باندھی جب تعمیر مکمل ہوئی "کعبۃ البرکات" اسکی تاریخ لکھی گئی۔ اس طرح خانقاہ فیض پناہ کی تعمیر نو ہوئی۔ خانقاہ معلی کی اندرونی چار دیواری پر کمخواب، اطلس، مخمل اور ریشمی غلافیں (جو کشمیری اصطلاح میں "دردہ" کہلاتی ہیں) قرآنی آیات زرینہ کشیدہ کاری میں تحریر کی ہوئی آویزاں ہیں، جو وقتاً فوقتاً بدلی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دیواروں پر نقش و نگار اور سنہرے حروف میں آیات، بینات، اوراد فتحیہ جو تفنن صالح نامی ناظم نے کندہ کرائے تھے اور جنہیں خانقاہ فیض پناہ

کے موزوں حضرت ملا معین ہمدانی نے خطاطی کے زیور سے آراستہ کیا تھا ہو بہو منقش ہیں جبکی بناء پر حجرہ خاص کے پاس کھڑکی کے دائیں جانب اللہ کا اسم گرامی مرقوم ہے جو زائرین کو اُن کی یاد تازہ کراتا ہے۔ دیواروں پر مزید حضرت محبوب سبحانی شیخ الشیخ جناب شیخ سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف کبریت احمر اور جناب میر سید علی ہمدانی رح کے وحدانیت سے لبریز اشعار بھی کندہ ہیں۔ محراب پر امیر کبیر رح کی یہ رباعی تحریر ہے ہے

حضرت شاہ ہمدان کریم | آیۂ رحمت ز کلام قدیم
گفت دم آخر تاریخ شدہ | "بسم اللہ الرحمان الرحیم"۔

یہاں یہ بتانا بعید از معلومات نہیں ہوگا کہ ۱۲۵۴ھ سکھوں نے تسخیر کشمیر کے بعد مسلمانوں کی تقریباً تمام عبادت گاہوں پر قبضہ کیا اور ان میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا جن میں خانقاہ فیض پناہ بھی شامل تھی۔ چنانچہ برطانوی خفیہ سراغرساں ایجنسی کا ایک سرکردہ ملازم ولیم مورکرافٹ جو بظاہر لداخ کے سرحدی علاقوں کے سروے پر مامور تھا، نے اپنے سفرنامہ میں جو ۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۵ء کے مابین قلمبند کیا گیا ہے خانقاہ فیض پناہ کا تذکرہ کرتے رقمطراز ہے۔ "میں نے اس مسجد کو مقفل پایا۔"

غرض ان توبہ شکن حادثات، حالات و واقعات کے باوجود خانقاہ معلیٰ کی چوبی عمارت بناوٹ، فن کاریگری کے لحاظ سے یکتائے زمانہ ہے۔ ہر بار اپنے پرانے نقشہ کے مطابق اسی جگہ اور پتھروں کی اُسی بنیاد پر دیودار کی شہتیروں سے شہر سرینگر کے وسط میں زینہ کدل اور فتح کدل کے مابین دریائے جہلم کے کنارے اپنی عظمت کی منادی دینے کے دوش بدوش پچھلی سات صدیوں سے یہاں آنے والے عابدوں، زائروں اور حاجت مندوں کی مشکلات رفع کرکے ان کی جھولیاں مرادوں سے بھرتا ہے۔ آگ کی ان وارداتوں میں خانقاہ فیض پناہ میں اُن وقف تبرکات کو جنکا

آگے ذکر آئیگا کوئی نقصان نہیں پہونچا، کیونکہ ہر بار بنیورہ اور دیندار کشمیریوں نے اپنی جان ہتیلی پر رکھ کر اُن کی تقدیس کو محفوظ رکھا۔

خانقاہِ فیض پناہ کی یہ شاندار عمارت برآمدوں اور اس سے ملحق دیگر حصّوں کو چھوڑ کر ۷۰×۵۰ فٹ پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ موجودہ عمارت دُو منزلہ ہے جس میں خواتین کے لیے مخصوص نشست گاہ ہے زمین سے اولتی (چھپّر کا وہ حصہ جہاں سے بارش کا پانی نیچے گرتا ہے) پچاس فٹ بلند ہے۔ شہ نشین، جس میں گھڑیال ہے جو غیر معمولی حالات میں بجایا جاتا ہے اور جس کی صدا پر اسلامیانِ شہر جوق در جوق خانقاہ کے احاطہ میں جمع ہوتے ہیں۔ گھڑیال افطار اور سحری کے اختتام کی منادی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ شہ نشین کے اوپر گنبد شہ ہے جسکی اونچائی زمین سے قبّہ تک ۱۲۵ فٹ ہے۔

خانقاہِ فیض پناہ کے قبلہ کی جانب دریائے جہلم بہتا ہے دریا اور خانقاہ کے مابین پتھروں کی اونچی دیوار ہے دیوار اور خانقاہ معلیٰ کے درمیاں کشادہ پگڈنڈی آمدورفت کےلیے ہے۔ زائرین کی سہولیت کے لیئے دریائے جہلم کے کنارے عین خانقاہ معلیٰ کے سامنے غسل خانہ اور ہاتھ منہ دھونے وضو کرنے کی جگہ مخصوص ہے۔ خانقاہِ معلیٰ کا صحن تین حصوں میں منقسم ہے۔ بائیں جانب جنگلہ بند قبرستان ہے جس میں خدا جانے کتنے بزرگ آسودہ ہیں۔ میرے دیکھتے ریاستی وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد اور معروف عالمِ دین مولانا سیّد مبارک شاہ گیلانی فطرت اور اُن کی بیگم صاحبہ اور

شہ ۱۹۲۷ء میں جب وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ کا مہاراجہ ہری سنگھ نے دریائی جلوس نکلوا کر استقبال کیا، مجاورینِ خانقاہ نے اسی گنبد کی بالادری پر سیاہ جھنڈ عامہ باندھ کر حکومت کے ظلم وستم کے خلاف مظاہرہ کیا اور نعرے لگائے۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ خانقاہ فیض پناہ کے مجاور تحریکِ آزادیِ کشمیر کے اولین نقیبوں میں ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

معلی جلال الدین یہاں آسودہ خاک ہوئے۔ فی زمانہ قبرستان کا ایک حصہ شہدا کیلئے مخصوص کیا گیا ہے۔ بیچ کے حصہ میں جو خانقاہ معلی اور بیرونی ڈیوڑھی کے مابین ہے۔ سنگِ سیاہ کے فرش سے آراستہ ہے اس پر سنگ سیاہ کے دو چبوترے ۲۰x۲۰ فٹ کے بنے ہیں جو عام حالت میں خواتین کی نشست و برخاست کے لئے مخصوص ہیں۔ بائیں جانب کے چبوترے پر روزانہ نماز فجر سے لیکر دن بھر زائرین اپنے ساتھ چاول اور مکئی کے دانے کبوتروں کو کھلانے کے لیے ڈالتے ہیں۔ صحن کے دائیں جانب کا حصہ آج سے چند سال قبل تک کھلا گراؤنڈ تھا جس میں ملحقہ علاقہ کے بچے کھیلا کرتے تھے۔ یہی وہ حصہ ہے جہاں ۱۹۳۱ء میں اسلامیانِ ریاست مہاراجہ ہری سنگھ سے اپنی شکایات سنانے کے لیے نمائندے چنے تھے اور مولانا عبدالقدیر نے تقریر کی تھی۔ کوئٹ کشمیر تحریک کے دوران اور ۹ راگست ۱۹۵۳ء کو لوگوں کے اجتماعات پر اسی صحن میں حکومت کی جانب سے عوام پر پہلی گولی داغی گئی اور موئے مقدس تحریک نے اسی صحن میں جنم لیا۔ منتظمین نے اب اس حصہ کی جنگلہ بندی کر کے اسے پارک میں تبدیل کیا ہے۔ ماضی میں خانقاہ معلی کے منتظمین نے علم کی روشنی عام کرنے کے لیے یہاں ہمدانیہ ہائی سکول کے نام سے مدرسہ قائم کیا تھا جسکو ۱۹۵۱ء میں شیخ محمد عبداللہ کی تعلیمی ری آرگنائزیشن پالیسی کے تحت یہ کہکر بند کیا گیا کہ حکومت مذہبی ناموں پر ادارے قائم کرنے کی روادار نہیں ہے اس بہانے ہمدانیہ ہائی سکول کی گرانٹ بند کی گئی اس زد میں بدقسمتی جس میں واقعہ اسلامیہ ہائی سکول بھی آیا۔ ہر سال ۶ رماہ ذی الحجہ کو عرس شاہ ہمدانؒ منایا جاتا ہے جس میں شرکت کے لیے وادی کشمیر کے اطراف و اکناف سے لوگ آتے ہیں۔ دوکانیں لگتی ہیں خوب خرید و فروخت ہوتی ہے۔ خانقاہ منعم پناہ میں روزانہ نماز پنجگانہ، نماز جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔

بات دراصل خانقاہ معلی میں وقف املاک کی ہے جنہیں جناب

میر سید علی ہمدانی رح اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ تبرکات آپ کو اپنے مرشد شیخ محمود اذکانی رح نے بیعت کے موقعہ پر خرقہ خلافت عطا کرتے تفویض کئے تھے جن میں :

(۱) علمِ مبارک جو جناب سید المرسلین محمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزواتِ عالیات میں اپنے ہمراہ رکھتے تھے۔

(۲) جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمۂ مبارک کا ستون۔

شامل ہے یہ دونوں تبرکات حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کربلائے معلیٰ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ علم مبارک کے بارے میں روایت ہے کہ سات مرتبہ حرمین شریف پہونچا۔ دو بار حضرت شیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی قدس سرہ لے گئے۔ انہوں نے حضرت شیخ محمود اذکانی رح کو تفویض کئے۔ آپ نے تین مرتبہ حرمین شریف کی زیارت کی اور علم شریف ہر بار آپ کے دستِ مبارک میں تھا۔ آپ نے یہ تبرک مبارک حضرت میر سید علی ہمدانی رح کو تفویض کیا۔ آپ نے زیارتِ حرمین شریف میں دو مرتبہ اپنے ساتھ لیا۔ کشمیر سے مراجعت ہوتے آپ سے ملک لدی ماگرے نے استدعا کی تبرکات مبارک اہل کشمیر کو عنایت کیجئے۔ آپ نے اُن کی گذارش پر ملک لدی ماگرے کشمیری کی حفاظت و نگہداری میں تبرکات سپرد کئے۔

آپ ۷۸۳ھ بمطابق ۱۳۸۱ء میں لداخ ہوتے ہوئے ترکستان تشریف لے گئے اور پھر تیسری بار ۷۸۵ھ بمطابق ۱۳۸۳ء میں کشمیر میں رونق افروز ہوئے۔ لگ بھگ ایک سال قیام فرمانے کے بعد زیارت حرمین شریف کی نیت سے رخت سفر باندھا۔ ماہ ذی القعدہ ۷۸۶ھ بمطابق ۱۳۸۴ء کشمیر سے پکھلی کی جانب روانہ ہونے سے قبل سلطان قطب الدین شاہ کو جو آپ کو الوداع کہنے کے لئے آئے تھے اپنی کلاہِ مبارک بطور تبرک عطا فرمائی۔ بقول حضرت امیر کبیر رح "فقر کی کلاہ تاج کرامت ہے" اور یہ تاج کرامت شہمیر خاندان کے بادشاہوں کے تاج، عظمت سلاطین

کی تقریباً دو سو سال تک زینت بنی رہی۔ ۹۴۲ھ میں شہمیری بادشاہ سلطان فتح شاہ نے مرتے وقت وصیت کی کہ امیر کبیرؒ کی کلاہِ مبارک کو اُس کی میت کے ساتھ قبر میں دفنایا جائے۔ اُس زمانے کے سررشتہ مشائخ جناب حاجی محمد صاحبؒ نے اِس وصیت پر عملدرآمد ہوتے دیکھ کر فرمایا ؎

تاج شاہی از سر شاہان کشمیر بر فتاد
و سرداری آنہار و بہ نگونساری نہاد

یہ پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی اس واقعہ کے تقریباً چار دہائی بعد شہمیری سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

آپ کے ذکرِ وصال سے قبل لازم ہے آپ کے مذہبی عقیدے پر ایک نگاہ ڈالی جائے۔ اہلِ تشیع سے بعض علماء آپ کو شیعہ تصور کرتے ہیں، اس عندیہ کو تقویت پہنچانے اور دلیل کو پختہ ثابت کرنے کے ثبوت میں آپ کے کئی نثری مجموعات جیسے مودۃ القربیٰ، روضۃ الفردوس اور ادعیۃ امیریہ قابلِ ذکر ہیں، پیش کرتے ہیں۔ ان رسائل میں بیشتر احادیث حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہ اور اہل بیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جمع کی گئی ہیں۔ مزید مکتوبات امیریہ میں آپ کا یہ فقرہ اُن کی دلیل کا سرچشمہ ہے: "میں خاندانِ رسالت کے ساتھ گہری عقیدت اور اُن کے مخالفین سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں"۔ جبکہ یہ دلیل اہل سنت والجماعت کے عقیدے سے نہ صرف مطابقت رکھتی ہے بلکہ اہل بیت رسالت مآب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں توقیر، تعظیم و تکریم کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت امیر کبیرؒ شیعہ تھے۔ شیعہ کا لغوی معنی ہے۔ شیدائی، جاں نثار، مسلمانوں کا وہ فرقہ جو حضرت علیؓ کو پیغمبرِ اسلام کے بعد خلافت کا حقدار مانتا ہے، امامیہ مسلک کا پیرو رہا ہے۔ اس بنیادی نقطے پر جب توجہ دی جاتی ہے، تو حضرت امیر کبیرؒ نے اِسکی حمایت میں بھی کوئی

اشارہ تک نہیں فرمایا ہے کہ آپ مذہب خلافت کے مسئلہ پر حضرت علی مرتضیٰ رضی کے طرفدار ہیں۔ ہاں اگر شیعہ کے لغوی معنی کو شیدائی اہل بیت تک محدود کیا جائے تو جملہ فرزندانِ توحید شیعہ ہیں کیونکہ حُب اہل بیت کی تعظیم و احترام میں کوئی کسی سے کم تر نہیں ہے اور کوئی کسی ایک پر فوقیت حاصل کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔
اس سلسلے میں حضرت امام شافعی کا یہ شعر کس قدر جامع اور مفصل ہے

لو کان رفضاً حُبّ آلِ محمدؐ

فلیشہد الثقلان انی رافضی

(اگر حُب آل محمدؐ ہی رفض ہے تو دونوں جہاں گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں)۔ پس ثابت ہوا حُب آل محمدؐ رفض نہیں سعادت مندی اور اُن کے تئیں توقیر و احترام ہے اور اگر حُب آل محمدؐ کی بنا پر حضرت امام شافعیؒ رافضی نہیں کہلائے جا سکتے تو حضرت سید علی ہمدانیؒ احادیث اہلِ بیت یکجا کرنے پر سلسلۂ شیعہ ہو سکتے ہیں؟ آپ کا یہ کارنامہ حب اہل بیت کی دلیل ہے۔
اسی طرح تصوف کا لغوی معنی علم معرفت، صوفیوں کا عقیدہ، پاکیزگی دل سے خواہشات کو دور کر کے اُسے خدا کی جانب مائل کرنا اور تزکیہ نفس کا طریقہ ہے۔

صوفیوں اور خدا شناسوں نے تصوف کی اپنے اپنے من پسند طریقوں سے تشریح کی ہے جبکہ وادیِ کشمیر میں اہل سنت والجماعت میں تصوف کی رو سے چھ مسلمہ سلسلے رائج ہیں ـــــ سلسلہ قادریہ۔ سلسلہ سہروردیہ۔ سلسلہ کبروی۔ سلسلہ نقشبندیہ۔ سلسلہ ریشیاں اور سلسلہ چشتیہ ـــــ۔ یہ تمام سلسلے ماسوائے نقشبندیہ کے معرفت الٰہی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تقلید کرتے ہیں۔ سلسلہ نقشبندیہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے عبارت ہے جو کہ خلفائے راشدینؓ جملہ فرزندانِ توحید اور ان تمام سلسلوں کی انتہا اور منتہیٰ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس ہے۔

حضرت امیر کبیرؒ تصوف کی روشن فتوت پر گامزن تھے جس کا منتہیٰ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

مگر اس لحاظ سے بھی آپ کی خلیفہ چہارم جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے نسبت کامل
عیاں ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ فتوت اہل تشیع سے مخصوص ہے بلکہ اہل سنت والجماعت
کے جملہ بزرگ مشائخ صوفیا اور سالک فتوت کو اپناتے ہیں ان کا اور جناب میر سید علی ہمدانیؒ
کی روش کیا اس سے اللہ ان کے دلوں میں بھی احترام اہل بیت اسی طرح موجزن ہے جس
طرح کسی دیگر مسلمان کے دل میں ہے جو صوفیانہ سلسلوں اور دائروں سے منسلک ہیں۔ کہنے
کا مطلب ہے کہ اہل سنت والجماعت کے ہاں بھی ہے اور اسی روش میں رہ کے ذہنی طور پر
تک مشائخ اذکار و خالق سے تسبیح و استغفار میں محو و مشغول ہیں کیونکہ تصوف علم باطنی کا
زینہ ہے اس لئے دلائل اور جوابی دلائل سے انحراف کرتے صرف حضرت امیر کبیرؒ کی تخلیق
اوراد فتحیہ جو وظائف تسبیح و استغفار کا بیش بہا مرقع ہے کے حوالے سے یہ بیان کرنا چاہتا
ہوں کہ اس میں جس احترام و تعظیم سے چاریارِ باصفات کا ذکرِ جمیل فرمایا ہے وہ آپکے مسلک
شیعہ ہونے کی دلیل کی قطعاً نفی کرتا ہے۔

بہر حال ہم کشمیر میں آپ کی تبلیغی کاوشوں، مہمات اور سرفرازیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو
آپ ممتاز دانشور، اعلیٰ ادیب، خطیب، ولی اللہ، مبلغ دین، تارک الدنیا، بزرگ
کشف و کرامات سے لیس مشائخ، مفکر اعظم، دیندار، سلطان تصوف، علم باطنی کے
شہسوار نظر آنے کے علاوہ بحوالہ ریشی نامہ سے

یعنی آں بانیٔ مسلمانی
میر سید علی ہمدانیؒ

جی ہاں آپ اپنے رہن سہن، طرز زندگی، ریاضات و عبادات، نقل و حمل، گفت و شنید،
طور طریق، شادی بیاہ کی رسوم، آلام و مشکلات، خیر و برکت، حیات و ممات، کشف و
کرامات، الفاظ سخن، روزمرہ کی بول چال اور علم دین کی ترویج و اشاعت میں قطعی اور مطلق
سنی ہیں۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل ملک کشمیر میں جو تھوڑے بہت

مسلمان تھے وہ اہل سنت والجماعت مذہب حنفی کے پیرو تھے۔ حتیٰ کہ خود شافعی ہونے کے باوجود آپ نے حنفی قوانین میں ردوبدل کرنے یا کسی حنفی کو شافعی مسلک اختیار کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ اپنے قیام کے دوران حنفی مسلک کی آبیاری کی جبکہ یہاں کا ماحول اور حالات اس قدر موزوں و موافق تھے کہ بادشاہِ وقت سلطان قطب الدین آپ کے حجرہ کی دربانی میں نہ صرف فخر محسوس کرتا تھا بلکہ آپ کی مراجعت کے وقت استدعا کی، "حضرت سید احمد کرمانیؒ (جو صاحب کشف و کرامات، مشائخ و بزرگ تھے) کو یہاں رہنے کی اجازت بخشیں تاکہ وہ مجھے احکام شریعت سکھائے"۔ اندازہ لگائیے جہاں بادشاہ بھی انتظامی اور سیاسی معاملات میں آپ کی رہنمائی اور تربیت کا محتاج ہو وہاں بحیثیت شیعہ ہونے کے آپ کو فرقہ اثنا عشریہ کی تبلیغ و ترویج سے کون روک سکتا تھا۔ اس سے یہ دلیل پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے کہ آپ اہلِ سنت والجماعت کے پیرو، مبلغ اور برگزیدہ بزرگ ہیں۔

اس تعلق سے فرقہ اثنا عشریہ اور اہل سنت والجماعت کے مابین دینی فرائض کی ادائیگی میں طرائق کی وضاحت سے بھی حضرت امیر کبیرؒ کے سنی ہونے کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ اہل تشیعہ مشرک کے جسم کو نجس سے عبارت کرتے ہیں اور اسے اپنی رہائش گاہ میں جوتے سمیت بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ جبکہ حضرت امیر کبیرؒ کے دست مبارک پر سینتیس ہزار مشرکین دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ نے کبھی بھی کسی مشرک کو جوتے سمیت اپنی نشیمن گاہ میں آنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ حق تو یہ ہے کوئی ایسی حماقت کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت امیر کبیرؒ کے اسفار کے تذکروں [illegible] آپ کے زیارتِ کربلا معلی کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا یہ سند نہیں ٹھہرائی جا سکتی البتہ اہتمام حجت کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے جبکہ زیارت کربلا معلی اہل تشیع سے مخصوص نہیں ہے۔ کروڑوں سنی مسلمانوں نے امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے روضہ مبارک کی زیارت کر کے فیض و

برکت حاصل کی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

جناب سید میر محمد ہمدانی ؒ جنہوں نے اپنے والد ماجد کے مانند خاور سے باختر تک دشت و جبل، صحرا، وادیوں، ملکوں، شہروں، دیہاتوں کی سیر و سیاحت نہیں کی آپ حضرت امیر کبیر ؒ کے وصال کے وقت بارہ برس کے تھے۔ چھبیس ۲۶ برس کی عمر میں کشمیر تشریف لے آئے۔ ان کے بارے میں فرقہ اثنا عشریہ کے علماء خاموش ہیں۔ اگر سادات ہمدانیہ واقعی شیعہ ہوتے تو آپ کی تعلیم و تربیت امامیہ طریقے اور فقہ کے مطابق ہونی لازمی تھی۔ جسکو اپنی کم عمری کے باعث لاکھ چھپانے پر بھی آپ چھپا نہیں سکتے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ آپ عالم اسلامی کے ان سرکردہ ممتاز بزرگوں میں ہیں جنہوں نے دین حق اور توحید الہٰی کا پیغام ہر ملک، شہر، قصبہ، گاؤں، مکان اور فرد تک پہونچانا اپنے ذمہ لیا تھا اور آپ فرقوں اور جماعتوں سے بے نیاز ہو کر اس فرض کو انجام دینے میں کامیاب و کامران ہوئے ہیں۔

تاریخی تذکروں سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ امامیہ مسلک کے حامی بڑی دیر بعد کشمیر آئے۔ ان میں پہلے قد آور شیعہ عالم دین میر سید حسین قمی ہیں۔ آپ ایران کے شہر قم سے سلطان زین العابدین کے عہد حکومت ۸۲۷ھ تا ۸۷۹ھ کے مابین یہاں تشریف لائے۔ آپ کے علم و کمال کشف و کرامات سے متاثر ہو کر سلطان بڈشاہ نے تحصیل سوپور کے علاقہ زینہ گیر کا ایک گاؤں سیدہ پورہ بطور جاگیر عطا کیا۔ آپ اعتدال پسند اور جید عالم دین گزرے ہیں۔ وادی میں اہل تشیعہ کی دو بڑی جماعتوں میں آپ سے عقیدت رکھنے والے قدیمی اور آغا صاحب بڈگامی الصفوی الموسوی کے خاندان سے عقیدت رکھنے والے جدیدی کہلاتے ہیں۔ دراصل کشمیر میں شیعیت کا عروج دسویں صدی ہجری میں ہوا جب میر شمس الدین اراکی دوسری بار بڑی جمعیت کے ساتھ یہاں وارد ہوئے۔ یہ زمانہ کشمیر میں بڑی افراتفری انتشار اور طوائف الملوکی کا تھا

مرزا حیدر گورگانی کے دوسرے حملے نے ان کی رہی سہی ساکھ ختم کی۔ مرزا حیدر کے انتقال کے بعد چکوں نے اقتدار پر قبضہ کیا۔ انہوں نے امامیہ مسلک کی ترویج و اشاعت سیاسی حربے کے طور پر شروع کی جس کی بنا پر اُن کی مخالفت بڑھتی گئی اور وہ زیادہ دیر تک اقتدار پر قابض نہ رہ سکے۔ ان حالات میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کو شیعہ تصور کرنا واقعاتی اور تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہے۔

بہر کیف قطع نظر اس بحث سے حضرت امیر کبیرؒ کے ذکر وصال کی جانب توجہ مبذول کریں۔ جیسا کہ آگے آپ پڑھ چکے ہیں۔ ماہ ذی القعدہ ۷۸۶ھ بمطابق ۱۳۸۴ء میں آپ نے زیارتِ حرمین شریف کے لیے رختِ سفر باندھا اور پکھلی ہوتے ہوئے کافرستان (جواب نورستان کہلاتا ہے) پہنچے۔ والئے کنار سلطان محمد خضر شاہ کی استدعا پر کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا۔ یکم ذی الحجہ ۷۸۶ھ بمطابق ۱۴ جنوری ۱۳۸۵ء کو آپ کنار ہی میں علیل ہوئے اور پانچ روز کی مدت علالت بغیر کچھ کھائے پیئے گزارے۔ چھٹے روز آپ نے پانی کے چند گھونٹ پیئے اور غیب سے آپ پر منکشف ہوا کہ عارضہ پیغام اجل ہے بروز ۶ ماہ ذی الحجہ ۷۸۶ھ بمطابق ۱۹ جنوری ۱۳۸۵ء کی رات کو بعد نماز عشاء آپ نے سادات اور صوفیوں کو اپنے پاس بلایا اور یہ وصیت فرمائی:

"اشک پونچھ لو آنسوؤں انسان کی طرح فانی ہیں۔ حق کی صدا سنو جو ابدی ہے۔ ہمیشہ حق پر قائم اور عبادت میں ثابت قدم رہو، ہمیں یاد رکھو اور معاف کر دو۔ اگر وفاداری میں ثابت قدم ہو تو سال بھر ہمارے مشہد (روضہ مبارک) پر قیام کرنا اور ذکر و اوراد پڑھتے رہنا۔ ان نصیحتوں پر عمل پیرا ہو تاکہ دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرو۔ مگر اس کے برعکس کوئی اور لائحہ عمل اختیار کرو گے تو تم خود ہی اس کے جواب دہ ہو۔ خدا حافظ جاؤ اور نماز ادا کرو۔

پھر بوقت شب تک آپ کی زبان مبارک پر یا اللہ یا رفیق یا حبیب جاری تھا اور آخری لمحہ میں آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا آپ تہتر سال کی عمر میں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اعداد ۷۸۶ ہیں آپ کا سال وصال بھی یہی ہے جس کی زلف تلواہ سے سرینگر کے محراب پر کندہ ہے یہ بات تائید کرتی ہے۔

حضرت شاہ ہمدانی کریم	آیۂ رحمت نہ کلام قدیم
گفت دم آخر تاریخ شد	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۷۸۶ھ

رحمان کے لغوی معنی ضرورت کے مطابق دینے والا اور رحیم کے لغوی معنی اعمال کے مطابق جزا دینے والا ہے۔ غور فرمایئے ضرورت کے مطابق دینے والے اللہ تبارک تعالیٰ نے اس مرد کامل کو لازوال شہرت اور ابدی زندگی عطا فرمائی۔ اپنے آخری لمحات میں رب العزت سے اعمال کے مطابق جزا دینے کی استدعا کی یہ اولیاء کرام کا قاعدہ ہے۔

آپ کے انتقال کے فوراً بعد سلطان خضر شاہ اس امر پر بضد ہوئے کہ آپ کو کنار میں ہی دفن کیا جائے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جنت کو ختلان پہنچانا خاصا مشکل ہو گا لیکن آپ کے اکثر صاحب سادات اور مریدوں نے بادشاہ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور آپ کی وصیت کے مطابق ختلان لے جانے پر قائم رہے۔ اس سے صورت حال فکر انگیز تک جا پہنچی جب فریقین کسی بات پر متفق ہوتے نظر نہ آئے تو حضرت شیخ قوام الدین بدخشی نے تجویز پیش کی کہ جو اشخاص زمین سے تابوت اٹھا سکے گا وہ اپنی مرضی کے مطابق آپ کو دفن کرے گا۔ فریقین نے تجویز قبول کی اور سلطان خضر شاہ نے اپنے قوی الجثہ نوجوانوں کو تابوت زمین سے اٹھانے کو کہا لیکن وہ اپنی پوری قوت لگا کر بھی اٹھا نہ سکے۔ جبکہ اس کے بعد حضرت شیخ قوام الدین بدخشی نے تابوت بڑی آسانی

سے اٹھایا اور ختلان کی جانب پیش قدمی کی۔ سلطان خضر شاہ کئی میل تک جنازے کے جلوس میں شامل رہا اور پھر اس نے وطن کی راہ لی۔ قاضی نور الدین سوشتری اور شیخ قوام الدین بدخشی کے مطابق جوں جوں ہم جانب منزل بڑھتے گئے تابوت سے زیادہ خوشبو آنے لگی۔ جس سے فضا دور دور تک معطر ہوئی۔ ہر پڑاؤ پر دور دور سے لوگ خوشبوؤں کی لپٹیں سونگھ کر جلوسِ جنازہ میں شریک ہوتے گئے اور فرشتے ابر رحمت بنکر سفید ابر کی صورت میں سایہ فگن رہے۔

آپ کا جنازہ ۲۵ ماہ جمادی الاول ۷۸۷ھ بمطابق ۱۳۸۵ء کو قریہ علیشاہ ختلان (کولاب) تاجکستان جو کبھی روسی ترکستان کہلاتا تھا پہونچا اور اُسی قطعہ زمین میں آپ کو آسودۂ خاک کیا گیا جو آپ نے اپنی حیات میں خود منتخب فرمایا تھا۔ اس طرح سادات ہمدانیہ نے ختلان میں مستقل بود و باش اختیار کی۔ امیر تیمور گورگانی نے جب آپ کے انتقال کی خبر سنی آبدیدہ ہوا ۔

تیری پلکوں پر رقصاں ہیں ستارے   یہ ظالم کس کا ماتم ہو رہا ہے

دراصل یہ امیر تیمور (متوفی ۸۰۷ھ) کے پشیمانی کے آنسو تھے۔ اُس نے اپنی نادانی کے کفارے کے طور پر اپنی زیر نگرانی آپ کا شایان شان مقبرہ تعمیر کرایا۔ جس میں آپ کے علاوہ آپ کی ہمشیرہ "ماہ خراسانی" ایک اور خاتون "آفتاب پنہانی" آپ کا فرزند ارجمند جناب میر سید محمد ہمدانی اُن کی اولاد اور آپ کی مسجد، خانقاہ اور مزار کے متولی دفن ہیں۔

آپ کا مزار صدیوں مرجع خلائق رہا۔ لیکن پچھلی سات دہائیوں میں سوویٹ روس کے ملحدانہ طرز نظام کا تاجکستان پر تسلط رہا جسکی وجہ سے زائرین کی آمد پر پابندی عاید کی گئی تھی اب چونکہ تاجکستان ایک آزاد مملکت کی صورت میں دوبارہ معرض وجود میں آیا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق آپ کے روضۂ مبارک کی زیارت

کے لئے زائرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی ہے۔

جناب میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ علم باطنی کشف و کرامات و ریاضات میں ہمہ گیر شخصیت کے مالک اور ولی اللہ تھے وہاں سلسلہ النبوت معلم، صاحب علم و القلم پرداز اور شاعر عرفان بھی تھے۔ آپ نے لگ بھگ ایک سو ستر کے قریب رسائل، ملفوظات اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن پر الگ تبصرے کی اس مقام پر گنجائش نہیں صرف آپ کی تصانیف و تالیفات میں سے چند ایک کے نام قلمبند کرنے پر اکتفا کرتا ہوں یعنی

(۱) ذخیرۃ الملوک (۲) مکتوبات امیریہ (۳) درویشیہ (۴) مشارب الاذواق۔ (۵) قاعدہ عشریہ (۶) تلقینیہ (۷) ذکریہ (۸) عقلیہ (۹) منہاج العارفین (۱۰) وجودیہ (۱۱) رسالہ بیان روح و نفس (۱۲) مکارم اخلاق (۱۳) المعروف فی القربیٰ (۱۴) شرح اسماء الحسنیٰ (۱۵) مراۃ الطالبین (۱۶) نوریہ (۱۷) ہمدانیہ (۱۸) اورادیہ (۱۹) فتوتیہ (۲۰) رسالہ حل مشکل (۲۱) رسالہ سبعین (۲۲) چہل اسرار (۲۳) توبہ (۲۴) اصلاحات الصوفیہ (۲۵) غایتہ المکان (۲۶) مرات التائبین (۲۷) خواطریہ (۲۸) حل الفصوص (۲۹) آداب المریدین (۳۰) رسالہ واردات (۳۱) رسالہ چلکہ (۳۲) اختیارات منطق الیطیر (۳۳) اقرب الطریق (۳۴) حقیقت ایمان (۳۵) فقریہ (۳۶) حق الیقین (۳۷) آداب سفرہ (۳۸) قدریہ فی اسرار النقط (۳۹) منازل سالکین (۴۰) فی فضل الفقر (۴۱) تفسیر حروف المعجم (۴۲) رسالہ علماء دین (۴۳) کشف الحقائق (۴۴) اوراد فتحیہ (۴۵) روضۃ الفردوس (۴۶) ادعیہ امیریہ۔

نوٹ: حضرت امیر کبیرؒ کی اوراد فتحیہ ایک نوری گلدستہ ہے جس کے آیندہ باب میں شامل کیا جائیگا۔ انشاء اللہ

حضرت سیّد حسین سمنانیؒ

خاکِ کشمیر گر مُصفّا شُد
از قدم گاہِ آلِ طٰہٰ شُد
ہیچ جائی بہ شہر و پرگنہ جات
نیست خالی ز حضرت سادات

(مُلا بہاؤ الدین متو)

سیاحت، تجارت، سیاست اور تہذیبی لین دین از نا ریخی تبدیلیوں کے اہم اور قدیم ذرائع ہیں۔ ہجرت جو سُنت الانبیا ہے کا بھی بجا طور ایک اہم ترین ذریعہ کے طور ذکر کیا جاسکتا ہے جس سے انسانی تہذیب کے خد وخال متعین ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ انسانی کوتاہیوں، فطرت کے داخلی قوانین اور ہماری گوناگون غفلت شعاریوں کی وجہ سے مثبت تاریخی انقلابات کبھی کبھی منفی تاریخی واقعات میں تبدیل ہوتے ہیں۔ انسانی کلچر

اور ثقافت کی ہیئتِ ترکیبی بھی اسی طرح بدلتی رہتی ہے۔ وادیٔ کشمیر میں اِس تناظر میں اشاعت اسلام کا جائزہ لیتے ہیں انہی تہذیبی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔۔۔ جہاں ہجرت الاولیائؒ نے سرزمینِ کشمیر کی کایا پلٹ دی۔

اسلام کشمیر میں باضابطہ طور چودھویں عیسوی میں پرتوفگن ہوا جب حضرت عبد الرحمان شرف الدین بلبلؒ وارد کشمیر ہوئے اور والیٔ تبت کا بیٹا شہزادہ رینچن سلطان صدر الدین کے نام سے حلقۂ اسلام میں آیا۔ اِس واقعہ کی تاریخ ۷۲۶ھ یوں باندھی گئی ہے "طلوع آفتاب دینِ احمدی"۔ اسی نام سے وہ پہلے نو مسلم بادشاہ کی حیثیت سے ۳ سال فرمانروائی کر کے دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ مؤرخ حسن شاہ بلبلؒ لنگر کی تاریخی حیثیت اور کشمیر میں اسلام کے ابتدائی نقوش واوّلین مسجد کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:۔

"رینچن شاہ بعد یافتنِ دولتِ اسلام برائے مرشدِ بزرگوارِ خود خانقاہِ رفیع بر کنارۂ دریائے بہت ترصیص نمود، ایں اوّلین خانقاہیست کہ در کشمیر تعمیر یافت و در آنجا برائے آمد و رفتِ مسافراں و محتاجان لنگر جاری ساخت و بہ جہتِ مصارفِ مطبخ و اخراجاتِ خانقاہ چند قریہ از پرگنہ ناگام تعین فرمود کہ تا زمانِ چھنت بدستور معمولی بود۔ ازیں آن محلہ را بلبلؒ لنگر میگفتند"۔

اس سے قبل ذولچو، جو ہلاکو کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا ستّر ہزار سپاہیوں کی معیت میں، منگول بادشاہوں کی کشمیر فتح کرنے کی خواہش پوری کرنے کے لئے پکھلی پورہ بارہمولہ کے راستے سے کشمیر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ سرحد محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے اُسے کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ راجہ سہدیو اُسے زرِ کثیر دے کر واپس کرانے میں ناکام ہوا۔ سفاک دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے لوگوں پر مختلف قسم کے ناقابلِ برداشت ٹیکس عاید کئے یہاں تک کہ برہمن بھی اُس کے ظلم کا شکار ہوئے۔ منگول فوج مار دھاڑ، ظلم کا بازار گرم کرتی گئی۔

ہر طرف کہرام مچا۔ تباہی اس حد تک بڑھ گئی کہ راجہ سہہ دیو اپنی جان بچانے کے لئے کشتواڑ بھاگ نکلا۔ بدنظمی اور بداخلاقی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ایک راجہ ہی اپنی جان بچانے کے لئے گدی کیا، ملک چھوڑ کر ہی چلا جائے اور اپنی مظلوم رعایا کو اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ ذولچو کی سفاکی آٹھ ماہ تک جاری رہی اور آخر کار فطرت کرم پر آئی کہ ساری منگول فوج براہِ پرگنہ دیوہ سر سے واپس جاتے ہوئے برفانی طوفان کی زد میں آکر ذولچو سمیت فنا ہو گئی۔ حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین ولیؒ کے آباو اجداد دیر، سے اور گر دیو کا پوتا اسی طوفانِ بدتمیزی میں جاں بحق ہوا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ذولچو مسلمان تھا۔[1]

گیارہویں صدی کے اوائل ہی سے ہندو عہد رو بہ زوال ہوتا ہے۔ راجہ اپنی رعایا کو بھول جاتے ہیں۔ نفس پرستی اور ہوس رانیوں کے حاوی ماحول میں، محمود غزنوی کشمیر پر حملہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اُسے لوہر کوٹ کے مقام پر دو بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا جس میں فطرت کی سفاکی نیرنگیوں کا ہاتھ تھا۔ منگول تباہی کے بعد تباہ حال دبے بسے کشمیری پہاڑوں کی چوٹیوں سے اپنی بستیوں کی طرف لوٹے۔ بدنظمی عروج پر تھی۔ یہی وہ اندرونی خلفشار تھا جس کے نتیجہ میں تبت کے راجہ کا بیٹا شہزادہ رینچن بڑی ہشیاری سے سہدیو کے سپاہ سالار رام چندر لاکر، جس کا وہ اعتماد حاصل کر چکا تھا، اپنے لداخی حواریوں کی مدد سے قتل کرا کے کشمیر کی گدی پر ۱۳۲۰ء میں براجمان ہوا، اور ۱۳۲۳ء تک کشمیر پر تا دمِ اخیر حکومت کرتا رہا۔

عرب و ہند کے تجارتی تعلقات قدیم تھے لیکن ہندوستان پہلی بار بلاواسطہ طور پر محمد بن قاسم کا فتحِ سندھ ۷۱۱۔۱۳ء سے متصادم ہوا۔

[1] کشمیر سلاطین کے عہد میں۔ ص: ۳۴، ۳۵، ۳۶۔

کشمیر میں اگرچہ تبلیغِ اسلام کی تاریخ کا تعین حضرت بلبل شاہؒ کے وقت سے کیا جا چکا ہے تاہم واقعہ یہ ہے کہ رینچن کے مشرف بہ اسلام ہونے سے سالہاسال سے قبل ۱۳۲۵ء سے بیشتر یہاں اسلام کا مہر درخشاں طلوع ہو چکا تھا۔ اور تبلیغ کرنے والے گروہ کو یہاں کے عام لوگ عقیدتاً ریشی ہی کہا کرتے تھے تحقیق کی شمعیں روشن کرنے والے آجکل جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ راجہ ہرش کی شکست کے بعد کشمیر میں جو پہلا مسلمان وارد ہوا احمد بن سام تھا۔ اُن کے دور سے رینچن شاہ کے دور تک جو جو کشمیری حلقہ بگوش اسلام ہوا، اُنکی تبلیغ کا کام کشمیر کے سرحدی علاقوں تک ہی محدود رہا۔ اور دائرہ اسلام میں پہلے پہل غریب اور نادار بودھوں اور پسماندہ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی آئے[1]

یہی وہ سماجی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر ہے، جس کے تناظر میں حضرت سید حسین سمنانیؒ ۷۷۵ھ میں وارد کشمیر ہوئے۔ حضرت سید حسین سمنانی سید تاج الدینؒ (مدفن اونتی پورہ) کے بھائی جناب امیر کبیر میر سید علی ہمدانی (۷۸۶ھ ۔ ۱۳۸۴ء) کے چچیرے بھائی تھے، جن کے پیام اور دعوتِ عمل، زہد و اتقا و توحید دروں بینی و جہاں بینی کو شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ یوں نظم کر چکے ہیں ؎

سیدالسادات سالارِ عجم	دستِ او معمارِ تقدیرِ امم
	ذکر و فکر از دومانِ او گرفت
مرشدِ آن کشورِ مینو نظیر	میر و درویش و سلاطیں رامشیر
خطہ را آن شاہ دریا آستین	داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آن مرد ایرانِ صغیر	با ہنرہائے غریب و دلپذیر

---

[1] علمدار، ص: ۲: ابتدائی ریشی سلسلے کا ایک تاریخی جائزہ۔ پروفیسر محی الدین حاجنی

یک نگاہِ او کُشاید صد گرہ — خیز و نیزش رابدل راہے بدہ

یہ حضرت امیر کبیرؒ ہی ہیں جنہیں کشمیری بجا طور پر بانیٔ اسلام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
جن کے ارشاد کے مطابق حضرت سید حسین سمنانیؒ تبلیغ دینِ اسلام کے لئے وارِد کشمیر
ہوئے۔ کشمیر کے نامور مؤرخ پیر حسن کھویہامی سید حسین سمنانیؒ کے ورود کشمیر کے بارے میں
لکھتے ہیں کہ انہوں نے امیر گورگان کے تشدد کے زمانے میں اپنے آبائی وطن شہر سمنان سے
جملہ احباب و اقارب کی معیت میں ہجرت کی اور قصبہ ساؤمان (ساماں)
جو کہ دہلی کے آس پاس علاقوں میں ہے کئی سال رہائش کی۔ وہاں سے سلطان شہاب
الدینؒ کے عہدِ حکومت میں ۷۷۵ھ میں حضرت امیرؒ کے حکم اور بھائی تاج الدین کی
ترغیب سے پیر پنچال کے راستے سے کشمیر کی سیر کا ارادہ فرمایا۔ اچانک آپ کا گھوڑا
پتھر سے ٹکرا کر لنگڑا ہوگیا۔ اور پہاڑ کو عبور کرنے میں دیر لگ گئی۔ حضرت سیدؒ اس
حادثہ سے دِل آزردہ ہوگئے اور وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ اُن کے بیٹھتے ہی پتھر دوڑنے
لگا۔ اور تھوڑے وقت میں دشوار گزار پہاڑی راستہ قطع کر کے ہیر پورہ (ہرپورہ)
پہنچے۔ یہ تیز رفتار پتھر آج تک ہیرپل (پیر کا پتھر) کے نام سے مشہور رہا ہے۔ شہرت
کے ڈر کے موجب پتھر کو وہیں چھوڑ کر پرگنہ دیوہ سر کے ایک گاؤں کولگام میں جو
دریائے ویشو کے کنارے ایک روح افزا اور دلکشا جگہ ہے سکونت اختیار فرمائی۔
کچھ مدت بعد اُن کے صاحبِ مرتبہ بیٹے سید حسنؒ اور اُن کے بھتیجے سید حیدرؒ بھی بال بچوں
کو لے کر وہاں آگئے۔ ازاں بعد نامور سیدؒ نے لوگوں کو راہِ خدا دکھانے کا کام شروع
کیا اور خلقِ خدا کو ظاہری اور باطنی فیض رسانی سے مستفیذ کیا۔ سنتِ رسول اللہ ﷺ کو رواج
اور دینِ اسلام کو فروغ دینے میں کوشش کرتے رہے۔ حضرت سیدؒ کی کرامات تحریر
و تقریر کی حد سے باہر ہیں۔ حضرتِ شیخ العالم علمدارِ کشمیرؒ روحانی فیض حاصل کرنے
کے لئے ریکموہ سے اُن کی خدمت میں کولگام آجایا کرتے تھے۔ ایک روز حضرت سیدؒ

سوئے ہوئے تھے اور ملاقات حاصل نہیں ہوئی۔ حضرت شیخؒ نے اپنی نظر جناب سیدؒ کی سونے کی کوٹھڑی کی طرف باندھی اور حضرت سیدؒ سے اپنی باطنی مدعا کا جواب پاکر واپس تشریف لے گئے۔ مختصر یہ کہ حضرت سید حسین سمنانیؒ بڑے ہی باکمال دینی اور روحانی بزرگ تھے۔ ۱۱ رماہ شعبان ۷۹۲ھ واصل بحق ہوئے[۱] انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپکی خانقاہ فیض پناہ آج بھی مرجع خاص وعام ہے۔ ایک وقت تھا کہ یہاں روزانہ لنگر لگا رہتا تھا اور یومیہ ایک خروار چاول پکا کر غریبوں محتاجوں اور یتیموں میں بانٹے جاتے تھے۔

تاریخ کبیر کے مصنف حاجی محی الدین مسکین ذکر سادات میں رقمطراز ہیں کہ "سید حسین سمنانیؒ امیر تیمور گورگانی کے عہد میں ۷۷۳ھ میں سلطان شہاب الدین (۱۳۵۴ء-۷۳) وارد کشمیر ہوئے........"

"وآن جناب از شہر سمنان، در ایام امیر تیمور گورگان از قصبۂ سادمان ہجرت نمودہ مدتے بسر رسانیدہ از آنجا در عہد سلطان شہاب الدین بہ شہور سنہ ہفت صد وہفتاد وسہ بفرمان حضرت امیر قدس سرہ آز راہ پیر پنجاب دریں صوبہ نزول واجلال فرمود۔"

حضرت شیخ العالمؒ اور حضرت سید حسین سمنانیؒ کے روحانی مراسم کے بارے میں یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

شیخ سمنانی حسین را نیز خدمت کردہ بود
پیر خویشش خواند در نظم خودش بے اہتمام

خواجہ اعظم دیدہ مری حضرت سمنانیؒ کے روحانی کمالات پر یوں روشنی ڈالتے ہیں آب وآتش در تصرف تسخیر آن حضرت بود وکرامات بے غایات ظہوری نمود۔ ۱۱ رماہ شعبان

---

[۱] تاریخ حسن۔ جلد ۳۔ تذکرہ اولیائے کشمیر۔

۸۲۵ھ میں واصل بحق ہوئے ۔

سالِ وصلش از روئے حبِ طلبی زبدۂ خاندانِ آلِ نبیؐ (۸۲۵ھ) حضرت

سید حسین سمنانیؒ کے ورودِ کشمیر کے بارے میں دو تین سال (۷۷۵-۷۷۳ء) کا اختلاف

قابلِ یقین تو ہوسکتا ہے لیکن سالِ وصال میں ۳۳ ، ۳۴ سال کا فرق ناقابلِ یقین ہے۔

یہ امر تحقیق طلب ہے۔ کشمیری زبان کے نقاد، محقق اور شاعر عبدالاحد آزاد (وفات ۱۹۴۸ء)

نے بھی ۸۲۵ھ ہی حضرت سمنانیؒ کا سنۂ وصال "کشمیری زبان اور شاعری" جلد ۲

میں درج کرتے ہیں۔ حضرتِ سید حسین سمنانیؒ کے دیگر احباب ولواحقین کولگام کے

متصل ویشو کے کنارے آمنو کے گاؤں میں نہایت ہی دلفریب قطعۂ ارضی کے گوشے

میں آسودہ ہیں۔ یہاں بھی اُن کا آستانِ فیض پناہ مرجعِ خلائق ہے جس کے لئے

حکومت وقت نے اراضی کا بہت بڑا رقبہ وقف رکھا ہے۔ یہاں سے دور دور

تک قدرت کے نظاروں سے محظوظ ہوا جا سکتا شاید علامہ اقبالؒ نے اسی جگہ

کے لئے کہا ہو ۔

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب

حسن خدا را دیدم آنجا بے حجاب

یہ حضرت سید حسین سمنانیؒ ہی تھے، جو حضرت شیخ العالمؒ کے والد سلر سنز کے مرشد

تھے جن کی برگزیدہ روحانی شخصیت کے زیرِ سایہ وہ دائرہ اسلام میں آئے۔ اُن کا نام

شیخ سلار دین رکھا گیا جن کے رشتۂ ازدواج میں بعد میں سدرہ موج بندمی اور جن کے

بطن سے حضرت شیخ العالمؒ شیخ نورالدین ولی عُرف علمدارِ کشمیرؒ اور نندہ ریشی

۷۷۹ھ کو تولد ہوئے۔ اِسطرح حضرت سید حسین سمنانیؒ کے مبارک ہاتھوں سے

کشمیری زبان کو عرفان و آگہی کی سدا بہار جہت ملی اور ہمیں ایک مسرت کا لافانی تحفہ

ہاتھ آیا کیونکہ حضرت سادات کی تبلیغی زبان فارسی و عربی تھی لیکن اسلام کا

حیات آفرین پیغام حضرتِ شیخ رح کے دلنشین شرکوں کی صورت میں کشمیری عوام کے دِلوں میں جاگزین ہوا یہاں تک کہ اُنکا کلام سینہ بہ سینہ چھ سو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہمارے اجتماعی حافظہ میں محفوظ رہ کر رواں صدی کے نصفِ ثانی میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔

ریشی یعنی دردمندِ ہر زماں

آرزوئے ہر زماں از ریشیاں است

(نورنامہ بابا نصیب الدین غازیؒ)

اِسی لئے مولانا رومؒ نے بجا فرمایا کہ صاحب دِل لوگوں کی نِگاہِ کیمیا اثر سے اِس خاکدان کی قدر و منزلت نگاہِ آئینہ ساز میں ذرّے سے آفتاب ہوجاتی ہے، کیونکہ ایک وقفہ اولیاء کی صحبت میں گزارنا سو سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے، اگر تو سنگ خارا ہے سنگِ مرمر بن جاؤ گے تم صاحب دِل لوگوں سے ملو گے تو موتی بن جاؤ گے۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاءٔ

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

گر تو سنگِ خارہ مرمر شوی

چوں بہ صاحب دِل رسی گوہر شوی

انہی صاحب دِل لوگوں میں حضرت سید حسین سمنانیؒ بھی تھے جن کے روحانی فیض و برکت سے حضرت شیخ العالمؒ کی عرفان و آگہی کے سوتے اُن کے دلنشین و حیات آفرین کلام کی صورت میں پھوٹے۔

آسماں گوید زمین را مرحبا

با توام چوں آہن و آہن رُبا (مولانا رومؒ)



سیّد محمدؒ رفاعی اصفہانیؒ

(المعروف سیّد جانباز ولیؒ)

اٹھویں صدی ہجری یا چودھویں صدی عیسوی کشمیر کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کچھ ہمعصر بزرگانِ دین نے وسطِ ایشیا اور ایرانی علاقوں سے اپنے رفقا کے ہمراہ آکر اس خطۂ ارض میں الحاد و توہم پرستی پر مبنی نظریات کے مقابلے میں اسلام کی آفاقی تعلیم کو عام کر کے یہاں کے لوگوں کی تقدیر بدل دی۔

حضرتِ شرف الدین عبدالرحمان بلبل شاہ صاحبؒ [1] کے بعد جو بزرگ دعوتِ اسلام کو خلقِ خدا تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کشمیر میں وارد ہوئے وہ حضرت سیدؒ جلال الدین مخدوم جہانیانِ جہانگشت ہیں۔ آپ ۷۴۸ھ

---

[1] آپ ۷۲۵ھ میں کشمیر تشریف لائے۔ تاریخِ حسن۔ حصہ سوم۔ صفحہ ۳
تذکرۃ الاولیاؒ والصلحاؒ۔ سید علی گوہر صفحہ ۸

میں کشمیر آنے کے بعد دینِ اسلام کی دعوت کو عام کرتے رہے۔ لیکن قلیل مدت تک کشمیر میں قیام فرما رہنے کے بعد واپس تشریف لے گئے۔[1]

سنہ ۷۶۰ھ میں حضرتِ سیّد تاج الدین ہمدانیؒ اپنے فرزندِ ارجمند حضرت سیّد حسن بہادرؒ کے ساتھ کشمیر میں تشریف آور ہوئے۔ سیّد حسن بہادرؒ کے خاندان (ساداتِ تلہ گام) میں سید اکبر شاہ ایک عالم و عابد گزرے ہیں۔ حضرتِ تاج الدین حضرت سیّد علی ہمدانیؒ کے چچیرے بھائی تھے۔ اُنہوں نے تن و من سے اِشاعتِ دینِ اسلام میں حصّہ لیا۔ آپ شہرِ خاص نوہٹہ میں مدفون ہیں۔[2]

سنہ ۷۷۵ھ میں حضرتِ سیّد حسین سمنانیؒ سلطان شہاب الدین کے عہدِ حکومت میں پیر پنچال کے راستے کشمیر آئے۔[3] آپ نے بھی احیائے اسلام کی ترویج کے لئے پوری جاں فشانی سے کام لیا۔ آپ کولگام میں مدفون ہیں۔

سنہ ۷۷۴ھ مطابقِ سنہ ۱۳۷۲ء میں حضرتِ میر سیّد علی ہمدانیؒ پہلی مرتبہ دینِ اسلام کی تبلیغ و اِشاعت اور پھیلاؤ کے لئے کشمیر تشریف لائے۔[4] چار ماہ قیام فرمانے کے بعد آپ حرمین شریفین کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ سنہ ۷۸۱ھ

---

[1] اخبار الاخبار۔ اُردو ترجمہ۔ ذخیرۃ الملوک۔ میر سید علی ہمدانیؒ صفحہ ۲۵ (پیشِ لفظ)

[2] تذکرۃ الاولیا حصّہ سوم۔ پیر حسن کھویہامی صفحہ ۶-۷
تذکرۃ الاولیاء والصلحاء۔ صفحہ ۸

[3] تذکرۃ الاولیائے کشمیر۔ صفحہ ۹
تاریخِ اعظمی۔ محمد اعظم دیدمری۔ صفحہ ۳۸

[4] پیش لفظ ذخیرۃ الملوک۔ اُردو ترجمہ۔ صفحہ ۸۷۔

مطابق ۱۳۷۹ء میں آپ دوبارہ کشمیر آئے اور ڈھائی برس تک خدمتِ دین[1] اور تبلیغِ اسلام کا مبارک کام انجام دیتے رہے۔ ہزاروں انسانوں کے ساتھ[2] ساتھ شاہ پور ربرہمن بھی حضرت سید علی ہمدانیؒ کے دستِ بیعت پر حلقۂ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ ۷۸۳ھ میں آپ تبت، ترکستان، لداخ، کاشغر، ختن اور چین کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ آپ نے ۷۸۵ھ مطابق ۱۳۸۳ء کو تیسری بار اپنی تشریف آوری سے کشمیر کو مشرف کیا اور ۷۸۶ھ میں سفرِ محمود حج کے لئے چلے گئے لیکن راستے ہی میں ہی آپ رحلت فرما گئے۔[1]

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے بعد جو بزرگ بت پرستی کے مقابلے میں خدا پرستی اور توہم پرستی کے مقابلے میں رسالت کا پیغام لیکر دینِ اسلام کو فروغ دینے کے لئے کشمیر آئے وہ حضرتِ سید محمد رفائی اصفہانی المعروف سید جانباز ولیؒ تھے۔ آپ ۷۳۵ھ میں ایران میں اصفہان کے مقام پر پیدا ہوئے اسلئے آپ کے نام کے ساتھ "اصفہانی" بھی لکھا جاتا رہا ہے[2]۔ آپ نے اپنی زندگی میں خدا کی راہ میں ظاہری اور روحانی لحاظ سے جانبازی کا مظاہرہ کیا اور اسی بنا پر جانباز کا لقب بھی پایا[3]۔ آپ سید احمد رفائی کی اولاد میں سے ہیں اور قادری نسبت رکھتے ہیں۔ آپ رفائی سلسلہ کے آخری عربی تھے[4]۔ اس طرح آپ کا سلسلہ حضرتِ امام حسینؓ سے ہو کر حضرتِ فاطمہ زہراؓ کے ذریعے حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] پیش لفظ ذخیرۃ الملوک۔ اردو ترجمہ۔ ۹۴۔ ۹۵
تذکرہ اولیائے کشمیر۔ حسن کھویہامی۔ صفحہ ۱۶

[2] تذکرۃ الاولیاءِ کشمیر۔ صفحہ ۳۰

[3] شاہنامہ کشمیر۔ تاریخِ شائق۔ ذکر جانباز صفحہ ۱۶ ۔ حاشیہ [4]: اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

کے ساتھ ملتا ہے۔ آپ کے والد صاحب کا نام سیّد حافظ حسین رفاعی تھا۔ آپ اپنے عم زاد حضرتِ سیّد حسن رفاعی[1] کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ سو بندگانِ دین کے ساتھ شوپیان کے راستے کشمیر آئے۔ آپ ۸۲۷ھ مطابق ۱۴۲۱ء میں کشمیر آکر سرینگر میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں آپ نوشہر (سرینگر) میں دو سال تک قیام کرنے کے بعد سرینگر سے دور کہیں تشریف لے جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ لوگوں کے جوق در جوق حاضر رہنے کی وجہ سے آپکو یہاں یادِ الٰہی کے لئے کم وقت میسر رہتا تھا۔ آپ کشتی کے ذریعے دریائے جہلم سے ہوتے ہوئے بارہمولہ کے نزدیک ایک گاؤں میں تشریف فرما ہوئے۔ آپ کے قیام فرما ہونے کی وجہ سے یہ گاؤں جانباز پورہ کہلایا۔[2] لیکن اس مقام پر بھی لوگوں کی کثیر آمد و رفت کی وجہ سے آپ بارہمولہ کے نزدیک ایک جنگل میں چلے گئے جو بعد میں خانپورہ کہلایا۔

آپ سیّد جلال الدین حسین مخدوم جہانیان جہانگشت کے خلیفہ تھے۔ مخدوم جہانیان کا شجرۂ نسب چودھویں پشت اور سید محمد رفاعی جانبازِ ولی کا شجرۂ نسب پندرھویں پشت میں حضرت امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جا ملتا ہے[3]۔ مخدوم جہانیاں کی نسبت سے آپ کا سلسلہ سہروردیہ ہے۔ آپ نے اُن سے باطنی فیض حاصل کر کے قربِ خدا حاصل کیا اور اُن کے مرید و خلیفہ ہو گئے۔

بقیہ ؎ تاریخ کشمیر ۔ میر سعید اللہ شاہ آبادی۔
تاریخ کبیر ۔ غلام محی الدین مسکین۔
تذکرہ اولیائے الصلحاء ۔ سید علی گوہر ۔ صفحہ ۱۸
حاشیہ ؎ ۲ اور ؎ ۳ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

حضرت سید محمد رفائیؒ[۲۷] اپنی سخاوت کی وجہ سے سخی جانباز کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ آپ کے لنگر میں بچھے ہوئے دستر خوان سے کوئی بھی شخص اپنی بھوک مٹا سکتا تھا اسی وجہ سے اس بستی کا نام خانپورہ پڑ گیا۔[۲۸]

حضرت سید جانباز ولیؒ جب کشمیر آئے اُن کے ساتھ مریدوں کی ایک بڑی جماعت تھی جو سب کے سب اعلیٰ درجے کے بزرگ تھے۔ اُن کے ساتھ آئے ہوئے صاحب کمال مریدوں کی تعداد ایکسو بیس[۱۲۰] تھی، جن میں سے بیس[۲۰] رازِ حق سے واقفیت رکھتے تھے۔ بیس[۲۰] مجذوب، بیس[۲۰] غوث و قطب، بیس[۲۰] ابدال، بیس[۲۰] کا شمار عاشقوں میں ہوتا تھا اور بیس[۲۰] سالک تھے۔ اِن اصحاب کے علاوہ اُن کے ساتھ سید جانباز ولیؒ کے ظاہری علوم کے اُستاد حضرت سید محمد عربی بھی تھے جن کو عرفِ عام میں سید عرب صاحب کہا جاتا ہے۔ سید عرب صاحبؒ سید جانباز ولیؒ کے آستانہ عالیہ کے ... دفن ہیں[۲۹]۔ سید جانباز ولیؒ کے ساتھ آئے ہوئے بزرگوں میں سے کچھ بزرگ آستانہ کے اندر دفن ہیں جن میں سے ایک بزرگ کا نام شیخ اللہ داد کمینی ہے اور دوسرے کچھ بزرگ اس کے صحن میں دفن ہیں[۳۰] مقامی

بقیہ حاشیہ[۲۷] سید جانباز ولیؒ سرینگر میں دو سال تک قیام کرنے کے بعد بارہمولہ تشریف لائے لیکن اُن کے بھائی سید حسن رفائیؒ نے مستقل طور پر نوشہرہ سرینگر میں ہی سکونت اختیار کی۔ [۲۸] ـ صفحہ ۱۰ ذکرِ جانباز۔ [۲۹] ـ تاریخ کبیر۔ بحوالہ تذکرۃ الاولیاء و الصلحاء۔ صفحہ ۱۸۔ [۳۰] ـ ذکرِ جانباز (از قدیر احمد) صفحہ ۳۵
[۳۱] ـ شاہنامہ کشمیر۔ تاریخ شائق۔ ذکرِ جانباز صفحہ ۴۶-۴۷۔

[۳۲] بروایتِ شیخ غلام الدین۔ خادم زیارت شریف سید جانباز ولیؒ۔

لوگوں کی روایت کے مطابق سیدّ محمد رفائی جانباز ولیؒ کے ساتھ آئے ہوئے اُن کے مطابق سیدّ محمد رفائی جانباز ولیؒ کے ساتھ ہوتے اُن کے دو ماموؤں میں سے ایک حضرتِ عبد اللہؒ درنگبل بارہمولہ میں اور دوسرے حضرتِ موسیٰ صاحب زیارت گاہ کے جنوب میں خانپورہ کی پہاڑی پر مدفن ہیں[1] اس کے علاوہ حضرتِ سیدّ جانبازؒ کا ایک خلیفہ سیدّ عبد اللطیف جانباز پورہ میں دفن ہے[2] یہ وہ جگہ ہے جہاں پر حضرتِ سیدّ جانبازؒ کچھ مدّت کے لئے تشریف فرما تھے۔

آپ کی تشریف آوری کے زمانے میں کشمیر میں سلطان زین العابدینؒ (بڈشاہ) کی حکومت تھی۔ بڈشاہ کو آپ کے ساتھ بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ نوشہرہ میں قیام کے دوران آپکے قیام و طعام کا انتظام بڈشاہ نے خود کیا اور بارہمولہ میں جانباز پورہ کے مقام پر ایک وسیع چراگاہ اور دو گاؤں سیدّ محمد جانباز ولیؒ کے لنگر کا خرچہ پورا کرنے کے لئے وقف کئے تھے[3]

حضرتِ سیدّ جانبازؒ سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ کیونکہ آپ کے دل میں عشقِ رسولؐ کے سوا اور کسی چیز کے لئے جگہ نہ تھی۔ حضرتِ سیدّ جانباز رفائیؒ بہت بڑے صاحب کرامت تھے۔ لیکن انہیں کرامات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بجائے اُن کی تعلیمات، خدمتِ خلق اور احیائے اسلام کے لئے اُن کی کوششوں اور قربانیوں پر غور کر کے اُن کی تقلید کرنے کی ضرورت ہے۔

---

[1] ۔ ذکرِ جانباز (از ۔ تدبیر احمد) صفحہ ۴۸

[2] ۔ تاریخ حسن ۔ تذکرہ اولیائے کشمیر ۔ اردو ترجمہ صفحہ ۴۳

[3] ۔ تذکرہ اولیاءِ کشمیر صفحہ ۴۰۔ شاہنامہ کشمیر ۔

حضرتِ سیدّ جانباز ولیؒ کا مقصد حیات دین اسلام کے احیاً کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ حصولِ مقصد کے لئے جو تڑپ اور ولولہ آپ کے دل میں موجود تھا اُسی کی وجہ سے آپ اپنا گھر بار اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر تکلیف دہ سفر طے کر کے وارد کشمیر ہوئے۔ بڈشاہ کی طرف سے جو گاؤں آپ کو جاگیر میں دئے گئے تھے اُن سے حاصل ہونے والی آمدنی تبلیغِ دینؒ کے کاموں پر خرچ کی جاتی تھی۔[1]

حضرتِ سیدّ جانبازؒ جو ظاہری و باطنی علوم میں کمال رکھتے تھے اور صاحب ارشاد تھے، توحید کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ نے عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم کی تبلیغ کا کام بھی انجام دیا۔[2] ہزاروں گمراہوں کو راہ راست پر لایا اور شرک اور کفر کے متوالوں کو اپنی جاذبِ نظر اور بابرکت شخصیت سے دین اسلام کے زمرے میں لا کھڑا کیا۔ ہزاروں غیر مسلم اُن کے روحانی کمالات سے متاثر ہو کر حلقۂ بگوشِ اسلام ہوئے اور اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لئے وقف کیا۔[3]

خانپورہ بارہمولہ میں آپ نے ایک تبلیغی مرکز قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مسجد اور ایک عید گاہ کی تعمیر بھی عمل میں لائی۔ آپ اِس بستی میں لوگوں کو تعلیم القرآن، درس حدیث اور تبلیغ دین سے روشناس فرماتے تھے جس سے ہزاروں لوگ مستفید ہوتے رہتے تھے کہ آپ کی مجلسوں میں ہمیشہ لوگوں کا جم غفیر رہتا تھا۔ آپ نے بہت سے لوگوں کو تصوّف کی تعلیم دیکر انہیں راہِ سلوک کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچنے میں رہنمائی کی۔ آپ عمر بھر عوام الناس کو بُرائی سے روکتے رہے اور نیک

---

[1] ذکرِ جانباز۔ صفحہ ۳۱

[2] فتوحاتِ قادریہ ۔۔ حاجی محمد حسن قادری منطقی۔

[3] "ذکرِ جانباز" (از قدیر احمد) صفحہ ۷۵ ۔

اعمال کی تلقین کرتے رہتے۔

سید جانباز رح کلمۂ حق کی اشاعت کے لئے ایران سے کشمیر آئے۔ چونکہ آپ سالارِ کاروان تھے اسلئے آپ کے ساتھ علم بھی تھے جو قافلہ کے آگے آگے رہتے تھے۔ آستانہ مبارک کے اندر ایک کونے میں ایک پتھر پر یہ علم ہیں جن کی تعداد تین ہے۔ اُن کے دستے لوہے کے ہیں۔ درمیانی حصہ لکڑی کا اور اگلے سرے بھی لوہے کے ہیں۔ ان میں سے دو علم بڑے سائز کے اور ایک چھوٹے سائز کا ہے۔ انہیں عرفِ عام میں (علم صاحب) کہا جاتا ہے[1]۔

آپ کے تبرکات میں کلاہ شریف بھی شامل ہے جسے ایک صندوقچہ میں رکھا گیا ہے جس کے آگے شیشہ لگا ہوا ہے۔ یہ کلاہ شریف سبز اور سُرخ رنگ کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرتِ سیّد جانباز رح یہ کلاہ شریف خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتے تھے[2]۔

اس کے علاوہ لکڑی کا کنگھا (شانہ) بھی یہاں موجود ہے۔ اس کے ایک طرف گول دائروں میں "اللہ" اور محمدؐ اور دوسری طرف "ابوبکر رض، عمر رض، عثمان رض اور حیدر رض" کندہ ہیں۔ اس کی ساخت بہت ہی دلکش اور عمدہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیّد جانباز رح کو یہ شانہ شریف اپنے اسلاف سے تحفہ کے طور پر ملا تھا اور اُنہوں نے اسے استعمال کرنے کے بجائے محفوظ رکھا[3]۔

لکڑی کا بنا ہوا ایک تیر کمان، تلوار بھی تبرکات میں شامل ہیں۔ کمان کی ساخت اس وقت کی کاریگری کا نمونہ ہے۔ یہ تیر کمان اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ حضرت سید جانباز رح شکار کھیلنے کے بھی شوقین تھے۔ تلوار آج کی تلواروں سے مختلف ہے۔ مشہور ہے کہ یہ دونوں چیزیں حضرت سید رح اپنے ساتھ لائے تھے[4]۔ اُن کے علاوہ دو چھوٹی

---

[1] تا [3] "ذکرِ جانباز" (از قدیر احمد) صفحہ ۷۵-۷۶

[4] ذکرِ جانباز (از قدیر احمد) صفحہ ۷۶

لکڑی کی کشتیاں، لکڑی کے دو چھوٹے چپو، بارہ سنگھا کا ایک سینگھ، نعلین اور کھڑاویں بھی تبرکات میں شامل ہیں۔

ان تبرکات کے علاوہ حضرت سید جانباز ولیؒ کے اور بھی بہت سے تبرکات ہیں جنہیں دو الماریوں میں رکھا گیا ہے جن کے آگے شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اس درگاہ میں ایک بڑی دیگ بھی موجود ہے جس میں مقامی روایت کے مطابق تین[3] خروار چاول وغیرہ ایک ہی وقت پکایا جاسکتا ہے۔ مقامی روایت کے مطابق حضرت سید محمد رفائی اصفہانی ایکسو پانچ سال کی عمر میں ۲۴ ماہ ربیع الاول ۸۲۰ھ مطابق ۱۴۳۳ء کو بارہمولہ میں انتقال فرما گئے۔ آپ کا مرقد خانپورہ بارہمولہ میں ہے۔ پیر حسن کھویہامی کا کہنا ہے کہ آپ کا مرقد جانباز پورہ بارہمولہ میں ہے[4] جو صحیح نہیں ہے۔ آپ کا عرس مبارک ہر سال ۲۴ ماہ ربیع الاول کو منایا جاتا ہے۔

---

[1] تاریخ کشمیر۔ سید علی بن سید محمد ماگرے۔
تاریخ اعظم۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری۔
تاریخ الاولیاء۔ امام الدین احمد۔
[2] تذکرہ اولیاء کشمیر۔ صفحہ ۴۰



مرغوب بانہالی*

حضرت شیخ نورالدین ولیؒ

ہمارے ماضی بعید اور ماضی قریب میں روئے زمین کے مختلف خطوں پر وقتاً فوقتاً ایسے دوستانِ خدا، مردانِ باصفا اور مُبلغین بے ریا پیدا ہوئے ہیں۔ جن کے انفرادی کردار نے اپنے اپنے معاشرے اور اپنی اپنی بستی کے اجتماعی شعور پر کچھ ایسے دور رس اثرات ڈالے ہیں اور انمٹ نقوش مرتب کرنے کی امتیازی کامیابیاں حاصل کی ہیں جو اثرات و نقوش صرف اُنکے انفرادی ایثار کا حصہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اپنے چراغِ وفا میں نمود و نمائش والے علم و دین کو تیل کی طرح جلانے کا حوصلہ خاصانِ بارگاہ کے سوا خود بلند بانگ عالموں اور دینداروں کو بھی میسر نہیں ہوتا۔ اور یوں اُن خاصانِ بارگاہ اور مقبولانِ ازلی کا طرۂ امتیاز اُنکی لاکھ کوشش اخفا کے باوجود اہلِ نظر بہت جلد بھانپ لیتے ہیں، خصوصاً اس حوالے سے کہ بندگانِ خدا کی حقیقی فلاح و بہبود اور نجات و رستگاری ڈھونڈھنے کی تڑپ نے اُن کو ذاتی مفادات کا گرویدہ بنانے رکھنے والے

* ۔ لال بازار۔ سرینگر

نفس سے بعض صورتوں میں برسہا برس تک اور بعض صورتوں میں ہمیشہ کیلئے کنارہ کشی اختیار کرنے کی اعلیٰ مقصدیت والی دیوانگی عطا کی ہوتی ہے۔ نتیجتاً و عملاً شمع کی طرح جل کر شبستانِ احباب کو روشن کرنے کے علاوہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی خلوص و ایثار کی ایسی ایسی مثالیں قائم کر گئے ہیں کہ نوکِ زبان پر اُن کا نام آتے ہی بقدرِ حسیت سامع کا دل و دماغ روشن ہو اُٹھتا ہے۔ کشمیر کی ایسی ہی ممتاز محبوبیت والی اور عہد آفریں روحانیت والی شخصیات میں مقامی سطح پر اُن صدیقی سوز والے دوستِ خدا اور ایک اویسی شان والے عاشقِ رسول ؐ میں حضرت شیخ نورالدین ولی کا نام نامی سرفہرست ہے جن کو اپنے مرشد حضرت میر محمد ہمدانی ؒ فرزندِ ارجمندِ حضرت میر سید علی ہمدانی ؒ) خطِ ارشاد مرحمت فرماتے وقت نہ صرف برادرِ مکرم کہہ کر یاد کرتے ہیں بلکہ اس تعارفی مقالہ کا عنوان بنائے گئے خاص نام یعنی شیخ نورالدین ریشی الکشمیری نام سے بھی اولاً وہی انہیں موسوم کرتے ہیں۔ یوں تو کشمیریوں کے اس خاص معمارِ اخلاق اور مشاطۂ ثقافتِ اسلامی کو ایک ایسے عظیم المرتبت پیشرو کا درجہ حاصل ہے جن کے دوسو سال بعد بھی اور بارہ سو سال بعد بھی "شیخ" ماقبل حروف والے عظیم شیخین کشمیری (خادمانِ دینِ مبین کی حیثیت سے) پورے عالم اسلام سے داد تحسین حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً شیخ شیخان حضرت شیخ حمزہ مخدوم ؒ کے خلیفۂ خاص حضرتِ الیشان شیخ یعقوب صرفی ؒ جو برصغیر کے لاہور اور دہلی جیسے صدر مقامات پر اعلیٰ قدر و منزلت پانے کے علاوہ تاجکستان اور ازبکستان کے تاشقند و بخارا جیسے مراکز ادب و ثقافت پر بھی خاص توقیر و پذیرائی پا کر ایشان یعنے اُستاد محترم کا درجہ پا لیتے ہیں۔ فیضی اور ابوالفضل کو علمی طور مرعوب کرنے والے بھی حضرتِ ایشان ؒ عالم اسلامی کی رگوں میں شعورِ توحید کا نیا خون دوڑانے والے اُن عہد ساز مجددِ الفِ ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی ؒ کے

خاص شیخ المحدیث بن جاتے ہیں، ہاں اُن کے مربی و استاد بن جاتے ہیں جن کی عظمت و عہد سازی کو ماضی قریب کے ایک اور عظیم فرزندِ کشمیر شیخ محمد اقبال (جو خود عالمی سطح پر ایک مثالی نابغہ روزگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں) اانے اس خاص شاگرد دِ صرفی یعنی حضرتِ شیخ احمد سرہندیؒ کی عظمت و عہد سازی کو اپنا خراجِ عقیدت یوں پیش کیا ہے ؎

گردن نہ جھکی اُسکی جہانگیر کے آگے　　جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ آحرار

حضرت ایشانؒ کی طرح بحیثیت شیخ المحدیث پورے عالمِ اسلام کی سطح پر پہچانے جانے والے حضرت مولانا انور شاہِ کشمیریؒ ثم دیوبندی ثم ضیغم اولانی جیسے عظیم معاصرِ شیخ محمد اقبالؒ سے کون واقف نہیں۔ ایسے تمام بلند قامت شیخین کی عظمت اور کارنامے اپنے عظیم پیشرو حضرت نورالدین ریشیؒ المعروف شیخ العالمؒ کے مقابلے میں عالمانہ اور مجتہدانہ اعتبار سے اُس شیخ الاسلامی جیسے عہدۂ خاص کی ذیل میں درج کرنے کے قابل ہیں، جسکی حیثیت اور حدِ اختیار کی ایک مختصر مگر فکرانگیز نشاندہی ڈاکٹر صوفی محی الدین نے اپنی مشہور کتاب کشمیر کے صفحات ۱۶۲، ۴ م۱۶۰ اور ۶۰۵ پر حُسن وخوبی کی ہے اور جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ البتہ حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کی عظمت اور کارناموں کی نوعیت قدرے مختلف ہے کیونکہ آپ کا شیخ الاسلام کے بجائے شیخ العالم کہلایا جانا اُس خاص واعظانہ شعری انداز اور پرتاثیر مبلغانہ ریاضت و نفس کشی کا ماحصل ہے جس کا سلسلہ حضرت شیخ حلاج منصورؒ ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ، حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندؒ، حضرت شیخ سعدیؒ، حضرت مولانا رومیؒ، حضرت میر سید علی ہمدانیؒ اور حضرت شیخ محمود شبستریؒ جیسے اُن عارفانِ باللہ اور سالکان باصفا سے زیادہ ملتا جلتا ہے جنہوں نے اپنی اپنی مادری زبانوں میں شعر کو تبلیغِ دین کا خاص

وسیلۂ اظہار بنا کر ایک عالمگیر زباندانی اور صدائے عرفانی کا شعور بیدار کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کا سلسلۂ شخصیت اویسی الاصل ہونے کے باوجود انہی حضرات کے قبیلۂ خاص سے تعلق رکھتا ہے اور جن دوستوں نے وقتی اُبال کے تحت شیخ مبارک اور شیخ ابوالفضل جیسے "شیخوں" کو اُن کی ذاتِ گرامی کے ساتھ جوڑنے کی حماقت کی ہے اُنہیں تائب ہو کر مولانا رومیؒ کے اس ارشاد گرامی کو پلے باندھنا چاہیئے ؎

اے بسا ابلیس کآدم روے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست

حضرت شیخ نورالدینؒ جیسی باکمال روحانی شخصیت کو پہچاننے یا دوسروں کے ساتھ تقابل میں لانے سے پہلے دل و ذہن کو غسل صحت کرانا اور ان مُبادیات کو ملحوظ نظر بنانا لازمی ہے جنہیں آدابِ معرفت کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ یہ اُنہی آداب کی آگہی کا فیضان تھا کہ عصر خواص نے جہاں اُنکے عرصۂ حیات میں ہی انہیں شیخ العالم قرار دیکر (بعض عُلماءِ سوء کے مقابلے میں امتیاز حاصل ہونے کا) ایک زیرِ لب اشارہ بہم پہنچایا ہے وہاں انہوں نے سالِ وصال کے حوالے سے بھی معاصر عارفوں میں اُنکے امتیاز کو شمس العارفین قرار دیکر واضح تر بنایا ہے ضرورت پڑی تو اِس نکتے کو شیخ موصوف کا سالِ ولادت اور سالِ وفات زیرِ بحث لاتے وقت بھی اُٹھایا جائے گا۔

○ شجرہ نسب: عظیم شاعروں، دانشوروں اور صوفیوں نے اپنے خاندانی سلسلے اور سوانحی واقعات قلمبند کرنے سے اکثر بے نیازی برتی ہے لیکن ان سب میں شامل ہونے کے باوصف حضرت شیخؒ نے یہ ایک بے نیازی نہیں اپنائی بلکہ خاص معاشرتی تقاضوں اور سماجی عوامل کے تقاضوں کو بخوبی ملحوظ رکھ کر بلند بانگ ڈھنگ سے اپنا شجرۂ نسب پیش کرتے ہوئے پوری

سات پشتوں تک اپنے اسلاف کے نام گِنائے ہیں۔ اِس خاص ضمن میں آپکے
لہجے کی بلند آہنگی اور اُس لہجے کے پس پردہ کارفرما رہے ہوتے مذکورہ سماجی عوامل
کو نشاندہی میں لانے سے پہلے وہ شجرہ پیش کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے جو
کلامِ شاعر کی داخلی شہادت جیسے بہترین ماخذ سے یوں برآمد ہوتا ہے کہ کشتواڑ
کے سنز اور سنگھ کہلائے جانے والے جو راجپوت بطور سین مقامی سطح پر معروف
رہے ہیں وہ کشمیریوں سے پہلے کشمیر کو طوائف الملوکی کا شکار بنانے والے
آخری ہندو راجگان کے سلسلہ (راجہ سہدیو اور اُدیان دیو) تک پہنچ کر ختم ہو گیا
ان کے ہی ایک رشتہ دار نے ایک بزرگ مہا سین کشتواڑی کی نسبت سے سین کو
سِنگھ سے بدل دیا جبکہ عوامی سطح پر سین قبیلے کے ایک رشتہ دار سلسلے کو سنز نام
سے جانا جاتا تھا کیونکہ انہیں قلعوں کی نگرانی کا خاص منصب تفویض ہوتا رہا تھا۔
عشرت کاشمیری نے اپنی تاریخِ کشتواڑ میں تبدیلی کا ذکر یوں کیا ہے "شنگرام
سنگھ کشتواڑ کا پہلا راجہ ہے جس نے اپنے نام کے ساتھ سین کی جگہ سنگھ استعمال
کرنا شروع کیا" (ص ۳۸) موتی لال ساقی نے حضرتِ شیخ کے جدِ اعلیٰ اوگرا سنز
کا تعلق سورج ونشی خاندان کے ساتھ ظاہر کرنے کے علاوہ اُسکے ایک چچا کا
تعلق راجہ سہدیو کے دربار سے ہونے کا امکان بھی ظاہر کیا ہے اور اُس کا نام بھی زنگا سنز
رکھا ہے جو بقول ساقی وہ ترک حملہ آور ذُلچو کے ہاتھوں مارا گیا۔ تاہم اسکی نسل آگے بڑھی
اور حضرت شیخ تک پہنچی (دیکھئے اکیڈمی کا نندہ ریوش ص ٦) لیکن ساقی صاحب کا یہ
متوازی شجرہ حضرت شیخ کے خود فراہم کردہ شجرہ کے ساتھ میل نہیں کھاتا ہے۔ کیونکہ وہ
یوں مرتب ہوگا۔

ساقی صاحب کا مرتب کردہ شجرہ نسب

(۱)

زنگاشنز

(۲)

ہُنرشنز

(۳)

گرزناشنز

(۴)

سلرشنز

(۵)

نُنداشنز

عہد حاضر کے اس شجرے کی ذیل میں بیان کی گئیں کئی اور باتیں بھی محل نظر ہیں البتہ پہلے ہم اس کے مقابلے میں اصلی اور دُرست ترین شجرے کو نظر میں رکھیں گے وہ یہ ہے

خود حضرت شیخؒ کا مرتب کردہ شجرہ نسب

(۱)

اوگراشنز

(۲)

درپتاشنز

(۳)

زنگاشنز

(۴)

سُنہرشنز

(۵)

گرزاشنز

(۶)

سلرشنز

(۷)

نُنداشنز المعروف نندہ ریشی

(شیخ نورالدین ریشیؒ)

———★———

اب اِس ضمن میں کلام شیخ العالمؒ کی بُلند آہنگی کا تھوڑا سا اندازہ اِس کے ترجمے سے بھی لگائیے ازاں بعد اس لہجے کے سماجی عوامل کو محسوس کیجئے۔ کہا ہے ؎

جد مِثون بگن ودّن اوگرا سنز اوسو

(معتبر ذرائع کا کہنا ہے کہ میرے جدِ اعلیٰ کا نام اوگرا سنز تھا)

سنت پتہ رُودُس درپیتا شنز

(اسکی پُشت سے جو بیٹا صاحب اولاد ہوا وہ درپتا شنز تھا)

درپتا شنز سِس سمے ییلہِ دوتو

(جب درپتا شنز کی وفات کا وقت آن پہنچا)

پوّت پتھ رُودس زنگا سنز

(تو اُسکی ایک ہی نرینہ اولاد رہی جس کا نام زنگا سنز تھا)

زنگا شنز ییلہِ زُن اندر موّرو

(زنگا شنز جب لڑائی میں کام آیا)

پتھ تس رُودُس شہنز سنز

(تو اُس کا وارث سہز سنز نام کا بیٹا بنا)

سہز سنز س سنت کم دوّپتو

(سہز شنز کے ہاں بیٹے کئی پیدا ہوئے لیکن)

اکھ شنز رُودُس گرزا سنز

(گرزا سنز نام کا ایک بیٹا بچا)

گرزا شنز س سلر تہٕ شلوٗ

(گرزا سنز کے دو بیٹے تھے ایک سلر سنز دوسرا سلو شنز)

سلرن ئۂ چھُس نُندا سنز

(اور سلر سنز کا ہی بیٹا میں نُندا سنز ہوں)

تفصیلاً شجرہ مرتب کرنے کے بعد حضرت شیخ کی جو بلند آہنگی آپکے لہجے کو بہت معنی خیز بناتی ہے وہ ہے ۔

سنزی چھُم مول تے سنزی چھُم موجی

(سنز (راجپوت) ہی میرا باپ اور اسی معزز رہتے خاندان سے میری ماں کا تعلق ہے۔)

کل تھاو کول میون چھُی سنزی ہو

(پس اے باتیں بنانے والے پورے ہوش و حواس سے سُن کہ میرا قبیلہ اور خاندان راجپوتوں سے تعلق رکھتا ہے۔)

یعنی اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ جانے تم زبان درازی سے کام لیکر مجھے اور میرے باپ کو اسلام قبول کرنے پر کس کس قسم کے طعنے دیتے ۔اصل میں سلطان صدر الدین ریخچن شاہ کے عہد سے سلطان سکندر کے عہد تک بڑے پیمانے کی تبدیلی مذہب (MASS CONVERSION) اور ہمہ گیر تحوّلِ معاشرہ ALROUND SOCIAL TARANSFORMATION) کسی زور زبردستی اور جبر و اکراہ کے بغیر وقوع پذیر ہوتے دیکھ کر قدامت پرست اور مختلف دھرمی آستانوں کے اجارہ دار ایسے غیر مسلموں کو بہت برا بھلا کہتے اور مختلف الزام تراشیوں سے ان کی کردار کشی کرتے جو دل سے اسلام کے شیدائی بن کر نیا مذہب قبول کرتے۔

(۲) شجرۂ نسب : جن لوگوں کو نومسلموں کے جوشِ ایمانی کا کچھ اندازہ ہوگا اور تفہیم دین کے لئے اُنکی دلی خواہش و ذاتی کاوش کا کچھ اندازہ ہوگا وہی اپنی ولادت سے صرف چند برس پہلے مسلمان ہو گئے ہوتے والدین کے اُس فرزند ارجمند کے نازِ توارث

اور اعتمادِ عقیدہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں جنکی روحانیت کو پروان چڑھانے کے لئے ایک سے زیادہ قِران السعدین تاریخِ کشمیر کے حصے میں آ گئے تھے۔ یا بالفاظِ دیگر جیسے عظیم المرتبت مبلغ دین حضرت سیّد حسین سمنانیؒ اور اُن سے فیضِ ایمان پانے والی عظیم عارفۂ کشمیر لل دید اُنکے والدین کی پیشگی تربیت کے لئے مامور ہو گئے تھے اور اُس یکتائے روزگار سعادتمند نومولود کی اوّلین روحانی تربیت بھی ان ہی دو بزرگوں کی نگہداشت میں ہونے کے بعد اُسکی تکمیل تربیت کے لئے ان سے بلند تر دو روحانی شخصیتیں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ اور ان کے فرزند میر سیّد محمد ہمدانیؒ کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔

کشمیر میں شیخ العالمؒ سے پہلے اس طرح کا ہدف بننے والوں میں سے دو بڑی مثالیں کوتہ رانی اور شری کنٹھ کی تھی جہاں اجارہ داروں کی مُہم طعنہ زنی بڑی کارگر رہی تھی چنانچہ اوّل الذکر سلطان صدرالدین ریچن شاہ کی وفات کے بعد اسکی تاب نہ لا کر ہندو مت میں واپس آگئی اور موخر الذکر کچھ دیر کیلئے کشمیر چھوڑ کر سمرقند بھاگ گیا۔ اِسکے بھاگنے کا سبب تاریخ واقعات کشمیر میں یوں بیان کیا گیا ہے " شیخ سلیمان ہندوؤں کے ایک بڑے طائفہ (برہمن طائفہ) سے تعلق رکھتا تھا اور شری کنٹھ نام رکھتا تھا۔ خداداد عقل اور جذبے نے اُس کو اسلام قبول کروایا بلکہ چھپے چوری مدرسہ اسلام میں جاکر حافظِ قرآن بن گیا۔ لیکن اپنی قوم کے خوف (خوفِ حملہ و طعنہ زنی) سے اُنکے اطلاع پانے سے پہلے ہی سمرقند بھاگ گیا اور اسلامی علوم میں بڑی مہارت حاصل کرلی۔ (ص ۴۰) یاد رہے کہ یہ وہی شیخ سلیمان ہیں جن کو حضرت شاہ ہمدانؒ نے نہ صرف اعلیٰ تعلیمی عہدہ سونپا تھا بلکہ اُنکے قابل بیٹے یعنی شیخ احمد خوشخوان کو بھی اوّلین اسلامی کالج میں اعلیٰ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہی آزمودہ حربہ سلطان سکندر کے عہد میں دو خاص با اثر نومسلموں پر بھی آزمایا گیا لیکن یہاں نہ کوئی دینِ

اسلام ترک کرنے پر آمادہ ہوا اور نہ کوئی کشمیر سے بھاگنے پر بلکہ اس کے بالکل برعکس ایک نے (قبولِ اسلام کے بعد) سہہ بھٹ سے ملک سیف الدین بن جانے کے بعد اُن کے خلاف برابر کا جوابی حملہ کر کے ان کی ناک میں دم کر دیا جبکہ دوسرے نے نُند ا سنز سے شیخ نورالدین بن جانے کے بعد گاؤں گاؤں محلہ محلہ گھوم پھر کر اُنہیں اسلام کی برکتیں سمجھانے کا مشفقانہ بیڑا اُٹھایا۔ وہ اور باتوں کے علاوہ انہیں ذات پات کے غیر انسانی سلوک سے باز رکھنے کی پُر شفقت کوشش کرتے رہے مثلاً ایسے ایسے "شرکی" تخلیق کرتے رہے جو اپنی زبان میں ہونے کے ناطے بھی اور نورانی قرآنی اثر کے ناطے بھی سخت سے سخت دل کشمیریوں کے دلوں میں اُتر جاتے تھے۔ یوں گویا سادات کے شروع کئے ہوئے تبلیغی مشن کیلئے شیخ نورالدینؒ کا وسیلہ اظہار اللہ کی کھلی اور بروقت مدد کا درجہ پاتا رہا چنانچہ چند معترضین کے بغیر بیشتر طعنہ زن یکے بعد دیگرے شیخ العالمؒ کے ہمنوا بنتے گئے۔ شیخ نورالدینؒ کا ہم مرشد اور ہم عصر ملک سیف الدین اتنی تبلیغی زحمت کیونکر برداشت کرتا کیونکہ وہ میر سید محمد ہمدانیؒ کا سسر بن سکنے کا ہی فخر نہ رکھتا تھا بلکہ سلطان سکندرؒ جیسے پابندِ شریعت بادشاہ کا وزیر اعظم اور فوجی سربراہ بن سکنے کا شرف بھی اپنی خداداد قابلیت سے حاصل کر چکا تھا اور وہ ہر دین دشمن کاروائی کو نقصِ امن کی نگاہ سے دیکھ کر فوری سرکوبی سے نہ ہچکچاتا تھا۔ پھر وہ اپنی اپنی اجارہ داریاں قائم رکھنے کے لئے ذات پات کی وکالت کرنے والوں کے طعنے کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے شیخ نورالدین کی طرح افہام واستدلال کے لئے اپنے آپ کو مکلف نہ سمجھا۔ اُس نے طعنہ زنوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیکر اُنکا قافیہ تنگ کر دیا تھا جس کی تفصیل مختلف تاویلات کے ساتھ تاریخوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ البتہ اسی پس منظر میں سراپا شفقت حضرت شیخ العالمؒ نے قرآنی تعلیمات کو اپنے لئے اور اپنے ہم زبانوں کے لئے

حرزِ جان بنانے کی کوشش کرتے ہوئے خاندانی تکبّر اور ذات پات کے ہر تصوّر کی بیخ کنی کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ مثلاً ایک "شرک" میں کہتے ہیں۔ ؎

حضرت بابہ آدم مولو

(حضرت باوا آدمؑ ہم سب کا مُشترکہ ابوالآباء ہے)

ماجہِ حوا تِتھی آرام

(اُسی کی عظمت کے زیرِ سایہ حضرت اُمِ حوا کو راحت نصیب ہوئی)

ادہ کتہِ ووپُدڈونب تہٕ ژٕژ ولو

(اس واضح عقیدہ اور نظریہ کے ہوتے ہوئے پھر کہاں گنجائش رہتی ہے کسی ذات پات کے نظریئے کی۔)

کوس ہم کول کیا دِیہ پام

(اس عظیم عقیدے کی رُو سے ہم سب ایک ہی قبیلے کے فرد ہیں اسلئے کسی کو نیچ سمجھنا عقل کا دیوالیہ پن ہے)

دوسرے "شرک" میں "پدرم سلطان بود" والے نظریئے کے تحت خاندانی برتری جتلانے والوں کو بڑی شفقت سے رعونت چھوڑنے کا مشورہ یوں دیتے ہیں۔ ؎

کول مولگی رنگن تہٕ سنگن

(خاندانیت کا زعم ذہنی اور روحانی برتری ڈھونڈھنے والوں کو ساتھ دینے والی شے نہیں)

کول مو ہنگن لیکھنے آو

(قبیلے اور خاندان کا نام کسی کے ماتھے پر لکھا نہیں ہے اور نہ لکھنے کی چیز ہے۔)

کول موا شُد لگی انگن

(قبیلے کا نام جپنے سے کسی کے دُکھتے اعضایا دکھتی رگوں کا مداوا ہرگز نہیں ہو سکتا)

گارن عمل تہٕ کول کتہٕ آو؟

(آخرت میں تو قبیلے کا زعم بالکل ہی بیکار چیز ہو گی کیونکہ وہاں اعمال کو دیکھیں گے پس کہاں سے آئی خاندانیت؟)

بہر حال سات پشتوں تک اپنا شجرۂ نسب اتنی بلند آہنگی سے بیان کرنے کا مقصد اُس وقت کے تغیر پذیر کشمیری سماج کے تناظر میں دیکھنے کی دعوت دینے والے ترجمانِ قرآنِ مبین حضرت شیخ نور الدینؒ حسب و نسب کی بڑائی جتلانے کے اور ذات پات کے نام پر تنفر یا تفرقے پھیلانے کے اُتنے ہی کٹر مخالف رہے ہیں جتنے وہ توحید پرست ہونے کے ناطے شرک اور بدعات کے کٹر مخالف رہے ہیں۔ ذات پات کی بیخ کنی کرنے کے کئی اور تبلیغی اظہارات اُن کے عارفانہ کلام میں غور کرنے سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً یہ "شرک" ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

ذات گرٕ شتھ کیا چھے سُودا؟

(اے ذات پات کے پجاری کیا فائدہ ہے تمہیں لوگوں سے اُنکی ذات پوچھنے میں)

ذات گرٕ شتھ کیا مُدعا چھے؟

(مجھ پر تمہارے اس حماقت بھرے استفسار کا مُدعا واضح نہیں ہو پایا)

تہٕ نوتھو نے قبیلہ جُدا

(ذرا ہوش کے ناخن لے جہاں تجھے حساب دینے کے لئے جانا ہے وہاں نسب کی بنیاد پر تیرا قبیلہ الگ نہیں رکھا جائے گا۔)

سارنے خالق خدا چھُے

(سب کا خالق خدا ہے)

نسبی لحاظ سے آخرت میں کوئی انتخاب عمل میں نہ آنے کی بات سمجھانے والے حضرت شیخ العالمؒ وہاں اچھے اعمال اور برے اعمال کی بنیاد پر اصحابِ یمین (جن کو دائیں ہاتھ میں اپنا اپنا نامۂ اعمال دیا جائے گا) اور اصحابِ شمال (جن کو بائیں ہاتھ میں اپنا اپنا نامۂ اعمال تھمایا جائے گا) کا انتخاب عمل میں آنے کی ہیبتناک گھڑی یاد دلاتے ہیں یہ کہہ کر ؎

رِژ رِژ یا ژھن یوٗن کُن ژارن   بے چھُم لگہٕ نا کارن ستی

ندامت دیکھئے کہتے ہیں جس گھڑی وہاں اچھوں اچھوں کو مرتبہ وار چُن لیا جائے گا مجھے اندیشہ ہے کہ میں اچھے اعمال کی کمی کے باعث کہیں اُس وقت بُروں کے ساتھ اُٹھایا جاؤں گا۔ نسبی رعونت والوں کی ذہنی جاروب کشی اور اصلاح کرنے والے شیخ نورالدینؒ ذات پات کی بیخ کنی کو اپنی عارفانہ شاعری کا ایک مستقل موضوع بنا کر زیادہ سے زیادہ غیر مسلموں کو اُس اسلامی اصولِ تقویٰ کا گرویدہ بناتے گئے جس کی واضح نشاندہی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ یعنے "تم میں بڑا وہ ہے جس کے دل میں خوفِ خدا اور زیادہ نیکی کا جذبہ ہو" کہہ کر کی گئی ہے۔ قرآنی باتیں عربی سے لے کر میٹھی کشمیری میں منتقل کر کے اپنے ہم زبانوں کو سنانے والے شیخ العالمؒ کشمیر کا سب سے بڑا سماجی انقلاب بپا کرنے میں نہایت اہم رول انجام دے سکے ہیں۔ نسبی رعونت والوں کے لئے ان کے اصلاحی پیغام کی تان ایسے الفاظ پر بھی ٹوٹتی دکھائی دیتی ہے ؎

ذات چھےٗ دپان ذات یُس ژھُنی

(ذاتِ باری تمہیں (قرآن میں) یہ بات بخوبی سمجھاتا ہے کہ جو بھی ابنِ آدم ذات پات کی بات سنے گا اور ملانے گا،

تس عقل تے بو دٲنی مو

(جان لو شعوب وقبائل کو صرف پہچان کا ذریعہ قرار دینے والے اللہ کی نظر میں) وہ عقل اور سمجھ سے عاری ہے)

اُلگ ذات چھٔنے نکس کَنی!

(اس دُنیا میں (ایک اللہ کے بندے اور ایک آدم کی اولاد ہونے کے ناطے) ہر کسی کی ایک ہی انسانی ذات ہے)

پُلگ ذات کٲنسہِ کُنی مو

(البتہ اس دنیا آخرت میں نیک اور بُرے اعمال کے اعتبار سے کوئی فرد کسی ایک ذات کا نہیں ہو سکتا کیونکہ لوگوں کے اعمال کے مراتب ومدارج وہاں بالکل الگ الگ ہوں گے)

یوّد بوٗ سے آسی اِسلامنی

(اگر تجھ پر اُخوتِ اسلامی کا نکتہ روشن ہو جائے تو (ق بِالمومِنِینَ اِخوانا کی بدولت))

توٗہ کھوتہ ذٲتز کانٛزھ پٔرنی مو

(اُس صورت میں تجھ سے روشن ذات والی کوئی مخلوق نہیں ہو سکتی)

یہ ہیں اپنے شجرۂ نسب اور اُس وقت کے کشمیر پر حاوی نظریۂ ذات پات سے متعلق حضرت شیخ العالمؒ کے آفاقی اور عالمگیر خیالات جن میں سے بیشتر دقیانوسی حسب ونسب کی رعونت پر اترانے والوں کا توڑ کرنے کے لئے شاعرانہ فصاحت کے ساتھ کہے گئے ہیں۔

کشمیر کے سارے دستیاب تذکروں کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ بات بخوبی سمجھ آجاتی ہے کہ حضرت شیخ نور الدینؒ کے حالات اور کارناموں پر تیار کی گئی جو

سب سے قریب العصر اور اہم دستاویز سلطان زین العابدین بڈشاہ (۸۲۳ھ ۱۴۲۰ء تا ۸۷۴ھ ۱۴۷۰ء) کے ملک الشعراء ملا احمد کشمیری کی "مراۃ الاولیاء" نامی کتاب کی شکل میں معرضِ وجود میں آگئی تھی۔ اس کی عدم دستیابی کے سبب اس موضوع سے متعلق تین بنیادی اہمیت کے ماخذ ہیں۔ ۱۔ حضرت شیخ حمزہؒ کے خلیفہ بابا داؤد خاکیؒ کا منظوم ریشی نامہ المعروف قصیدۂ لامیہ۔ ۲۔ حضرت خاکیؒ کے خلیفہ بابا نصیب الدین غازی کشمیریؒ کا نثر و نظم پر مشتمل نور نامہ المعروف کتابِ مناقب۔ ۳۔ بابا نصیبؒ کے خلیفہ بابا داؤد مشکواتیؒ کا نثر و نظم پر مشتمل "اسرار الابرار" نامی تذکرۂ اولیاء۔

شاید بیشتر محققین اس بات سے بخوبی واقف ہونگے کہ بابا داؤد خاکیؒ (۹۲۸ھ ۱۵۲۱ء۔ ۹۹۴ھ ۱۵۸۵ء) کا ریشی نامہ اصل میں شیخ نور الدینؒ کے حالات و کرامات نظم کرنے کے برعکس بابا موصوف کے ایک ہم عصر ولی بابا ہردی ریشیؒ کے حالات و کرامات نظم کرنے کے لئے مخصوص رہا ہے۔ اور ان کا تعلق حضرت شیخ نور الدینؒ کے سلسلۂ ریشیان سے ہونے کے ناطے صرف تمہیداً شیخ العالمؒ کا مختصر توصیفی ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً اس شعر سے آغاز کلام کرنے کی غرض سے بحیثیتِ بانیٔ سلسلہ اُنکو یوں پیش کرتے ہوئے ؎

شیخ نور الدین ریشیؒ پیرِ جمع ریشیاں
زاہدے خوش بود و با حق داشت بسیار اشتغال

ظاہر ہے کہ یوں بابا خاکیؒ نے شیخ موصوف سے متعلق تفاصیل بہم نہ کرکے اولین دستیاب ماخذ پیش کرنے کا موقعہ کھو دیا ہے۔ البتہ یہ بات قرین قیاس لگتی ہے کہ انہوں نے ہی اس امر کی تلافی کے لئے اپنے خلیفۂ خاص بابا نصیبؒ کو ایک مفصل نور نامہ لکھنے کی تحریک دی ہوگی اور یوں حضرت شیخ العالمؒ پر تحقیق و تحسین کاری کا شوق رکھنے والوں کے لئے اولین دستیاب ماخذ کی فضیلت

بابا نصیب الدینؒ کے نور نامہ کے حصے میں آگئی ہے۔ ریشی نامہ یا قصیدۂ الامیہ ۹۸۶ھ میں لکھے جانے کے مقابلے میں ابوالفقرا بابا نصیبؒ (۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء تا ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء) کا نور نامہ تقریباً پچیس سال بعد ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء کے آس پاس مکمل ہوگیا ہے۔ بابا نصیبؒ کے مرید خاص بابا داؤد مشکواتی کا "اسرار الابرار" نامی تذکرۂ ریشیان نور نامہ کے تیئیس سال بعد ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء کے آس پاس مکمل ہوگیا اسلئے آخر الذکر دو تذکروں کے درمیان زیادہ بُعد زمانی حایل پھر بھی ان دو میں ماخذوں کی حیثیت سے شیخ العالمؒ کا سالِ ولادت درج کرنے میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے جس سے ایک اور اہم واقعہ سے متعلق یعنے خود امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ جیسے معمار ثقافت کشمیر کے ساتھ اس اہم روحانیت پرور فرزند کشمیر کی مُلاقات کا واقعہ مختلف مباحث کی لپیٹ میں آنے کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے چنانچہ بابا نصیبؒ نے جہاں شیخ العالمؒ کا سالِ ولادت ۷۷۹ھ اور سالِ رحلت ۸۴۲ھ اپنے کسی ماخذ کا نام لئے بغیر درج کرلیا ہے۔ وہاں اُنکے مرید بابا داؤد مشکواتیؒ نے حضرت شیخ موصوفؒ کا سالِ ولادت ۷۵۷ھ اور سالِ وفات ۸۰۸ھ مرشد کی طرح ہی اپنے کسی ماخذ کا نام لئے بغیر درج کرلیا ہے۔ لہٰذا محققانہ پذیرائی کے لئے دونوں کی حیثیت ایک جیسی ہے۔ البتہ مرشد کے حقِ تقدم اور مرتبہ کو ملحوظ رکھکر بعد کے بیشتر تذکرہ نویسوں نے بابا نصیبؒ کی پذیرائی کو ایک گونہ اخلاقی فرض سا سمجھ لیا ہے۔ مثلاً اولیائے کشمیر کا سب سے بلند مرتبہ "فتحات الکبرویہ" کے نام سے ۱۱۶۳ھ میں لکھنے والے شیخ عبدالوہاب نوری نے ان دونوں واقعات پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ کے عالمگیر موضوعات کی طرح آخرت میں اُنکے علمدارِ کشمیریاں بن جانے کی امتیازی شان بھی قابلِ فہم بن جاتی ہے۔ شیخ نوری کا صرف ترجمہ پیش ہے۔

"جن دنوں بابا داؤد خاکیؒ اپنے مرشد حضرت محبوب العالم سلطان مخدوم

شیخ حمزہؒ کے ارشاد کی تکمیل میں پرگنہ کھویہامہ (کوہیاموں) کے شنکہ بال نامی مقام پر لمبی چِلہ کشی کی نیت سے گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ انہی دنوں کے دوران ایک رات اُنکے دل پر یہ (استفہامیہ) خیال حاوی رہا کہ (اگر ہر بستی اپنے سب سے ہمدرد روحانی خیر خواہ اور علمدار کے ساتھ مِیدانِ محشر میں اٹھائی جانی از روئے مشیت مطلوب ہے تو) کشمیر کی بستی کے لوگ کس بزرگ شخصیت کے علم کے زیرِ سایہ اٹھائے جائیں گے۔ اُسی رات حضرت رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خواب میں اپنے جلوۂ عالمتاب سے نواز کر یہ فرمایا کہ روزِ قیامت کے لئے کشمیریوں کا علمدار اور سلطانِ کشمیر شیخ نورالدینؒ کو مقرر کرلیا گیا ہے۔ گویا اس خطے کے لوگ اُنکی علمداری میں ہی اُٹھائے جائیں گے۔

بابا داؤد مشکواتیؒ نے (بابا خاکیؒ کے اس بیان کی روایت کرنے کے علاوہ) یہ بھی کہا ہے کہ حضرت امیرؒ کے ساتھ شیخ العالمؒ کی ملاقات مشہور رہے لیکن امیر سے یہاں (میر سیّد علی ہمدانی کے بجائے) میر سید محمد ہمدانیؒ مراد لیا جانا چاہیئے کیونکہ تاریخی کتابیں اسی بات پر متفق ہیں اور ابوالفقرا بابا نصیبؒ نے نور نامہ میں جہاں انکے درمیان (ملاقات) مجلس آرائی کا ذکر کیا ہے وہاں انکی مُراد بھی میر سیّد محمد ہمدانیؒ ہی ہے۔ دراصل کاتب نے غلطی سے میر سیّد علی ہمدانیؒ لکھا ہے۔ اسی طرح سے کچھ لوگوں کا شیخ نورالدینؒ کی ولادت کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کا سالِ ولادت ۷۵۷ھ ہے اور سالِ وفات ۸۰۰ھ جبکہ ابوالفقرا بابا نصیبؒ نے نور نامہ میں اُن کا سالِ ولادت ۷۷۹ھ اور سالِ وفات ۸۴۲ھ بتایا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخؒ کے مقبرہ پر بھی یہی تاریخیں درج کی گئی ہیں"۔

● ——— (فتحات الکبرویہ ورق ۱۳۵ ب/۱۳۶ الف)

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری (۱۱۰۳ھ - ۱۱۷۹ھ) نے اپنی مشہور تالیف "واقعات کشمیر" میں "اسرار الابرار" میں سالِ ولادتِ شیخ ۷۵۷ھ ہی درج کیا ہے لیکن سالِ وفاتِ شیخ سنہ ۸۲۰ھ دکھایا ہے۔ ایسا "فتحات الکبرویہ" کے الفاظ میں درج سنہ ہشتصد وہشت میں کتابت کی غلطی ہونے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور "واقعات کشمیر" کا اندراج ہشتصد وبیست ہی "اسرار الابرار" کی عبارت کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھنے کے علاوہ حضرت شیخ العالمؒ کی عمرِ شریف بیشتر بزرگانِ دین کی طرح ۶۳ سالہ قرار دیئے جانے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف سے مماثلت جو یانہ عقیدت رکھنے والوں کی نظر میں بھی قابلِ غور ہے۔ مورخ حسن نے بھی اپنی مشہور تاریخ کے حصہ اولیاء (اسرار الاخیار) میں بابا داؤد مشکواتی کی "اسرار الابرار" میں تاریخِ وفاتِ شیخ کی پذیرائی کی ہے۔ ان تاریخوں کی پذیرائی کرنے سے جہاں حیاتِ شیخ العالمؒ کے بیشتر زبان زدِ عوام واقعات پر نظر ثانی کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے وہاں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ، حضرت سید حسین سمنانیؒ اور للہ عارفہ کے ساتھ شیخ العالمؒ کے ملاقی ہونے اور اکتساب فیض کرنے کے بہت سے پہلو زیادہ تابناک دکھائی دینے لگتے ہیں۔ البتہ اختلاف رائے کے اِن مباحث کی روشنی میں حیاتِ شیخ مرتب کرنے والے محققین کو عوامی عقیدے میں رچے بسے خیالات بدلنے اور کراماتی بیانات کی اصلیت بیان کرنے سے بہتر وہ عافیت کوشی دکھائی دی ہے جن کا مظاہرہ عبدالاحد آزاد جیسے ایک روشن دماغ اور پر خلوص محقق کو بھی اپنی کتاب "کشمیری زبان اور شاعری میں" ذکر شیخ العالمؒ کی تمہید باندھتے وقت کرنا پڑی ہے۔ اس تمہید کا ایک اقتباس حیات شیخ العالمؒ پر نظر ڈالتے ہوئے کیا جائے گا۔ یہاں پر اتنا ہی کہہ دینا کافی ہو گا کہ آزاد موصوف نے جہاں ابوالفقرا بابا نصیبؒ کے بیان کی پذیرائی کر کے اُنکے فارسی الفاظ کو ولادتِ شیخ العالمؒ سے متعلق اردو الفاظ

کا جامہ یوں پہنایا ہے۔ "اُس سرمایۂ سعادت (حضرت شیخ نورالدینؒ) کی ولادت سلطان قطب الدین کے نویں سالِ جلوس قریۂ کیموہ میں چھ جمادی الاوّل ۷۷۹ ہجری کو ہوئی۔" وہاں آزاد نے نہ صرف اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کیا ہے کہ سلطان قطب الدین کا پہلا سالِ جلوس ۷۷۵ھ ہجری مطابق ۱۳۷۳ء ہے اور اس لحاظ سے ۷۷۹ھ ہجری سلطان قطب الدین کا نواں نہیں بلکہ صرف چوتھا سال جلوس ہے اور اگر واقعتاً ولادت شیخ کو نویں سال جلوس کا ہی معاملہ قرار دیا جانا مطلوب ہو تب ۷۷۹ھ کے بجائے ۷۸۴ھ کو سالِ ولادت ماننے کی مجبوری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تاریخی واقعات کے باہم ٹکرانے کی پرواہ کئے بغیر اسی تاریخِ ولادت کی بنیاد پر آزاد نے نہ صرف حضرت شیخؒ کے بارے میں یہ ذیلی عنوان جلی حروف میں تحریر کرنے کے قابل گردانا ہے کہ "حضرت میر سید علی ہمدانیؒ سے ملاقات" مسلّم ہے بلکہ اسکی ذیل میں مطلوبہ واقعہ یوں پیش کیا ہے "جب میر سید علی ہمدانیؒ دوسری دفعہ کشمیر تشریف لائے تو ایک دن موضع کیموہ (تحصیل کولگام) جہاں حضرت شیخؒ سکونت کرتے تھے، پہنچے۔ شیخ کی عمر اُس وقت سات برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ ایک کریوہ پر ایک اونچی جگہ پر بیٹھے تھے۔ حضرت امیرؒ نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑا اور شیخ کے پاس گئے۔ شیخ آداب بجا لا کر متواضع بیٹھے حضرتِ امیرؒ دیر تک شیخ کو اسرارِ باطنی سے آگاہ کرتے رہے۔ حضرت امیرؒ کے ساتھیوں میں غلام الدین موذن ایک تھے۔ اُن کے دل میں حضرتِ امیرؒ کے اس رویہ سے بُرے جذبات ابھرنے لگے۔ ابھی اس کے دماغ میں یہ خیالات گھوم ہی رہے تھے کہ سید پاک آگئے اور غلام الدین موذن سے یوں مخاطب ہوتے ——— اے غلام الدین ان غلط قسم کے اوہام کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ حقائق شناس لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی خود گمراہی کے گڑھے میں گر جائے گا۔ اور یہ معصوم جو تمہاری نظر

میں حقیر ہے، ایک ایسا سورج ہے جو مائل بہ رفعت ہے ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تو اس کا مرید بننے کی خواہش کرے گا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت امیر کبیرؒ اپنے وطن واپس تشریف لے گئے۔ رحلت فرمانے کے وقت اپنے فرزندِ ارجمند میر محمد ہمدانیؒ کے نام کشمیر جاکر حضرت نورالدین ریشیؒ سے ملنے کی وصیت تحریر فرماکر اپنے مرید خاص شیخ قوام الدین کے حوالے کر دی۔ حضرت امیرؒ کا سالِ وفات "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے حاصل ہوتا ہے یعنی ۷۸۶ھ ہجری۔

● ــــــ (کشمیری زبان اور شاعری ج ۲ ص ۱۸۰/۱۸۱)

عبدالاحد آزاد نے مذکور بیان آنکھیں بند کر کے نقل ہی نہیں کیا ہے بلکہ سہل انگاری، عافیت کوشی اور مورخانہ بے بصری کو بھی اپنی قد آور شخصیت پر منڈلانے کی دعوت دی ہے چنانچہ ایک سرسری تجزیئے کی رو سے وہ اس ایک ہی اقتباس میں کئی محلِ نظر باتیں بیان کر گئے ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر کو اپنے ماخذ نورنامہ سے من وعن نقل کرنے کا احساس دلاتے ہیں مثلاً:

● ــــــ یہی حضرت شیخ کی ولادت ۷۷۹ھ میں ہونے کے باوجود سلطان قطب الدین کے نویں سال جلوس میں ہوئی ہے۔

● ــــــ یہ کہ میر سید علی ہمدانیؒ جب دوسری بار کشمیر تشریف لائے تو وہ حضرت شیخؒ سے عہدِ طفولیت میں ہی ملے اور ان کے ساتھ اسرار باطنی پر کافی دیر تبادلہ خیال کیا۔ شیخ العالمؒ جیسے ممتاز روحانی نابغے کے ساتھ کم عمری میں ایسا تبادلہ ہو سکنے میں کوئی کلام نہیں۔ اصل استفسار حضرت امیر کے تین بار کشمیر تشریف لانے اور دوسری بار کی تشریف آوری کے دوران حضرت شیخ سے ملاقی ہونے اور اُس وقت انکی عمر صرف سات سال ہونے سے ہے جو تذکرہ نویس اور مورخین حضرت امیرؒ کی سہ بارہ کشمیر نوردی کے قائل ہیں وہ متعلقہ تین سالوں کا تعین اس طرح سے کرتے ہیں:۔

• حضرت امیرؒ کی پہلی کشمیر نوردی سلطان شہاب الدین کے عہد میں ۷۷۴ھ / ۱۳۷۲ء کے دوران سات سو مبلغین و سادات سمیت۔[1]

• حضرت امیرؒ کی دوسری کشمیر نوردی سلطان قطب الدین کے عہد میں ۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء کے دوران آکر سب سے لمبا قیام تقریباً ۲½ سال۔[2]

• حضرت امیرؒ کی تیسری کشمیر نوردی سلطان قطب الدین کے عہد میں ۷۸۵ھ / ۱۳۸۳ء کے دوران سب سے مختصر قیام بوجہ علالت۔[3]

اب اگر یہ بات مان لیں کہ دوسری کشمیر نوردی کے آغاز میں ہی حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ حضرت شیخ سے خاص شفقت کے ساتھ ملتے ہیں اور اُن سے اسرار باطنی بیان کر کے انہیں کم سنی میں ہی اپنا ہمراز بنا لیتے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اپنی علمداری کو بھول کر جو شیخ نورالدینؒ آخری عمر تک حضرت امیرؒ کے ساتھ داخل جنت ہونے کی دُعائیں مانگتے رہیں۔ ؎

نندہ ریوِشں عرض کرِ شاہِ ہمدانس   جنتس ہیٚزہ م پانسں ستیٚ[3]

وہ مرشد کامل کے اڑھائی سالہ قیام کشمیر کے دوران بار بار انکی قدموسی کے لئے حاضر نہ ہو جاتیں۔ خاص طور پر اس عرصے میں کشمیر کے مختلف علاقوں میں حضرت امیر کبیرؒ کے تبلیغی دورے مشہور ہونے کے علاوہ موجودہ خانقاہ معلےٰ کے مقام پر (مورخ حسن کی رُو سے) وہ دو چلّے گزار کر عقیدتمندوں کو کھلے عام اپنے دیدار اور کردار ساز گفتار سے نوازتے رہتے کی باتیں بھی تو مشہور ہیں جن سے حضرت شیخؒ جیسے نابغہ اپنے آپ کو بے بہرہ رکھنا ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن

---

[1]، [2] اور [3]: دیکھئے فتحات الکبرویہ، واقعات کشمیر۔ ریاض الاسلام۔ باغ سلیمان۔ تاریخ حسن[3] اور کشیر۔

ان سنوں کے قلابے آپس میں ملانے سے کئی عجیب سی باتیں اُبھرتی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے:

سال ولادت ۷۷۹ھ تسلیم کرنے کی صورت میں حضرت امیرؒ کے دوسری بار وارد کشمیر ہونے کے وقت یعنی ۷۸۱ھ میں حضرت شیخ کی عمر صرف دو سال ماننی پڑتی ہے۔ دو سال کے بچے کے ساتھ اسرار باطنی پر حضرت امیرؒ کا تبادلۂ خیال اگر اُسی نوعیت کا مان لیں جیسا کہ لوک روایت کے مطابق شیرخوارگی کے زمانے میں ہی آپکا للہ عارفہ کی نصیحت کو قبول کرنا اور دودھ پینے سے روٹھنے کی حالت کو خیرباد کہنا ہے تو مضایقہ نہیں۔ پھر کم از کم آپ کو سات سالہ قرار دینا تو اصلاح طلب ماننا ہی پڑے گا بلکہ ابوالفقرا بابا نصیبؒ کے ماخذ کو دریافت کرنا بھی ناگزیر بن جائیگا۔ اور اُنکے مرید خاص بابا داؤد مشکواتی کے درج کردہ سال ولادت پر بھی مزید ہوشمندانہ غور کرنا لازمی بن جائے گا۔ اس صورت میں اب تک سب سے آخر پر حضرت شیخؒ پر عرقریزی سے سوانحی رسالہ (مونوگراف) ساہتیہ اکیڈیمی کی استدعا پر لکھنے والے غلام نبی گوہر کو بھی اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرنا ہوگی کہ بابا داؤد مشکواتی مختلف اندراجِ سنین کر کے یا اپنے مرشد سے اختلاف رائے کر کے محض اسلئے ناقابل قبول بن جاتے ہیں کہ وہ اپنے ماخذوں کا نام نہیں لیتے ہیں یا اسلئے بھی کہ انکی کتاب "اسرار الابرار" ایک عوامی پذیرائی والے سلسلے میں مغالطے پیدا کر سکتی ہے۔ ایسی صورت حال میں حقیقت پسندانہ روایہ اس بات کا متقاضی ہے کہ چونکہ بابا داؤد مشکواتی کی طرح ہی بابا نصیبؒ نے بھی اپنے ماخذوں کا حوالہ نہیں دیا ہے اس لئے اسے من وعن تسلیم کرنے سے بھی کتنی مغالطے پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے بعض کی نشاندھی کی گئی۔ اسلئے پہلے مماثلت جوئی کی وہ بات ذہن سے نکالی جائے کہ اگر حضرت رسالتمآب کی عمر شریف کے ساتھ مطابقت عددی رکھنے والی ۶۳ سالہ گنتی کم وبیش قرار پاتی ہے تو حضرت شیخ رحمؒ کی سنت

شناس اور شریعت پسند عظمت میں کوئی فرق آئے گا۔ ہرگز نہیں۔ اگرچہ بیشتر عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عرصہ حیات صرف ۶۳ سالہ مہلت دنیوی پر محیط رہا ہے تو وہ ایک حسنِ اتفاق ہے کوئی لازمہ مشیت ایزدی نہیں ہے۔ چنانچہ ہزاروں بزرگانِ دین کی عمریں اس عددِ خاص سے کم اور زیادہ رہی ہیں اور انکی روحانی عظمت میں اس سے کوئی کمی و بیشی واقع نہیں ہوئی ہے اور یوں اگر حضرت شیخؒ کے تمام واقعاتِ زندگی کے تناظر میں بنیادی ماخذات دستیاب ہونے تک محققانہ سطح پر حضرت شیخؒ کا سالِ ولادت مرشد کے بجائے مرید کا ہی اہم تر تسلیم کر لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہ ہونا چاہیئے۔ البتہ اس جلیل القدر علمدارِ کشمیرؒ کا سانحہ ارتحال چونکہ تاریخی طور پر سلطان زین العابدین کے عہد میں ۸۴۲ ہجری سال کے ناطے ہی کافی روشن و مبرہن ہے اسلئے اس پر بحث برائے بحث عبث ہوگی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ بابا داؤد مشکواتی کا فراہم کردہ سالِ ولادت ۷۵۷ھ/۱۲۵۵ء تسلیم کر کے بابا نصیب الدین غازی کا درج کردہ سالِ وفات ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء تسلیم کرنے سے حضرت شیخ العالمؒ کی عمر شریف کو ۶۳ سال کے بجائے ۸۵ سال پر محیط جاننا ہوگا۔٭ اس صورت میں حضرت امیر کبیرؒ سے ۷۸۱ھ میں ملاقات کے وقت حضرت شیخ کا ۲۴ سالہ جوان ہونا ہی زیادہ فکر انگیز نہیں بنتا بلکہ چھ سال بعد ہی تیس سال کی عمر میں حضرت امیرؒ کی طرح حضرت شیخ موصوف کا اپنی باقی زندگی تبلیغ دین کے لئے قطعیت سے وقف کرنا بھی ان اصحابِ کبار کی بابرکات زندگیوں سے قریب تر ہونے کی اُس تمنا کا آئینہ دار بنتا ہے جس نے حضرتِ شیخؒ سے ایسے دردمندانہ اور صدقدلانہ شعر بھی کہلوائے ہیں۔ ٭

٭ قمری سال عیسوی سنہ کے شمسی سال سے کمتر عرصہ پر محیط ہوتا ہے اسلئے قمری ۸۵ سال تقریباً ۸۳ سال عیسوی کے برابر ہی محیط ہوں گے۔

محمدؐ تہٕ ژور یار برحق کنہٕ زِکھ — تمن نِش اندنے سأری نیائے

● (رسولِ محترم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے چہار یاران باصفا جیسے اصحاب کبار کو اتباع کے لئے کامل اور برحق نمونے جانکر فدوی بنا سیکھو ان کے اتباع میں ہی تمہاری ہر مشکل کا حل پوشیدہ ہے) عالمگیر ایمانی اور انسانی قدروں کی معرفت کرنے والے شیخ العالمؒ نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایمان و ایثار سے معمور زندگیوں سے والہانہ عقیدت دکھلانے کا یہ عملی تقاضا بھی روشن کیا ہے کہ عرصۂ حیات کم ہو یا زیادہ لیکن اسکی قدر و منزلت صرف ایک صورت میں بڑھ سکتی ہے اور وہ ہے اپنے آپ کو وقفِ خدمتِ انسان و اسلام کرنا چنانچہ کہتے ہیں:-

حضرتِ صدیقس تَس دُردانس

(میں صدقے انسانیت کے اُس انمول موتی پر جس کو دنیا حضرت صدیق کے نام جانتی ہے)

یُس اوّل ہیوت صاحبن پانس ستہٕ

(ہاں اُسی عظیم انسان پر جس کو شاہ رسل و شاہ لولاک نے اپنا پہلا یار جاننے کا شرف بخشا)

عمرِ خطابس پہلوانس

(میں صدقے عدل و روحانیت کے اُس پہلوان اعظم حضرتِ عمر ابن الخطاب پر)

یمہٕ جنگ کور شیطانس ستہٕ

(جن کی ضربِ ایمانی سے شیطان لعین کو شکست فاش ملی)

حضرت عثمان ابنِ عفانس

(میں صدقے اس پیکرِ حلم و حیا حضرت عثمان ابنِ عفان پر)

ییٚمہٕ اتھہٕ کرِ قرآنس ستہٕ

(جن کو قرآن حکیم کے اسرار و رموز کے ساتھ ہمکلامی کا شرف نصیب ہو گیا)

حضرتِ شاہس شیرِ یزدانس

(میں صدقے ہوں دامادِ رسولؐ زوجِ بتول شاہِ ولایت حضرتِ شیرِ خدا پر)

ییٚمہٕ ژروٹ کھیٚیہِ میہمانس ستہٕ

(جنہوں نے اپنے اہل و عیال سمیت بھوکے رہ کر مہمان کو کھانا کھلانے کی بے مثال سخاوت بھی دکھائی)

رسولِ خدایس شاہ سلطانس

(میں صدقے ان سب کو مثالی انسان بنانے والے معمارِ انسانیت رسولِ خدا شاہِ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) پر)

یُس اُمت ینزٕ ہیہِ پانس ستہٕ

(جو معراج میں بھی الامتی کہہ کر آخرت میں امتیازی امت نوازی کا مقامِ محمود پانے والے ہیں)

اِسی شاعرانہ منشور کی ذیل میں حضرت شاہ ہمدانؒ سے متعلق درج بالا شعر تخلیق کیا گیا ہے جو حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے ساتھ حضرت شیخ کی والہانہ عقیدت کے علاوہ اُن سے بالمشافہ ملاقات کی ایک زیرین لہر جیسی شہادت بھی محسوس کراتا ہے۔

خاص طور پر سے   جنتس ہیٚنزِ ہم پانس ستہٕ

یعنی مجھے جنّت میں اپنی رفاقت میں رکھنا جیسے ندائیہ میں دنیا کی ملاقات میں باقی رہی ہوئی تشنگی کو دور کرنے کی تڑپ بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ بہر حال بات چلی تھی عبد الا آناد سے اس ضمن میں واقع ہوئی سہل انگاری کی۔ کیونکہ اپنے درج بالا اقتباس کے آخری جملے میں جہاں وہ [illegible] امیر کبیرؒ کے [illegible] میں

رحلت فرمانے کی بات کرتے ہیں وہ ۷۹۰ھ تولد کو تو ہوئے بچے کو ۷۹۶ھ میں سات سالہ جتلانے کے برعکس ۷۸۱ھ میں ہی سات سالہ ہونے کی توثیق کرتے ہیں اور ایسے غلط مبحث کا ارتکاب کرتے ہیں جس سے خود اُن کے درج کردہ واقعات کی عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ بلکہ اُن کی طرح ۷۵۷ھ کے برعکس ۷۹۰ھ کے سال ولادت پر حضرت شیخ کے سوانحی حالات نقل کرنے والے بہت سے قلمکار بھی کئی کئی غلطیوں اور غلط بیانیوں کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر اصحاب رائے اور اشخاص تحقیق کے لئے یہ لمحہ فکریہ پیدا کرنے کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے کیونکہ اُنکی بے احتیاطیوں کے برعکس آزاد کے نہاں خانہ دل میں چھپا بالغ نظر محقق پھر بھی پیشگی کفارات اور حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک طویل تمہید سپردِ قلم کر چکا ہے جس میں اُس کے ناقدانہ شعور کی جھلک بھی صاف دکھائی دیتی ہے اور بزرگ پیشروؤں کی بیان کردہ باتوں میں چون و چرا نہ کر سکنے کی مجبوری بھی۔ مثلاً بابا نصیب کے نور نامہ نامی ریشی نامہ کی مکمل پذیرائی کرنے کے باوصف اُس نور نامے کی بنیاد پر نثر اور نظم میں تحریر کئے گئے ریشی ناموں کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

"ریشی نامہ نثر کا مصنف خلیل بابا مرحوم ہے اور منظوم ریشی نامہ کمال بابا مرحوم کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں اہلِ قلم قصبہ چرار کے رہنے والے تھے۔ دونوں کے شاہکار فارسی زبان میں ہیں۔ اس قیمتی تصنیف کا کوئی حصہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ "ریشی نامہ" ابتدا سے انتہا تک سنسکرت زبان کی (راج ترنگنی جیسی) تاریخی تصنیفوں کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ ہر واقعہ پر افسانوی رنگ چھایا ہوا ہے۔ شیخ کے حالات اس طرح لکھے گئے ہیں یہ کہ ہر واقعہ ایک معجزہ یا کرامت معلوم ہوتا ہے۔ واقع کی اصل تشکل مشکل سے ہاتھ آتی ہے۔ بعض کہانیوں میں "داستانِ

امیر حمزہ" کا لطف آتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں جادو کلام کر رہا ہے یہاں کرامات اور خرق عادات کے چمن زار کھل رہے ہیں۔ باوجود اس کے مجموعی حیثیت سے دلچسپ بھی ہے۔ اور تاریخی ضروریات بھی خاص حد تک مہیا کر سکتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں مختلف تاریخی معلومات کی ایک فہرست ملتی ہے۔ اور وقتی ماحول اور ذہنیت کا ایک مکمل نقشہ نظر آتا ہے۔ البتہ داستان بہت طویل ہے جن واقعات کو داستان کا پیٹ بھرنے کے لئے لکھا گیا ہے اور جو جذبات محض کی منہ بولتی تصویریں ہیں ان کو نظر انداز کرنے کے بعد جو واقعات رہ جاتے ہیں وہ بھی متعدد اور طویل ہیں۔ ان مرقعوں کے جذباتی رُخ سے قطع نظر کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے لیکن اس میں ایک بڑی مشکل پیش آتی ہے جس کا حل کرنا آسان نہیں۔ وہ یہ کہ شیخ کی عارفانہ حیثیت نہایت بلند ہے۔ اُن کے سوانح نگاروں کا رتبہ بھی کافی عالیشان ہے۔ جس واقعہ کی روایت بابا نصیب الدین غازیؒ جیسے بزرگ فرمائیں اور جس سانحہ کے لکھنے پر بابا داؤد خاکیؒ جیسے علامۂ دہر اور زبردست صوفی کا قلم اُٹھے اس پر اعتراض کون کر سکے۔؟ ہمارا زمانہ جدید سوانح نگاری یعنی روایت و درایت کا زمانہ ہے۔ اہلِ دل حضرات کے عقیدتمندانہ روایات کو سائنسی درایت کی زبان میں لکھنا اور اُسکی کسوٹی پر پرکھنا دورِ حاضر میں فی سبیل اللہ فساد کے مترادف ہے۔ اسلئے مناسب ہے کہ جذبات اور واقعیت کو مناسب ترکیب میں پیش کیا جائے۔ ہم ریشی نامہ سامنے رکھکر ایسا ہی کرنے کی کوشش کریں گے۔" مناسب ترکیب کے حفظ ماتقدم کے طور پر درج کئے گئے اس بیان کے باوجود آزاد کا ناقدانہ شعور اس کے وقت تک ریشی نامے شائع نہ ہو سکنے کے سماجی عوامل اور تجاہلانہ اسباب کی نشاندہی کر کے عظیم مسلم محققوں کی اولاد خاص طور پر اپنے علاقے کے تنگ چشم وِدھوانوں کو ہدف تنقید بنانے کی عمدہ جسارت دکھاتا ہے۔ چنانچہ ریشی ناموں کو ذریعہ آمدن بنانے والے استحصالی عناصر کے

طباعت ریشی نامہ میں حائل ہونے کی باتیں بیان کر کے علامہ شبلی کے خیالات کی روشنی میں لکھتے ہیں" اس کی اشاعت نہ ہو سکنے کی) تیسری وجہ ہے کہ قصبہ چرار کے علم دوست اور اہل ذوق اصحاب کی جگہ تن آسان لوگوں نے لے رکھی ہے۔ کسی زمانے میں یہ متبرک مقام علوم وعرفان اور شعر وادب کا مرکز تھا اب اس کے ردعمل کا مرقع بن چکا ہے۔ خود بینی کو خودی سمجھنے والے کی تخلیقی صلاحتیں تخریبی جذبات کی شکل میں بہہ جاتی ہیں۔ صدق اور صاف گوئی کو نہ کسی کی تعریف کی ضرورت ہے نہ رنجیدگی کی پروا۔ بزرگوں کے بقائے دوام کی حقیقت اُنکی سیرت اور ارشادات میں مضمر ہوتی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات وعظمت کا زندہ ثبوت قرآن و حدیث ہیں۔ مدینہ منورہ کی شاندار عمارتیں نہیں۔ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معتقدین کے جذبہ عشق کے سطحی نقوش ہیں۔ ریشیانِ چرار کا کامل یقین ہے کہ کلام شیخ نورالدین" سچ مچ شیخ نورالدین" ہی کا کلام ہے اور اگر اُن کا یہ دعوی صحیح ہے کہ وہ کلام قرآن وحدیث کی تفسیر ہے تو اُس کو جُز دانوں میں چھپ چھپا کر رکھنا ظلم اور زیادتی ہے۔"

یہ دوسرا لمبا اقتباس پڑھنے کی باتیں بیان کرنے کے باوجود آزاد صاحب کے اندراجات کا کفارہ نہیں بن سکا ہے البتہ اس اقتباس کی آخری سطروں میں بیان کی گئیں دو باتوں کو تفصیل سے مطالعہ کرنے کی دعوت مزید زوردار بن گئی ہے۔ ایک یہ کہ کلام شیخ نورالدین" سچ مچ شیخ نورالدین" ہی کا کلام ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کا کلام قرآن وحدیث کی تفسیر ہے۔ حضرت شیخ العالم" کی عہد ساز عارفانہ شاعری کی یہ دو غور طلب باتیں خصوصیت کے ساتھ زیر بحث لانے سے پہلے اُنکی شخصیت کے چند پہلو بھی دیکھنے لازمی ہیں۔

غلام نبی آتش*

حضرت بابا نصر الدّین ریشیؒ

پرگنہ کوٹہار میں مشہور قصبہ چھتر گُل سے بائیں جانب آگے خوبصورت پہاڑوں کی اوٹ میں کھارہ پورہ سے معمولی دوری پر دو چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہیں۔ ایک کا نام بِرُمر (BRIMAR) اور دوسرے کا نرسر (NARSAR) ہے۔ بِرُمر قدرے ہموار سطح پر واقع ہے جبکہ نرسر پہاڑ کے دامن میں نسبتاً اونچائی پر ہے۔ دونوں گاؤں بے انتہا خوبصورت ہیں۔ لیکن یہاں کے لوگ آج بھی معاشی بدحالی سے دوچار ہیں۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے دھان کی کھیتی کے لائق وہاں کافی زمین دستیاب نہیں ہے۔ نرسر وہی گاؤں ہے جہاں آج سے کئی صد سال قبل حضرت شیخ نور الدّین ریشیؒ سالار اعظم ریشیانِ کشمیر کے خلیفۂ خاص حضرت بابا نصر الدّینؒ نے جنم لیا۔ ریشی ناموں اور عام تذکروں میں غلطی سے اِس گاؤں کا نام ترسر (TURSAR) درج ہوتا آیا ہے۔ جبکہ اس نام کا کوئی گاؤں پرگنہ کوٹہار میں موجود نہیں ہے۔ بِرُمر اور نرسر کے درمیان ایک جگہ بڑے بڑے کھیت ہیں

---

* نائل، اننت ناگ، کشمیر

جن میں دھان کی بوائی ہوتی ہے۔ ایک کھیت کے قریب چنار کا ایک درخت بھی ہے جس کے نیچے تین یا چار بڑے بڑے مستطیل پتھر ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق یہ کھیت حضرت نصرالدینؒ کے بتائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ چنار کے نیچے موجود پتھروں پر حضرت شیخ نورالدینؒ ریشی اور حضرت نصرالدینؒ نماز پڑھا کرتے تھے۔ نرسر کی طرف جاتے ہوئے کٹھن اور تنگ پہاڑی راستے کے ایک طرف یکے بعد دیگرے دو چشمے موجود ہیں۔ ایک چشمہ اب خشک ہوگیا ہے جبکہ دوسرے چشمے میں تھوڑا بہت پانی اب بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ دونوں چشمے حضرت شیخ نورالدینؒ اور حضرت نصرالدینؒ سے منسوب بتائے جاتے ہیں۔ گاؤں میں ایک چھوٹی سی قدیم مسجد بھی ہے جسمیں بمشکل پانچ دس آدمی بیک وقت نماز ادا کرسکیں گے۔ اس کی دیواریں پتھروں کی بنائی گئی ہیں۔ چھت عام مکانوں کی طرح نہیں بلکہ دیواروں کے آر پار لکڑی کے تختے رکھ دیے گئے ہیں۔ دروازہ بھی معمولی قسم کا ہے۔ مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مسجد حضرت شیخؒ اور بابا نصرالدینؒ نے خود ہی بنائی تھی۔ اس مسجد کے قریب ایک زیارت گاہ ہے جس کا طرز تعمیر ہمارے ریشیوں کی زیارت گاہوں سے مشابہ ہے۔ مقامی روایت کے مطابق زیارت گاہ کے اندر موجود ایک لمبے چوڑے پتھر کے نیچے کچھ تبرکاتِ شیخؒ پوشیدہ ہیں۔ زیارت گاہ کچھ زیادہ پرانی نہیں لگتی۔ کبھی کبھی معتقد یہاں آکر حاضری دینے آتے ہیں۔ دونوں چشموں اور راستے کے دونوں طرف موجود بڑے بڑے پتھروں پر معتقدین چراغ یا شمعیں روشن کرتے ہیں۔

اس چھوٹے سے دور افتادہ گاؤں میں صدیوں سے سینہ بسینہ چلی آئی ان روایات کی صحت پر اگرچہ یقین کرنا مشکل ہی ہے پھر بھی ان کا یہاں ذکر کرنا اس لئے ضروری اور دلچسپ ہے کہ حضرت بابا نصرالدینؒ کی جائے ولادت

ہوتے ہوئے بھی سینکڑوں برسوں سے کسی معتقدِ شیخؒ نے اس گاؤں میں موجود روایات کا نہ تو تذکرہ ہی کیا ہے اور نہ تجزیہ بلکہ اس گاؤں کا نام بھی غلط طور درج کیا ہے۔ ممکن ہے اصل واقعات اب روایات بن کر رہ گئے ہوں اور روایات بھی رفتہ رفتہ لغو اور جھوٹ میں بدل گئی ہوں مثلاً تبرکاتِ شیخؒ کا پتھر کے نیچے پوشیدہ ہونا وغیرہ۔ لیکن ایک اہم بات اِن روایات سے اخذ کی جا سکتی ہے کہ حضرت شیخؒ اور بابا نصرالدینؒ کا تعلق اس گاؤں سے ضرور رہا ہے۔[1]

ریشی ناموں اور عام تذکروں میں ہمارے ریشیوں اور دیگر اولیائے کرام کے حالاتِ زندگی ان کے اصلاحی اور مذہبی کارنامے وغیرہ اُن کی کرامات میں دب کر رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر ریشیوں کے حالات، زاد و بوم وغیرہ ان تذکرات میں سرے سے ملتے ہی نہیں۔ اگر ملتے بھی ہیں تو فقط اساطیر کے پردوں میں۔ اسی لئے حضرت بابا نصرالدینؒ کا سنِ پیدائش کسی جگہ درج نہیں ہے۔ البتہ حضرت شیخ نورالدینؒ ریشی کے حالات، واقعات و کرامات کے ساتھ ساتھ تذکرہ نگاروں اور ریشی ناموں کے مؤلفین نے حضرت نصرالدینؒ کا ذکر بھی کیا ہے۔

حضرت بابا نصرالدینؒ کا نام دُتر تھا (عبدالاحد آزادؔ نے اصل نام نصر ہی لکھا ہے) ریشی ناموں میں درج ہے کہ دُتر کے والدین آسودہ حال تھے۔

---

[1] تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ بابا نصرالدینؒ کی جائے ولادت علاقہ کوٹھار کا ترسر (ترسَر) گاؤں ہے۔ گاؤں میں مقامی روایات سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن تبرکاتِ شیخ العالمؒ کا پتھر کے نیچے پوشیدہ ہونا حیران کُن ہے اور ناممکن لگتا ہے کیونکہ ایک طرح سے ایسا ہونا تبرکات کی بے ادبی کے مترادف ہے۔

لیکن ایامِ طفولیت میں انہیں قے کی بیماری لاحق ہو گئی۔ وہ برابر بارہ[12] سال تک درد و کرب سہتے رہے۔ آخر کار والدین نے حضرت شیخ کشمیر نور الدین ریشیؒ کے یہاں کیموہ کے غار میں پہنچا دیا۔ حضرت شیخ کی توجہ سے مریض کو دائمی مرض سے نجات مل گئی لیکن اس کے والدین کو خالی ہاتھ لوٹنا پڑا کیونکہ نگاہِ فیض اثر اپنا کام کر گئی تھی۔ وتر حضرت شیخؒ کے پاس ہی رہنے لگا۔ حضرت شیخؒ نے وُتر کا نام بدل کر نصر الدینؒ رکھ دیا اور صدیوں سے یہ نام زبان زدِ خلائق رہا ہے۔ عبد الاحد آزاد نے ریشی ناموں کا حوالہ دیئے بغیر اس ضمن میں لکھا ہے:

"اُس نے حضرت شیخؒ سے رخصت مانگی۔ انہوں نے ترکِ دنیا کے لیئے نصیحتیں کیں۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ کہا اے شیخ! از گدائی خانہ داری بہتر است مرا از لقمۂ دریوزہ گری عار می آید"

۰۔۔ (اے شیخ! گداگری کے بجائے گھر بسانا بہتر ہے۔ مجھے مانگ کر لقمہ کھانے سے شرم آتی ہے) اور غار سے نکل کر گھر کی راہ لی۔ خانہ داماد کے طور پر ایک کسان کے یہاں سکونت اختیار کی۔ تھوڑے ہی عرصے میں گھر بار چھوڑ کر حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ حضرت شیخؒ نے اس کی باطنی تربیت پر پوری پوری توجہ کی اور اس کا نام نصر الدین رکھا۔[1]" ۰۔۔ (کشمیری زبان اور شاعری حصہ دوم ص ۱۶۹)

---

[1] بابا نصر الدینؒ کا خانہ داماد بن جانا درست نہیں لگتا کیونکہ تمام ریشی نامے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے والدین آسودہ حال تھے، اُس زمانے میں آسودہ حال شخص کو خانہ داماد بن کر جانے کی ضرورت کیونکر پڑ سکتی تھی۔ البتہ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اسلاف سے سنا ہے کہ بابا نصر الدینؒ نے کچھ وقت (دائرۂ اسلام میں آنے کے بعد) نر سر میں گذارا جہاں وہ اپنے کھیتوں میں کام کاج کیا کرتے تھے اور حضرت شیخ بھی ان کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ کی خدمت میں آنے کے
وقت بابا نصر الدّینؒ کی عمر بتیس[2] سال سے زیادہ نہ تھی۔ مرشد کی خدمت میں رہ کر
بابا نصر الدّینؒ روحانیت کے اعلیٰ مقامات حاصل کر گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ریاضات
و عبادات اور نفس کشی نے بابا کو کشمیر میں تحریکِ ریشیت کا ایک اہم رکن بنا دیا۔ اسے
اپنے مُرشدِ کامل اور سالارِ اعظمِ ریشیت حضرت شیخِ کشمیر کا خادم، ہمدم و ہمراز، فرزندِ
معنوی اور جانشین ہونے کا فخر حاصل ہو گیا۔ حضرت شیخ نے بابا نصر الدّینؒ کو
لنگر خانہ کا انتظام سونپ دیا اور یہ کوئی معمولی ذمہ داری نہیں تھی کہ:

"حضرت شیخ ایک باضابطہ اور منظم تحریک کے قائد تھے۔
اس تحریک میں آپ کے رفقاء اور کارکنوں کی تعداد اتنی بڑھ
چکی تھی کہ تنظیم کے مرکزی مقام پر ایک لنگر خانہ کی ضرورت
پڑی اور اس مطبخ کی نگرانی کے لئے کسی معمولی رفیق کا انتخاب
مکتفی نہ ہوا بلکہ عظیم المرتبت نائب کو یہ عہدہ تفویض کیا گیا۔
مرکزی لنگر خانہ کی موجودگی کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی
ہو سکتا ہے کہ تحریکِ ریشیت کے کارکنان ساگ، جنگلی سبزیوں
اور تھوڑے سے دودھ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ غلہ کی اقسام
سے زیادہ تر اجتناب کرتے تھے۔ اس مختصر اور سادہ سی غذا
کی تنظیم کے لئے بھی ایک باضابطہ تنظیمی مشینری کا موجود ہونا
بذاتِ خود اس حقیقت کی تاریخی بُنیاد فراہم کرتی ہے کہ حضرت شیخؒ
ایک منظّم ترین تحریک کے علمبردار تھے اور اس تنظیم کا باضابطہ فعال
مرکز بھی موجود تھا اور شاخیں بھی اطراف و اکناف میں قائم تھیں۔"

۰ — (احد عشر کوکب، از شہسوار ابن گوہر)

مرکزی لنگر خانہ کے انتظام کی ذمہ داری حضرت بابا نصر الدینؒ نے بحسن و خوبی انجام دی۔ ایک دفعہ کوئی رفیق حضرت شیخؒ کے پاس یہ شکایت لے کر حاضر ہوا کہ نصر بابا تو خود دودھ پی جاتے ہیں اور ہمیں جنگلی ساگ کھانے کو دیتے ہیں۔ حضرت شیخ افطار کے وقت شکایت کنندہ رفیق کے ہمراہ مطبخ چلے آئے۔ بابا نصر نے جس برتن میں افطاری رکھی تھی، اُسے اٹھا کر شکایت کُنندہ رفیق کو پینے کے لئے دے دیا تو وہ رفیق بد مزگی سے تھو تھو کرنے لگا۔ حضرت شیخؒ نے بابا سے پوچھا۔

"کب سے مٹی گھول کر پینے لگے ہو؟"

بابا بولے۔

"جب سے جناب کے حلقۂ احباب میں شامل ہو چکا ہوں"۔

بابا کی نفس کشی کا یہ عالم دیکھ کر شکایت کُنندہ رفیق پانی پانی ہوگیا۔ حضرت شیخؒ نے حکم دیا کہ آج سے چاول کھا کر افطار کیا کرو۔ اُس دن کے بعد بابا نصر الدّین اٹھارہ دانے چاول (مطابق تاریخِ حسن جلد ۳) اُٹھا کر افطار فرماتے تھے۔

اسی طرح ریشی ناموں میں یہ واقعہ بھی درج ہے کہ ایک بار بابا کو چلہ کشی کا حکم ہوا تو خلوت میں جانے سے قبل بابا نے چار اخروٹ اپنے ساتھ رکھے۔ مُرشد نے پوچھا۔

"بابا! اخروٹ کیوں توڑ رہے ہو؟"

"چلہ کے دوران خوراک کے لئے"۔ بابا نے جواب دیا۔

حضرت شیخ نے فرمایا۔

"میں سمجھا تھا کہ نفس توڑ رہے ہو"۔

چالیس دن کے بعد بابا خلوت سے باہر چلے آئے تو چاروں اخروٹ مُرشد کے قدموں میں رکھ دیئے۔ بابا نصرالدّین کی نفس کُشی کی داستانیں آج تک زبان زدِ عام ہیں۔

حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کی وصیّت کے مطابق حضرت میر محمد ہمدانیؒ بن میر سیّد علی ہمدانیؒ ۵ رجب ۸۱۴ھ کو حضرت شیخ نورالدّین ریشیؒ سے بمقامِ زالوسہ ژرار (چرار شریف) ملنے گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تاریخی ملاقات کرالہ پورہ یارپہ وَن میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے وقت تحریک ریشیت سے وابستہ دو ممتاز خواتین سُہت بی بی اور دوہت بی بی بھی موجود تھیں۔ انکی حاضر جوابی سے حضرت میر محمد ہمدانیؒ متاثر و مسرور ہوئے تھے۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ سوالات و جوابات اور توجہّ باطنی کے بعد حضرت شیخ نورالدّینؒ کے درجاتِ ولایت و مراتبِ روحانیت پہچان کر ان کے کمالاتِ باطنی کا پورا اندازہ کرنے کیلئے بحرِ مکاشفہ میں غوطہ زن ہوگئے۔ حضرت ریشؒ حقیقت سے آگاہ ہو کر حضرت میر محمد ہمدانی کے پیچھے ہولئے اور حضرت میر محمد ہمدانیؒ مراقبہ سے فارغ ہو کر فرمانے لگے

"بدیں رتبہ ہیچ کس از یاراں رسانیدے؟"

(کیا اپنے دوستوں میں سے کسی کو اس درجے تک پہنچا دیا ہے؟)

گفت۔ "چہار کس" (ریشؒ نے فرمایا۔ ہاں چار دوستوں کو)

اور حضرت بابا بام الدّینؒ، حضرت بابا زین الدّینؒ، حضرت بابا لطیف الدّین اور حضرت بابا نصرالدّینؒ کو پیش کیا۔ اس طرح حضرت بابا نصرالدّینؒ کی عظمت و رفعت کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔ حضرت شیخِ کشمیر کو اپنے چاروں جلیل القدر خلفاء پر ناز تھا

سہ بُمہِ، نصر تہ بابہ زاگنو لطیف رنبہ وونے چھُم

ڈین دِیتم تر تھاہ سوٗمبرنو   ییمے میاٗنی بہٕ مہندے چھُیس

● ـــ (بابا بام الدّینؒ، بابا نصر الدّینؒ، بابا زین الدّینؒ اور بابا لطیف الدّین دل کو لُبھانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ چاروں عطا کئے، یہ میرے ہیں اور میں اُن کا ہوں)

حضرت شیخ نور الدّین ریشیؒ کے کئی "شُرکی" بابا نصر الدّینؒ کی طرف مُخاطب ہو کر کہے گئے ہیں، جن میں سے وہ مشہور "شُرکی" بھی ہیں، جو حضرت شیخ نے واصل بحق ہوتے وقت فرمائے ہیں اور بابا ہی کو اس وقت مُرشد کے سرہانے حاضر رہنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔

نصر بابہٕ زُو چھُہ شمع زن تارس
نصر بابہٕ زُو چھُہ دماہ ہینجہٕ پوژھے

● ـــ (نصر بابا، یہ جان بُجھتے ہوئے دِیئے کی طرح ہے۔ یہ جان ایک لمحے میں واپسی پر تیار مہمان کی طرح ہے)

زُوس پژھ گری زِ نہٕ مکارس
یارس دِزیم اند مزارس ووٗنے

● ـــ (زندگی پر بھروسہ مت کرنا۔ مجھے قبرستان میں تلاش کرنا)

ژوٗرا ژام متّے لالہٕ امبارس
مو کھتہٕ نیٖوٗنم بوٗہٕ کیو دوٗژھے
مُہتھ ژوٗلُم ووہنی کوٗت لارس
یارس دِزیم اند مزارس ووٗنے

● ـــ (لعل و جواہرات کے ڈھیر پر چور ڈاکہ ڈال کر چلا گیا، میں اس کا تعاقب

کیونکر کروں، مجھ کو قبرستان میں ڈھونڈ لینا)

۸۴۲ھ میں بمقام رپہ ون حضرت شیخؒ نے انتقال فرمایا اور اُن کے بعد برابر تیرہ ۱۳ سال تک حضرت بابا نصر الدینؒ نے تحریکِ ریشیت کی مرکزی قیادت سنبھالی۔ یہ عظیم بشارت بھی بابا نصر الدینؒ ہی نے دی کہ دربارِ رسالتؐ سے حضرت نور الدین ریشیؒ کو "علمدارِ کشمیر" کا خطاب عطا ہوا ہے۔

ریشی ناموں میں بابا نصر الدین سے بیسیوں "شُرک" منسوب کر کے درج کیے گئے ہیں۔ مگر وہ اس طرح کلامِ شیخ نور الدینؒ کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کا الگ سے کوئی تجزیہ ممکن نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حضرت بابا نصر الدین کو "پہلوانِ سخن" بھی کہا گیا ہے، اب حضرت شیخؒ کے ساتھ اُن کے منظوم مکالمے شاید موجود نہیں ہیں۔ بابا نصر الدین کے اس شعر سے حضرت شیخ نور الدین ریشیؒ کا سالِ وصال ملتا ہے۔ اس طرح بابا کشمیری زبان کے پہلے شاعر ہیں جو اشعار میں مادۂ تاریخ موزوں کر سکتے تھے۔

دوّپ نصر مے تاریخ ورگ
نوند زوت گو بای سُرگ

۱۱۰ + ۴۱۳ + ۲۶ + ۱۳ + ۲۸۰ = ۸۴۲ھ

بابا نصر الدینؒ سے منسوب درجِ ذیل اشعار میں اُن کے مُرشد حضرت شیخؒ کا رنگ و آہنگ موجود ہے ؎

گور بتہ چھے ہیوت تہ دِتوٗ   گور بتہ چھے ود تہ کلے
گور رُوس چھون تہ چھوتو   بموہ گور ہیوت تم کنذ رائے



گرِ گر اکس تاج لاگن سرس   گرِ کور رسول خدائے مرس ٹوٹھیو

حضرت بابا نصر الدّین نے ۸۵۵ھ میں انتقال فرمایا۔ تاریخ وفات اس شعر سے نکلتی ہے ؎

سالِ وصلش باز پرسیدم زعقل
"عارفِ باﷲ نصر الدّین" بگفت

۸۵۵ھ

آپ حضرت شیخ العالمؒ کی تربتِ شریف کے پاس ہی دفن ہیں۔ روضۂ شیخؒ کے آس پاس جو اصحاب مدفون ہیں، ان کے اسمائے مبارک اِن اشعار میں ملتے ہیں جو آستانہ شریف میں ایک تختی پر لکھے ہوئے تھے۔ اس پر کاتب کا نام قاضی عبدالعزیز درج تھا۔ ۱۹۵۱ء میں آستانہ شریف کو وسعت دینے کے دوران اُس جگہ کو بھی منہدم کر اگیا جہاں یہ تختی آویزان تھی[1]

؎ گردِ شمسُ العارفین ایں دہ ستارہ روشن اند
نصر الدّین و جوگی ریشی، لولی حاجی یک تن اند
روپ ریشی، ریپ ریشی، سہہ ریشی میر ہم
ملا بابا، فتہ بابا، باجُنید ایں دہ تن اند

---

[1] موجودہ پُر آشوب حالات میں محاصرۂ چرار شریف کے دوران کی درمیانی شب کو آستانۂ حضرت شیخ العالمؒ معہ خانقاہ نذرِ آتش ہوگئی جس کے نتیجے میں کئی یادگار تحریریں معہ اس تختی کے کشمیریوں سے ہمیشہ کے لئے چھن گئیں۔ تبرکاتِ متبرکہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم!

حضرت سید میر محمد ہمدانی رح

سرزمینِ کشمیر کی تمدنی تاریخ میں میر محمد ہمدانی رح کا نام ایک ایسی درخشندہ و تابندہ شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اس مشن کو بہت حد تک تکمیل کو پہنچایا جس کی شروعات ان کے والدِ بزرگوار امیرِ کبیر میر سید علی ہمدانی رح اور ان سے قبل سید شرف الدین (بلبل شاہ) جیسے بزرگوں نے کی تھی۔ حضرت امیرِ کبیر کی تشریف آوری سے خطۂ بے نظیر کشمیر کی تہذیب و تمدن اور ثقافت میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوئی اور انہیں بجا طور پر کشمیر میں بانیٔ مسلمانی کہا جاتا ہے لیکن میر سید محمد ہمدانی رح کا نام کشمیر کی تمدنی تاریخ میں بس اسی حوالے سے اہم نہیں ہے بلکہ انہوں نے خود ایسے کارنامے انجام دیئے جن سے کشمیر کے طول و عرض میں لوگوں کے دلوں کی تاریکیاں ہدایت کے نور سے جگمگا اٹھیں۔

میر محمد ہمدانی رح ۷۷۴ ہجری / ۱۳۷۲ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت کے متعلق حضرت امیرِ کبیر رح نے پہلے ہی پیشن گوئی کی تھی۔ اس بارے میں ملا حیدر بدخشی رح اپنی تصنیف منقبت الجواہر میں رقمطراز ہیں:-

"نقل ہے نورالدین جعفرؒ اور قوام الدین بدخشیؒ وغیرہ سے۔ یہ لوگ جنابِ سیادت (امیر کبیرؒ) کی خدمت میں حاضر تھے۔ اس لئے زبانِ مبارک سے سنا کہ فرما رہے تھے۔ "میں ایک رات قطب الواصلین، سلطان العابدین شیخ محمد ازکانیؒ کی خانقاہ میں تھا کہ خواب میں دیکھتا ہوں۔ جناب شیخؒ نے مجھے ایک سفید باز عطا کرکے کہا اسے لے لو۔ یہ خدا کی طرف سے تجھے عطیہ ہے"۔ عرض کیا "مرشد یہ باز مجھے کس کام آئے گا"۔ فرمایا "خانقاہ میں رکھو۔ اس کی برکت سے زیب و زینت اور روشنی آئے گی"۔ ناچار ہاتھ میں لے لیا۔ دیکھتا ہوں تمام اولیاء اللہ حاضر ہو کر مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اشارہ فرزندی کا تھا۔ صبح ہونے پر جناب شیخؒ سے عرض کیا اور پوچھا "بزرگوار خواب میں ایسا دیکھا تعبیر کیا ہے"۔ زبان مبارک سے فرمایا "اے سید فرزند کا اشارہ ہوا ہے"۔ حالانکہ آپ اس وقت عالم تجرد میں تھا۔ بعد ازاں جناب کے حکم سے چالیس برس کی عمر میں متاہل ہو گئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے محمد نام کا ایک فرزند عطا کیا اور چونکہ جناب سیادتؒ مطلع آفتابِ حقیقت تھے اس لئے فرزند عزیز بھی عالم تحقیق کا منارہ ثابت ہوا۔ فرمانِ رسولؐ ہے۔ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ۔
(بیٹا باپ کا راز ہے)

آپ کے دادا سید شہاب الدین ہمدان کے حاکم اور امیر تھے۔ لیکن اپنے والد بزرگوار کی طرح سیاسی معاملات کی بجائے روحانیت سے ہی خود کو جوڑا اور اس میں ولیٔ کامل کا درجہ پا گئے۔

آپ حضرت امام زین العابدینؓ کی اولاد میں سے تھے اور شجرہ نسب میں سیدنا امام حسینؓ سے لیکر بیس واسطوں کے بعد آپ کا نام آتا ہے جو کہ یوں ہے۔

میر سید محمد ہمدانیؒ بن حضرت سیدنا سید امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ لقب علی ثانی کنیت ابو محمد اسم شریف ظہیر الدین علی بن سید شہاب الدینؒ بن سید محمد ثالثؒ بن سید علیؒ بن سید یوسفؒ بن سید شرف الدینؒ بن سید محب اللہؒ بن سید محمد ثانیؒ بن سید جعفرؒ بن سید عبد اللہؒ بن سید محمد اولؒ بن سید علی بن سید حسنؒ بن سید حسینؒ بن سید جعفر الحجہؒ بن سید حسین الاصغرؒ بن امام زین العابدینؓ بن سیدنا امام حسینؓ۔

میر سید محمد ہمدانیؒ کی جائے پیدائش سے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ عام طور پر یہی کہا گیا ہے کہ وہ ہمدان میں پیدا ہوئے لیکن خلاصۃ المناقب کے مطالعہ سے اگرچہ آپ کے والد میر سید علی ہمدانیؒ کے ہمدان سے ختلان منتقل ہونیکی وجہ اور قطعی تاریخ معلوم نہیں ہو پاتی اور یہ مانتے ہوئے بھی کہ ۷۷۳ ہجری / ۱۳۷۱ عیسوی تک آپ نے ختلان میں سکونت اختیار نہیں کی تھی تاہم اسی سال آپ نے قبچاق میں حاجی اخیؒ کی تعمیر کردہ عمارت میں تین مہینے گزارے تھے اور اسی سال نور الدین جعفر بدخشیؒ کو آپکے حلقۂ ارادت میں آنیکے بعد آپکو اپنے مولد اندراب (بدخشان) لیا تھا۔ ایسا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ۷۷۳ ہجری / ۱۳۷۱ عیسوی میں ہی آپ نے ختلان کو سکونت پذیری کے لیے منتخب کیا تھا اور اس کے بعد ایسی کوئی شہادت نہیں کہ آپ واپس ہمدان گئے۔ اس نکتۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو میر سید محمد ہمدانیؒ کے کولاب ختلان میں پیدا ہونے کا واضح اشارہ ملتا ہے۔

جس وقت آپ کے والدِ بزرگوار کا انتقال ہوا آپکی عمر صرف بارہ سال تھی۔ اس سے قبل ضعف کے ایام میں ہی حضرت امیر کبیرؒ نے اپنے فرزند سید محمد الطالقانی الہمدانیؒ کے لیے اپنے ہاتھ سے وصیت نامہ اور خلافت نامہ لکھ کر مولانا سراج قوام الدین بدخشیؒ کے حوالے کئے اور ان سے فرمایا تھا کہ یہ کاغذ خواجہ اسحاق ختلانیؒ اور مولانا نور الدین بدخشیؒ

کے پاس پہنچا کر میرے ہی ملک کے حوالے کیے جائیں۔ البتہ حضرت امیر کبیرؒ کے فرمان کے
مطابق خلافت نامہ ان کے ہاتھ نہ دیا جائے جب تک تربیت تکمیل کو نہ پہنچے۔ چنانچہ
روایت ہے کہ وہ بیعت تامہ پانے کے وقت اجازت نامہ حاصل کرنے کی غرض سے کر میر
سید محمد ہمدانیؒ میں باطنی تغیر ہوا۔ سب ہی نے یکسر ترک کی اور تین سال اور پانچ مہینے خواجہ
اسحاق ختلانیؒ کی خدمت میں رہ کر سخت ریاضت کرتے ہوئے راہ سلوک کی منازل طے کیں۔ اس
مدت میں دو مہینے ان کے لیے گرم آب استنجا تیار کرتے تھے اور بعد میں پانی لانے کے لیے مامور
ہوئے۔ یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ حضرت امیر کبیرؒ کی
دختر نیک اختر آپ کے عزیز مرید اور خلیفہ خواجہ اسحاق ختلانیؒ سے بیاہی گئی تھیں۔ اس طرح
وہ میر محمد ہمدانیؒ کے بہنوئی تھے۔ بعد ازاں نور الدین جعفر بدخشیؒ کی خدمت میں رہ کر آپ
نے آداب طریقت سیکھے۔ یہاں تک کہ سولہ سال کی عمر میں کامل ہو گئے اور اپنے والد محترم
کا اجازت نامہ حاصل کیا اور لوگوں کی راہنمائی میں مشغول ہوئے۔

سلطان سکندر کے دور حکومت میں ۷۹۶ ہجری / ۱۳۹۳ عیسوی میں وارد کشمیر ہوئے
تب ان کی عمر بائیس برس کی تھی۔ ان کے ہمراہ تین ہزار سادات کی ایک بڑی جماعت تھی
جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ اس عمر تک پہنچتے ہوئے کتنی مقبولیت
حاصل کر چکے تھے۔ کم عمر ہونے کے باوجود وہ صلاح و تقویٰ سے آراستہ اور علوم ظاہری و
باطنی سے پیراستہ تھے۔ لہٰذا جوں ہی آپ یہاں پہنچے سلطان سکندر نے اخلاص و اعتقاد
کے ساتھ توبہ کا ہاتھ آپ کے سامنے پھیلایا اور یقین و عمل سے ان کے خاص مریدین گئے۔

جب ان کی تشریف آوری کی خبر شیخ نور الدین نورانیؒ نے سنی تو انہوں نے فرمایا
"کاشرن پیر آو" یعنی کشمیریوں کے لیے پیر آگیا۔ ابجد کے حساب سے ان کے اعداد حضرت
میر محمد ہمدانیؒ کے کشمیر میں وارد ہونے کی تاریخ یعنی ۷۹۶ بنتے ہیں۔ حسن شاہ کھویہامی نے
اپنی تاریخ حسن میں ان کی تشریف آوری کی تاریخ یوں نظم کی ہے۔

حسن گفت تاریخ تشریف او
مبارک امیر کبیر آمدہ

۷۹۶ ھ

فتحاتِ کبرویہ مصنف عبدالوہاب نوری کے مطابق میر محمد ہمدانیؒ ۸۱۱ ہجری/۱۴۰۸ء میں وارد کشمیر ہوئے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں لگتی۔ کیونکہ سلطان سکندر نے خانقاہ معلی سے متعلق جو وقف نامہ میر محمد ہمدانی رح کو دیا ہے اور جس پر دونوں کی مہریں ثبت ہیں۔ اس پر ۷۹۸ ہجری ۱۳۹۵ عیسوی تاریخ درج ہے۔ اس لئے آپکی تشریف آوری کی تاریخ ۷۹۶ ہجری/۱۳۹۴ عیسوی ہی صحیح اور مستند مانی جاسکتی ہے۔

کشمیر میں اسلام کی ترویج میں میر محمد ہمدانیؒ نے زبردست اور قابل قدر کوششوں سے حیرت انگیز کارنامے انجام دئے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ عوام الناس اور حکمران طبقہ زندگی اور تہذیب و تمدن سے متعلق الگ الگ زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں صورت حال بالکل مختلف دیکھنے کو ملتی ہے۔ چنانچہ کشمیری کلچر کی ایک مکمل تصویر یہاں کے فلسفۂ ریشیت میں ملتی ہے اور حالات و واقعات کا مطالعہ کرنے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس فلسفہ میں جو رنگ بھر کر میر محمد ہمدانیؒ نے شیخ العالمؒ کو خطِ ارشاد عطا کرکے مکمل کیا وہ اس بات کا غماز ہے کہ اُن کی شخصیت نے کس حد تک یہاں کے لوگوں کو متاثر کر دیا۔ مختلف تاریخوں اور تذکروں میں حضرت میر محمد ہمدانیؒ اور شیخ العالم رح کے درمیان ملاقات کا ذکر اور تفاصیل ملتی ہیں۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ میر سید علی ہمدانی رح کی زبردست کوششوں سے سرزمینِ کشمیر ہر طرف سے نور اسلام سے منور ہوا تھا۔ تاہم جس تحریک کی بنیاد انہوں نے ڈالی تھی اسے منظم بنانے میں میر محمد ہمدانی رح نے اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ میر سید علی ہمدانی رح نے ریاضت اور تبلیغ کے لئے جس جگہ ایک چبوترہ قائم کیا تھا وہ میر محمد ہمدانی رح کی تشریف آوری کے بعد دینی تعلیم کا مرکز بن گیا اور

اس جگہ ۷۹۸ ہجری/۱۳۹۶ عیسوی میں خانقاہ معلیٰ کی تعمیر بنیادگی سے شروع ہوئی جو ۷۹۹ ہجری/
۱۳۹۷ عیسوی میں مکمل ہوئی۔ خانقاہ کی تعمیر کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچنے پر سید محمد ہمدانیؒ نے
سلطان سکندر کو ایک لعلِ بدخشاں تبرکاً دیدیا۔ جبکہ سلطان سکندر نے تین گاؤں پرگنہ شاہ اللہ
سے وچی، پرگنہ مارتنڈ سے نورہ ونی اور پرگنہ ادلر سے ترال خانقاہ کے لئے وقف کئے۔ علاوہ
ازیں کچھ زمین بھی مالکان سے خرید کر خانقاہ کی تحویل میں دی گئی۔ وقف سے حاصل ہونے
والی آمدنی خانقاہ کے مجاوروں، خانقاہ میں قیام کرنے والوں اور مساکین اور غرباء میں تقسیم
ہوتی رہی تاکہ وہ اپنے آپ کو دنیاوی پریشانیوں سے فارغ پاکر روحانی فیوض و برکات
حاصل کرتے رہیں اور درود و اذکار اور اوراد پڑھنے میں مشغول ہو جائیں۔ خانقاہ کی دیکھ
ریکھ کا کام مولانا سعید کے سپرد کیا گیا جبکہ ملک ویلو گنائی ناظم مقرر کئے گئے۔ حسین چک کے
دورِ حکومت میں یہ جاگیر ضبط ہوئی اور اکبر بادشاہ کی مداخلت سے واگذار ہوئی۔ حسن شاہ
کے دورِ حکومت میں علاؤالدین پورہ میں واقع یہ خانقاہ آگ کے حادثہ میں شہید ہوا۔ حسن شاہ
نے اس خانقاہ کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کی زمین اُن کی مرضی سے خرید کر
خانقاہ کے احاطے کو وسعت دے کر نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ ملا علی نام کے شخص نے پیسے
لینے سے انکار کیا تو اسے دوسری جگہ زمین خرید کر دیدی گئی۔ اس کے بعد اس جگہ ایک
بڑی خانقاہ بنی جس کے متولی قاضی ابراہیم موسیٰ کے والد قاضی حمید الدین بنائے گئے۔ محمد شاہ
کے دورِ حکومت میں ملک کاجی چک نے اس خانقاہ کو نئے سرے سے بنانے کے بہانے
گرادیا لیکن اس کی بہن مسماۃ صالحہ جو شیخ اسماعیل کی مرید تھی، نے کاجی چک کا تغافل دیکھ کر
اُن تمام زیورات کو خانقاہ کی تعمیر پر خرچ کر دیا جو محمد شاہ نے اُسے دئے تھے اور بھائیوں کو
ورثے میں ملے تھے۔ اس تعمیر پر ساٹھ ہزار تنگہ اور ایک ہزار اشرفی (چہار دانگی) خرچ ہوئے۔
مکمل ہونے پر مزدوروں میں دو سو اونی کرتے اور پانچ ہزار ٹوپیاں انعام کے طور پر تقسیم
کی گئیں۔ ۱۱۴۴ ہجری/۱۷۳۱ عیسوی میں پھر سے نذرِ آتش ہونے کے بعد ابوالبرکات خان

نے اس کی پھر سے شاندار تعمیر کی۔ اس تاریخی پس منظر کو یہاں پر اس لئے بیان کیا گیا کہ میر محمد ہمدانیؒ کے ذہن میں موجود خانقاہ کے متعلق وہ دور اندیش تصور اجاگر ہو جائے جس کے مطابق یہ خانقاہ برابر آج تک کشمیر میں اشاعت اسلام کا اہم مرکز ہے۔ یہ خانقاہ مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کی داستان عظمت ہے۔ بقول سر والٹر لارنس یہ کشمیر کا مقدس ترین مقام اور شہر کی انتہائی دلکش چیز ہے۔ اس میں میر سید علی ہمدانیؒ کے کئی تبرکات بھی موجود ہیں۔

۸۰۱ ہجری/۱۳۹۹ عیسوی میں سید محمد ہمدانیؒ کی تحریک پر محلہ سکندر پورہ میں جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ اس میں ۳۷۲ ستون لگائے گئے۔ ۳۲ ستون اس کی چار محرابوں میں نصب کئے گئے جن کی بلندی چالیس گز اور ضخامت چھ گز گولائی کی ہے۔ اس کے معماروں میں خواجہ صدرالدین تھے جو تعمیری کاموں میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔ وہ میر محمد ہمدانیؒ کے ساتھ ہی خراسان سے یہاں آئے تھے۔ اس کام میں سید محمد لورستانیؒ بھی شامل تھے۔ وہ بھی اس کام میں کمال رکھتے تھے۔ یہاں کے کاریگروں کی مدد سے اس مسجد کی تعمیر کا کام ۸۰۴ ہجری/۱۴۰۲ عیسوی میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔

بیجبہارہ میں سید محمد قریشیؒ کے مقبرہ کے پاس ایک مسجد تعمیر کی۔ بچھ بھون میں آپ نے خود ہی ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ ترال میں ۸۰۰ ہجری/۱۳۹۸ عیسوی میں اپنے والد حضرت امیر کبیرؒ کے نام پر اشاعتی طرز کی ایک خانقاہ تعمیر کی جس طرز کی سرینگر میں خانقاہ معلیٰ کی تعمیر کی تھی۔ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے نام پر پانپور میں بھی ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کی۔ اسی طرح ۸۰۱ ہجری/۱۳۹۹ عیسوی میں دچی پرگنہ شادرہ میں بھی ایک بڑی خانقاہ تعمیر کی۔ اسی طرح انہوں نے اور چھوٹی بڑی مساجد تعمیر کیں۔ اسلام کی ترویج کے لئے وہ دور دراز بھی گئے اور جگہ جگہ دینی مراکز، مساجد اور خانقاہیں بنائیں۔ پرانے دیوتاؤں کی اتنی کتابوں اور تحریرات کو دریا برد کرا کے ان پر ایک بند تعمیر کیا گیا جو توہم پرستی پر مبنی تھیں اور دیوتا

وغیرہ سے متعلق لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرتی تھیں۔ اصلاحِ معاشرہ کے لیے انہوں نے کافی کام سرانجام دئے اور بدعت و خلافِ شریعت رسم و رواج کا نام تک مٹا دیا۔

موقع کی مناسبت سے یہاں ایک اور اہم بات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے سلطان سکندر کے اس رویہ کے متعلق جس کی بنا پر انہیں بت شکن کہا جاتا ہے اور اُن کے وزیر ملک سیف الدین کی شخصیت مسخ شدہ صورت میں پیش کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ اسلام قبول کرنے سے قبل ملک سیف الدین کا نام ملک سہ بٹ تھا۔ جب میر محمد ہمدانیؒ وارد کشمیر ہوئے اُس وقت وہ سلطان سکندر کے سپہ سالار تھے چنانچہ جب وہ میر محمد ہمدانیؒ کی آمد پر اُن کے استقبال کے لئے گئے وہ آپکی ایک ہی نگاہ کے اثر سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جناب ابوالقاسمؒ نے فرمایا ہے کہ سلطان نے اُسے حضرت میرؒ کے استقبال کے لیے بھیجا تھا۔ جونہی اُن کو دیکھا فوراً مسلمان ہو گیا۔ سلطان نے جب پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو جواب دیا کہ میں نے جونہی انکو دیکھ لیا تو مسلمان بننے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض ہندو مورخین نے رنجش کی بنا پر اسے موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہوئے سلطان سکندر کو دبے لفظوں میں بت شکن قرار دیا اور فارسی مورخین نے بغیر چھان بین اسے بلا تحقیق بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اس ضمن میں محترم غلام [illegible] کے وہ حواشی قابلِ توجہ ہیں جو انہوں نے تاریخ کشمیر مصنف سید علی کے اُردو ترجمے میں لکھے ہیں۔ کم ترتیبی کے باوجود ان میں چند ایسے اشارے ملتے ہیں جنہیں یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جون راج کے بعد اس کے شاگرد شری ور پنڈت نے اپنی تاریخ "زینہ راج ترنگنی" میں کہیں بھی یہ بے بنیاد بات نہیں لکھی ہے کہ سلطان سکندر نے مندر توڑے تھے اور نہ ہی یہ بات لکھی ہے کہ سلطان سکندر بت شکن تھا اور نہ ہی ان دونوں مذکورہ مورخین

نے یہ بات لکھی ہے کہ سلطان سکندر نے کالی شری مندر منہدم
کرکے اس جگہ خانقاہ معلیٰ تعمیر کی ..... حالانکہ یہ دونوں سنسکرت
مورخین اس عہد کے ہم عصر مورخ تھے۔ یاد رہے کہ کالی شری مندر
کا نام کلہن پنڈت، جونراج، شری ور پنڈت، پراجیہ بھٹ
اور شُک پنڈت نے اپنی تواریخ میں کہیں بھی نہیں لکھا ہے.....
خانقاہ معلیٰ سلطان سکندر کا سرکاری مسافر خانہ تھا جسکو میر محمد ہمدانی
نے ایک لعل بدخشان کے عوض خریدا تھا۔ جسکا ذکر اس ڈاکومینٹ
میں ہے جو اب تک خانقاہ معلیٰ کی لائبریری میں موجود ہے۔"
خانقاہ کے نزدیک ہی ایک بودھ وہار تھا۔ اس کے پتھر ابھی تک اس جگہ ملتے ہیں جہاں ہندوؤں
نے سکھ دور میں ایک عبادت گاہ تعمیر کی تھی اور خانقاہ معلیٰ کی تعمیر میں اس کا کوئی پتھر استعمال
نہیں کیا گیا ہے۔ سکھوں کے دور حکومت میں اہل ہنود کے ایک فرقے کے اکسانے پر جب
سکھ گورنر اور اس کے نائب فولا سنگھ نے خانقاہ معلیٰ کو ڈھانے کے لیے توپ خانہ
مقرر کیا۔ مسلمانوں نے مزاحمت کی تو دعویٰ کیا گیا کہ یہ کالی شری مندر کی جگہ تعمیر کیا گیا ہے۔
جب اس بارے میں سند طلب کی گئی تو کسی بھی تاریخ یا دستاویز میں اس مندر کا نام ہی
نہیں ملا۔ مسلمانوں نے وہ ہرن کی کھال پر لکھا ہوا وثیقہ نامہ دکھایا جسکے مطابق یہ
جگہ سلطان سکندر کا مسافر خانہ تھا اور جسے ایک لعل بدخشان کے عوض خریدا گیا تھا البتہ
خانقاہ کے پاس جنوب میں ایک بودھ وہار تھا نہ کہ مندر۔ اس طرح سکھ گورنر اور سکھ
کمانڈر فولا سنگھ خانقاہ معلیٰ کو ڈھانے سے باز رہا۔ "شیرازہ" انگریزی میں جے ایل بھان کا
ایک مضمون چھپا ہے جس میں گنیش مندر، سرینگر سے برہما کی ایک مورتی برآمد ہونے کی بات
کی گئی ہے جس پر لکھی گئی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سلطان سکندر کی وفات سے چار سال
قبل وقف کی گئی ہے۔ جے ایل بھان نے اس ضمن میں جو سوالات اُٹھائے ہیں وہ قابل توجہ

ہیں۔ ایک یہ کہ اگر سلطان سکندر بت شکن تھا تو نئی مورتیاں نصب کرنے کی اُس نے کیوں کر اجازت دی؟ اگر وادی کے اطراف میں جگہ جگہ مندر توڑے گئے، تو شنکراچاریہ اور پاندریٹھن کے مندر کیوں نہیں توڑے گئے جو بالکل شہر کی حدود میں ہیں اور اب تک صحیح حالت میں ہیں۔ پٹن، پایر اور نارستان کے بڑے مندر اب تک کیوں کر موجود ہیں؟ دراصل جو پرانے مندر ویران ہوئے ہیں۔ وہ سکندر سے پہلے ہی شنکردرما۔ ہرش اور وغیرہ غیر ملکی حملہ آوروں نے لوٹ کر ویران کر دیئے ہیں۔ سلطان قطب الدین کا مقبرہ اس جگہ تعمیر ہوا ہے جہاں مندر کے آثار ملتے ہیں۔ اگر اس وقت ملک سیہ بٹ بھی مسلمان نہیں بنا تھا اور سلطان سکندر بقول جونراج اُس وقت بہت چھوٹا تھا تو یہ مقبرہ کیوں کر وہاں تعمیر ہوا اور بذات خود سکندر اور اسکی ملکہ کو کسی نے مندر کے آثار پر دفن کیا ہے۔ جبکہ سلطان سکندر کی ملکہ زین العابدین کے دور میں وفات پاگئی، جس نے ہندوؤں کو بہت ہی مراعات دی تھیں۔

یہ کہنا بھی بعید از قیاس ہے کہ اُس زمانے میں اتنی کتابیں دریا برد کی گئیں کہ جن پر ایک ستھو بنڈ تعمیر کیا گیا جو اَب تک موجود ہے۔ جب [illegible] زمانے میں کاغذ بہت ہی نایاب تھا اور اکثر عبارات بھوج پتر پر لکھی جاتی تھیں جو زیادہ دیرپا نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ بنڈ اب بھی پانی سے ڈھ نہیں گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ کتابیں دریا برد ہوئی ہوں۔ لیکن اِس بارے میں بھی مبالغہ آرائی عیاں ہے۔

چونکہ سلطان سکندر میر محمد ہمدانی ؒ سے زبردست متاثر تھا اور سلطنت کے کاموں میں بھی اُنہی سے مشورہ لیتا تھا اگر وہ بت شکن تھا تو سیدھی سی بات ہے کہ اس بارے میں وہ میر محمد ہمدانی ؒ کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاتا پھر کیونکر جونراج میر محمد ہمدانی ؒ کے متعلق لکھتا کہ "سید محمد ہمدانی ؒ ستاروں میں چاند ہیں"۔ ہم عصر ہندو مورخین نے اس دور کے متعلق اگر ایسی کوئی بات لکھی ہے تو شاید وہ اس رنجش کی بنا پر کہ ملک سیہ بٹ نے ہندو دھرم

چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔ بعد کے فارسی مورخین نے تنگ نظر بن کر اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ ایسی عبارات کے بے جا اثرات ذہن میں رکھ کر جب بھی کہیں کسی مورخ یا محقق کو کہیں زمانے کے ہاتھوں ویران شدہ مندر کے آثار ملے تو اسکی ویرانی کو سکندر سے منسوب کر کے اپنا دامن چھڑاتے رہے۔

تاریخوں میں ایسے واضح اشارات ملتے ہیں کہ میر محمد ہمدانیؒ اور ان کے والد بزرگوار کی تشریف آوری کے بعد یہاں کے تقریباً سبھی لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بودھ جو شاید سماجی اور اقتصادی طور ہندوؤں نے انتہائی پسپائی میں چھوڑے تھے، نفسیاتی دباؤ کے تحت بغیر چوں وچرا اسلام کے دائرے میں آئے اور اپنے وہاروں کو انہوں نے مسجدوں اور خانقاہوں میں تبدیل کیا ہوگا۔ ستی کی رسم سے متعلق اکثر تاریخوں میں ذکر آیا ہے کہ سلطان سکندر نے میر محمد ہمدانیؒ کے کہنے پر اس پر پابندی لگائی تھی جو بعد میں زین العابدین نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے اٹھا دی۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ کتنا عظیم انسانی فعل ہے کہ وقتی طور اگر ہندوؤں میں اس سے ناراضگی بھی ہوئی ہو لیکن آج چھ سو سال بعد لاکھ کوششوں سے ہندوستان میں اس انتہائی وحشیانہ حرکت کو بند کئے جانے کی ترکیبوں کے باوجود جانیں تلف ہو رہی ہیں۔ اس نکتۂ نظر سے تاریخ کے طالب علموں کے لیے سائنسی بنیادوں پر اس دور کا مطالعہ بہت ہی دلچسپ ہوگا اگر وہ تعصب کی عینک کو چھوڑ کر براہِ راست ماخذوں سے کام لیں۔ اس طرح سے شاید سلطان سکندر جیسے عظیم بادشاہ اور سلطان زین العابدین کے متعلق جو تاثرات اب قائم ہیں وہ بالکل ہی بدل جائیں۔ اس نکتہ نگاہ سے شاید سلطان شہاب الدین کی عظمت شایانِ شان طور سامنے آئے جس کے سامنے تمام راجہ اور بادشاہ کمتر دکھائی دیں۔

جیسا کہ پہلے ہی اشارہ دیا گیا کہ سلطان سکندر آپ کی تشریف آوری کے بعد ہی آپکے مریدوں میں شامل ہوئے۔ خاص سلطان کے لیے آپ نے علم تصوف پر ایک رسالہ "رسالہ سکندریہ" تصنیف کیا۔ اسکے علاوہ بھی میر محمد ہمدانیؒ نے ۴۵ رسالے لکھے ہیں۔ یہ

تمام تصانیف ظاہری اور باطنی علوم میں معتبر درجہ رکھتی ہیں۔ بزرگ صوفی حضرت جنید بغدادیؒ کے تحریرات سے یا تو متاثر ہیں یا ان دونوں کے خیالات میں زبردست مماثلت پائی جاتی ہے علوم ظاہری میں آپ نے منطق سے متعلق ایک کتاب "رسالہ شمسیہ" تحریر کی ہے۔ اس کتاب کو اکثر تذکروں میں شرح شمسیہ بھی لکھا گیا ہے۔ یہ بھی ذکر ہے کہ اس کتاب کو لکھنے میں آپ کو آپ کے والد کی باطنی طور نظرِ کرم سے مدد ملی ہے۔ چنانچہ یہ بھی درج ہے کہ سلطان سکندر کے دورِ حکومت میں جو بہت سارے علماء، فضلا، سادات اور دیگر علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ تھے۔ اُن میں قطب الاقطاب حضرت سید محمد حصاری شادمانیؒ بھی شامل تھے۔ جو آپ کے رشتہ دار بھی تھے اور عمر سے بزرگ بھی۔ چونکہ سلطان سکندر اُن کی بھی کافی عزت کرتے تھے۔ لیکن میر محمد ہمدانیؒ کی قیام گاہ پر ہمیشہ اور بلا ناغہ صبح اور شام آیا کرتے تھے۔ اس بات پر سید حصاریؒ سلطان سے رنجیدہ ہوئے اور سلطان سے شکوہ آمیز باتیں کیں کہ آپ ایک کم عمر لڑکے کے پاس بار بار جاتے ہیں اور مجھ جیسے ریش سفید کے پاس کم آتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کے درمیان مجالس بھی ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار سید محمد حصاریؒ نے ایک بحث کے دوران تکرار کی تو راتوں رات حضرت امیر کبیرؒ کی توجہ سے رسالہ شمسیہ تحریر کیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جب میر محمد ہمدانیؒ کو اس بات کا علم ہوا کہ سید محمد حصاریؒ مجھے کم مایہ سمجھتے ہیں تو اداس ہوئے۔ رات میں والد بزرگوار کی توجہ سے یہ کتاب لکھ ڈالی اور علاوہ ازیں ایک اور کتاب سلطان سکندر کو روانہ کی جو اُس نے سید محمد حصاریؒ کے پاس بھیجدیں۔ جب انہوں نے دیکھا تو اسلوب سے یہ اندازہ کیا کہ میر سید علی ہمدانیؒ کی تصانیف ہیں لیکن ان کی کلیات کا مطالعہ کیا تو دونوں رسائل اُن میں نہیں پائے۔ باطنی طور جانچ کی تو پتہ چلا کہ میر محمد ہمدانیؒ کو اویسی رتبہ حاصل ہے۔ صبح ہوئی تو خود آپ کے پاس چلے آئے اور اجازت نامہ لکھ کر دیا۔ مؤرخ حسن لکھتے ہیں کہ:

"ایک دن سید محمد حصاریؒ شیر پر سوار ہو کر حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ

کے سامنے سے گزرے اسی وقت آپ نے جائے نماز دیوار پر ڈالی
اور سوار ہوکر سید محمد حصاریؒ کے آگے نکل گئے اور فرمایا اے
شیخ جو کچھ آپ نے کیا جان آزاری ہے اور جو کچھ میں نے کیا خودداری
ہے۔ کام نہ تو تند خو خشم ناک شیر کو ماتحت بنانا ہے اور نہ بے جان
دیوار کو فرمانبردار بنانا بلکہ مدعا و مقصد اللہ تعالیٰ کی دائمی حضوری
اور دیدار ہے۔"

اسکے بعد کدورت دور ہوئی اور سید محمد ہمدانیؒ کو تربیت سے نواز کر خلافت نامہ لکھ کر دیا۔ حضرت محمد ہمدانیؒ کے خاص مریدوں اور رفقاء میں سید احمد سامانی بن کمال الدین بن محمود سامانی ہیں جو شرح فرائض کے شارح ہیں۔ قاضی حسین شیرازی جو شہر میں قاضی کے عہدے پر فائض تھے انہوں نے احادیث کے متعلق ایک کتاب بھی تحریر کی تھی جسکا نام چند تاریخوں اور تذکروں میں رسالہ رینیہ اور چند ایک میں رسالہ رتنیہ لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ کتاب ابتک مل نہیں پائی ہے۔ علاوہ ان کے خاور نامہ اور شرح لمعات کے مصنف سید محمد خاوریؒ، سید علاؤالدینؒ، سید فخرالدینؒ، سید تاج الدینؒ، شیخ جلال الدین بخاریؒ، سید علی اکبرؒ، سید نورالدینؒ سید حسین خوارزمیؒ، سید محمد مدنیؒ، سید محمد حصاری شادمانیؒ، سید زیرکؒ، سید محمد حبیبؒ، سید محمد زندہ پوشؒ، سید کمالؒ، سید عبداللہؒ، سید حاجی محمدؒ، سید نورالدین محمدؒ، سید محمد مدنیانؒ، سید حسین منطقیؒ، سید محمد نورستانیؒ، سید حسن منطقیؒ، سید محمد اصفہانی المعروف سید جانبازؒ، سید محمد خاوریؒ، سید احمد سامانیؒ، سید محمد افضلؒ، سید حبیبؒ، سید خلیلؒ اور سید علی اکبرؒ وغیرہ وہ نام ہیں جن کے ساتھ آپکے زبردست روحانی روابط اور مراسم تھے۔ اور آپکے دوش بدوش یہاں اسلام کی ترویج کے لئے زبردست کوششیں کرتے رہے۔ مذکور ہے کہ سلطان سکندر کے دونوں بیٹوں یعنی میران خان جو علی شاہ نام سے مشہور ہے اور شاہی خان جو سلطان زین العابدین بڈشاہ کے نام سے مشہور ہوا نے آپ ہی سے قرآن پاک کی تعلیم اور ظاہری و باطنی تربیت

حاصل کی۔

کشمیر کی تاریخوں کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ میر محمد ہمدانی رح کی شادی یہاں ہی سید حسن بہادر کی بیٹی بی بی تاج خاتون سے ہوئی۔ لیکن پانچ سال بعد وہ انتقال کر گئیں اور ملک مسعود ٹھاکور کے مقبرے کے متصل فتح کدل کے پار دفن کی گئیں۔ سید حسن بہادر سلطان شہاب الدین کا سپہ سالار تھا۔ انہوں نے اُسے رستم کے خطاب سے نوازا تھا۔ ہندوستان فتح کرنے کے بعد فیروز شاہ نے اُسے اپنی بیٹی نکاح میں دی تھی۔

بی بی تاج خاتون کی وفات کے بعد سلطان سکندر نے میر محمد ہمدانی رح کا نکاح ملک سیف الدین کی بیٹی بی بی بارعہ سے پڑھوایا۔ ایک سال بعد (بقول حسن تین سال بعد) وہ بھی چل بسیں اور موضع کوٹر (کرالہ پورہ) جہاں میر سید محمد ہمدانی رح نے باغ تعمیر کیا تھا دفن کی گئیں اور آج کل وہ "دیدہ موج" نام سے مشہور ہیں۔

میر محمد ہمدانی رح کی اولاد میں سے تین بیٹوں کا ذکر ملتا ہے وہ ہیں سید شمس الدین ختلانی، سید علاؤالدین اور سید محمد عمر۔ ہمدانی سادات ایران اور برصغیر ہند و پاک کے مختلف شہروں اور دیہات میں رہتے ہیں۔

میر محمد ہمدانی رح نے کشمیر میں تقریباً بائیس برس قیام کیا تاہم چند مورخین نے لکھا ہے کہ وہ کشمیر میں بارہ برس رہے۔ لیکن یہ بات تحقیق کی رُو سے صحیح نظر نہیں آتی کیونکہ میر محمد ہمدانی رح سلطان سکندر کے دورِ حکومت میں ۷۹۶ ہجری / ۱۳۹۴ عیسوی میں کشمیر آئے تھے۔ خانقاہ معلیٰ میں چند ایسی دستاویزات موجود ہیں جو ہرن کی کھال پر لکھی گئی ہیں اور ان پر سلطان سکندر اور سید محمد ہمدانی رح کی مہریں ثبت ہیں۔ چنانچہ وثیقہ نامہ پر جو میر محمد ہمدانی رح اور سلطان سکندر کے درمیان طے پایا تھا اس پر ۷۹۷ ہجری / ۱۳۹۵ عیسوی لکھا ہوا ہے اور خطِ ارشاد جو حضرت شیخ العالم کو دیا گیا ہے اس پر ۲۵ رجب المرجب ۸۱۴ ہجری / ۱۴۱۱ عیسوی درج ہے۔ اس طرح سے ان دستاویزات کے درمیان تقریباً اٹھارہ سال کا وقفہ بنتا ہے لہٰذا ان

باتوں کی روشنی میں یہی صحیح مانا جائے کہ آپ نے یہاں بائیس برس قیام کیا۔
تاریخ حسن کے مطابق سید محمد حصاری ؒ سے دوبارہ رنجش کی بنا پر آپ یہاں سے ہی نوکر چاکر اور لشکر لے کر اور سلطان سے اجازت لے کر ۷۸۱ ہجری / ۱۳۸۱ عیسوی میں حج بیت اللہ شریف کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں سے واپسی پر آپ ختلان چلے گئے۔
بقول سید علی مورخ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ سلطان سے رخصت لے کر ۷۸۱ ہجری ۱۳۸۱ عیسوی میں بارہمولہ کے راستے واپس طالقان چلے گئے۔ بارہمولہ میں دارہ مسجد تعمیر کرنے کے بعد کولاب روانہ ہوئے۔
منگلوار ۱۷ ربیع الاول ۸۵۴ ہجری / ۱۴۵۰ عیسوی میں انتقال کر گئے اور آپکی ابدی آرامگاہ آپکے والدِ بزرگوار کے مرقد پُرانوار کے ساتھ ہی ہے۔ یہ مزار کولاب شہر (تاجکستان) کے مشرق میں واقع ہے اور مزار سید علی ہمدانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تاجیک فن تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ عمارت پکی اینٹوں سے بنی ہے جن پر چونے کا پلستر کیا گیا ہے۔ مزار میں داخل ہونے کیلئے شمال میں دو راستے اور مشرق اور جنوب میں ایک ایک راستہ ہے۔ یہ گیارہ کمروں پر مشتمل ہے جن میں سے دو بڑے اور نو چھوٹے کمرے ہیں۔ وسط میں سید علی ہمدانی ؒ کا روضہ ہے۔ اس خانقاہ میں آپکے فرزند میر سید محمد ہمدانی ؒ اور ان کی اولادوں میں سے کچھ، میر محمد ہمدانی ؒ کی پھوپھی "ماہ خراسانی" اور ایک خاتون "آفتاب ہمدانی" دفن ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے مزار اور مسجد کے متولی طالقان کے ایک شیخ بھی اسی مزار میں دفن ہیں۔
اس مزار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور نے بنوایا تھا۔ اور اسکا پتھر وہی ہے جیسا سمرقند میں تیمور کی قبر پر لگا ہے۔ اگر یہ صحیح مانا جائے تو ان تاریخی بیانوں پر از سرِ نو غور کرنا ہوگا جن کے مطابق امیر تیمور گورگانی اور میر سید علی ہمدانی ؒ اور اُن کی خاندان کے افراد کے درمیان رنجش تھی۔ یا یہ ماننا پڑے گا کہ امیر تیمور بعد میں میر سید علی ہمدانی ؒ کے ساتھ ناروا سلوک پر پشیمان ہوا ہوگا اور اپنی پشیمانی دور کرنے کی کوشش میں یہ مزار

بنوایا ہو۔ اس بارے میں بھی روایت ملتی ہے کہ امیر تیمور میر سید علیؒ کا ارادتمند ہو گیا تھا۔ چنانچہ امیر تیمور کے پوتے کا مقبرہ بھی اسی مزار کے قرب میں واقع ہے لہٰذا یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جس لوح پر حضرت امیرؒ کے حالات درج ہیں وہ اسی نے کندہ کروائے ہوں اور اسکی آپ کے ساتھ زبردست عقیدت رہی ہو۔

۔ کتاب نامہ

- مولانا نور الدین جعفر بدخشی۔ خلاصۃ المناقب (قلمی نسخہ۔ ریسرچ لائبریری سرینگر)
- عبدالوہاب نوری۔ فتوحات کبرویہ (" " ")
- ملا حیدر بدخشی۔ منقبت الجواہر (اردو ترجمہ مولوی محمد ابراہیم)
- سید علی کشمیری۔ تاریخ کشمیر (کشمیری ترجمہ۔ بشر بشیر)
- حسن شاہ کھویہامی۔ تاریخ حسن (تذکرہ اولیائے کشمیر) اردو ترجمہ مولوی محمد ابراہیم)
- محمد اعظم دیدہ مری۔ واقعات کشمیر۔ (قلمی نسخہ۔ ذاتی لائبریری)
- سید علی گوہر۔ روضۃ الانساب سادات
- بہاء الدین متو۔ ریشی نامہ۔ (کلچرل اکیڈمی)
- بابا داؤد مشکواتی۔ اسرار الابرار (اردو ترجمہ)
- صوفی۔ جی ایم۔ کشیر (انگریزی) • کاشر انسائیکلوپیڈیا (کلچرل اکیڈمی)
- ہمارا ادب۔ مشاہیر نمبر ۱، ۲، ۳ (کلچرل اکیڈمی)
- شمس العارفین (کلچرل اکادمی) • ریشیات (")
- علمدار۔ کشمیر کلچرل آرگنائزیشن • شیخ العالم۔ کلچرل اکیڈمی
- شیرازہ، کشیری، اردو، انگریزی۔ (فائل) — کلچرل اکیڈمی



غلام نبی گوہر

حضرتِ سیّد عالی بلخی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سید محمد عالی بلخیؒ کا آستانہ عالیہ بکھپر پورہ میں ہے۔ حضرت سید عالیؒ حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کے معروف خلفا میں سے ہیں۔ جس طرح حضرت شیخ نور الدینؒ کے دیگر خلفا مثلاً حضرت بام الدینؒ، حضرت زین الدینؒ، حضرت لطیف الدینؒ وغیرہ کے حالاتِ زندگی اُن کے مرشد کے واقعاتِ حیات کے ساتھ خلط ملط ہو چکے ہیں اُسی طرح حضرت سید عالی کے بارے میں بھی جو تذکرہ ریشی ناموں میں ہوا ہے وہ "کراماتِ شیخؒ" کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ الگ سے شیخ موصوف کا کوئی مفصّل یا اجمالی تذکرہ موجود نہیں ہے۔ یہ بتانا مناسب ہے گا کہ حضرت شیخ العالمؒ کے بارے میں جو بھی تذکرے قلمبند کئے گئے ہیں اُن کی پُوری ضخامت "کراماتِ شیخؒ بیانی" پر ہی صرف ہوئی ہے اور ان کرامات میں بھی ایسے واقعات دہرائے گئے ہیں جو پورے کے پورے خرقِ عادت لگتے ہیں، حالانکہ حضرت کے خلوصِ عمل کا اس سے بڑا اور کیا معجزہ ہو سکتا ہے کہ بُمہ زُو کے ایک ایسے برہمن کو آپ کے فیض نے بابا بام الدینؒ بنا دیا جو اپنی زندگی کے ابتدائی چالیس برس نورِ معرفت سے بیگانہ رہ کر گزار چکے تھے۔ دور اُفتادہ "پلماڑ" کے آزادانہ ماحول میں پلے بڑھے جواں سال راجپوت جے سنگھ کو ولایت کی رفعتوں پر پہنچانا فضا کی وسعتوں کو مغلوب کرنے سے زیادہ کٹھن ہے کہ کردار سازی کا عمل آئینہ سازی کے عمل سے ہزار درجہ مشکل ہے مگر ہمارے بیشتر تذکرہ نگار اس حقیقت کو نظر انداز کر بیٹھے کہ اس شفیق اُستاد کے فیضِ نظر کا یہ کتنا بڑا کارنامہ تھا کہ ایک اکھڑ دیہاتی "اُوتر" کو بابا نصر الدین بنا دیا اور سنگ و خارا کی پرستش کرنے والے لدی رینہ کو بابا بام الدینؒ یا ایک مشرکانہ ماحول میں پلی بڑھی دیہاتی لڑکی کو نہ صرف مئے

عرفان سے سرشار کیا بلکہ اُس کے نطق کو اعجازِ مسیحائی عطا کیا۔ مگر اِن حقائق کے باوجود "ریشی ناموں" کے مصنفین نے ایک سادہ مگر پُر کار حیات کی ایسی حاشیہ آرائی کی کہ ہمیں اِنسان اور مومن شیخ نورالدینؒ کو ڈھونڈنے کے لئے عالمِ ملکوت یا عالمِ جنیات میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے جب کہ عصرِ حاضر میں مصر کے مرحوم محمد ہیکل نے حیاتِ طیبہ کے سیرتی ادب میں ایک نئے اور نمایاں باب کا اضافہ کیا ہے اور اُن کی کتاب کا دُنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور انگریزی میں یہ PROPHET MOHAMMAD SW کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب کے دیباچے میں فاضل مصنف نے عذر خواہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُس نے معجزاتِ رسول کا بہت کم تذکرہ اس لئے کیا ہے آپکے دو بڑے معجزات قرآن مجید اور اُن کی حیاتِ طیبہ کے واقعات ہیں۔ ناچیز کی دانست میں حضرت نورالدینؒ کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ انہوں نے اُسوۂ حسنہ کے سانچے میں اپنی حیات کو ڈھالا اور پھر بھی کہتے رہے ــــ "اسہِ نِن دوزخس تَس روزِ کتھ" ــــ دوزخ کے بدترین عذاب سے زیادہ عذاب دہ آپکے لئے وہ گھڑی ہوگی جب ہمارے اعمال کی وجہ سے ہمارے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشِ ربِ جلیل نادم ہونا پڑے مگر ہم نے اِس عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، پرخلوص مبلغ اور بیباک مجاہد کی عاشقانہ، مبلغانہ اور مجاہدانہ حیات کو اساطیری داستانوں کی دُھند میں چھپا دیا ہے۔

چونکہ حضرت سید عالی بلخیؒ کا تذکرہ حیات بھی کرامات بھری داستانِ شیخؒ سے جوڑا گیا ہے اسلئے اُن کا سارا حال و احوال ہمارے لئے دستیاب ہونا ناممکن ہوا ہے۔ نتیجتاً موصوف کے حسب و نسب، زاد بوم اور دیگر حالاتِ زندگی سے متعلق مواد نہ ہونے کے برابر دستیاب ہے۔ جو کچھ ہے اُس میں بھی تضاد بیانی پائی جاتی ہے۔ چونکہ راقم نے اِن ماخذوں کی صحت کو ہی چیلنج کیا ہے اس لئے لازم ہے کہ کچھ مختصر مثالیں پیش کروں ورنہ یہ مضمون ناقص رہے گا۔

حضرت شیخؒ کی حیات کے بارے میں اِن تذکرہ نویسوں نے اتنی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے کہ حقائق کا دریافت ہونا بمصداق کوہ کندن وکاہ برآوردن سعئی لاحاصل بن گیا ہے۔ انہوں نے کلامِ شیخؒ کا (جنہیں عرفِ عام میں "شیخہ شرُک" کہا جاتا ہے) کوئی نہ کوئی شانِ نزول ثابت کرنے کے لئے پسِ منظر کی داستانیں وضع کی ہیں۔ آپ کی ایک مشہور تمثیلی اور علامتی نظم (ہُون چھوٗ دپان وَو بہ وَو) نقل کرتے ہوئے اِن اصحاب نے ایسا پسِ منظر جوڑا ہے جس سے صاف لگتا ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے دانستہ اور شعوری طور آپ کو چوروں کی صحبت میں ڈالا تھا بلکہ خود بھی "حرام غذا پر پلی تھی" جب کہ یہی تذکرہ نویس حضرات خود لکھ چکے ہیں کہ سدٗرہ موج، والدہ حضرت شیخؒ "ایک غریب بیوہ ہونے کے باوجود ایسی باغیرت خاتون تھیں کہ انہوں نے اپنے فرزند کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مکتبوں کی خاک چھانی۔

اِس سے اُنکے دنیاوی شعور (WORLDLY WISDOM) کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے اور اُن کی خدا ترسی اور عابدہ ہونے کے بارے میں یہی تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں اور لکھتے ہیں کہ آپ باپیر زاہدہ تھیں۔ حضرت یاسمن ریشی اور حضرت سید سمنانی سے تربیت حاصل کرتی رہیں۔ بقولِ بابا نصیب الدین وہ اُن کے (نصیبؒ صاحب کے) اِس گھر کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ اِن ہی کی روایت ہے کہ جب حضرت شیخ شکم مادر میں تھے تو آپ نے حضرت امیرؒ سے شکایت کی تھی کہ پنج گانہ نمازوں کے وقت آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہے جس پر انہوں نے رُو بہ مشرق رہنے کی ہدایت کی۔ ایسے ولیٔ کامل کی صحبت سے استفادہ کرنے والی نیک خاتون کے بارے میں یہ لکھنا کہ وہ اپنے سوتیلے بیٹوں شُشں اور گندرو کی حرام کمائی پر بسر اوقات کرتی تھیں، کتنی بڑی تضاد بیانی اور بہتان تراشی ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ اس عظیم خاتون کی کردارکشی کے بھی مترادف ہے۔

دوسرے واقعے کا تذکرہ کرنا بھی ضروری لگتا ہے۔ مرحوم عبدالاحد آزاد نے بھی اِس واقعہ کو پوری تضاد بیانی کے ساتھ ہی نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو کشمیری زبان اور شاعری۔ ص۔ (۱) ۵۶ اور (۱) ۷۹) یہ واقعہ سید غلام الدین صاحب کے بارے میں ہے۔ ایک جگہ ان ریشی ناموں میں لکھا گیا ہے کہ وہ ۷۸۶ھ میں حضرت امیرؒ کے موذنِ خاص کی حیثیت سے اُن کے ہمراہ کشمیر آئے تھے اور جب حضرت امیرؒ نندہ ریشیؒ سے کیموہ میں ملے تو اُن کے دل میں خدشات پیدا ہوئے کہ ایک اعلیٰ النسب سیّد عالم ایک اُمّی طفل کے پاس آیا ہے تو حضرت امیرؒ نے غلام الدّین صاحبؒ پر حقیقت واشگاف کرنے کے لئے اُنہیں صحبتِ نورالدینؒ میں چھوڑ دیا۔ پھر ان ہی تذکروں کے مطابق یہی غلام الدّین صاحبؒ کوئی تیس سال بعد حضرت امیرؒ کے فرزند جناب سید محمد ہمدانیؒ کے موذنِ خاص بنائے جاتے ہیں اور انہیں میر ہمدانیؒ کے ہمراہ نُندہ ریشی کے ساتھ ملایا جاتا ہے اور اُس کے دل میں ایسے ہی خدشات پھر پیدا ہو جاتے ہیں اور میر ہمدانیؒ اُنہیں صحبتِ نورالدینؒ میں یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر دونوں ہی جگہ پر لکھا جاتا ہے کہ یہ سیّد غلام الدینؒ تھید علاقہ پھاگ میں دفن ہیں۔

اس تضاد بیانی کے ہی پسِ منظر میں ہیچ قسم تذکرہ سیّد عالیؒ کے بارے میں بھی اِن ریشی ناموں میں موجود ہے اور ان ہی اندراجات سے ہمیں موصوف کے بارے میں کچھ حالات و واقعات حاصل کرنے کی تفتیش و تحقیق کرنا ہے کیونکہ کوئی اور ماخذ دستیاب نہیں اور نہ کہیں اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔ راقم کی رائے میں حضرت سید عالیؒ کا ذکر بھی اُس تذکرہ اولیائے کشمیر میں موجود ہوگا جو عدیمی صاحب نے پندرھویں صدی میں لکھا تھا مگر اُس تک تاحال ہماری رسائی نہیں ہے۔

حضرت بابا نصیب (م ۱۰۴۷ء) کے ریشی نامہ میں حضرت بابا بام الدّین کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے اگرچہ

یہ کتاب حضرت شیخ العالمؒ کے وصال کے قریب دو سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ اس طرح تاحال اس عظیم المرتبت شخصیت اور اُن کے خلفائے کے بارے میں پہلی مفصل دستاویز دستیاب ہے "اسرار الابرار" ——— مشکواتی صاحبؒ کی تصنیف بھی ان کے ذکر سے محروم ہے۔ مولانا عبدالوہاب شائق کے "ریاض الاسلام" اور مُلا بہاؤالدین متو کے "ریشی نامہ روح افزا" میں بھی ذکرِ سید عالی موجود نہیں ہے۔ البتہ ۲۹-۱۸۲۸ء میں نثر اور نظم میں باباکمال (چرار شریف) کے "ریشی نامہ" "عنبر شمامہ" اور "نور نامہ" منظوم میں حضرت سید موصوف کا تذکرہ ہے لگتا ہے کہ حیاتِ سید موصوف یا اُن سے منسوب واقعات کو بیان کرنے کی غرض سے یہ تذکرہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ محض حضرت شیخؒ کی روحانی قدر و منزلت ظاہر کرنے کے لئے اور اُن کی کرامات کو واضح کرنے کے لئے حضرت سید موصوف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا ہی بابا محمد خلیل (چرار شریف) نے بھی اپنی ضخیم کتاب "روضۃ الریاض" میں کیا ہے۔ ان دونوں مصنفین میں اس حد تک اختلاف ہے موخر الذکر کا کہنا ہے کہ حضرت سید صاحب موصوف کے والدِ بزرگوار جب اِس دُنیائے فانی سے رحلت کر گئے اُس وقت حضرت سیدؒ کی عمر ایک سو سال سے تجاوز کر چکی تھی جبکہ باباکمال کے مطابق آپ عین شباب میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے اور اعیانِ سلطنت نے آپ کو بلخ کے تخت پر اپنے والد کی جگہ جلوہ افروز ہونے کی گزارش کی لیکن آپ نے تاج و تخت چھوڑ کر صالحانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

اِن واقعات سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں آزاد مرحوم نے اپنی تصنیف "کشمیری زبان اور شاعری" کی جلد دوم میں اُن کا تذکرہ کیا ہے اِن نگارشات کی روشنی میں حضرت سیدؒ موصوف کے بارے میں ہمیں چند معلومات حاصل ہوتی ہیں جیسے کہ حضرت سیدؒ بلخ کے شہزادے تھے۔ آپ کے والدِ ماجد جب تخت و تاج چھوڑ کر واصل بحق ہوئے تو بقول بابا خلیل اللہ، آپ کی عمر سو سال تھی اور بقولِ باباکمال آپ عالمِ شباب میں تھے۔ درباریوں اور اُمرا نے آپ سے تخت و تاج سنبھالنے کی استدعا کی۔ آپ نے حکم دیا کہ تمام خزائن پیش کئے جائیں تاکہ سارے دریا بُرد کرنے کے بعد خدا طلبی کے لئے سفر اختیار کرسکیں مگر ایک وزیرِ باتدبیر کی رائے حاوی رہی اور دولت دریا بُرد کرنے کے بجائے غربا میں تقسیم کی گئی۔ خود آپ معہ اہل و عیال ملک چھوڑ کر نکل پڑے۔ کوئی اثاثہ ساتھ نہ تھا۔ دورانِ سفر آپ کی رفیقۂ حیات انتقال کر گئیں۔ حضرت سیدؒ کو زبردست صدمہ ہوا اور اُن کے دونوں بچوں کو بھی والدہ کی شفقت کی محرومی کا بے انتہا دُکھ ہوا۔
اس حالت میں حضرت سیدؒ کے دل میں رہبرِ کامل کی طلب اور شدت اختیار کر گئی۔ ایک شب خواب میں آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو آپ نے دیکھا کہ دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک نوعمر عجمی آپؐ کے قریب بیٹھے ہیں۔ حضرت شاہ ولایتؐ سے ان کے بارے

میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نورالدین کشمیری ہیں پھر دستر خوانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر آپؒ کو ضیافت کھلائی گئی اور ضیافت کے آخر پر لذیز کھجور پیش کیے گئے یہ بشارت پاکر آپ اپنے ایک فرزند کو سُرخ لباس پہنا کر واپس بلخ لے آئے اور اُسے تخت پر بٹھایا اور دوسرے کو سبز لباس میں ملبوس کر کے اپنے ہمراہ کشمیر لے آئے۔

اُن دنوں حضرت شیخ رُدپہ وَن میں گوشہ نشین تھے۔ آپؒ کو کشف ہوا کہ ایک خاص مہمان بلخ سے آرہے ہیں۔ تو آپؒ بابا نصر کو ساتھ لے کر اُن کے استقبال کے لئے چل دیئے۔ بکھری پورہ کے مقام پر حضرت شیخؒ اور سید موصوف کی ملاقات ہوئی تو حضرت سیدؒ نے خواب کا تذکرہ کیا اور پھر کھجوروں کی لذت کا خصوصاً ذکر کیا۔ اس پر حضرت شیخ نے پیراہن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ گٹھلیاں پیش کیں جو اُن کھجوروں کی تھیں جو دستر خوان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؒ نے چُن لی تھیں جب وہ حضرت سیدؒ کو پیش کیے گئے تھے۔ رات کو میزبان اور مہمان یہاں ایک گڈریئے کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ حضرت سیدؒ کے دل میں خیال آیا کہ آیا اُن کا ہونے والا رہبر عالم ہے یا اُمّی تو انہوں نے اپنے اطمیناں کیلئے حضرت شیخ سے کہا کہ حضور مجھے توحید کے بارے میں کچھ احادیث یاد ہیں مگر پتہ نہیں کہ صحیح ہیں یا موضوع ...... حضرت شیخ نے کہا "چلئے صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیں پھر دونوں دربار نبویؐ میں پہنچتے ہیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی اِن احادیث کی صحت کے بارے میں استدعا کی جاتی ہے۔

اب آپ دیکھ لیجئے کہ مؤرخین نے حضرت سیدؒ کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ اکثر مورخین ان کے بارے میں خاموش ہیں یا یہی کچھ لکھنے پر انہوں نے اکتفا کیا ہے کہ آپؒ کو خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار سے نورالدین کشمیریؒ سے راہبری حاصل کرنے کی بشارت ملی تھی۔ البتہ مؤرخ پیر حسن شاہ کھویہامی نے ذرا تفصیل سے اس بارے میں لکھا ہے، وہ بھی چند سطروں میں جو من وعن پیش خدمت ہیں۔

"بلند رتبہ سیدوں میں تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات سے بھرپور، ریاضات وعبادات میں چمکدار موتی۔ سلطان سکندر کے زمانے میں کشمیر آئے، بکھری پورہ میں سکونت اختیار کی۔ شیخ نورالدینؒ سے طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ سلطان زین العابدین نے پرگنہ ناگام میں جاگیریں مقرر کیں۔ آل واولاد کے ساتھ وہیں دفنائے گئے۔"

ان تذکروں میں کراماتِ شیخ رحؒ کے ضمن میں ایک اور واقعہ یوں درج ہے کہ ایک بار پیر کامل نے اپنے دستِ مُرید کو رنجیدہ خاطر پایا۔ استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ رنجیدہ اسلیئے ہیں کہ والدین کی

قبور کی زیارت سے محروم ہیں۔ طئے مکان سے مرشد نے طالب کو بلخ پہنچا دیا اور ہدایت فرمائی کہ اپنے آبا کے قبرستان کی نشاندہی کریں۔ انہوں نے مقبرۂ مذکور پر پہنچ کر ایسا ہی کیا اور نشان شدہ قطعۂ ارض کو حضرت شیخؒ نے (قبور سمیت۔) پکھری پورہ پہنچا دیا جو اب بھی الگ سے مخصوص ہے۔

ایہاں اس حد تک اتفاق پایا جاتا ہے کہ حضرت سیدؒ اپنے مرشد کے واصل بحق ہونے کے بعد اٹھارہ سال تک بقیدِ حیات رہے اور انہوں نے محرم الحرام ۸۶۰ھ سنہ میں وفات پائی۔ اُن کا روضہ پکھری پورہ[۱] میں مرجعِ عقیدت عام و خاص ہے۔ یہاں ہر سال اسوج[۲] کے مہینے میں عرس چاند کی چودھویں کو منایا جاتا ہے

۱۔ پکھری پورہ کا دور افتادہ گاؤں صحت افزا مقام یوسمرگ کے دامن میں اور نالۂ روشی کے قرب و جوار میں واقع ہے اور حضرت سید عالیؒ کی ذات بابرکت کی وجہ سے بہت مشہور رہے اور آپؒ کے آستانۂ عالیہ (قدیم) کی طرزِ تعمیر دوسرے ریشی آستانوں سے مختلف نہیں جس میں پنجرہ کاری کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے تھے۔ تعمیر جدید میں بھی قدیم طرزِ تعمیر کو ہر رنگ سے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اِس متبرک مقام کی مدح میں شاعرِ کشمیر مہجور مرحوم نے ایک پُر مغز غزل کہی ہے جسے انہوں نے ہزاروں سامعین کی موجودگی میں پڑھا اور داد حاصل کی۔ غزل پڑھ چکنے کے بعد صدرِ محفل نے مہجور مرحوم کی تعریف کرتے ہوئے انہیں "اقبالِ کشمیر اور ٹیگور کشمیر" کے خطابات سے نوازا۔ اس پس منظر میں اس وقت کے دو اہم شاعروں مہجور اور آزاد کی باہمی چشمک بھی منظرِ عام پر آئی اور یہ واقعہ پکھری پورہ کو ہماری ادبی تاریخ میں جگہ دیتا ہے اور اسی بنا پر یہاں اِس کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب مہجور مرحوم کی مذکورہ غزل کا تذکرہ آزاد مرحوم سے چرار شریف میں ہوا اور انہیں یہ بتایا گیا کہ مہجور کو کشمیر کا اقبال اور ٹیگور کہا گیا تو آزاد مرحوم نے ایک تضمین لکھی جس کے دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاکہ تعلقاتِ مہجور اور آزاد پر قلم اُٹھانے والوں کو کچھ اشارات بہم ہوں۔ سہ

۱
اقبال صاٗبن وانتو انسان عرشس پیٹھ
مہجور صاٗبن ووئے نمبکھ نارِ پکھرا پہ ر

۲
ٹیگور صاٗبن ڈِژ وسعت انسانی خیالن
مہجور صاٗبن بوز مگر نٹہ وارِ پکھر لور

●

۲۔ شمسی کلینڈر کے لحاظ سے یہ عرس اگست کے مہینے میں منایا جاتا ہے (انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۲)

اور میلہ بکھری پورہ برابر ایک ماہ تک جاری رہتا ہے جس میں بڑی گہما گہمی رہتی ہے۔ اطراف واکناف سے زائرین آتے ہیں میلے کا تفریحی پہلو بھی ہے۔ پہلوان اپنے کرتبوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے موسیقار اپنی فنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے، تاجر اور سوداگر اپنی اشیاء بیچنے کے لئے یہاں مہینہ بھر رہتے ہیں جن میں آلاتِ کشاورزی فروخت کرنے والوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

آج تو ذرائع رسل و رسائل عام ہیں اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا تھا۔[1] اس بازار مصر میں حسنِ یوسف کی خریداری کے لئے زلیخا بھی سرگرداں رہتی ہے اور غریب و نحیف معمر خواتین بھی متاعِ حیات کو داؤ پر لگانے کے لئے آتی ہیں۔ شاید اسی لئے مہجور مرحوم نے کہا ہے۔؎

بُتہ آس تُجِہ ہند پاٹھو لاراں سُتہ گونا ہستھ
یوسف چھُہ یِوان گننہ در بازارِ بکھر پور[2]

مذکورہ بالا "مبہم مواد" کے پس منظر میں کچھ اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کے جواب کے لئے راقم اور راقم کے ہم عصر قلمکاروں کو مکتفی جواب ڈھونڈنے کے لئے تحقیق و تجسس سے کام لینا لابدی بنتا ہے۔

● کیا حضرت سید عالیؒ بلخ کے بادشاہ یا شہزادہ تھے۔؟

اِس ضمن میں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ بلخ وسطِ ایشیا میں واقع ہے اور چودھویں کے آخر پر اور پندرہویں صدی کی ابتدا میں تیمور نے چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو ختم کر کے وسطِ ایشیا میں ایک عظیم چغتائی سلطنت قائم کی تھی۔ اُس نے دُور دُور تک فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اپنی سلطنت کو وسیع سے وسیع تر کیا۔ اسطرح اِس مملکت میں بلخ کا جداگانہ اور مطلق العنان وجود تسلیم کرنا قرینِ قیاس نہیں۔ میرے خیال میں حضرت سیدؒ کے والدِ ماجد کو سیادت، ریاضت اور علم و دانش کے علاوہ قدرت نے وافر مال و زر بھی عطا کیا تھا اور اِسی کو تذکرہ نویسوں نے پادشاہی کی حدود تک پہنچا دیا۔

● حضرت سید سلطان سکندر کے عہد میں واردِ کشمیر ہوئے تھے یا سلطان زین العابدینؒ بڈشاہ کے دورِ حکومت میں۔؟

مؤرخ حسن کا قول ہے کہ آپ عہدِ سکندری میں یہاں تشریف لائے جب کہ تذکرہ نویسان حضرت

---

[1] راقم کے بچپن میں بھی پلوامہ اور بڈگام سے لوگ راتوں کو جلوس کی صورت میں آتے رہتے تھے۔ ہر جلوس کے ساتھ مخصوص لَے میں "پد" گانے والے فنکار آگے آگے ہوتے اور "پد" گاتے تھے۔ جلوس میں شامل لوگ مصرعہ اوّل کو خوش الحانی سے دہراتے رہتے تھے مرحوم عبدالغفار خان لوجرہ کا فن یہیں اُبھرا اور نکھرا۔

[2] کلیاتِ مہجور میں مہجور صاحب کا یہ غزل نہ معلوم کیوں شامل نہیں ہے۔

شیخ خصوصاً بابا کمال اور بابا خلیل اللہ اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ جب حضرت سید موصوف کے وارد کشمیر ہونے کا حال حضرت شیخ نورالدین رح کو بکشف معلوم ہوا جو اُن ایام میں رُوپہ وَن میں تھے، وہیں سے آپ بابا نصر صاحب کی ہمراہی میں اُن کے استقبال کے لئے پکھری پورہ گئے۔ شیخِ کشمیر رح زندگی کے آخری سات سال یعنی ۱۴۳۱ء سے ۱۴۳۸ء تک رُوپہ وَن میں قیام پذیر رہے اور وہیں سے آپ "ژاروَن" میں قائم کردہ ریشی صدر مرکز کے انتظام کی نگرانی کرتے رہے۔

سلطان سکندر کا عہدِ حکومت ۱۴۱۸ء میں ختم ہوا پھر دو سال سلطان علی شاہ نے حکومت کی اور بعد ازاں ۱۴۲۰ء میں سلطان زین العابدین تخت نشین ہوئے۔ اسطرح سے حضرت سید موصوف کا عہدِ سکندری میں وارد کشمیر ہونا اس لئے ناقابلِ اعتبار لگتا ہے کہ اوّلاً تو اس عہد میں حضرت شیخ کیموہ ہی میں اقامت پذیر تھے اور ثانیاً اُن دِنوں حضرت شیخ کی شہرت ابھی حدودِ کشمیر سے باہر نہیں پہنچی تھی۔

● —— کیا محض ایک خواب کی بنا پر حضرت سید موف حضرت شیخ کی ملاقات کے لئے بلخ سے کشمیر آئے تھے یا پھر کچھ اور اُمور بھی اس کے مُوجب تھے۔؟

ڈاکٹر محمد ریاض صاحب "حضرت امیر کبیر" نامی کتاب کے صفحہ ۱۲۱ پر لکھتے ہیں کہ تیمور کے انسانیت سوز مظالم کیخلاف حضرت شاہ ہمدان نے آواز بلند کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس ظالمانہ دور میں سادات کو خاص طور پر ہدفِ تشدّد بنایا جاتا تھا جو ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس بارے میں اِن سادات کے لئے کشمیر باعثِ کشش رہا اور یہاں کے پُرسکون اور روحانی ماحول نے اہلِ دل سادات کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ علاوہ ازیں یہاں کی حکومت نے جس فراغ دِلی سے اِن علماء کی قدر دانی کی اُس سے ایران اور وسطِ ایشیاء سے علماء اور سادات کا کشمیر آنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ اِس آمد رفت سے حضرت شیخ رح اور اُن کی ریشی تحریک کو شہرت اِن ممالک کے روحانی اور علمی حلقوں تک جا پہنچی۔

حضرت سید کا اپنے ملک سے دل برداشتہ ہونا معقول نظر آتا ہے۔ کشمیر میں آپ کے خاندان اور آپ کے ملک سے مہاجر آتے تھے۔ لگتا ہے کہ ان ذرائع سے حضرت سید موصوف تک بھی حضرت شیخ رح کے روحانی کمالات کی باتیں پہنچی ہوں گی چونکہ اُن کے دل میں رہبرِ کامل سے فیضیاب ہونے کی تمنّا گھر کر چکی تھی اور اِسی لگن میں اُن کو دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بشارت ملی تو کشمیر آنے کا جذبہ شدّت اختیار کر گیا۔ آپ نے اپنی دولت اور امارت کو لات ماری اور رختِ سفر باندھا اور نامساعد موسمی حالات اور دشوار گزار پہاڑی راستہ طے کر کے چلّہ کلان (دسمبر۔ جنوری) میں پکھر پورہ پہنچے۔

ایک اور نکتہ بھی بحث طلب ہے۔ تذکرہ نویسان حضرت شیخ اور مرحوم آزاد بھی نقل کرتے ہیں۔

کہ جب حضرت سید بکھری پورہ پہنچے تو انہوں نے اُن کھجوروں کی لذت کا تذکرہ کیا جو انہوں نے دسترخوانِ محمدیؐ سے خواب میں کھائے تھے اور حضرت شیخؒ نے اُن کھجوروں کی گٹھلیاں انہیں پیش کیں۔ اس سے دو[۲] دُور رس نتایج اخذ ہوتے ہیں۔ ۱۔ کہ حضرت شیخؒ کسی احساس کے شکار تھے جو انہیں ایک سیدزادے کو باور کرانے کے لئے ریاضی قسم کا ثبوت فراہم کرنا پڑا۔ ۲۔ حضرت سید موصوف دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بشارت ملنے کے باوجود تذبذب میں تھے۔ حضرت شیخؒ "الفقر فخری" کے اُسوہ حسنہ پر عمر بھر عمل پیرا رہے مگر لگتا ہے کہ بعض تذکرہ نویسیاں فقر کے مفہوم کے اصل جوہر کو نہ پاسکے۔ اُن کے ہاں فقر و انکسار احساسِ کمتری کا دوسرا نام ہے۔ فقر کے بارے میں حضرت شیخؒ کا فرمان ہے کہ "فقر جہنم کے شعلوں کے خلاف سپر ہے۔"

یہ بات بھی سوچنے کے لائق ہے کہ کیا ایک طالبِ حقیقی، جسے اپنے مرشد کے بارے میں دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بشارت مِلی ہو، اپنے پیرِ کامل کے بارے میں دل میں اُنہیں کسی طرح آزمانے کے لئے جگہ دے سکتا ہے طالب و مرشد بکھری پورہ میں ایک گڈریئے کے گھر رات بسر کرتے ہیں تو حضرت سید موصوف کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ آیا اُن کے مُرشد عالِم ہیں یا اُمّی! اِس طرح کا بیان حضرت سید موصوف کی شان میں گستاخی سے کم نہیں کہ اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آپؒ کو اپنے خواب پر بھروسہ نہ تھا اور مرشد کی طلب یا مرشد کے حضور آنے کا جذبہ اُن کے دل میں موجزن نہ تھا، ہاں یہ درست ہے کہ پیاس کی شدت سے پیاسا سراب سے بھی دھوکا کھاتا ہے۔ ؎

زِ نفس تشنہ لبی دار و بہ عقل بیش مناز
دِلت اگر فریب بہ جلوۂ سراب نہ خورد

مگر طلبِ مرشد میں جتنی بھی پُرخلوص شدت ہو اُسی تناسب سے منزل نزدیک اور آسان ہو جاتی ہے۔ یہ حضرت سیدؒ کی اِسی شدت کا جنون تھا کہ خود دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کو اس منزل کی راہبری مِلی اور خود مرشدِ کامل برق و باراں کو نظر انداز کر کے اُن کے استقبال کو گئے۔ ایسے طالبِ صادق پر کسی قسم کی تہمت عاید کرنا سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے۔

یہ تو اخذ کیا جا چکا ہے کہ حضرت سید موصوف ۸۶۰ھ میں واصل بحق ہوئے۔ راقم کی رائے میں آپؒ کی عمر کشمیر آنے کے وقت ۲۵ سے ۳۸ سال تک رہی ہوگی اور آپؒ پیرِ کامل کی صحبت میں کم از کم پانچ چھ برس رہے ہیں کہ حضرت شیخؒ کے وصال کے بعد آپؒ تقریباً سترہ، اٹھارہ سال بقیدِ حیات تھے اور اسطرح جب آپ کا انتقال ہوا تو اُس وقت آپ کی عمر تقریباً ساٹھ تا تریسٹھ سال رہی ہوگی۔ ●

غلام نبی آتش

حضرت بابا بام الدّین ریشی رحمۃ اللہ علیہ

بُمہٕ زُوٗیکُ بمُہٕ سادا   تِمۍ پوٗتلین شرادا رِکو
تُس تہٕ لو یُتھ تو ہے نادا   تِتھۍ مےٚ وَر دِتو دِو
(شیخ نورالدّین ریشیؒ)

•۔ (ایک تھا بُمہٕ زدُہ کا بُمہٕ ساد۔ اُس نے مورتیوں کی پرستش کی، اے مولا، تو نے اُس کو بلا کر راہِ راست دکھائی، ایسے مراتب مجھ کو بھی عطا فرما۔)

• روایت ہے کہ علاقہ دِدر کوٹ میں کیموہ کے قریب ایک گاؤں جسے "کھی جو گگ پور" کہتے ہیں، کے بُمِش تپَل نامی محلے کے ایک مکان میں شام ڈھلتے ہی ایک پنڈت اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا کہ آج پو پھوٹنے سے پہلے گاؤں کے چشمے سے پھولوں کے دو خوبصورت گلدستے ظاہر ہونے والے ہیں۔ ایک چنبیلی کا اور دوسرا اڈہر کے پھولوں کا! جو عورت چنبیلی کا گلدستہ سونگھے گی۔ بھگوان اسے ایک ایسا بیٹا عطا فرمائے گا کہ آفتابِ نصف النہار کی طرح بلند و بالا اور درخشاں ہوگا اور جو عورت اڈہر کے گلدستے کی خوش بو سونگھے گی اُسے بھی ایک بیٹا ملے گا، جو اگرچہ آفتاب نصف النہار کی طرح بلند و بالا اور درخشان نہ ہوگا۔ لیکن خاص روحانی قدوقامت اور درجات ضرور پائے گا۔ میاں بیوی کی یہ گفتگو شیخ سالار الدین رحؒ نے سن لی جو کہ اُس وقت پنڈت جی کے مکان کے پاس سے گذر رہا تھا۔ شیخ سالار الدین نے یہ بات

اپنی اہلیہ محترمہ سُدرہ٭ کو بتائی۔ اولاد کی متلاشی یہ بات سنتے ہی چشمے کے کنارے بیٹھ کر گلدستے کا انتظار کرنے لگی۔ رات کے پچھلے پہر کو چشمے میں سے چنبیلی کا گلدستہ ظاہر ہوگیا۔ سدرہ ماجی نے اُس کی خوشبو سونگھ لی تو اسکا پاؤں بھاری ہو گیا۔ اب وہ گھر کی اور چلنے لگی تو پنڈتانی راستے میں ملی' وہ گلدستے کی خوشبو سونگھنے کے لئے چشمے کی اور جارہی تھی۔ سدرہ ماجی کو دیکھ کر کفِ افسوس ملتی رہ گئی۔ آخر اڈھر کے پھولوں کے گلدستے کو سونگھ کر واپس چلی گئی۔ مدت پوری ہونے پر سدرہ ماجی کے بطن سے شیخ نورالدین زندہ ریشی سالارِ اعظم قافلۂ ریشیانِ کشمیر نے جنم لیا اور پنڈتانی کے بطن سے بمہ ساد جو بعد میں حضرت بابا بام الدینؒ کے نام نامی سے شہرت پاکر حضرت شیخ کا خلیفۂ اوّل بن گیا' پیدا ہوا۔ پنڈت جی کا نام اُتن اور پنڈتانی کا فکرستھی بتایا جاتا ہے۔

اگر اس لوک روایت کو صحیح مان لیا جائے' جیسا کہ اس کی صحت پر آج تک عوام الناس کا یقین ہے اور اس کو ریشی ناموں اور تذکرات وغیرہ میں درج بھی کرلیا گیا ہے' تو ماننا پڑے گا کہ حضرت بابا بام الدینؒ کا سالِ ولادت وہی ہے جو کہ حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کا ہے یعنی ۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۷ء بمہ ساد کا باپ اُتن پنڈت بہت بڑا جیوتشی اور سنگتراش تھا۔ وہ اعلیٰ قسم کی مورتیاں بنانے میں کمال رکھتا تھا۔ لیش تیل نامی جگہ پر کچھ عرصہ پہلے کھدائی کرنے پر کچھ مورتیاں بھی ہاتھ آئی ہیں۔ بقول ارجن دیو مجبور اس جگہ کو چھوڑ کر اُتن پنڈت بمہ زوُ چلا گیا جہاں اعلیٰ قسم کی مورتیاں بنانے کے لیے مناسب قسم کے پتھر بافراط میں دستیاب تھے٭

بمہ زوُ نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں اسلام آباد (اننت ناگ) سے سات کلومیٹر کی مسافت پر دریائے لدر کے دائیں کنارے کریوۂ مٹن کے دامن میں آباد ہے۔ مٹن کے مشہور چشموں سے شمال کی جانب بم زوُ تک صرف ایک میل کا فاصلہ ہے اور بمہ زوُ کے بالکل قریب ہٹہ مر نامی گاؤں شروع ہو جاتا ہے جہاں چند سال پہلے کھدائی کرنے پر بودھ آثار ملے ہیں' جن میں منقش خشت ہائے پختہ اور ٹائیلیں وغیرہ شامل ہیں" بم زوُ" سے مُراد ہے" بم کا جزیرہ" کیونکہ "زوُ" کشمیری میں جزیرے

٭ "سُدُر" کشمیری میں سمندر کو کہتے ہیں۔ حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کے تولد ہونے کے بعد عقیدت و احترام سے بیگم شیخ سالارالدین (والدۂ شیخ نورالدینؒ) کو "سدر ماجؔ" کہا جانے لگا۔ "ماجؔ" یا "موج" کشمیری میں "ماں" کو کہتے ہیں۔

٭ "وَہتھ آگر"۔ شیخ نورالدین ولی نمبر ص ۲۷

کا مترادف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بُم سادنے یہاں عبادت وریاضت کی تھی، اس لئے اسکا نام "بُمہ زوُ" پڑا۔ راج ترنگنی کے اردو مترجم کے مطابق مارتنڈ مہاتم میں اس جگہ کا نام "بھیم دویپ" کی صورت میں موجود ہے۔ اُس نے مزید لکھا ہے کہ "دویپ" زوُ کی ایک صورت ہے، جس کے معنی کشمیری زبان میں جزیرے کے ہوتے ہیں، بھیم جو بھوم سے مشابہ ہے، اس سے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ بھیم کیشو کا منحفّف ہے، دریائے لدر میں چٹانی ٹیلے کے سامنے، جس کے دامن میں یہ مندر (بھیم کیشو مندر) واقع ہے، بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں اور اسی وجہ سے اس کا نام "بمہ زوُ" رہا ہے۔* واقعہ یہ ہے کہ اس وقت وہاں کوئی جزیرہ نہیں ہے۔ کلہن کے مطابق سنگراج کے خسر اور رانی دِدا کے نانا بھیم شاہی نے بھیم کیشو نام کا ایک مندر بمہ زوُہ میں بنایا تھا۔ اس وقت جو مندر ایک غار میں موجود ہے، اُسے بھیم کیشو مندر کا ہی ایک حصّہ تصوّر کیا جاتا ہے حتیٰ کہ کلہن نے غار میں موجود مندر کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ بمہ زوُ میں چند چھوٹی چھوٹی گپھاؤں کے علاوہ وہ مشہور ومعروف گپھا بھی ہے جو تاریخ کشمیر میں "غار آری رائے" کے نام سے مشہور ہے۔ آج تک کوئی شخص اس غار کے دوسرے سرے تک نہیں جاسکا ہے۔ حیدر ملک چاڈورہ مورخ کشمیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ میں (حیدر ملک) بائیس آدمیوں کے ساتھ اس غار میں داخل ہوگیا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک چراغ تھا، تیل بھی ساتھ تھا، ایک جگہ ایک بیس گز اونچا گنبد تھا، وہاں ہمیں چار راستے ملے، دائیں، بائیں، اوپر اور نیچے، ہمیں آگے جانے کی جُراٗت نہیں ہوئی۔ نیچے جانے والے راستے کے اندر ہم نے ایک پتھر گرادیا۔ تقریباً ایک پہر تک اُس پتھر کے گرنے کی آواز سُنائی دی اور یہیں سے ہم باہر چلے آئے۔

بہر کیف، بمہ زوُ کے اسی پُر سکون مقام پر بُمہ سادنے اپنے اسلاف کے مذہب کے مطابق ریاضت وعبادت شروع کی۔ بڑی تپسیا کے بعد وہ کشمیر کا ایک بڑا روحانی گرو بن گیا۔ اس کے

* حقیقت کچھ بھی ہو قرینِ قیاس یہی ہے کہ بُمہ سادکے تعلق سے ہی اس جگہ کا نام "بُمہ زوُ" پڑا ہوگا یہ بات باور کرنے لائق نہیں کہ "بمہ ساد" کو "بھیم شاہی" مان لیا جائے جیسا کہ اچھر چند نے لکھا ہے وہ تو "بُمہ زوُ" کے بھیما دیوی سے منسوب ہونے سے بھی متفق نہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ کشمیری میں "بُم" ایک سبزی (کاہ نیلوفر) کا نام بھی ہے جو چشموں اور تالابوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ "بھوؤں" کو بھی کشمیری میں "بُمہ" یا "بُمبہ" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بچے ایک کھلونے سے کھیلتے ہیں جسے "بُم پتل" کہتے ہیں۔ بہر حال یہ سب لکھنے سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جانا چاہیئے کہ ان چیزوں کا "بُمہ زوُ" سے بدیہی کوئی تعلق پیدا کیا جاتا ہے۔

محیر العقول، روحانی کمالات کا ذکر ریشی ناموں میں موجود ہے۔ بُم زُو میں واقع اُس کے مندر میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بُت موجود تھے جنکی وہ پرستش کرتا تھا۔ روحانی کمالات کا یہ عالم تھا کہ پو پھوٹنے سے پہلے وادی کے پانچ تیرتھ استھانوں میں حاضری دے کر واپس آجایا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ تیرتھ ایکدوسرے سے بہت دُور تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ مقامات کھادن یار (بارہ مولہ)، دلرناگ (جھیل وُلر میں) چھتہ بل (چھتر یار) شیو پورہ (کوہِ سلیمان کے دامن میں) اور ژندریار (بجبہاڑہ) میں واقع تھے۔

حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ بمہ ساد کی شہرت سے واقف تھے۔ انہیں لگا کہ ایسے باکمال شخص کو دائرہ اسلام میں آنا چاہیئے۔ بمہ زو پہنچ کر حضرت شیخؒ نے بمہ ساد کی روحانی قوت سلب کر کے مقابلے کی ٹھان لی• اس مقابلے کی داخلی شہادت وہ مشہور شعری مکالمہ ہے، جو بمہ ساد اور حضرت شیخؒ سے منسوب ہے اور آج تک زبان زد خلایق ہے۔ یہ مکالمہ پہلی بار بابا کمال الدینؒ نے اپنے ریشی نامہ موسوم بہ "ریشی نامہ عنبر شمامہ" میں درج کیا ہے۔ حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ مندر میں داخل ہوگئے، تو بمہ ساد بپھر کر کہہ اٹھا۔

کُس مالہِ چُھکھ تہٕ آکھ کمہٕ دیشہٕ	گریشن رُوستے سانہٕ براندٕ ژاکھ
ڈیشتھ لجم بجہٕ اندیشہٕ	دپھتہٕ ریشی مالہِ کور کنہٕ آکھ

•۔(برخوردار، تو کون ہے اور کس دیش سے آیا ہے، پوچھے بغیر ہمارے گھر میں داخل ہوگیا، تجھے دیکھ کر میں اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہوگیا، بتا ریشی مالو، تو کہاں سے آیا!)

حضرت شیخ العالم نورالدین ریشیؒ نے کہا، بھوکا ہوں، کچھ کھانے کو دے دو؟ سادھو نے

• "بمہ زو" کی سیدھ میں دریائے لدر کے اس پار ایک چشمہ ہے۔ چشمے کے کنارے "برن" کا ایک بڑا درخت ہے۔ "برن" کشمیری میں Maple کو کہتے ہیں۔ چشمے کے ارد گرد عام پتھروں کی معمولی دیوار ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بمہ ساد کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کی غرض سے جب حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ آئے تھے تو انہوں نے اسی جگہ کو اپنی قرارگاہ بنایا تھا۔ یہ چشمہ اُس گاؤں سے زیادہ دور نہیں ہے جسے نمبل کہتے ہیں۔ حالانکہ "نمبل" سے مراد دلدل ہے اور ممکن ہے کہ کسی زمانے میں یہ گاؤں (نمبل) دلدل ہی رہا ہو۔ مذکورہ بالا درخت بھی زیادہ پرانا نہیں لگتا اور یہ چشمہ کسی خاص توجہ کا مرکز بھی نہیں ہے۔

جو کچھ پکایا تھا وہ مورتیوں کی نذر کر دیا تھا اور باقی کھا لیا تھا۔ خالی ہانڈی دھو کر چولھے پر رکھی تھی، جواباً کہا ؎

رنن آہار ژالہِ لیبٕج لاۓ جِسم   سینتھ واۓجم تل آسا تھ
سُمتھ پوٗ تلین سوٗ ے کنہِ لاۓجم   چھِمُم لیبٕج تہٕ دِمے کیا تھ

(بُمہٕ ساد)

● ۔ (جو کچھ پکانا تھا، پکا چکا۔ ہانڈی کو چولھے سے اُتارا۔ کھانا مورتیوں کی نذر کیا۔ اب ہانڈی کو دھو کر رکھا، تجھے کیا کھلاؤں ؟)

حضرت شیخؒ نے اصرار کیا کہ ہانڈی میں کھانا بھرا پڑا ہے، تو جھوٹ بولتا ہے، ذرا دیکھ تو لے' بُمہ ساد نے چونکہ خالی ہانڈی دھو کر رکھ لی تھی، اس لئے حضرت شیخؒ کی باتوں پر ناراض اور آپے سے باہر ہونے لگا۔ حضرت شیخ کے سمجھانے بجھانے پر جا کر دیکھا کہ ہانڈی پکے پکائے چاولوں سے بھری پڑی تھی۔ بُمہ سادا انگشت بدنداں ہو کے رہ گیا اور کہا ؎

کسُو مالہِ چھکھ تہٕ آکھ کمہِ وَتے   یکھتوٗ وُلِنتہٕ گژھی تزیر
حاران کوٗرتھس امہٕ حکمتے   دیھتو ریشہِ مالہِ کیا چھُے سحر

● ۔ (برخوردار، تو کون ہے، کس راہ سے یہاں آیا ؟ تیری حکمت سے میں حیران ہوں' ریشہِ مالو ۔ یہ کیا ساحری ہے !)

حضرت شیخؒ نے فرمایا' یہ ساحری نہیں' خدائے لاشریک کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ ازاں بعد روحانی درجات و کمالات کے سلسلے میں حضرت شیخؒ نے بُمہ ساد سے پوچھا کہ جنت سے تربوزہ لے آؤ، تاکہ تمہارے کمالات ظاہر ہوں" ریشی ناموں میں اسی روایت و کرامت کو بہت بڑھا چڑھا کر درج کیا گیا ہے اور ہمارے اکثر ریشی نامے وتذکراتِ عمومی بزرگوں کی کرامات سے بھرے پڑے ہیں۔ اسطرح اُن بزرگوں کے اصل حالات کرامات کی غلافوں میں لپیٹ کر رہ گئے ہیں۔ بہرکیف' بُمہ ساد نے کہا ؎

ریشہِ مالہِ کتھن چھِہم نہٕ پژان   پرٕ پرٕ موکر اُتی تھیہ روز
بہٕ چھس پانۓ بہِشتس اژان   زانہٕ کھے کتھ میشانۍ وژن بوز

● ۔ (ریشہِ مالو، تو بار بار سوال پوچھتا رہتا ہے۔ زیادہ باتیں نہ کر، دیکھ لینا، میں خود بہشت میں داخل ہوتا ہوں' میری بات جان لے۔)

کہا جاتا ہے کہ بُمہ ساد روحانی قوت کی مدد سے بہشت کے دروازے تک تو پہنچ جاتا ہے، لیکن دربان اندر جانے کی اجازت نہیں دیتا اور کلمۂ توحید پڑھنے کی تاکید کرتا ہے۔ کلمۂ توحید پڑھوا کر دربان نے جنت کا میوہ بمہ ساد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ حضرت شیخ کے پاس پہنچکر کہنے لگا ؎

ریشؔی مالہ چھیہم رُوزتھ مراقبس	بیدار گژھتو ترٖلی وسواس
بہشتک میواہ اونیمٔ دِس	بجر سائین عٔلمس راس

● ــ (اے ریشؔی، مراقبے سے اُٹھ اور وسوسے چھوڑ۔ دیکھ ہمارا کمال، آنکھ جھپکنے میں بہشت سے میوہ لایا ہوں)

حضرت شیخؒ نے فرمایا ؎

بُمہ ساد کس باکوٗرتھ اورزوے	توٗے گومُت چھُے زرد روٗے
معلوم کوٗرتھ پنُن جُستجوے	اَپِنِس چھُکھ رچھان ادبروٗے

● ــ (بمہ ساد، توُنے کس کی آرزو کی ہے ؛ اس لیے تیرا چہرہ زرد پڑگیا ہے، تجھ کو اپنی اوقات معلوم ہوگئی، اب کیوں ہمارے پاس آبرو، بچانے کی کوشش کرتا ہے)

کہتے ہیں کہ حضرت شیخؒ نے مورتیوں کی طرف اشارہ فرما کر پوچھا، یہ انسان نے بنائی ہیں اور محض پتھر ہیں، بمہ ساد نے کہا ؎

پوتلِہ میٹائیٖ اَسن تہٕ گِندَن	پوتلِہ میٹائیٖ ساری انسان[3]
پوتلین میتاہن عالم رَسن	حکُم یوٗد کرکھ کھسن آسمان

● ــ (میرے بت ہنستے کھیلتے انسان ہیں۔ ساری دُنیا انکی خوشنودی چاہتی ہے۔ اُنہیں حکم دوں تو آسمانوں کی سیر کرینگے۔)

اور بمہ ساد کے حکم سے مورتیاں آسمان میں اُڑنے لگیں۔ لیکن حضرت شیخؒ نے اپنی قوت روحانی سے انکو نیچے گرا دیا۔

آخر کار بمہ ساد دائرہ اسلام میں آکر حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کے خلیفۂ اوّل قرار پائے حضرت شیخؒ نے اپنی توجہ سے اُن کو سلوک کے اعلیٰ مقامات پر پہنچا دیا اور اُن کا نام بام الدین رکھ دیا۔ پیرو مرشد کی ہدایات کے مطابق حضرت بابا بام الدینؒ ریاضت و عبادت میں مشغول ہوگئے۔ مشہور ہے کہ اُن کے ہاں دیئے میں تیل کے بدلے پانی جلتا تھا۔ نفس کُشی کا یہ عالم تھا کہ ایک سفید پتھر کو چاٹ کر افطار کیا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کی ہدایت

کے مطابق حضرت زین الدین ریشی کی والدہ ماجدہ نے اپنے لخت جگر زیا سنگھ کو، جو بعد میں زین الدین ریشی کہلایا، کشتواڑ سے لاکر بابا بام الدین کے حوالے کر دیا۔ بابا نے کچھ مدت تک زین الدین کو اپنے یہاں رکھ کر اسلام کی تعلیم دی۔ بعد میں وہ حضرت شیخؒ کی خدمت میں چلے گئے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت بام الدینؒ تقریباً بارہ سال تک زندہ رہے۔ ریاضات و عبادات کا یہ عالم تھا کہ عوام سے قطع تعلق کر کے صبر و قناعت کی زندگی بسر کر کے اور پیر و مرشد کی ہدایات پر عمل کر کے سلوک کے اعلیٰ و ارفع مقامات پر فائز ہو گئے۔ تا دم واپسیں کسی کی خدمت کے محتاج نہیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان سکندر کا بیٹا علی شاہ ایک بار سادہ لباس پہن کر حضرت بام الدینؒ کی خدمت میں ملاقات کے لئے آیا اور درخواست کی کہ کوئی نصیحت کریں۔ بابا نے کہا، میری نصیحت تمہیں کیا اثر کرے گی، بادشاہ کی فطرت آگ کی سی ہے۔ جو ہوا سے زیادہ بھڑک اٹھتی ہے۔ علی شاہ نے کہا، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم دیجیے۔ بابا بام الدین نے کہا بہتر ہے کہ آپ دوبارہ یہاں نہ آئیں، اور نہ ہی اپنے دربار میں میرا نام لیں۔ علی شاہ بولے، کیا آپ کو اہلِ دُنیا سے نفرت ہے؟ ہاں، اس سے کہیں زیادہ جتنی میں دُنیا سے نفرت کرتا ہوں۔ بابا نے جواب دیا۔ علی شاہ نے پھر پوچھا، دنیاداروں اور ریشیوں میں کیا فرق ہے؟ بابا بولے، وہی جو اندھوں اور آنکھ والوں میں ہے۔ علی شاہ کے چلے جانے کے بعد بابا بام الدینؒ نے اپنی کُٹیا کو دھو کر صاف کروایا۔

حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کی وصیت کے مطابق حضرت میر محمد ہمدانیؒ ابن حضرت میر سید علی ہمدانیؒ ۵ رجب ۸۱۴ھ کو حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ سے بمقام زالوسہ تھار (چرار) شریف ملنے گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اُن کی ملاقات کرالہ پورہ یا رُپہ وَن میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے وقت تحریکِ ریشیت سے وابستہ دو ممتاز خواتین (بہت بی بی اور دوہت بی بی) بھی موجود تھیں۔ اُن کی حاضر جوابی سے حضرت میر محمد ہمدانیؒ متاثر و مسرور ہوئے تھے۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ سوالات و جوابات اور توجہٗ باطنی کے بعد حضرت شیخ نورالدینؒ کے درجات ولایت و مراتب، رُوحانیت پہچان کر، اُن کے کمالات باطنی کا پورا اندازہ کرنے کے لئے بحرِ مکاشفہ میں غوطہ زن ہو گئے۔ حضرت شیخؒ حقیقت سے آگاہ ہو کر حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے پیچھے ہو لیے اور حضرت میر محمد ہمدانیؒ مراقبہ سے فارغ ہو کر کہنے لگے "بدیں رتبہ، ہیچ کس از یاران رسانیدے؟" (کیا اپنے دوستوں میں سے کسی کو اس درجے تک پہنچا دیا ہے؟) گفت، چہار کس (فرمایا، ہاں چار دوستوں کو) اور حضرت بابا بام الدینؒ، حضرت زین الدینؒ، بابا لطیف الدینؒ اور حضرت بابا نصر الدینؒ کو پیش کر دیا۔

حضرت شیخ العالمؒ نورالدین ریشیؒ کو ان چاروں خلفاء پر ناز تھا، بقولِ خود ؎

بمہٕ، لفرُ ترٕ بابہٕ زآلو لطیف رنیہ ووٕنُے چھس
دَیِن دیِتیم تِرٕ بتھ موٗبرِلو یِے شیاآذ بۄ ہُند ہۄندے چھس

● (بام الدین، لفرالدین، بابا زین الدین اور لطیف الدین سبھی اعلیٰ اور خوش آیندہ ہیں۔ خدا نے مجھے سفرِ دُنیا پر بھیجا تھا، یہاں پر یہ چار میرے ہیں اور میں اُن کا ہوں)

حضرت بابا بام الدینؒ ۱۴۴۰ء میں انتقال کر گئے۔ کہتے ہیں کہ بوقت نزع آپ نے حضرت بابا زین الدین ریشیؒ کو پکارا جو اُس وقت تبت میں اپنے خلفاء سمیت جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے۔ وہ طئے مکان کرکے بمہ زوہ پہنچ گئے اور بابا کی تجہیز و تکفین کا اہتمام کیا۔ جاں بحق ہونے سے قبل بابا بام الدینؒ نے اپنے استعمال کی ساری چیزیں مثلاً خرقہ، سفید پتھر (جسکو چاٹ کر وہ افطار کیا کرتے تھے) وغیرہ گٹھڑی میں باندھ کر اپنی قبر میں ڈال رکھی تھیں۔ وصیت کے مطابق یہ چیزیں اُن کے ساتھ ہی دفن کر دی گئیں۔ وجہ اس کی یہ بتائی جاتی ہے کہ بابا شہرت اور نام و نمود کو ناپسند فرماتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے واصل بحق ہونے کے بعد ان کے استعمال کی چیزوں کو بطور تبرک پیش کرکے لوگ انہیں اپنا ذریعۂ معاش بنالیں۔ شاید اسی لئے اُن کے مرقد پر بھی لوگوں کا تانتا نہیں بندھا رہتا، لوگ آتے ہیں اور فاتحہ پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ دیگر زیارت گاہوں کی طرح یہاں کے مجاورین زائرین کو نذر و نیاز کے لئے تنگ نہیں کرتے اور نہ ہی یہاں کوئی میلہ لگتا ہے۔ اکثر زیارت گاہوں پر ہر سال میلے لگتے ہیں" لشی جلاکر چراغان کئے جاتے ہیں۔ خاص کر عشِ مقام میں زیارت گاہِ زین الدین ریشی پر چراغان ہوتا ہے لیکن بابا بام الدینؒ کے یوم وصال پر جو کہ عوام الناس نے سینہ بہ سینہ سُن کر سُتولہ پوہ کشمیری مقرر کر دیا ہے۔ فقط درود و اذکار اور شب خوانی کی محفلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے اور گھڑی دو گھڑی کے لیے بجلی کے قمقمے روشن کئے جاتے ہیں۔

بمہ زوہ میں بابا بام الدینؒ کی تربت اسی جگہ موجود ہے جہاں وہ قبولِ اسلام کے بعد عبادت کیا کرتے تھے۔ تربت کے ارد گرد ایک وسیع غلام گردش ہے۔ اور زیارت گاہ کی عمارت ریشی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ آج تک دو بار زیارت گاہ کی تجدید عمل میں آئی ہے۔ ۱۹۸۹ء میں زیارت گاہ کی تجدید کے وقت چار بام چھت پر ٹین کی چادریں لگائی گئی ہیں۔ زیارت گاہ میں بابا کی تربت کے ساتھ ہی تین خلفاء کی قبریں بھی ہیں اور زیارت گاہ کے بغل میں کئی قدموں کے فاصلے پر بابا رکن الدینؒ

● کاشر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ ص ۲۰۱

کی قبر ایک کوٹھری میں ہے، کوٹھری کی دیواروں پر پلستر چڑھایا گیا ہے لیکن چھت کی قدیم اندرونی اور بیرونی ہیئت برقرار رکھی گئی ہے۔ بابا رکن الدینؒ حضرت بابا بام الدینؒ کے اہم خلفاء میں سے تھے۔ بابا رکن الدینؒ کی قبر سے چند قدم دور ایک مسجد شریف ہے۔ یہاں پہلے ایک چھوٹی سی قدیم مسجد تھی۔ حال ہی میں اُسے شہید کر کے نئی مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ زیارت گاہ اور مسجد شریف کی تجدید بمہ زو کے پڈر، بابا اور شیخ خاندانوں کے اکابرین کی مساعی جمیلہ سے ممکن ہو سکی ہے۔ مجموعی طور پہ ایک نہایت ہی پُر سکون جگہ ہے جہاں نہ شور شرابہ ہے نہ بھیڑ بھاڑ۔ زیارت گاہ کے ایک طرف پہلگام جانے والی سڑک کے کنارے چٹانی ٹیلے کے دامن میں ایک قبرستان ہے۔ بمہ زوہ میں یکتائے روزگار کمہار سکونت پذیر تھے۔ آج تک انکی ذریت موجود ہے۔ مسجد شریف متذکرہ کے عقب میں کمہار بستے ہیں، عبدالکریم کمہار نامی شخص کے مکان کی چھت پر کمالِ استادانہ مہارت سے ٹھیکریوں کے بلبے بلبے شیٹ (SHEET) بالکل اسیطرح لگائے گئے تھے۔ جس طرح آجکل ٹین کی چادریں لگائی جاتی ہیں۔ حال ہی میں اُس مکان کو گرا کر نئے طرز کا مکان تعمیر کیا گیا ہے۔ کمہاروں کے اسی مکان سے تقریباً پچاس فٹ اُوپر وہ غار ہے جسمیں پتھروں کا مندر موجود ہے۔

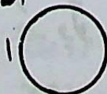
حضرت بابا بام الدین کے مُریدوں میں مندرجہ ذیل بزرگ شامل تھے جو بابا کی توجہ اور تربیت سے اعلیٰ روحانی کمالات حاصل کر گئے۔

بابا رکن الدینؒ، شوکر ریشیؒ، کھنی ریشیؒ، رتن ریشیؒ، سنت ریشیؒ، دنت ریشیؒ (مدفن بمہ زوہ)، بابا رجب الدینؒ (مدفن ناگہ نارین کٹھار)، بابا شکور الدینؒ بابا فخر الدینؒ (کوہ پھاگ) بابا نوروز ریشیؒ، بابا نندہ ریشیؒ، بابا حاجی ریشیؒ۔

●

کتابیات

۱۔ ریشی نامہ عنبر شمامہ
۲۔ کاشر انسائیکلوپیڈیا ۲ رجلد
۳۔ شیرازہ کشیری (نندہ ریشی نمبر)
۴۔ برجِ نور، کلچرل اکادمی
۵۔ نورِ آگر، مراز ادبی سنگم۔



سیّد رسول پونپر

بابا زین الدّین ریشیؒ

مطلعِ نورؔ و مخزنِ اسرار — مفتخر ریشیانِ نیکوکار
زین الدّین آنکہ مست عرفان بود — ساقیٔ بزم مے پرستاں بود

(مُلّا بہاؤ الدین متوؔ)

بابا زین الدّین ریشیؒ جنہیں ان کے عقیدت منداور عام لوگ زٲنہٕ شاہ صاحب کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کشمیر میں تحریکِ ریشیت کے بانی حضرت شیخ نورالدین ولیؒ علمدارِ کشمیر کے دوسرے خلیفہ تھے جن کے اعلیٰ روحانی مرتبہ کے وہ خود بھی معترف تھے۔

زینہ میون چھے امریتہ گورو
تمۍ تہ آدر سمسار ژیو
گوڈ تہ گورس ژاٹھا ژٕو رٕو
تیتھو مے ؤرؠ دِتو دِیو

• — (میرا زین الدین سرچشمۂ آبِ حیات ہے، اس نے بھی دُنیا کی جستجو کم ہی کی، شاگرد رتبہ میں استاد سے سبقت لے گیا۔ اے اللہ! مجھے بھی ایسا ہی قدر دیدے۔ یعنی مجھے بھی اعلیٰ و ارفع روحانی مرتبہ عطا کر۔)

جہاں روحانی استاد ہی اپنے شاگرد کے روحانی اور باطنی مقام کا تعین کرے وہاں ہم کیا ہماری بساط ہی کیا۔ کیونکہ بابا زین الدین ریشیؒ حضرت شیخؒ کی باطنی آغوش میں پلے اور ہمیں تو صرف سُنی سنائی اور ضبطِ تحریر میں لائی روایات پر تکیہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ روایات کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اُن سے انکار کفر کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک امرِ مسلّمہ ہے کہ بزرگانِ دین اور ریشیانِ کشمیر کے تبلیغی کارنامے مافوق الفطرت داستاں سرائی کے دھندلکوں میں گم ہو گئے ہیں۔ پھر بھی یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اُنہوں نے کشمیر میں رشد و ہدایت کی قندیلیں روشن کیں۔ حضرت زین الدین ریشیؒ کی ولادت و وصال کے بارے میں تاریخ اور تذکرے خاموش ہیں۔ بس اتنا وثوق سے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے عالی مرتبہ شاگرد، ہم وطن، ہم عصر اور ہم مسلک تھے۔ پروفیسر محمد اسداللہ وانی اپنے مقالہ "حلقۂ یاراں" میں لکھتے ہیں کہ وہ علاقہ ملچاڑ کے رہنے والے تھے جو باندرکوٹ (بھنڈارکوٹ) کا ایک ملحقہ علاقہ ہے۔ جانکی ناتھ گنہار کے حوالے سے وہ یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ وہ ملچاڑ ہی کے رہنے والے تھے اور انہوں نے بھنڈارکوٹ کے ایک مقامی غار میں بہت سا عرصہ گذارا[1]۔ مؤرخ حسن تذکرۂ اولیائے کشمیر میں یوں رقمطراز ہیں :۔

"حضرت شیخ زین الدین حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کے دوسرے خلیفہ تھے۔ اُن کی اصلی جائے پیدائش باندرکوٹ کشتواڑ میں تھی۔ ان کا اصلی نام زینہ

---

[1] بُرجِ نور۔ مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی — ۱۹۸۱ ۔ ص ۲۵۷

سنگھ تھا۔ اُن کے والد دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور زیا سنگھ کم سنی میں یتیم ہو گئے اِس لئے اُس کی پرورش کا مشکل کام اُسکی ماں کے ذمہ ہی ہو گیا۔ ایک دفعہ وہ سخت بیمار ہوا۔ اُسکی والدہ اُسکی حالت دیکھکر رو رہی تھی کہ اچانک ایک نورانی شخص اُس کے سامنے نمودار ہوا اور اُس کی ماں سے پوچھا۔ "تو کیوں رو رہی ہے؟" عورت نے جواب دیا۔ "میرا بیٹا بیمار ہے۔ نورانی شخص نے پھر کہا "میرے ساتھ وعدہ کرو کہ اگر بچہ ٹھیک ہو گیا تو تم کشمیر آکر مسلمان ہو جاؤ گی"۔ زیہ سنگھ کی ماں نے وعدہ کیا اور نورانی شخص غائب ہو گیا۔ لڑکا تو صحت یاب ہوا۔ لیکن اسکی ماں کشمیر کا رُخ کرنے میں ٹال مٹول کرتی رہی۔ اسی دوران اُسکا بیٹا پھر بیمار ہو گیا۔ ماں کو شک پڑ گیا کہ یہ وعدہ خلافی کا نتیجہ ہے۔ رختِ سفر باندھا اور ماں بیٹے کشمیر چل پڑے۔ یہ ابھی دوران سفر ہی میں تھے کہ حضرت شیخ العالمؒ نے بابا بام الدین کو اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ "ایک عورت بچہ لیکر یہاں پہنچے گی۔ اُن کی خاطر تواضع اور آؤ بھگت کی جانی چاہیئے۔ زیا سنگھ اور اُس کی والدہ بابا بام الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند ایام اُن ہی پاس گزارے۔ جب حضرت شیخ العالمؒ وہاں تشریف لائے تو زیا سنگھ کی ماں نے پہلی ہی نظر میں اُن کو پہنچان لیا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے دیدار وہاں باندرکوٹ میں اُنہیں نصیب ہوئے تھے۔ وہ اُسی وقت دائرہ اِسلام میں آئے۔ زیا سنگھ کا نام شیخ زین الدین رکھا جب حضرت شیخ کی نیک صحبت، نگاہ کرم اور باطنی توجہ نے اُنہیں اثر کیا تو ماں کو واپس وطن کشتواڑ روانہ کیا اور خود حضرت شیخ کی خدمت میں رہنا مناسب سمجھا۔ یہ اسی عبادت و ریاضت کا نتیجہ تھا کہ اُن کا باطنی درجہ شاگرد کی حیثیت سے اِس درجہ بلند ہوا کہ حضرت شیخ العالمؒ اپنی مناجات میں اُن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "میرا

۱؎ عام رائے یہی ہے کہ اُن کا اصلی نام زیا سنگھ تھا اور قرین قیاس بھی یہی ہے۔

زینہ آبِ حیات کا چشمہ ہے۔ اُس نے خدائے تعالیٰ کی تمام بندگی کی کہ شاگرد (اُستاد (چیلا، گرو) سے آگے بڑھ گیا ہے اے خدا مجھے بھی ایسی ہی کشائش عطا کر"۔ جب حضرت شیخ العالمؒ کو معلوم ہوا کہ وہ کمال درجہ کو پہنچ گیا ہے تو اُن کو رھیش مقام کی گپھا میں خلوت نشینی کا حکم دیا اور شیخ زین الدین رھیش مقام روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ غار سانپوں اور بچھوؤں سے بھرا پڑا ہے۔ اُن سے مخاطب ہو کر کہا "کہ یہ غار اب درویشوں کے لئے مخصوص رکھا گیا ہے۔ تم کسی اور جگہ جاؤ"۔ سانپوں اور بچھوؤں نے رات کی مہلت چاہی اور اگلے دن وہاں سے نکل کر دوسرے غار میں جو پہاڑ پر ہے چلے گئے۔ حضرت شیخ زین الدینؒ نے سانپوں سے وعدہ لیا کہ وہ کسی کو ڈنک نہ ماریں یا ڈسیں۔ لوگوں سے کہا کہ وہ بھی اُنہیں نہ چھیڑیں۔ باوجود کثرت کے وہ آج کل بھی کسی کو ڈستے نہیں۔ کہتے ہیں کہ کشمیر کے سانپوں کی قسموں میں سے یہ سانپ زیادہ زہریلے ہیں۔ چھوٹے موٹے اور بدشکل جیسے کشمیری میں "پُہر" کہتے ہیں۔ جب حضرت شیخ زین الدینؒ گپھا میں گوشہ نشیں ہوئے تو معلوم ہوا کہ پانی کا کوئی بندوبست نہیں۔ اُن کا خادم حاجی شمس الدین کہیں دور سے پانی لایا کرتا تھا جاڑے میں ایک دن پانی لاتے لاتے اُس کا پاؤں پھسل گیا اور اُس کے گھٹنے میں شدید چوٹ آئی۔ گھڑا بھی ٹوٹ کر چور چور ہو گیا۔ وہ روتا ہوا بابا زینؒ کی خدمت میں آیا۔ اُنہوں نے تھوڑی سی تیل کی مالش کی اور خادم کا گھٹنا ٹھیک ہو گیا۔ اُس کے بعد آپ نے پانی کے لئے دُعا فرمائی اور غار کے پاس ہی ایک درخت کے نیچے کھود کر ایک گڑھا سا بنایا۔ پانی کا سوتا پھوٹ پڑا اور حضرت شیخؒ کے پیچھے بہنے لگا۔ گاؤں والوں کو بھی پانی فراہم ہوا جس جگہ سے حضرت شیخؒ واپس مڑے اُسی جگہ پانی رس کر غائب ہو گیا۔ آج کل بھی پانی وہاں تک جاری رہتا ہے اور پھر زمین میں جذب

ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک گڈریئے کو اُن کا وہاں خلوت نشیں ہونا پسند نہ آیا۔ اور اُن کو گپھا سے نکالنے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک دن موقعہ پاکر بکری کے ایک بچے (بزغالہ) کو ذبح کیا۔ اُس کی کھال، سر اور پاپچے اُن کی جائے نماز (مصلیٰ) کے نیچے چھپا کے رکھے اور رپورٹ کی۔ سپاہی اور کوتوال آپہنچے گڈریئے نے نشاندہی کی تو دبائی ہوئی چیزیں برآمد ہوئیں۔ حضرت شیخ زین الدینؒ نے سر، پاپچے اور کھال اکٹھا کرنے کو کہا۔ خدا کی جانب رجوع کیا۔ بزغالہ زندہ ہو گیا۔ بزغالہ کو اللہ نے زبان عطا فرمائی اور اُس نے سارا اصلی واقعہ بیان کیا۔ یہ واقعہ حضرت شیخ زین الدینؒ کی دُور دُور تک شہرت کا باعث ہوا۔ عقیدتمندوں کے ساتھ ساتھ منکرین اور دُشمن بھی معتقد ہو گئے۔ ایک دن حضرت شیخؒ نے خادم سے کوئی کڑوی اور بے مزہ چیز کھانے کو مانگی۔ اُس نے کالی مرچ لائی حضرت شیخؒ نے اُس کی قیمت پُوچھی۔ معلوم ہوا چیز مہنگی ہے۔ واپس لوٹا دی اور ہاتھ مُنہ دھونے کو نکلے۔ اخروٹ کے درخت کے نیچے سے گزرے۔ کچھ اخروٹ زمین پر گرے تھے۔ ایک اخروٹ اُٹھایا اُس کا چھلکا اُتار کر تھوڑا سا حصہ مُنہ میں ڈال کر چبایا۔ بہت بے مزہ اور کڑوی چیز معلوم ہوئی۔ پُوچھا کہ اس کی قیمت کیا ہے؟ ساتھیوں نے کہا۔ حضرت کچھ بھی نہیں۔ اُس وقت سے حضرت شیخ زین الدین ریشیؒ نے اخروٹوں کے چھلکے ہی کو اپنی خوراک بنایا۔ سوکھے ہوئے چھلکوں کو پیس کر اور چھان کر کھاتے تھے۔

ایک اور روایت ہے کہ حضرت شیخ زین الدینؒ غار سے کچھ اوپر ایک جسے کرنڈی مرگ کہتے ہیں جاکر یادِ خدا میں مشغول ہو جاتے تھے۔ وحشی جانور اور پرندے اُن کے اِردگرد جمع ہو جاتے۔ اگر کسی اجنبی کو آتے دیکھتے تو بھاگ

جاتے اور جنگل کا راستہ لیتے۔ ایک دفعہ اُن کا خادم کرنڈی مرگ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں لوگ ایک کوہل (ندی) کی کھُدائی اور صفائی کر رہے تھے جنہوں نے اُن کے خادم کو بھی روک کر بیگار میں لگا دیا۔ جب وہ حضرت بابا کے پاس دیر سے لوٹے تو اُنہوں نے وجہ پوچھی۔ خادم نے اصل واقعہ سُنایا۔ بابا زین الدین ریشیؒ ناراض ہو کر نہر کے کنارے پر آ گئے۔ اپنی کُلاہ زمین پر رکھ کے لاٹھی (عصا) کو نہر میں پھینکا۔ پانی خشک ہو گیا، لوگ حیران و پریشان ہو گئے۔ حقیقتِ حال معلوم ہونے پر لوگ بابا کے پاس دوڑتے دوڑتے گئے اور اُن سے اپنے کیے پر پشیمانی ظاہر کی۔ اُنہوں نے بابا سے مزید التجا کی کہ وہ اپنے خدام کے لئے کوئی نشانی رکھیں تاکہ اُن کے ساتھ اُلجھنے میں کوئی گستاخی سرزد نہ ہو۔ حضرت شیخؒ نے زمین سے ٹوپی نہ اُٹھائی۔ البتہ نہر سے اپنی لاٹھی (عصا) نکالی۔ پانی پھر جاری ہوا۔ وہ نہر آج تک خشک نہیں ہوئی ہے۔ اپنے خدام کو دھاری دار پگڑی باندھنے کی تلقین کی۔ جسے کشمیری میں "ریش کا ژن" کہتے ہیں۔ دھاری دار عمامہ باندھنے کی رسم خدامِ آستانِ عیش مقام میں آج بھی جاری ہے۔ یہ اُن کے لباس کا ایک اہم ترین جُز ہے۔

ایک دِن سُلطان زین العابدین بڈشاہ "شاہ کوہل" کھُدوانے کے معائنہ کے دوران بابا زینُ الدین ریشیؒ کی مُلاقات کو گئے۔ اُنہوں نے بادشاہِ وقت کی حسبِ منصب خاطر قدامت نہیں کی۔ ایک فقیرِ خدامست کج کلاہ کی نظر میں بادشاہت کی توقعت ہی کیا۔ جو ہونا تھا ہوا۔ بادشاہ وقت ناراض ہوئے۔ اور حُکم صادر کیا کہ بابا زینُ الدینؒ کو تبت جلائے وطن کر دیا جائے کیونکہ یہ اُنہی بودھوں کی تربیت کرنے کے لائق ہیں۔ حضرت ریشیؒ اپنے چیلوں کی معیت میں تبت چلے گئے۔ اور شاہی بم بجا لا کر سر تسلیم خم نہ کیا۔ وہاں پر بھی

اُنہوں نے تبلیغ دینِ اسلام کا اعلیٰ وارفع کام جاری رکھا اور بہت سے لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا۔ لوگ اُن کی خدمت گزاری میں دل وجاں سے جٹ گئے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ تبت کے راجہ کا بیٹا بیمار ہو کر مر گیا۔ راجہ نے کچھ تو اپنی جہالت اور کچھ لاماؤں کے بہکاوے میں آکر حضرت بابا زین الدینؒ سے کہا کہ آپ کے سبز قدم سر زمین تبت پر کیا پڑے کہ اُسکا بیٹا مر گیا۔ انہیں دھمکی دی گئی کہ یا تو میرے بیٹے کو زندہ کر دو ورنہ اپنی جاں سے ہاتھ دھونے کے لئے راضی ہو جاؤ۔ حضرت ریشیؒ بے چین ہو گئے۔ فرمایا: رات کو صبر کرو اور کل صبح جو خدا کی مشیت ہوگی ظہور پذیر ہوگا۔ رات گزر گئی صبح ہوتے ہی اللہ کے حکم سے بچے کو بقید حیات پایا۔

انہی دِنوں حضرت بابا بام الدینؒ نے رحلت فرمائی۔ شیخ زین الدینؒ طئے مکانی سے انہیں غسل دے کر اور تجہیز و تکفین کر کے واپس تبت پہنچے اور اپنے رفقاء کو بابا بام الدینؒ کے وفات پانے کی خبر سُنا دی۔ دریں اثنا یہاں کشمیر میں سلطان زین العابدین کے پاؤں میں درد ہو گیا۔ علاج ومعالجہ، دُعائے پیر و فقیر سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ انہیں خیال آیا کہ اس تکلیف کی اصل وجہ حضرت ریشیؒ کی ناراضگی ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے فرزند حیدر خان کو اظہارِ معذرت کے لئے تبت روانہ کیا۔ حیدر خان نے انتہائی تعظیم وتکریم کے ساتھ حضرت زین الدین ریشی کو واپس کشمیر لایا۔ بادشاہ نے بذات خود اُن کا استقبال کرنے میں سبقت لی اور خطا سرزد ہونے پر پشیمان ہوئے۔ پاؤں کے درد کا کہیں شائبہ تک نہ رہا۔

جب بابا زین الدینؒ واصل بحق ہوئے تو خدام اور معتقدین نے اُن کے جسدِ خاکی کو غسل دے کر، کفن پہنا کر تابوت میں رکھا۔ نماز جنازہ نماز

سے کچھ دُوری پر لاداکی گئی۔ پاس ہی قبر بھی کھودی گئی۔ اُن کے جسد خاکی کو قبر میں اُتارنے کے لئے تابوت کو کھولنے پر خالی پایا گیا۔ لوگ سراسیمگی کی حالت میں زار و قطار روتے ہوئے تابوت چھوڑ کر گھروں کو چلے گئے۔ رات کو اُن کے عقیدتمندوں میں سے کسی نے حضرت ریشی ؒ کو خواب میں یہ فرماتے ہوئے دیکھا کہ اُنکی قبر وہیں پر کھودی جائے جہاں تابوت رکھا پڑا ہے۔ اُس نے التماس کی کہ ہماری قبریں کہاں ہونگیں کیونکہ وہاں پر ایک قبر کے علاوہ تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ پھر فرمایا "کچھ اور اوپر میرے لئے دُوسری قبر تیار کریں۔ انہی دو قبروں کے درمیان اور بہت سی قبروں کے لئے جگہ نکلیگی۔ دُوسرے روز ایسا ہی کیا گیا۔ انہی دو قبروں کے بیچ میں اُن کے اٹھارہ خُدّام و خُلفاء آسودہ ہیں۔ غار میں بھی اُن کی نشست گاہ پر ایک فرضی قبر ہے۔ عیش مقام میں حضرت بابا زین الدین ریشی ؒ کی بارگاہِ فیض پناہ مرجع خاص و عام ہے[1]۔

بابا شیخ زین الدین ریشی ؒ کا عرس ہر سال کشمیری حساب کے موجب بارہ ویشاکھی (دہیک) کو چندرما کے مطابق شدھی کو منایا جاتا ہے یہ عرس ظاہر ہے موسم بہار میں پڑتا ہے۔ اِس رات یعنی تیرھویں کو "پھوڑ دو" یعنی خاص قسم کا چراغاں کیا جاتا ہے جس کا چلن خاص کر علاقہ مرزانک محدود ہے۔ لوگ جن میں زیادہ تر بچے ہی شامل ہوتے ہیں چیڑ کی جلتی لکڑیوں کی مشعلیں ہاتھ میں لیکر دوڑتے اور ناچتے ہیں۔ جہاں چیڑ کی لکڑی دستیاب نہ ہو وہاں دھان یا کسی اور قسم کے گھاس کے گٹھے بید کی موٹی اور لمبی شاخوں کے سروں سے باندھکر

---

[1] تاریخِ حسن۔ جلد سوم : ص : ۱۲۸ تا ۱۳۲۔

بجائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی بڑے بھی چھوٹوں کی خوشیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ ایک عجیب سحر انگیز منظر ہوتا ہے۔ لوگ "بیشر دو" کو خریف کی فصل کے لئے زمین کی تیاری کا اعلان تصور کرتے ہیں۔ اسطرح یہ رو شنیوں کا یہ سادہ اور انوکھی رقص زندگی کی معنی خیز علامت بھی ہے۔



میر سید حسین قمیؒ

کشمیر میں اشاعتِ اسلام کی شروعات عملی طور اُس زمانے سے ہوئی جبکہ یہاں کا حکمران رینچن شاہ، جو خود بدھمت کا پیروکار تھا، عارفِ کامل حضرت سید شریف الدین بلبل شاہؒ کے دستِ حق پر بیعت کر کے مُشرف بہ اسلام ہو کر سلطان صدر الدین کے نام سے مشہور ہوا۔ سید بلبل شاہؒ ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اس سلسلے میں مصنّفِ "کحل البصر" سید محمد انیس کاظمی رقمطراز ہیں۔

"شخصیت ایں مرد بزرگ کہ موجب ترویج اسلام در کشمیر گردید لائق ایں است کہ بالاختصار برائی آشنائی باو در ینجا سخنے گفتہ آید خواجہ محمد اعظم دیدہ مری در بارہ ایں درویش خداشناس نویسد کہ اسم مبارک آنجناب قدوۃ الواصلین امام العارفین مروج السلام کاسر الاصنام حق آگاہ مؤید الدین حضرت بابا بلبل شاہ قدس اللہ سرہ الاقدس کہ بامر مرشد بزرگوار خود بروایت متواترہ مشہور بہ طی الامکان از وطن بر آمدہ بال[illegible] در ینجا حاضر شد۔ گویند کہ بلال

شاہ یا بلبل شاہ نخست در زمانِ راجہ سہدیو بہ کشمیر مسافرت نمود۔ بعضے اسم این سید را عبدالرحمان و بعضے سید اشرف الدین و گروہے شرف الدین سید عبدالرحمن ترکستانی گویند ولے این امر مسلم است کہ وے از طائفہ سادات موسوی ترکستان بود۔ ذکتر صوفی در کشمیر می نویسد" ۵

آن کہ در راہِ الٰہی روشن از بدر و ہلال
بلبل باغ ولایت شاہبازِ لا مثال
شد بہ کشمیر اول از دستش درخت دین نہال
شیخ و مرشد عارفِ حق حضرت بابا بلال

(اسرار الابرار بابا داؤدؒ مشکواتی)

عارفِ کامل سید بلبل شاہ سے قبل اگرچہ وادیٔ کشمیر اسلام کے نور سے منور ہو چکی تھی مگر اس دور میں باہر سے آنے والے مسلمان مشائخ تبلیغ دین کے ارادوں سے قطع نظر زیادہ تر سیر و سیاحت اور تجارت کے مقصد سے ہی آیا کرتے تھے۔ پہلے دور کے ان ہی آنے والوں میں حمیم بن سام کا نام بھی لیا جاتا ہے جس نے یہاں اسلام کا چراغ سب سے پہلے روشن کیا۔ لیکن تبلیغی مشن لے کر آنے والوں میں سید شرف الدین بلبلؒ ہی سر فہرست مانے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں تمام مورخین کشمیر اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۹ء کے دوران کشمیر تشریف لائے تھے۔

اشاعت اسلام اور ترویج دین کا مشن لے کر جو مقتدر اور عظیم شخصیتیں کشمیر میں آکر یہاں جگہ جگہ اسلام کی جوت جگا چکیں ان میں جہاں قطب الاقطاب میر سید علی ہمدانیؒ میر سید محمد ہمدانیؒ، سید سلطان حیدر الکبروی، سید صفی الدین اردبیلی، سید تاج الدین ہمدانی میر شمس الدین اراکی، میر محمد مدنی، سید حسین کبروی، سید فیروز ذر، کمال الدین مدنی، سید محمد

جبل العاملی، سید محمد حصاری اور سادات بیہقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وہاں میر سید حسین قمی بھی ایک ایسی دینی و تبلیغی شخصیت تھے، جنہوں نے دین اسلام اور اثنا عشریہ مشن کے پھیلاؤ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ بقول مؤلف تنبیہ العبادفی احوال محمد جواد (منشی محمد جعفر) میر سید حسین قمی ۷۶۱ھ میں ایران کے مشہور شہر قم سے آکر وارد کشمیر ہوئے۔ لیکن حکیم غلام صفدر ہمدانی (سابق افسر خزانہ) اپنی کتاب "شیعانِ کشمیر" میں بیان کرتے ہیں کہ میر سید حسین قمی ۸۲۱ھ کشمیر میں تشریف لائے۔ مگر یہ بات مسلم ہے کہ میر سید حسین قمی دوسرے سادات ایران کی طرح بعہد سلطان زین العابدین بڈشاہ واردِ کشمیر ہوئے اور اسطرح سے کشمیر میں ان کی آمد ۸۲۱ھ کے آس پاس ہی صحیح اور درست دکھائی دیتی ہے اور یہی کشمیر میں سلطان زین العابدین بڈشاہ کا دور تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زین العابدین بڈشاہ کے ہی دورِ حکومت میں ایران سے مذہبی شخصیتیں کسی پس و پیش کے بغیر جوق در جوق کشمیر آتی رہیں۔ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ بڈشاہ شاہمیری خاندان کے ستر ۱۷ سلاطین میں سے وہ واحد بادشاہ تھے جو اپنے پیشرو شہمیری سلاطین میں بہت ہی وسیع القلب، انصاف پسند، منکسر المزاج اور عالموں، فاضلوں اور مشائخ و عارفوں کے بہت قدردان تھے۔ اور ان کے کارناموں کو بہ نظر استحسان دیکھا کرتے تھے۔ بڈشاہ کے ہی عہدِ زریں میں وادی میں علم و ادب اور شعر و شاعری اور دوسرے فنون نے ترقی کی۔ ایران کے ساتھ بڈشاہ کے پچاس سالہ دورِ حکومت میں ہی انکی مخلصانہ کوششوں سے کشمیر کی تہذیبی و ثقافتی رشتے مستحکم و مضبوط ہو چکے اور ایران سے جتنے بھی سادات وادی کشمیر میں وارد ہوتے رہے بڈشاہ اُن سبھوں کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھنے کے روادار تھے اور انہیں اپنے اپنے مسلکوں پر رہنے یا کام کرنے کی کھلی آزادی تھی اور اُن پر کسی قسم کی قدغن نہ لگادی جاتی سلطان زین العابدین نے اپنی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے قریب قریب سبھی سادات

کے حق میں چھوٹی بڑی جاگیریں منظور کی تھیں۔ چنانچہ سید حسین قمیؒ کو بھی اُن کے مصارف کے لئے شمالی کشمیر کی سوپور تحصیل میں زینہ گیر کا پورا پرگنہ دے دیا گیا تھا جیسا کہ اکثر مورخین لکھتے آئے ہیں۔

مُصنِّف "تنبیہ العباد فی احوال مولوی جواد" میں میر سید حُسین قمیؒ کے بارے میں رقمطراز ہے کہ:

"آپ بڑے کشف وکمالات کے مالک تھے۔ سلطان زین العابدین بادشاہ آپ سے بڑی عزّت وتکریم سے پیش آتے تھے اور آپ کے مصارف کے لئے پرگنہ زینہ گیر تحصیل سوپور مقرر کیا تھا۔ آپ کے علمی کمالات اور باطنی فیوضات کی بناء پر بادشاہ آپ سے شرفِ تلمذی بھی حاصل کرتے رہتے تھے۔ سرزمین کشمیر میں مذہب امامیہ کے پھیلانے میں آپکا بڑا ہاتھ ہے۔ آپ کا مزار مبارک سید پورہ پرگنہ زینہ گیر تحصیل سوپور میں مرجع خاص وعام ہے"۔

مؤرخ حسن کھوہامی اپنی کتاب تاریخ حسن کی تیسری جلد "تذکرۂ اولیائے کشمیر" میں میر سید حُسین قمیؒ کی آمد، حیات اور کارناموں خصوصاً اشاعت اسلام کے بارے میں سرد مہری سے صرف یہ دو سطریں لکھ کر میر قمیؒ کے تئیں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں

"عہد سلاطین کشمیر کے زمانے میں قمیؒ نے آکر پرگنہ زینہ گیر میں سکونت کی روحانی فیض وبرکت سے بے شمار لوگوں کو نوازا۔ اُن کا مزار شریف سید پورہ میں مشہور ہے"۔

بیگم ظفر علی سابق ڈپٹی ڈائریکٹر زنانہ ایجوکیشن وسابق ممبر قانون ساز اسمبلی جو کہ نسلاً میر سید حسین قمیؒ کے ہی خاندان سے منسلک ہے اپنی خود نوشت سوانح حیات "میرے شب وروز" میں لکھتی ہے کہ

"تبلیغ مذہب اور تجارت کی غرض سے سبزواری سادات کا ایک اعلیٰ خاندان ایران سے کشمیر چلا آیا۔ یہ خاندان زہد و تقویٰ معرفت اور طریقت و ریاضت اور عبادت کے باعث مرجعِ خاص و عام تھا۔ اس خاندان کے ایک بھائی احمد پورہ (ماگام) اور دوسرے بھائی زینہ گیر (سوپور) میں سپردِ خاک ہیں۔ ان کی قبروں پر آستانے تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہ دونوں آستانے مرجعِ خلائق ہیں۔ زائرین دور و نزدیک سے آتے ہیں عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں اور اپنی مرادوں کی جھولی بھرتے ہیں"

"کاشر انسائیکلوپیڈیا" (جلد ۲) مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی میں میر سید حسین قمی کے بارے میں ظاہر کیا گیا ہے کہ:

"کشمیر کے کئی علاقوں میں دینی تبلیغ سے فراغت پانے کے بعد میر سید حسین قمی نے علاقہ زینہ گیر (سوپور) کے ایک گاؤں میں قیام کیا اور اپنے اس قیام کے دوران تبلیغ دین کرتے رہے۔ عالم دین ہونے کے علاوہ روحانیت میں کمال رکھتے تھے اور اُن سے بہت سی کرامتیں وابستہ ہیں۔ "صراطِ مستقیم" ان کی خاص تصنیف ہے"

منشی محمد دین فوق "تاریخ اقوام کشمیر" کے سادات رضوی کے باب میں میر سید حسین قمی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سلطان زین العابدین بڈشاہ بادشاہ کشمیر کے عہد میں شہر قم ملکِ ایران سے ایک بزرگ سید حسین رضوی کشمیر تشریف لائے۔ بادشاہ مردم شناس تھا۔ اس نے اس جوہر گرانمایہ کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور اپنے آباد کردہ علاقہ زینہ گیر (نزدیک سوپور) میں جو عالیشان باغ بنایا تھا، اس کے رہنے کو عطا کیا۔ آپ حضرت امام علی الرضا کی ذریات میں

ہونے کی وجہ سے رضوی کہلاتے تھے۔ بڈشاہ کی زندگی ہی میں ۷ر شعبان ۸۷۱ھ (مطابق ۱۴۶۶ء) کو آپ زینہ گیر میں جہاں آپ ہی کے نام پر ایک موضع سید پورہ آباد ہو گیا تھا، انتقال فرما گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ مزار آپ کا موجود ہے۔ موضع سید پورہ میں نصف شیعہ اور نصف سُنّی آباد ہیں اور سب زمینداری کرتے ہیں۔ آپ کے دو فرزند تھے۔ فرزند کلان کا نام حاجی محمد سعید تھا جنکا روضہ احمد پورہ (بارہمولہ)[۱] میں مرجع خلائق ہے۔ روضہ کے ساتھ ایک مسجد اور امام باڑہ بھی ہے۔ فرزند ثانی کا نام آغا سید احمد تھا۔ اُن کی اولاد کشمیر کے علاوہ مرشد آباد، پٹنہ، پشاور وغیرہ بلکہ عراق تک کے علاقوں میں موجود ہے۔ عراق میں آغا سید حسن کاشمیری آج سے کچھ عرصہ پیشتر مجتہد عراق کے نام سے مشہور تھے وہ اِسی شاخ سے تھے"

میر سید حسین قمی نے سیدہ پورہ میں اشاعتِ اسلام خاصکر شیعہ مسلک کی ترویج کے لئے جو اَن تھک کوششیں کیں اُن ہی کے نتیجے میں میر قمی نے سیدہ پورہ (زینہ گیر) سے ترہگام (کپوارہ) تک کے بیلٹ میں اثنا عشریہ مسلک کے پھیلاؤ میں نمایاں کارکردگی دکھائی۔ مگر بعد ازاں شہمیری خاندان کے زوال اور چک سلاطین کے ستائیس[۲] سالہ اقتدار کے بعد مغلوں اور دُرانیوں نے جو شیعہ کُش پالیسی یہاں اپنائی اور خاص طور سے مرزا حیدر کاشغری کے ہاتھوں جو مصائب کو اٹھانے پڑے ان ہی سے خائف ہو کر اس بیلٹ کے شیعہ لوگ سنّی مسلک کی طرف واپس لوٹے اور اکثر اس بیلٹ سے ہجرت کر گئے اور اس طرح سے کچھ لوگ زینہ گیر کے دو چھوٹے گاؤں سید پورہ اور ٹھہور پورہ جو ایک دوسرے کے قریب ہیں، میں سمٹ

---

[۱] یہ احمد پورہ (ماگام) ہے

کمرہ گئے۔ شیعیان کشمیر کے فرقہ قدیم[علہ] کے پیشوا اور پیش نماز خاندان سے وابستہ مذہبی رہنما مولوی محمد عباس انصاری اور مولوی افتخار حسین انصاری کے موءرث اعلیٰ ملا عالم کا مرقد اسی سیدہ پورہ کے قریب ایک گاؤں موسوم بہ برآٹ میں آج بھی موجود ہے۔ البتہ اس پر کوئی روضہ تعمیر نہیں کیا گیا ہے۔ صرف چاروں طرف دیوار بندی سے اُن کے مرقد کو محفوظ کیا گیا ہے۔ شیعوں کا یہ پیشوا خاندان اصل میں اسی براٹ گاؤں میں سکونت کرتا تھا جو بعد میں نقل مکانی کرکے پہلے مرہ گنڈ (بارہمولہ) اور بعد ازاں بغا نقاہ سوختہ لنڈ اکدل، سرینگر منتقل ہوا۔ مُلا عالم میر سید حسین قمی کے انصار میں ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زبنہ گیر سے ترہگام کا بیلٹ میر سید حسین قمی کے اثر و نفوذ سے ہی فرقہ اثنا عشریہ کے ساتھ وابستہ ہوا تھا۔

میر سید حسین قمی نے جب سیدہ پورہ میں انتقال کیا تو اُن کے عقیدت مندوں نے اُن کے مرقد پر چہار بام طرز کا ایک شاندار روضہ تعمیر کیا اور اُس وقت روضہ کی چھت اس دور کے رواج کے مطابق بوج پتر کی بنائی گئی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور عدم توجہی سے خستہ ہو چکی۔ پھر سنہ ۱۹۱۲ء میں میر سید حسین قمی کی اولاد میں سے جناب آغا سید حسین سابق گورنر کشمیر نے اس روضہ کی مرمت کرا کے اسے وسعت دی اور چھت پر ٹشنگلی لگا دی گئی۔ بعد ازاں اس صدی کی پانچویں دہائی میں آغا سید مظفر سابق چیف سیکریٹری نے میر قمی کے اس روضہ کی نئے سرے سے مرمت کرا کے اُسے خوب سے خوب تر بنوایا اور زائرین کی سہولیت کے لئے قصبہ سوپور سے سیدہ پور تک جانے والی کچی سڑک کو پختہ کرایا گیا۔ جب میر قمی کا یہ روضہ ابتداً میں بنایا گیا تھا تو اس کے سامنے ایک مسافر خانہ بھی تعمیر ہوا تھا جو آج تک موجود ہے اور جس میں وادی کے اطراف و اکناف سے آنے والے وہ مسافر قیام کرتے ہیں جو میر سید حسین قمی کے

علہ مولوی افتخار حسین انصاری کے مریدوں کو فرقہ قدیم کہا جاتا ہے۔

روضہ کی زیارت کے لئے آجاتے ہیں۔ میر قمی کے ارادت مند سال بھر اسی طرح زیارت کے لئے یہاں آتے رہتے ہیں جس طرح کہ بابا ریشی یا کسی اور زیارت پر عقیدتمند اور چاہنے والے پہنچ جاتے ہیں۔ اس زیارت پر سال میں دو بار برج اسد (جولائی واگست) کے موقعہ پر مجالس وعظ و تبلیغ اور مجالس عزا کا انعقاد ہوتا ہے جن میں علاقے بھر کے محب اہل بیت شرکت کرتے ہیں۔ ان دونوں موقعوں پر میر قمی کے ہزاروں عقیدت مند سید پورہ آکر حاضری دیتے ہیں یہ روضہ کشمیر کے روایتی فن تعمیر کا ویسا ہی نمونہ ہے جیسا کہ یہاں کی دوسری زیارتوں کے روضے ہیں۔



حضرت سیّد محمدؐ امین اویسیؒ

حضرت سید محمد امین اویسی (کشمیری۔ ووسی) میر سید حسین منطقی بیہقی ولد سید نورالدین بیہقی کے دوسرے فرزند تھے۔ پہلے فرزند کا نام میر سید حسن بیہقی منطقی تھا جنکا مزار بمقام اونتی پورہ تحصیل پلوامہ، کشمیر میں شارع عام پر واقع ہے اور محلِ فیوض و برکات ہے۔ آپ کا حقیقی نام اگرچہ سید محمد امین تھا، مگر عوام میں میر اویسی (کشمیری۔ ووسی) کے لقب سے مشہور ہیں۔ میر ووسی کے خاندان کا دوسرا لقب منطقی بھی ہے۔ کیونکہ آپ کے والدِ بزرگوار میر سید حسین علمِ منطق (ع ١٥٩٠ء) میں وقت کے سربرآوردہ بزرگ اور ماہر تھے۔ میر سید حسین منطقی کشمیر میں ان تمام سادات کے جو آپ کی ذریت سے ہیں، جدِ اعلیٰ کہلاتے ہیں۔ آپ کو بیہقی کہے جانے کا سبب یہ ہے کہ آپ کے جدِ بزرگوار سید تاج الدین شہر بیہق سے، جو خراسان (مشرقی ایران) کا ایک مردم خیز شہر ہے، والیٔ کشمیر سلطان سکندر بت شکن کے عہدِ میمنت لزوم میں تیمور کے غیظ و غضب سے بچنے کے لئے واردِ کشمیر ہوئے تھے۔ یہی معاملہ امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی قدس سرہٗ اور آپ کے سات سو سادات

کے ساتھ پیش آیا تھا۔ صاحب تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار اپنی کتاب کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں :۔

"نقل ہے کہ جناب امیرؒ کو امیر تیمور گورگانی سے کدورت و ملال تھا۔ بادشاہ نے آپ کو اپنی قلمرو سے خارج کر دیا تھا، اور اس لئے حضرت امیرؒ نے امیر تیمور کی قلمرو میں نہ صرف قیام و طعام خود پر حرام کر لیا تھا بلکہ ایک مسجد کے ... تھے کہ یہ ملکِ خدا ہے اور میں بادشاہ کی مملکت سے جا رہا ہیں۔ بعد ازاں سات سو سادات و علماء کے ہمراہ نماز ظہر سے ذرا قبل طے مکان کے ذریعہ کوہ پیر پنچال پہنچے تھے۔ یہاں نماز عصر ادا کی اور اس خطہ دلپذیر کو ماہ ربیع الاول ۷۷۴ھ مطابق ستمبر ۱۳۷۲ء جب سلطان قطب الدین حکمران تھا، قدوم میمنت لزوم سے مشرف کیا تھا، اور نفس شہر میں محلہ علاؤالدین پورہ (موجودہ ملک انگن) سرینگر کشمیر میں اقامت اختیار کی تھی۔

روایت ہے کہ میر سید محمد بیہقی کی دختر نیک اختر جو میر دوسی کے چچا تھے، سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ صاحب کے عقد میں تھی۔ چونکہ سلطان کی ان سے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، اس لئے اس نے میر دوسی کے والد میر سید حسین منطقی سے خواہش فرزند ظاہر کی۔ میر سید حسین نے فی الفور آستین سے ایک نوزائیدہ بچہ نکال کر سلطان کی تحویل میں دیدیا اور ساتھ ہی ہدایت کر دی کہ اس کا نام محمد امین رکھا جائے۔ یہ فرزند جو تازہ ان کا بیٹا پیدا ہوا تھا میر سید حسین بیہقی طے مکان کے ذریعہ بیہق سے سلطان کے پاس کشمیر لائے تھے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد جب میر سید حسین کی اہلیہ محترمہ بیہق سے وارد کشمیر ہوئیں، تو از روئے حکایت بولیں کہ فلاں تاریخ میں میرے یہاں لڑکا پیدا ہوا تھا اور اچانک غائب ہو گیا تھا۔ سید حسین نے جواب میں کہا کہ "میں نے وہ فرزند سلطان کو بخش دیا ہے" اس پر آپ کی اہلیہ نے جب بچہ کا مشاہدہ کیا تو، تو چلا اٹھیں کہ یہ تو واقعی میرا ہی فرزند ہے۔ اور اسطرح میر دوسی سلطان زین العابدین کے پالک تھے۔

میر ووسکی نے قرآن وسنت کی تعلیم حاجی بابا ادہم سے حاصل کی۔ حاجی بابا ادہم افغانستان کے شہر بلخ کے باشندے تھے اور سلطان ابراہیم[1] ادہم کے خانوادہ سے منسوب تھے۔ آپ سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں وارد کشمیر ہوئے تھے اور یہیں پر ۸۴۱ھ (۱۴۳۷ء) میں فوت ہو کر قلعۂ شاہی کے باہر مزار شاعر واری میں سپرد خاک ہوئے۔

طریقت و معرفت میں حضرت میر اویسی سید ہلال نقشبندی سے مستفید تھے۔ سید ہلال نقشبندی خواجہ محمد بن محمد المعروف بہ خواجہ بہاؤالدین نقشبند[2] کے مرید تھے اور امیر تیمور کے حملوں کے باعث کشمیر آگئے تھے جہاں سید محمد مدنی سے سلسلۂ کبرویہ میں تربیت پائی تھی۔ بعد از وفات بمقام موضع مالشبل جبل مانسر کے کنارے دفن ہوئے۔ ۵ماہ صفر تاریخ عرس ہے۔

بعد ازاں میر سید محمد امین ووسی سلسلۂ اویسیہ کے متبع ہو گئے تھے۔ طریقت کا یہ سلسلہ ولیٔ کامل حضرت اویس قرنی سے ملتا ہے۔ اویس قرنی محبت رسولؐ میں

---

[1] ابراہیم بن ادہم بن منصور بن زید بن جابر کنیت ابواسحاق شہر بلخ کے مشہور پارساؤں سے تھے۔ آپ کا تعلق عرب کے قبیلہ بنی عجل یا بنی تمیم سے تھا۔ آپ بلخ کے شہزادوں سے تھے جن کی ایک شاخ نے ہندوستان پر بھی حکومت کی ہے۔ چنانچہ سلطان علاؤالدین خلجی کا خاندان اسی علاقے سے تھا۔ سلطان ابراہیم ادہم نے سلطنت کو لات ماردی اور ۱۶۰ھ (۷۷۶ء) میں راہی ملک بقا ہو گئے۔

[2] نقشبند سلاسل تصوف میں ایک مشہور سلسلہ ہے جس کے ماننے والے خواجہ بہاؤالدین محمد نقشبند کے متبع ہیں۔ خواجہ بہاؤالدین نقشبند اپنے مرشد خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی وصیت کے مطابق ذکر جلی (باآواز بلند ذکر) کی بجائے ذکر خفی (آہستہ ذکر) کے قائل تھے۔ نقشبندی طریقہ کے اصول جس کو طریقۂ خواجگان بھی کہتے ہیں یہ ہیں: ہوش در دم، نظر بر قدم، سفر در وطن، خلوت در انجمن، یاد کرد، بازگشت، نگاہداشت، یادداشت۔

اسقدر مستغرق تھے کہ اپنا وجود تک فنا کر دیا تھا۔ سلاسل تصوف میں سلسلۂ اولیسیہ سب سے قدیم ہے۔ یہ ۶۵۷ھ میں متذکرہ صدر حضرت اویس قرنیؓ کے توسط سے وجود میں آیا۔ اس سلسلے کے سالک لذائذ دنیوی سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ روایت ہے کہ جنگ احد میں آنحضرتؐ کا ایک دانت شہید ہو گیا تھا۔ اویس قرنیؓ نے آپ کی متابعت میں اپنا اگلا دانت بھی نکلوا دیا تھا۔ اس فرقہ کے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ چونکہ شدید قسم کی ریاضتوں کا حامل ہے، اس لئے اس کے متبعین صرف یمن میں دستیاب ہیں۔ یمن کے باہر خال خال لوگ ہی اسکے ماننے والے ملتے ہیں۔ بہر کیف میر اویسی بھی اسی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور اسی کی مناسبت سے ویسی تخلص کیا تھا۔ آپ ذات مرشد میں بالکل اسی طرح فنا ہو چکے تھے جسطرح مولانا جلال الدین رومی اپنے مرشد شیخ شمس الدین تبریزی میں فنا ہو چکے تھے، چنانچہ جناب مولانا نے ایک دیوان اپنے نام کی بجائے اپنے مرشد کے نام سے معنون کیا ہے اور اس کا نام دیوانِ شمس تبریز رکھا ہے چنانچہ مرشد کی فوقیت اس شعر میں تسلیم کی ہے ؎

مولوی ہرگز نشد مولائے روم　　　تا غلامِ شمس تبریزی نشد

(ملک روم (موجودہ ترکی) کا آقا یعنی معیت کے مولوی (مولا والے) نہ ہوئے جب تک کہ انہوں نے شمس تبریزیؒ کی غلامی اختیار نہ کرلی)۔

صاحب خوارق السالکین[1] میر سید محمد امین ویسی کے القاب میں رقمطراز ہیں:

---

[1] خوارق السالکین کے مولف ملا احمد بن صبور محلہ رینہ واری سرینگر میں نالہ مار کے کنارے مسجد کے متصل ایک حجرہ میں سکونت پذیر تھے۔ آپ خواجہ ہاشم ہلوا اور خواجہ آفتاب رعناواری کے خوشہ چینوں سے تھے۔ ہادی تخلص تھا۔ خوارق السالکین آپ کی تصانیف میں سے ہے جس میں کشمیر کے بزرگان دین کا بالتفصیل تذکرہ ہے۔ اس کا ایک عدد قلمی نسخہ محکمۂ تحقیق و اشاعت سرینگر میں محفوظ ہے۔

"ولایت کے چبوترے کے صدر، دانائی کی بلندی کا چاند، بزم توحید کے ساقی، ملک تفرید کے حاکم، کوہ یقین کے چہیتے، بحر عرفان کے گھڑیال"۔

کشمیر کے تذکرہ نگاروں کی رُو سے سلطان زین العابدین حضرت میر کا زبردست معتقد تھا۔ سلطان نے بمقام اشم آپ کی عزلت اور گوشہ نشینی کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کی تھی۔ اس سے قبل آپ کچھ عرصہ کوہ ماران (ہری پربت) کے دامن میں خلوت گزیں ہوئے تھے۔ یہاں آپ نے ایک باغ بھی لگایا تھا جو انتہائی دلکش اور دیدہ زیب تھا۔ یہ جگہ "میرہ واڑ" کہلاتی تھی۔

روایت ہے کہ سلطان زین العابدین کی مسلسل یہی کوشش تھی کہ آپ کو اپنا خلیفہ یا جانشین مقرر کرے۔ اسی مقصد کے لئے سلطان آپ کو بیشتر اوقات اپنے ہمراہ رکھا کرتا تھا۔ سنِ بلوغ کو پہنچنے پر سلطان نے اکثر اُمورِ سلطنت آپ کی نگرانی اور تحویل میں دیدیئے تھے جس سے واضح طور پر سلطنت کی جانشینی کے متعلق سلطان کا عندیہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر چونکہ آپ کے سر میں سودا لئے عالم معنوی تھی' اس لئے ترغیب سلطنت ناقابل اعتنا ٹھہری۔

نقل ہے کہ جینل ولر میں جب حرم آباد المعروف بہ زینہ لنک کی تعمیر پایہ تکمیل کو پہنچی تب سلطان نے بطور رسم افتتاح ایک جشن منعقد کیا۔ جس میں ارکین سلطنت بھی شامل ہو گئے۔ ارکینِ سلطنت حسب مراتب نذر و نیاز اور پیش کشوں میں مصروف تھے کہ عین اسی موقعہ پر حضرت محمد امین اویسیؒ نے خود کو ماہی بے آب کی طرح دریا میں پھینک دیا۔ اس صورت حال کے پیش آنے سے سلطان اور حاضرین مجلس کا عیش یکدم منغض (گدلا) ہو گیا۔ خوشی غم سے اور عید ماتم سے مبدل ہو گئی۔ ملاحوں نے اس دُرِ یگانہ کو اس بحر بیکراں سے نکالنے کے لئے دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔ مگر باوجود کوشش بسیار کے یہ موتی ہاتھ نہ

نہ لاسکے۔ بحالتِ یاس و نا امیدی سلطان اور اس کا لاؤ لشکر مراجعت فرمائے شہر ہوا۔ اثنائے راہ میں سلطان جب موضع صفاپور طے کرنے کے بعد اشم پرگنہ محمد آباد پہنچا، تو کیا دیکھا ہے کہ جناب سید ایک درخت کے نیچے رو بقبلہ تشریف فرما ہیں۔ سلطان کے قالبِ مردہ میں جان آگئی۔ سجدۂ شکر بجالایا۔ ارکینِ سلطنت نے تحفے اور ہدایا پیش کئے۔ دراصل سید محمد امین کے مجلس سے غائب ہونے اور اس گاؤں میں آنے کا مقصد خواجہ ہلال نقشبندی سے علمی استفادہ تھا۔ سلطان کی درخواست پر خواجہ ہلال واردِ شہر ہوئے اور بعد از وفات اسی اشم کے گاؤں میں آخری آرامگاہ پائی۔ انہی میر سید محمد امین ویسی نے اسی گاؤں میں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی جس سے اہلِ پرگنہ اب تک مستفید ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت میر ویسی نے یہاں ایک خانقاہ بھی بنوائی تھی۔ جسکا مسالہ آیندہ چل کر خواجہ خاوند محمود نقشبندی کے حکم سے محلہ حسین شاہ چک (موجود نقشبند صاحب) میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں حاجی عنایت اللہ نے ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۸ء) کے مشہور ہی خانقاہ نقشبندیہ کے ارد گرد ایک دالان بنوایا تھا جسکا شمالی حجرہ آثارِ مبارک سے شرفیاب ہوا تھا۔

القصہ جناب سید سلطان کی معیت میں واردِ شہرِ کشمیر ہوئے۔ سلطان اور اس [illegible] میر ویسی کا منہ بولی والدہ تھیں، جناب سید کو عزلت اور گوشہ نشینی کا [illegible] آپ کے [illegible] کدل پل کے متصل ایک عالی شان خانقاہ تعمیر کروادی جو آیندہ چل کر آپ ہی کے نام پر خانقاہ میر ویسی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی خانقاہ میں آپ بعد از شہادت مدفون ہوئے۔

— ایک دفعہ جناب میر سید محمد امین ویسی سید مخدوم بہاؤ الدین ذکریا کے مزار کی زیارت کے لیے ملتان تشریف لے گئے۔ راستے میں چوروں نے آپ سے زرِ نقد طلب کیا۔ آپ نے زمین کھودنے کا حکم دیا اور ایک لاکھ روپے زمین سے برآمد ہوئے۔ دوسری بار چوروں نے پھر آپ کا راستہ روک لیا۔ اس موقعہ پر آپ نے آسمان کی

جانب منہ کیا، فی الفور بارش اور اولے پڑنے لگے۔ چوروں نے جب راہِ گریز نہ پائی تو آپ کے دامن عافیت میں پناہ لی۔ اخیر پر چوروں کا گروہ چوری سے تائب ہوکر آپ کا معتقد ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد طی مکان کے ذریعہ آپ وارد کشمیر ہوگئے

- نقل ہے کہ شبرنگ نامی آپ کا ایک غلام تھا۔ یہ غلام جناب اویسیؒ کی خدمت میں ہمیشہ کمربستہ رہا کرتا تھا۔ آپ کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ یہ غلام بھی صاحب کشف ہوکر امورِ غیبیہ بے تامّل بیان کیا کرتا تھا۔ اس کیفیت سے روکنے کے لیے سید صاحب نے اسے بازار کے کھانے کا عادی بنا دیا تھا۔

- سلطان زین العابدین جس نے باون برس حکومت کرکے ۸۷۴ھ (۱۴۷۰ء) میں رحلت کی اور محلہ ملک پورہ میں دریائے بہت (جہلم) کے کنارے مدفون ہوا، اپنے پیچھے ادہم شاہ نامی ایک بیٹا چھوڑا۔ اس نے ترکِ سلطنت کرکے قلندریؔ[1] اختیار کرلی تھی۔ اسی ادہم شاہ سے ایک فرزند فتح شاہ یادگار رہا جو بعد از وفات محلہ جمالٹہ متصل دریا جہاں اس وقت امیرا کدل ہے، مدفون ہوا۔ ادہم شاہ کا دوسرا فرزند چھ ماہ حکمرانی کرکے بحالتِ مستی کھڑکی سے گر پڑا اور اسکی گردن ٹوٹ گئی۔ بعد ازاں اُس کا فرزند حسن شاہ تخت نشین ہوا۔ اُس نے امرِ وزارت سید محمد بیہقی کے جو میر محمد امین اویسیؒ کے چچا تھے، سپرد کردیا تھا۔ یہ بات امرائے کشمیر بالخصوص تازی بٹ اور ملک احمد یتو کو ناگوار گزری۔ یہ لوگ سادات بیہقیہ کے جو اُن کے خیال میں غیر ملکی تھے اور ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہوگئے تھے، مخالف ہوگئے۔ فرصت پاکر انہوں نے ایک ہی رات میں سادات بیہقیہ کے چودہ آدمی تہ تیغ کردیئے۔ انہیں مقتولین میں ایک شخصیت میر محمد امین اویسی صاحب کی تھی۔ اس وقت آپ اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ نوشہرہ سرینگر میں مقیم تھے۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق آپ اپنا سر پکڑ کر محلہ ملچمر کی خانقاہ میں آئے۔ لوگ یہ کرامت

---

[1] قلندر: وہ فقیر جو لاپروا اور پابندِ شرع نہ ہو۔ (لغات کشوری۔ ص ۳۷۷، کالم پہلا)

دیکھ کر دم بخود رہ گئے اور پھر اسی خانقاہ میں آپ کی تدفین عمل میں لائی گئی۔ شہادت سے قبل آپ کی عبادت گاہ پر جو محلہ عالی کدل سرینگر میں واقع ہے، حسبِ ذیل ابیات خونِ آلودہ انگلیوں سے لکھکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محبوب حقیقی سے جا ملے۔

رباعی ؎

منم آن رندِ جہان گرد مسیحا نفسے | کہ من این ہر دو جہان را نشمارم بخسے
اگر از عشقِ توام سر برود گو برود | کہ من این رازِ نہان تو نگویم بکسے

(میں وہ جہاں گرد اور مسیحا نفس رند ہوں کہ دونوں جہانوں کو تنکے کے برابر جگہ نہیں دیتا۔ تیری محبت میں سر بھی چلا جائے تو تیرا رازِ پنہاں میں کسی سے بھی نہ کہونگا۔ بقول صاحب لغاتِ کشوری رِندوہ منکر جس کا انکار شرعی باتوں سے از روئے عقلمندی کے ہو نہ بسبب جہالت کے)

رباعی ؎

من فارغم زِ مصلحت اہلِ روزگار | میدان یقین کہ کشتن من بود بے گناہ
اکنون بیا و شعر بخوان بر مزارِ من | تا روئے ظالمانِ ستمگر شود سیاہ

(میں اہلِ زمانہ کی مصلحت سے الگ تھلگ ہوں یقین سے جان لے کہ میرا قتل بے گناہ تھا۔ اب اور میری قبر پر شعر پڑھ، تاکہ ظلم پیشہ ظالموں کا منہ کالا ہو جائے)۔

فرد (ایک شعر)

صورتِ قبرم زِ بعد مرگ ویران خوشتر است | نامرادی ہمچو من با خاک یکسان خوشتر است

(موت کے بعد میری قبر ویران اچھی ہے۔ میری طرح نامرادی مٹی میں ملنا بہتر ہے)

روایت ہے کہ تعینِ قبر کے سلسلے میں جب لوگوں کا اصرار شدید ہو گیا، تو فرمایا میری قبر کی خاطر خود بخود بوقت صبح کوئی چیز بر لب دریا پہنچ جائیگی۔ دوسرے روز علی الصباح لوگوں نے صندل کا ایک تختہ دریا میں گزرتے ہوئے دیکھا۔ یہ تختہ جہاں ٹھہرا وہیں پر آپ کی قبر

بنوادی گئی۔ یہ تختہ ابھی تک مرقد شریف پر موجود ہے۔ یہ واقعہ سلخ ذی قعدہ ۸۸۹ھ (سیچر، ۱۹ دسمبر ۱۴۸۴ء) میں پیش آیا۔ "شہید کشمیر" مادہ تاریخ شہادت ہے۔ یہ تاریخ آج بھی ایک سیاہ پتھر پر مزار کی بیرونی دیوار پر جلی حروف میں کندہ ہے۔

میر سید محمد امین ویسی علاوہ صاحب حال بزرگ ہونے کے وقت کے ایک باکمال فارسی شاعر بھی تھے۔ صاحب فتحات کبرویہ ملا عبدالوہاب نوری گنائی نے آپ کی درج ذیل غزلیات بطور تبرک سپرد قلم کی ہیں :-

دلم بدست نگارے فتاد دیگر بار — ستم گرے صنمے سرو قد و لالہ عذار

مہے کہ بر رخ او آفتاب حیران است — شہے کہ میکند از غیر مرغ روح شکار

نہ طاقتے کہ توان کرد صبر در غم او — نہ نیز در نظرش ہیچ قوت گفتار

دمے ہزار فغان می کشیم د ہر ساعت — ز دست آن بت چینی و لعبت بلغار

مرا وصال تو باید نہ دینی و عقبیٰ — کہ من خدائے پرستم نہ خانہ و دیوار

اگر نہ قابل قتلم مرا مگیر و مکش — وگر نہ در غم ہجران مرا چنین مگذار

اگرچہ جملہ عالم غلام تست اے شوخ — چو دولیس منطقی در قرنہا نیابی یار

(ترجمہ :- میرا دل ایک اور دفعہ ایک ظالم سرو قد اور لالہ رخسار محبوب کے پنجے میں جا پھنسا ہے۔ میرا محبوب ایسا چاند ہے کہ سورج بھی اس کے منہ سے حیران ہے۔ ایسا بادشاہ ہے کہ صرف مرغ روح کا شکاری ہے۔ اُس کے بنا طاقت صبر نہیں ہے اور نہ اسکی نگاہوں سے قوت گفتار ہے۔ اُس بت چینی اور بلغاریہ کی گڑیا سے ہر گھڑی ہزار آہ و فغان کرتا ہوں۔ اے محبوب مجھے تو تیرے وصل کی ضرورت ہے دنیا اور آخرت کی نہیں۔ میں خدا کی پوجا کرتا ہوں، گھر اور دیوار کا نہیں۔ اگر میں قتل کے قابل نہیں ہوں تو مجھے گرفتار نہ کر اور غم ہجر میں نہ رکھ۔ اے بے باک محبوب اگرچہ تمام دنیا تیری غلام ہے تاہم تو دولیس منطقی جیسا صدیوں میں بھی یار نہ پائیگا)۔

مائیم محرم حرم کبریائے دوست | چون ما وقوف نیست کسے را بجائے دوست
ما خواجۂ سراچۂ اسرارِ لا مکان | جولان کنان بخلوت جنت سرائے دوست
مائیم از آنِ مظہر اعیان ممکنات | جام جہان نمائے رُخِ جانفزائے دوست
ما سرو قامتیم بہ بستان کائنات | از قدِ ماست زینت و زیبِ قبائے دوست
مارا مسلم است درین عرصۂ وجود | حکم و نشاط و عیش اقامت بجائے دوست
اے آنکہ طالب رُخِ زیبائے دلبری | اُنظر بو بجھا ستروں لقائے دوست
ہان گر ز وجود فانی مطلق شوی چو ما | یابی بقائے لم یزلی از لقائے دوست

چون وِلیس منطقی نظر کرد دوست دید
چون تجلہ ذات دید لبشد خاک پائے دوست

(ترجمہ:- ہم دوست کے حرم کبریا (بزرگ احاطہ) کے رازدار ہیں۔ ہماری طرح کسی کو بھی دوست کی جگہ معلوم نہیں ہے۔ ہم لامکان کے گھر زینے کے دارو غہ ہیں اور اس لئے دوست کی جنت سرا میں گردشیں کرتے ہیں۔ ہم اشیائے ممکنات کے مظہر ہیں اور دوست کے جانفزا چہرے کے جام جہان نما ہیں۔ ہم چمن کائنات (دنیا) کے سرو ہیں اور ہماری بدولت دوست کی قبا کو زیب و زینت ہے۔ اس وجود کے میدان میں ہمارے لئے ہی عیش و عشرت مسلّم ہے۔ اے وہ شخص جو محبوب کے رخِ زیبا کا طالب ہے، تجھے چاہیئے کہ کوہ اُستروں[1] میں دوست کی شکل دیکھ لے۔ اے شخص جب تو اپنے وجود سے فانی ہو کر آزاد ہو جائے گا۔ تب ہی دوست کی ملاقات سے ابدی بقا پائیگا۔ دلیس منطقی نے جب نظر ڈالی تو دوست دیکھ لیا اور جب پوری ذات دیکھ لی، تو اسکی خاک پا ہو گیا)۔

بہ عاشقاں کہ فراق و وصال یکسانست | نہ شاد مانیٔ وصل و نہ بیم ہجر انست

---

[1] جموں دسرینگر شاہراہ پر اونتی پورہ کے مشرق میں ستروں ایک پہاڑ کا نام ہے جہاں میر دسیبی کے دوسرے بھائی سید حسن منطقی دفن ہیں۔

بہ پیشِ مردمِ عارف چہ مسجد و چہ کنشت | بچشمِ اہلِ نظر خوب و زشت یکسانست
دلا بچشمِ حقارت نظر بکفر مکن | کہ آں بنزدِ محقق بغیرِ ایمانست
کسیکہ دیدۂ وحدت بفیگند برہم | زکافریست اگرگویمش مسلمان است
جہان و کارِ جہان پُر ز معنیٔ ازلیست | بچشمِ سر نگر کان ہمہ در انسانست

اگر ز مذہب و ملت بپرسی از ہوتیسی
بہ دینِ عشق تو سرخیلِ بُت پرستان است

(ترجمہ:۔ عشاق کے لیے جدائی اور وصل ایک شے ہے۔ انہیں نہ وصال کی خوشی ہے اور نہ فراق کا غم۔ مردِ عارف کے لئے مسجد اور مندر اور اہلِ نظر کے لئے اچھا اور بُرا یکساں ہے۔ اے دل کفر کو بنظرِ حقارت مت دیکھ کیونکہ وہ محقق کے نزدیک ایمان کا غیر ہے۔ جس شخص نے نگاہِ وحدت بند کرلی، وہ باوجود مسلمان کے کافر ہے۔ دنیا اور اس کا کام ابدی معنی سے پُر ہے اور اسے جب تو سر کی آنکھوں سے دیکھے گا تو یہ سب انسان میں پائیگا۔ اے شخص اگر تو وتیسی کے دین و مذہب کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہے، تو جان لے کہ وہ تیری محبت میں بُت پرستوں کا سردار ہے)[1]

متذکرہ صدر غزلیات اس امر کی آئینہ دار ہیں کہ آپ کے کلام میں تصوف و عرفان کی چاشنی بدرجۂ اتم ہے۔ غزلیاتِ سوزِ عشق اور سپردگیت کی بہترین نمونہ ہیں۔ اندازِ بیان دلکش، سلیس، اور سادہ ہے۔ بعد کے شعراء کے برعکس رعایتِ لفظی سے قطعاً گریز ہے اور وارداتِ عشق من و عن صفحۂ کاغذ پر اسطرح بکھیر دیئے گئے ہیں جس طرح موتی کی لڑی

---

[1] اسی مطلب کو اردو کے مشہور و معروف شاعر میر تقی میر نے اپنا غزل کے ایک مقطع میں یوں بیان کیا ہے ؎

میر کے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ٹوٹ کر زمین پر بکھر جاتی ہے۔ فنا فی اللہ اور ذاتِ ربانی میں مدغم ہو جانے کا اس سے بہتر بیان ناممکن ہے ۔

بالن کرزوجود فانی مطلق شوی چھا   یا بی بقائے لم یزلی از لقائے دوست

ساداتِ بیہقیہ کے خلاف امرائے کشمیر کی بغاوت میں میر ویسی کے عزیز و اقارب سے جو بزرگ شہید ہوئے، اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

● ۔ میر محمد منلقی' حضرت ویسی کے خواہر زاد (بھانجا) تھے۔ آپ سے تربیت پا کر مقاماتِ عالیہ پر فائز ہوئے تھے۔ آپ کی شہادت موضع زینہ کوٹ' پرگنہ سایر الموا ضع پائین میں ہوئی تھی جہاں سے آپ کی نعش محلہ سکہ ڈافر میں برلب دریا سپرد خاک کی گئی تھی۔ انہی دنوں دریا مل نام ایک شخص نے جو بڑا صالح تھا' خواب میں دیکھا کہ میر محمد منلقی فرما رہے ہیں کہ دریا طغیانی ہوتا ہے' اس لئے مجھے کسی اور جگہ دفن کریں۔ دریا مل نے اس سے تغافل برتا' کیونکہ قبر کی جگہ غیر معلوم تھی۔ تیسرے روز فرمایا کہ کل کو جا۔ وہاں کی زمین بہ سبب بارش تر پائیگا' مگر میری قبر کی جگہ خشک ہو گی۔ اس پر شخص مذکور نے بیلچہ برداروں کو بلوا کر قبر کھدوائی اور پھر آنجناب کو محلہ چھ بل میں اس جگہ دفن کر دیا جہاں بحالت موجودہ خانقاہ دُد شاہ مجذوب ہے۔ صاحبِ فتحات کے نزدیک آپ کی ضریح مبارک متبرک اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

● ۔ سید ناصر الدین بیہقی آپ سید محمد کاندھامی ولد سید تاج الدین بیہقی کے خلف الرشید تھے۔ سید ناصر الدین بیہقی سید محمد امین منلقی ویسی کے واقعۂ شہادت کے وقت ہندوستان ہجرت کر گئے۔ کچھ مدت بعد حسن شاہ کی استدعا پر دوبارہ کشمیر لوٹ آئے تھے۔ آپ کی دختر سلطان حسن شاہ کے عقد میں تھی۔ بمقام بمبر مدفون ہیں۔

● ۔ سید حسن بیہقی' سید ناصر الدین بیہقی کے فرزند تھے۔ روحانیت کی تعلیم والد ماجد سے پائی تھی۔ آپ بھی منجملہ اُن سادات کے ایک تھے جنہوں نے ساداتِ بیہقیہ کے خلاف

امرائے کشمیر کی بغاوت میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ محلہ دوکان شری بھٹ (متصل عالمگری بازار سرینگر) میں بر سرِ راہ دفن ہیں جبکہ بقیہ شہدائے محدودِ نوشہرہ میں مدفون ہیں۔

● سید تاج الدین، سید علاؤالدین بیہقی کے تیسرے فرزند تھے۔ آپ بھی سید حسن بیہقی کے ساتھ شہید کر دیئے گئے تھے۔ بمقامِ اسکندر پورہ مع دیگر ساداتِ عالی درجات کے دفن ہیں ۔



حضرت سیّد محمّد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا نام مبارک سیّد محمد (مدنی) تھا۔ مگر سرزمین کشمیر میں آپ مدنیؔ صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ خاندان اور نسب کے لحاظ سے آپ کا تعلق ساداتِ قادریہ سے رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ کبیر کشمیر میں درج ہے۔

سیّد محمد مدنی از خویشان حضرت میر محمد ہمدانی است قدس اللہ سرہ و بعضی می گویند که از اولادانِ قطب ربانی محبوب سبحانی حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ است۔

اور آپ ان کی ذریت سے ہیں۔ چنانچہ فتوحات قادریہ میں اِن کا نسب نامہ موجود ہے جس کی نقل درج کی جارہی ہے۔ لیکن اہل تشیع آپ کو اولاد حضرت زید شہید فرزند امام زین العابدین رضی اللہ عنہ، سمجھتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کبیر میں بیان کیا گیا ہے۔

"و اہلِ تشیع اورا از اولادِ حضرت زید شہید فرزند امام زین العابدین رضی اللہ عنہما می دانند"

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری 'واقعات کشمیر' میں بیان کرتے ہیں:۔

"سید السادات منبع البرکات حضرت سید محمد مدّنی از رفقائے بلکہ از منسوبانِ

حضرت میر سید ہمدانی قدس اللہ سرہ بود۔"

بعض تذکروں میں بیان کیا گیا ہے کہ ان سے کسب فیض بھی کیا ہے۔

بہر حال حضرت سید محمد مدنی (مدین صاحب) ایک خاص عرصہ تک مدینہ شریف میں قیام پذیر تھے۔ اور اس وجہ سے مدنی کہلائے۔ مکہ معظمہ میں بھی حاضری دی تھی اور پھر سیر و سیاحت کا خیال دل میں جاگزین ہوا اور شاہ حبشہ کی صاحبزادی سے شادی کرلی۔ طریقہ سہروردیہ پر قائم تھے اور قطب عالم جناب حضرت مخدوم سید جلال الدین بخاری قدس اللہ سرہ سے بھی روحانی فیض حاصل کیا اور مدینہ مطہرہ سے رخت سیاحت باندھا اور اکثر اسلامی ممالک کی سیر کی اور امیر تیمور کے ایک ایلچی کے ساتھ سلطان سکندر شاہمیری کے عہد حکومت میں کشمیر تشریف لائے اور پھر سلطان سکندر کی جانب سے بعض ملکی معاملات کی انجام دہی کے سلسلے میں ولایت ماوراء النہر تشریف لے گئے اور نہایت ہی عمدہ طور پر اپنا فرض پورا کرلیا اور اہل و عیال کے ساتھ دوبارہ کشمیر آئے اور رینہ واری میں محلہ ہزاری بازار میں سکونت پذیر ہوئے۔ بادشاہ اکثر اوقات آپکی ملاقات کے لیے آتا تھا۔ پھر بادشاہ نے نہایت ہی منت اور عاجزی کر کے اپنے محلات، واقع نوشہرہ میں رہنے کی استدعا کی۔ جو آپ نے منظور کرلی۔ بادشاہ نے آپ کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کی۔ حکام اور سلاطین ہر روز آپکی ملاقات کے لئے آتے تھے۔ یہاں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ خراسان، ترکستان اور ہندوستان امیر تیمور گورگان کے زیر نگین تھے۔ عرب، عراق کے حکمرانوں کے ساتھ کشمیر کے سلاطین کے دوستانہ مراسم اور خوشگوار تعلقات قائم تھے۔ امیر تیمور بھی کشمیر کے سلاطین سے بہت ہی خوش تھا۔ چنانچہ تحفہ و تحائف کا سلسلہ ان کے درمیان جاری تھا اور بقول مفتی محمد شاہ سعادت سید مدنی امیر تیمور کے دربار سمرقند میں بھی چند دنوں کے لئے قیام پذیر تھے۔ امیر تیمور نے ان کا سرکاری اعزاز کے ساتھ استقبال کیا تھا اور کچھ عرصہ بعد حضرت سید مذکور کو کشمیر کی سفارت کی پیش کش کی جو انہوں نے قبول فرمائی[ش] ـــــ شجرہ نسب منقول از فتوحات قادریہ۔

غوث الاعظم پیر پیران حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سید عبدالرزاق ← سید تاج الدین ← سید ابو صالح النصر ← سید شمس الدین ← سید احمد ← سید شرف الدین یحییٰ

← سید محمد ← سید علی ← سید حسین ← سید حسن ← سید یحییٰ ← سید قاسم ← سید احمد ← سید علی ← سید حسین ← سید نعمت اللہ ← سید قاسم

← سید محمد (مدنی) المعروف مدین صاحب رح

ش سید محمد مدنی مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے اور سلطان سکندر کے زمانے میں بطور سفیر کشمیر آئے۔ (کاشر انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ کلچرل اکاڈمی)

کشمیر کی آب و ہوا حضرت سیدؔ مذکور کی روحانی طبیعت کو بہت ہی مرغوب خاطر ہوئی۔ اِن دنوں لوگ جوق در جوق حلقۂ اسلام میں شامل ہوتے تھے۔ توحید پرستی کا دورہ دورہ ہونے لگا۔ سادات، علماء بزرگانِ دین کی قدر شناسی ہوتی تھی۔ کشمیر میں سیدؔ محمد اصفہانی، قاضی حسین، سید شیرازی اور سید محمد خاوری کی صحبت کا استفادہ کیا۔ جناب حضرت شیخ بہاؤالدین گنج بخش کشمیریؒ سے بھی دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔

واقعات کشمیر میں مورخ محمد اعظم بیان کرتے ہیں کہ نوشہرہ کی سکونت سے پہلے حضرت سیدؔ مدنیؔ نے مالہ سوہ، پرگنہ بانگل میں سکونت اختیار کرلی تھی اور پھر سلطان زین العابدین بڈشاہ کی استدعا پر سرینگر تشریف لائے اور نوشہرہ میں قیام پذیر ہوئے۔ چنانچہ محمد اعظم مورخ کشمیر فرماتے ہیں :-

"و بعضے گویند کہ در عہد سلطان زین العابدین اوائل در موضع مالہ سوہ پرگنہ بانگل توطن فرمودہ بود ثانی الحال بہ التماس بہ شہر آمدہ در نوشہرہ سکونت نمودند۔"

اور اس طرح سلطان اور ان کے حکام کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ سلطان نے ان کیلئے ایک خانقاہ بنوائی اور اس کے ساتھ ایک لنگر خانہ بھی قائم کیا۔ درس و تدریس کے لئے ایک مدرسہ بھی بنوایا جہاں سید مدنی کے علاوہ ملا عبدالکبیر قاضی حسین سید شیرازی درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مدرسہ اور خانقاہ کے اخراجات کے لئے چند دیہات کی آمدنی مقرر کی گئی تھی۔ یہ مدرسہ بہت دیر تک تشنگانِ علم و فن کی پیاس بجھاتا رہا اور کشمیری سلاطین کی خانہ جنگی میں شاہی محلات کے ساتھ جل گیا اور آج بھی اس کے کھنڈرات اسکی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ خانقاہ مدنی کے بارے میں مورخ اعظم لکھتے ہیں :-

"میگویند کہ حضرت سید بنائے مسجد خود را سعی زیادی کردہ در طول و عرض برابر بیت اللہ قبلہ عالم است درست فرمودند ازیں جہت تجدید بنا بہ تکرار نمودند تا مرتبہ اخیر راست آمد"

یہ خانقاہ کشمیر میں اب بھی موجود ہے۔ اس کی تعمیر ۸۴۸ھ مطابق ۱۴۴۴ء میں ہوئی تھی۔٭ مسجد مدنی

٭ مسجد مدین صاحب سرینگر کے علاقہ مدین صاحب میں واقع ہے۔ اسکے شمالاً قریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر زڈی بل کا علاقہ ہے۔ ایک جانب سازگری پورہ، دوسری جانب باغ علی مردان خان اور آگے نوشہرہ کا علاقہ ہے۔ اسی علاقے میں ایک زمانے میں سلطان شہاب الدین (1355 - 73) نے لکشمی پور آباد کیا تھا۔

مسجد کی بنیاد ۱۴۴۸ء میں سلطان زین العابدین نے اپنے استاد سید محمد مدنی کے نام پر ڈالی — (کاشر انسائیکلوپیڈیا، مطبوعہ کلچرل اکادمی ص۳۵۳)۔ ایڈیٹر

میں بڑے بڑے پتھر استعمال کئے گئے ہیں۔ تاحال یہ مسجد خستہ حالت میں تھی۔ لیکن اب سرکار نے اسکی مرمت کی ہے اور قدیم طرزِ تعمیر کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسجد کو دیکھ کر سلاطین کشمیر کی فن تعمیر سے دلچسپی کی داد دینی پڑتی ہے کہ عظیم مغلوں کی طرح سلاطین کشمیر بھی زبردست معمار تھے۔ پتھروں کا ملاپ اور عمارات کی لاثانی نوعیت کا طریقہ اہل فن و ہنر اور کاریگروں کی اعلیٰ قابلیت کا نمونہ ہے۔ اس کی مشرقی دیوار کے ایک پتھر پر بخط جلی عربی عبارت کندہ کی گئی ہے۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ھٰذا المسجد فی العہد ظل اللہ الارضین السلطان زین العابدین خلد اللہ ملکہ"۔ دوسرے پتھر پر یہ فقرے پائے جاتے ہیں۔ "بنی ہٰذا المسجد الفقیر محمد المدنی۔ ساکن کشمیر"۔ تیسرے پتھر پر عربی میں یہ تاریخی فقرہ منقوش ہے۔ "فی تاریخ سنہ ثمان واربعین وثمان صایہ"۔

حضرت علامہ شیخ بابا داوٗد مشکواتیؒ اُن کے بارے میں اپنی کتاب "اسرار الابرار" میں منتخب التواریخ کے حوالے سے فرماتے ہیں :۔

"جناب حضرت سید مدنی فیض رسانی میں کامل، پرہیزگاری میں یکتا اور بزرگی میں لاثانی تھے۔ زہد و تقویٰ کے رفیق اور شریعت کے امیر تھے۔ خداشناس اور خالص توحید پرست تھے۔ میر سیّد محمد ہمدانیؒ کے مرید تھے۔ اِس زمانے میں جو خدادوست، علماء فضلاء اور صلحاء وارد کشمیر ہوئے تھے ان سب سے انہوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ غرض وہ دُنیائے فانی سے واقعی آزاد، ریاضت و عبادات میں بے مثال، کرامات میں یکتائے روزگار اور مقاماتِ ولایت میں ہوشیار اور ماہر تھے۔"

ان کا قول ہے کہ "آدمی کا اعتبار اِس کی بصیرت سے ہوتا ہے۔ اگر انسان کی آنکھیں اپنے محبوب دوست کا جلوہ دیکھیں تو ان کا اعتبار اور بڑھ جاتا ہے۔ انسان کا جسم کھال ہے۔ اگر دیدارِ حق نصیب نہ ہو تو اس کے لئے اندھا ہونا ہی بہتر ہے۔ ظاہری حشمت میں اگر انسان سلیمان کا ہمسر ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس سے چیونٹی ہی بہتر ہے"۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ بُرا فقیر وہ ہے جو بادشاہوں کے دروازوں پر مارا مارا پھرے اور بہتر بادشاہ وہ ہے جو فقیروں کے درباروں سے فیض یاب ہو۔

حضرت بابا داوٗد مشکواتیؒ نے "خاور نامہ" اور "لمعات" کے مصنف سید محمد خاوری کے حوالے سے ان کے متعلق ایک خاص واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن سلطان زین العابدین اپنے وزیر کے ساتھ انکی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے ان کو ظاہری اور باطنی طور پر باکمال پایا۔ نہ انکی دینداری میں کوئی کمی پائی اور نہ نیک کردار میں کوئی رخنہ دیکھا۔ بادشاہ، جو خود بھی پابند صوم و صلوٰۃ اور نیک کردار

تھا۔ شرف ملاقات پاتے ہی مطمئن ہوا اور اپنی انتہائی عقیدت کا اظہار کیا لیکن حضرت سید محمد مدنی نے بڑی انکساری کا اظہار کرکے فرمایا کہ مجھے ہی بادشاہ عادل و عابد کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیئے تھا مگر میں نے اتنی جسارت نہ کی تاکہ بادشاہ کے حکام کو تکلیف نہ پہنچے۔ بادشاہ نے کہا کہ خدمت تو ہماری طرف سے اور دعائے نیک آپکی طرف سے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ عارفوں کی زبانی یہ بات مشہور ہے کہ ایک لالچی درویش وہ ہے جو امیدوں کے دروازوں پر ہاتھ پھیلائے اور بلند ہمت بادشاہ وہ ہے جو عابدوں اور درویشوں سے روحانی فیوض و برکات حاصل کرے۔ اظہار عقیدت و خلوص کے بعد بادشاہ نے حضرت میر محمد مدنی کے اعزاز میں عالیشان دعوت کا اہتمام کیا اور حضرت محمد مدنی نے بھی بحکم خدا اور رسولؐ عادل حکمرانوں کی فرمانبرداری کے طور پر اس دعوت کو قبول کیا۔ بادشاہ نے اپنے محل کے شاہی خانِ سامان کو بلاکر قسم قسم کے کشمیری کھانے پکانے اور گوناگوں نعمتیں تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور ان میں شکار کی شب دیگ بھی شامل تھی جو کشمیری سلاطین کا ایک مرغوب کھانا تھا۔ خانِ سامان نے شاہی کاردار (شکاری) کو حکم دیا تھا کہ وہ مُرغابی ذبح کرکے باورچی کے سُپرد کردے تاکہ اس کا پکوان بھی دعوت میں شامل ہو۔ شکاری جب مرغابی کے شکار کو گیا مرغابیاں پانی میں کود پڑیں۔ شکاری نے ایک مرغابی کی گردن پر لاٹھی ماری۔ جب تک شکاری تیرتا ہوا اس مُرغابی کے نزدیک پہنچا تب تک مرغابی مرچکی تھی۔ شکاری نے بادشاہ کے ڈر سے خود مردہ مُرغابی کو ذبح کرکے خانِ سامان کے ذریعے باورچی خانے میں پیش کیا۔ باورچی نے پکوان تیار کیا۔ جب دستر خوان بچھا تو سید مدنی نے مرغابی کے پکوان کو اٹھاکر الگ رکھ دیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ اس پکوان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ گھر بھیجدیں یا اور کسی کو دیدیں۔ سید محمد مدنی نے فرمایا کہ یہ شکاری کو دیدیں۔ بادشاہ پریشان ہوا اور شکاری کو طلب کیا۔ اس سے پوچھ تاچھ کی گئی کہ کیا معاملہ ہے۔ شکاری ڈر گیا اور ڈرتے ڈرتے سچ کہنے کے بغیر کوئی چارہ نہ جانا اور سارا ماجرا سُنا ڈالا۔ بادشاہ وزرار اور اراکین سلطنت میر محمد مدنی کے اور زیادہ عقیدت مند بن گئے۔ بادشاہ نے میر سید محمد مدنی سے معافی مانگی اور شکاری کو سخت تنبیہ کی۔ اس واقعہ کے بعد سلطان زین العابدین بڈشاہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے روحانی فیوض و برکات کے علاوہ ان کے پند و نصایح سے بھی مستفید ہوتا۔

اس واقعہ کے بارے میں خواجہ محمد اعظم دیدہ مری بیان کرتے ہیں کہ سلطان زین العابدین نے امتحان کے مقصد سے دیدہ و دانستہ خود مردہ مرغابی کو پکوایا تھا تاکہ میر محمد مدنی کے روحانی کمالات کا اندازہ ہوسکے۔ چنانچہ محمد اعظم فرماتے ہیں:

"اکثری نوشتند کہ بقصد امتحان این از کسان سلطان سر زدہ بود"۔

محی الدین مسکینؔ، مشہور مورخ و مصنف "تاریخ کبیر کشمیر" نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ سلطان نے امتحان کے طور پر ایسا کیا تھا۔ محی الدین مسکین لکھتے ہیں :۔

"و اکثری نولیسند کہ ایں کار از ملازمان سلطان بر سبیل امتحان واقع شدہ بود"۔

بابا داؤد مشکواتیؒ محی الدین مسکین اور مؤرخ اعظم نے "خاور نامہ" اور "لمعات" کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب حضرت سید محمد مدنیؒ بیمار ہوئے تو انہوں نے وصیت فرمائی کہ میرے مرنے کے بعد کوئی بھی مجھے غسل نہ دے کیونکہ میں نے اپنے ایک دوست سے عہد کر رکھا ہے کہ وہی مجھے غسل بھی دے گا اور میری تجہیز و تکفین بھی کرے گا۔ چنانچہ جب آپ نے وفات پائی تو آپکی وصیت کے مطابق لوگ انتظار کرنے لگے، یہاں تک کہ ایک دیوانہ سر اور پیر سے ننگا وہاں آ پہنچا اور لوگوں کو ہٹا کر اکیلا انکی تجہیز و تکفین میں مصروف ہوگیا۔ فارغ ہو کر وہ اس دنیا سے پرے کہیں چلا گیا اور کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔ اس دنیا سے پرے بہت سارے عالم ہیں اور ان نظروں سے ہٹ کر بیشمار کوائف و حالات ہیں۔ بابا داؤد مشکواتیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اِن حالات کا یقین ہے اور کوئی شک نہیں۔ ان کا قول ہے :۔

"نیا کہاں سے آتا ہے اور پرانا کہاں چلا جاتا ہے۔ نظروں سے اوجھل لاانتہائی عالم ہے"۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

آگے چل کر یہ تینوں مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت مخدوم شان بابا اچپ گنائیؒ اپنے مرشد شیخ بہاؤالدین گنج بخش کے پاس گئے تھے لیکن اُن کو اپنے مقام پر نہ پایا۔ بہت تلاش کے بعد دیکھا کہ نوشہرہ کی طرف سے آرہے ہیں۔ جب حال پوچھا تو فرمایا کہ حضرت سید مدنیؒ کے ساتھ میرا وعدہ تھا کہ اگر میں پہلے فوت ہو جاؤں گا تو وہ میری تجہیز و تکفین کریں گے اور اگر وہ پہلے فوت ہوگئے تو میں انکی تجہیز و تکفین کروں گا۔ آج وعدہ پورا کیا، وفا کی سرحد میں دوڑا اور وعدہ پورا کر کے واپس پہنچا کیونکہ

وعدے سے منحرف ہونا ظلم ہے اور وعدہ توڑنا کفر ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے جس کا نتیجہ یہ نکالنا چاہیئے کہ حضرت سید محمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے میں دنیا کو خیرباد کہہ گئے تھے جب قطب العالم حضرت شیخ بہاؤالدین بقید حیات تھے۔ حضرت شیخ بہاؤالدین رح کی وفات ۸۴۹ھ مطابق ۱۴۴۶ء میں واقع ہوئی۔ فتحات کبرویہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید محمد مدنی نے ۸۹۴ھ میں انتقال فرمایا اور اسرار الاخیار کے مصنف بھی غالباً فتحات کبرویہ کے حوالہ پر آپ رح کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "در ۸۹۴ھ ندائے ارجعی بشنید"۔ لیکن "اسرار الابرار" "واقعات کشمیر" وغیرہ کی تحریرات، حوالہ جات مدنظر رکھتے ہوئے فتحات کبرویہ کی تاریخ وفات درست معلوم نہیں ہوتی۔ اسرار الابرار وغیرہ کی بات اس لئے زیادہ قابل تسلیم ہے کہ یہ کتاب مستند اور مصدقہ نقولات سے اخذ کرکے اس زمانے میں مرتب اور تصنیف ہوئی جب کہ سید محمد مدنی کے انتقال کے بعد تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ متفقہ طور پر تاریخ نامہ جات حوالہ دیتے ہیں کہ آپ رح نے سلطان بڈشاہ کے عہد حکومت میں داعی اجل کو لبیک کہا ہے۔ سلطان بڈشاہ ۸۴۶ھ مطابق ۱۴۴۲ء تخت نشین ہوئے ہیں۔ ۵۱ سال تک حکومت کرکے ۸۷۹ھ مطابق ۱۴۷۴ء انتقال کر گئے۔ بہرصورت حضرت سید محمد مدنی بعد از انتقال علاقہ نوشہرہ محلہ مدین صاحب (جو کہ انہی کے نام پر موسوم ہوگیا) اپنی عظیم الشان خانقاہ کے بالکل متصل بجد جنوب دفن کئے گئے ہیں۔ ماہ رجب کی گیارہویں تاریخ تھی اور ۸۹۴ھ جب آپ رح نے انتقال فرمایا۔ قبرستان کی مضبوط و مستحکم احاطہ بندی بذریعہ سلطان بڈشاہ قائم ہوئی ہے۔

حضرت مدنی کی اہلیہ بی بی حبش حاجی کا اصلی نام ہاجرہ خاتون ہے۔ وہ محلہ ہزاری بازار رعناواری میں سکونت پذیر تھیں۔ مرنے کے بعد اپنے مکان کے صحن میں ہی مدفون ہوئیں۔ اور اکثر ان کے متعلقین بھی اسی مقبرہ میں دفن ہیں۔ یہ شاہ طاماسن حبشہ کی دختر نیک اختر تھیں جو ان کے نکاح میں آئی تھیں۔

حضرت سید محمد مدنی کے جنازے میں سلطنت کے اراکین، وزرا۔ خود سلطان زین العابدین۔ علماء فضلاء اور عوام شامل تھے۔ نماز جنازہ کی امامت خود سلطان نے انجام دی تھی۔ نماز جنازہ میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں شامل تھے۔

وفات کے بعد ان کے روضہ پر سلطان بڈشاہ کے عہد حکومت سے ڈھائی سو سال تک خاص و عام مسلمانوں کا دستور العمل رہا تھا کہ وہ ہر جمعرات اور پیر کے دن یہاں آتے تھے اور خانقاہ مدنی میں

نماز ادا کر کے ان کے روضہ پر فاتحہ خوانی کے آداب بجالاتے تھے۔

خواجہ اعظم مورخ ان کے روضہ کے بارے میں واقعات کشمیر میں بیاں کرتے ہیں :

"مقبرہ شریفہ ایشان را محل استجابت دعا میدانستند۔ تا عہد علی مردان خان زیارت گاہ تمام شہر بود۔ ہجوم و ازدحام میرفتند۔ بعد آن تخفیف گونہ شد و ایں حکایت دریں نسخہ جای دیگر مرقوم خواہد شد"۔

یہ مقبرہ شریفہ محل استجابت دعا سمجھا جاتا تھا۔ کشمیر میں علی مردان خان کی آمد تک یہاں بے انتہا عوام کا ہجوم ہوا کرتا تھا۔ شب برات، شب قدر، شب معراج، عید میلاد کی محفلیں یہاں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لیکن بعدازاں اس قسم کی مجلسوں میں لوگوں کی حاضری کم ہونے لگی۔ اسی دوران ایک گستاخ نے یہاں بڑی دیدہ دلیری سے بے ادبی کی گو کہ اسی وقت وہ ایسی سزا پا گیا جو کہ از حد عبرتناک تھی۔ اس کی آنکھیں بے نور ہوگئیں اور وہ اندھا ہوگیا۔ یہ واقعہ کشمیر کے طول و عرض میں مشہور ہوا اور لوگ اس روضہ پر جانے سے ڈرنے لگے۔

علی مرداں خان نے روضہ شریفہ اور مسجد مدنی کی مرمت کی۔ کہتے ہیں کہ اس روضہ پر اکبر اعظم، جہانگیر اور شاہ جہاں بھی حاضری دیا کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ جہاں کے حکم سے اس روضہ کی مرمت علی مرداں خاں نے کروائی تھی اور بقول مؤرخ، سعادت علی مرداں خاں نے ہی خانقاہ مدنی کے کتبہ پر علیؑ ولیا لکھا۔

علی مرداں خاں نے مدین صاحب کے متصل ہی سلطان زین العابدین کے تعمیر کردہ باغ حیدر میں اپنے رہنے کے لئے ایک عظیم حویلی بنوائی تھی جس کے کھنڈرات اب بھی باغ مذکور میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آجکل اس باغ میں محکمہ صنعت و حرفت کے تعمیر کردہ صنعت و حرفت کی مختلف فیکٹریاں قائم کی گئی ہیں اور گورنمنٹ ہائی سکول بھی اسی باغ کے احاطے میں واقعہ ہے۔ اس باغ کے بارے میں قدیم تذکروں کا بیان ہے کہ باغ میں جا بجا فوارے، آبشاریں، نہریں، حوض اور حمام کے علاوہ لاثانی عمارتوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا تھا جہاں مغل شہنشاہ، امراء اور حکما داد عشرت دیتے تھے۔ علی مرداں خان کے بعد اس کا بیٹا کشمیر کا گورنر مقرر ہوا۔ ابراہیم خان نے بھی روضہ و خانقاہ کی مرمت کی تھی۔ کشمیر کے ایک شاعر داراب جویا نے ابراہیم خان کی مدح میں اکثر قصیدے لکھے ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت میں جب کہ کشمیر کا صوبائی گورنر وزیر پنوں تھا، بدقسمتی سے شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک زبردست ہنگامہ رونما ہوا اور اس ہنگامے کو مؤرخ حسن

نے اپنی تاریخ کی جلد اول میں "تاراج دہم" کے عنوان کے تحت مفصل طور پر بیان کیا ہے جسے پڑھکر کوئی بھی ذی حس اور باشعور مسلمان اظہار تاسف کئے بنا نہیں رہ سکتا۔

واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں کہ حضرت سید محمد مدنی کے یوم وصال ۱۱، ماہ رجب ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۹۲۹ بکرمی مطابق ۱۸۷۲ء کو ان کے روضہ پر حسب دستور زائرین فاتحہ خوانی اور مسجد مدنی میں نماز ادا کرنے کی غرض سے جوق در جوق آئے تھے۔ اس سال کشمیر میں قحط سالی اور وبا پھیلی ہوئی تھی اور اس بیماری کی وجہ سے بے شمار لوگ لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اس لئے لوگ مساجد اور خانقاہوں، بالخصوص خانقاہ مدنی میں، دفع بلا کے لئے خدا کے حضور میں دست بدعا تھے۔ چونکہ خانقاہ مدنی کو محل استجابت سمجھکر اس روز بھی حاضر ہوئے تھے۔ محلہ مدین صاحب کے شیعہ حضرات نے خانقاہ مدنی کے قریب میں چند گز کے فاصلے پر امامیہ مسجد تعمیر کی تھی۔ چند سرپھروں نے امامیہ مسجد کی دیواریں گرادیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے فساد برپا ہوگیا اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گھتم گتھا ہوگئے گالی گلوچ کے علاوہ لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔

حسن جو اس زمانے کا ہم عصر مورخ ہے، لکھتا ہے کہ اس ہنگامے میں دونوں مسلک کے لوگوں کو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس ہنگامے میں جو لوگ ملزم بنائے گئے تھے وہ سب قصوروار نہ تھے۔ غنڈوں اور اوباشوں کو چھوڑ دیا گیا۔ وزیر پنوں کے مقرر کردہ تفتیشیوں نے تفتیش کے نام پر دونوں ہی مسلکوں کے لوگوں سے خوب پیسہ اینٹھا اور اپنی جیبیں بھریں۔ ایک ہزار کے قریب لوگوں کو قیدی بنایا گیا اور بے قصور ملزمان قلعہ ہاری پربت، جیک اور ریاست کے دور دراز قید خانوں میں قیدی بنائے گئے۔ ان سے بھاری جرمانہ وصول کیا گیا اور تب رہا کئے گئے، جو ملزم جرمانہ ادا نہ کرسکے، وہ قید خانوں میں ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اوڑی کے قید خانے میں جو ملزم تھے ان کا جرمانہ سوپور کے عوام نے چندہ جمع کرکے ادا کیا۔

خواجہ محی الدین گندرو ایک شریف النفس اور نیک سیرت شخص پر یہ تہمت لگائی گئی تھی کہ اس نے اس فساد کو اکسانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کو مہاراجہ کے دربار میں پابہ زنجیر پیش کیا گیا۔ مہاراجہ نے پچاس ہزار روپیہ جرمانہ وصول کرنے کا حکم صادر کیا۔ اور جرمانہ وصول ہونے کے بعد اس کو رہا کیا گیا۔ مہاراجہ نے مظلوموں کی امداد کے لئے دو لاکھ اسی ہزار روپیہ بطور مالی اعانت منظور کئے۔ اس حادثہ جانکاہ کی تاریخ حسن نے یہ لکھی ہے۔" ازیں حسرت جہانے را جگر سوخت" اور "خرد تاریخ آں گفتا جگر سوخت" جس سے ۱۲۸۹ھ برآمد ہوتا ہے۔

حکومت نے روضہ اور خانقاہ مدنی پر تالا چڑھا کر دونوں مسلک کے پیروؤں کو یہاں آنے کی مخالفت کر دی ـــــ یہاں ہر قسم کے اجتماعات کو ایک خاص حکم کے ذریعہ ممنوع قرار دیا گیا اور یہ حکم گذشتہ ایک سو اکیس سال سے نافذ عمل ہے۔ نہ وہ محفلیں رہیں، نہ وہ وعظ خوانی سنی گئی اور نہ درود و اذکار کا ورد دیکھا گیا۔ تا حال یہ روضہ اور خانقاہ کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ اس روضہ اور خانقاہ کے نام پر جو زمین تھی لوگوں نے اس کے اکثر حصے پر ناجائز طریقے سے تسلط جمالیا۔ ۱۹۲۱ء میں مسلمانان کشمیر نے اس روضہ اور خانقاہ کو واگذار کرانے کی کوشش کی۔ گلانسی کمیشن میں بھی ان دونوں مقامات کو واگذار کرنے کا ذکر کیا گیا۔ جب کہ دیگر مقدس مقامات خانقاہ سوختہ، خانقاہ بلبل لنگر، مسجد دارا شکوہ کو واگذار کیا گیا مگر یہ روضہ اور خانقاہ تا حال سرکاری تحویل میں ہیں۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ روضہ اور خانقاہ سے قیمتی اور عمدہ ٹائلیں چن چن کر اڑالی گئیں ہیں۔ یہ ٹائلیں مغل طرز کی ٹائلیوں سے عمدہ اور اعلیٰ نوعیت کی تھیں۔ یہ رنگین ایرانی اینٹوں کی طرح مربع شکل کی تھیں۔ ان کی چمک قابل داد رہی ہے۔[1] اور دیکھنے والا کاریگروں کے فن کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس پر شکوہ خانقاہ کی موجودہ حالت دیکھکر یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش

اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش!

حال ہی میں محکمہ آثار قدیمہ نے خانقاہ اور روضہ کی مرمت کا کام انجام دیا ہے۔ اور اس کی قدیم

---

[1] مسجد کے اندر موجود لکڑی کے کام، ختم بند اور دیواری تصاویر کے اعلیٰ نمونے عہد بڈشاہی میں کشمیر میں ان فنون کی تابندہ علامت ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ روغنی ٹائیلوں کا استعمال اور ان پر موقلم کی سحر کاری کشمیر میں پہلی بار اسی مسجد میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

مسجد مدنی تا حال مغل دور سے پہلے کے کشیری طرز تعمیر کی شاید واحد عمارت ہے جو زمانے کے بے رحم ہاتھوں نقصان اٹھا کر بھی، خستہ حالت میں ہی سہی، موجود ہے۔ مسجد میں استعمال کی گئیں رنگین ٹائیلیں اس پورے خطے میں کہیں اور نظر نہیں آتیں۔ ہاں سمرقند کی عمارات میں اس زمانے میں استعمال ہوتی تھیں جب کہ بڈشاہ وہاں تھے۔

مسجد کے ایک محراب پر تیر کمان لئے اژدہے (۸۰۸۹,۵۸۰۸) کی بنائی گئی تصویر کسی معمے سے کم نہیں۔ اس پر بادلوں اور پھولوں کا امتزاج چینی اور ایرانی آرٹ کا خاصہ ہے :۔ ــــ (ادارہ)

طرز تعمیر کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔[1] خانقاہ اور روضہ کی رکھوالی کے لئے ایک چوکیدار کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا ہے۔

●

کتابیات

● تاریخ حسن ج ۱۔ج ۲۔ج ۲ ● تاریخ کبیر کشمیر از محی الدین مسکین
● "کشمیر" از جی ایم ڈی صوفی ● واقعات کشمیر از محمد اعظم دیدہ مری ● یادگار عجائب
● اسرار الابرار از بابا داؤد مشکواتی ● لمعات از خاوری ● خاورنامہ از خاوری
● مانومینٹس آف کشمیر آر۔سی۔کاک (MONUMENTS OF KASHMIR)
● KASHMIR UNDER SULTANS BY MOHIBUL HASSAN
● تاریخ بڈشاہی از محمد الدین فوق مرحوم ● کلیات داراب جویا
● تاریخ کشمیر از پروفیسر حسن شاہ ● تذکرۃ العارفین ● تحفۃ الفقرا۔
● فتحات کبرویہ ● فتوحات قادریہ ● گلشن کشمیر ● گلزار کشمیر ● اسرار الاخیار
● تحقیقات امیری ● تحائف الابرار ● خوارق السالکین ● روضۃ الابرار
● ذخیرۃ التواریخ ● بہنج گنج ملا بہاؤالدین متو

●

---

[1] ریاستی محکمۂ آثار قدیمہ نے زین العابدین (بڈشاہ) کے عہد میں بنی اس مسجد کی مرمت کا کام ہاتھ میں لیا تو اسکی چھت کی بھی مرمت کی۔ سرینگر میں یہ کسی تاریخی عمارت پر شاید اب آخری "برزہ چھت" ہے اس لئے اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ چھت کی ظاہری شکل میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ مدین صاحب کی مسجد کی چھت سے مٹی، بوج پتر وغیرہ اتار کر چھت کی ٹین پوشی کی گئی۔ اسکے بعد ٹین پر پھر سے تختے بچھا کر اس پر دوبارہ بوج پتر بچھائے گئے اور اس کے اوپر دوبارہ مٹی ڈالی گئی اور اس طرح اس قدیم مسجد کی نئی چھت دیکھنے والوں کو بالکل اپنی اصل شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ ●—— (م۔ا۔ا)

حضرت سید منصورؒ

تواریخِ کشمیر میں حضرت سید منصورؒ کے متعلق حالات صحیح طور پر نہیں ملتے ہیں سید منصورؒ کے بارے میں تاریخ حسن کے مؤرخ نے جو بھی حالات لکھے ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اُس نے سید منصورؒ کو سید جعفرؒ (راول پورہ) کا برادر لکھا ہے۔ مؤرخ حسن سے قبل کسی تذکرہ نویس یا مؤرخ نے سید منصورؒ کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ فارسی زبان میں لکھی گئی کشمیرِ قدیم کی تاریخ جو فی زمانہ دستیاب ہے۔ وہ مؤرخ سید علی بن سید محمد کشمیری کی ہے جو حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے یہ تاریخ سلطان محمد یوسف شاہ چک کے پہلی بار کشمیر کا سلطان بن جانے کے عہد ۱۵۷۹ء میں تالیف کی ہے اور ساداتِ کرام اور ریشیانِ کشمیر کے حالات اپنے زمانے تک عرق ریزی کے ساتھ لکھے ہیں۔

تواریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعد کے کشمیر کے فارسی تذکرہ نویسوں اور مؤرخوں نے سید علی بن سید محمد کشمیری کی تاریخ سے استفادہ کیا ہے اور

دوسرے لفظوں میں ان کا تتبع کیا ہے۔ اور یہی تاریخ اُن کا اولین اور اہم ماخذ رہی ہے۔ چونکہ مؤرخ سید علی کشمیری نے اپنی تاریخ میں سید منصورؒ اور ان کے بھائی سید جعفر راول پورہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سید جعفر اور سید منصورؒ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ اور ان کے فرزندِ دل بند جناب میر سید محمد ہمدانیؒ کے ساتھ کشمیر آئے ہوئے سادات کرام میں شامل نہیں تھے۔ اس بات کا بھی تاثر ملتا ہے کہ حضرت سید جعفر راول پورہ اور اُن کے بھائی (دیگر برادر) سید منصور میر سید علی ہمدانی اور میر سید محمد ہمدانیؒ کے بعد کشمیر آئے ہوں گے کیونکہ مؤرخ سید علی کشمیری نے اپنی تاریخ میں اکثر اُن سادات کرام کے حالات لکھے ہیں۔ جو حضرت امیرؒ اور ان کے فرزند سید محمد ہمدانیؒ کے کشمیر آئے ہوئے ہمراہیوں میں سے تھے۔

مؤرخِ کشمیر خواجہ محمد اعظم دیدہ مری "واقعات کشمیر" جو انہوں نے ۱۱۴۸ھ سے تالیف کرنا شروع کی تھی، میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "بعض سادات کرام کے حالات حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ ان سادات کرام میں حضرت سید موسیٰ اور اُن کے سات بھائیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے تین بھائی ایک ہی جگہ دفن ہیں۔ دیگر چار بھائیوں کے نام وغیرہ اور اُن کا اتہ پتہ کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر سادات کرام کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ ان کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی تاریخ سے اس سلسلے میں اُن کی مختصر عبارت ملاحظہ ہو۔

حضرت سید موسیٰ و سید قدوۃ الفقراء و سید جعفر و سید افضل و سید معصوم و سید قاسم و سید داؤد این ہفت بزرگوار برادران دینی الامام یکدیگر در موضع بیرو پرگنہ بانگل در یک روضہ آسودہ اند از انجملہ قبر سہ سید ظاہر سمت و چہار قبر دیگر مستور و مندرس شدہ است .... و سید خلیل نیز در پرگنہ مذبور و سید جعفر

مشہور السادات والمجد بہ والکرامت در موضع راولپورہ ۔۔۔۔

تا محلۂ کچھ بل بتفارلیق آسودہ اند ۔۔۔۔۔۔ و سید ابراہیم و

سید رشی ہنوار و سید اسحٰق و سید اسمٰعیل و سید فیروز کہ در محلۂ

نور باغ و سیکہ ڈافر نواحی آں مدفون اند۔ حقیقت مولد و

منشاء این حضرات غیر از نام در ہیچ کتابے بنظر نیامد۔ فرد

"ندانم ز آغاز و انجام شاں ۔۔۔۔۔۔ مرا بر زباں بس بود نام شاں"

(ترجمہ: میں ان کے آغاز اور انجام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔ میرے لئے میری زبان پر ان کا نام کافی ہے)

زمانے کی ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض سادات کرام جن کے مقبرے اور زیارت گاہیں آج شہر سرینگر اور اس کے مضافات محلوں اور علاقوں میں موجود ہیں مگر ان کے حالات اور یہاں تک ان کے اصلی نام کے بارے میں کسی بھی تاریخ یا تذکرہ میں ذکر موجود نہیں۔ اسی طرح کشمیر کے بہت سارے سادات کرام اور مشائخ کرام کے حالات تاریخ میں مشہور نہیں ہیں ان میں بعض یہ ہیں۔

سید حیدر (حیدر پورہ بڈگام)۔ سید محمد مسعود (اونہ)، سید علی اکبر (چھتہ بل)، رحیم گنڈ دلت مقبرہ سید علی اکبر چھتہ بل رحیم گانڈرون سے ہاتھ ذرہ بھر پیچھے دائیں طرف ہے پر واقع ہے اس سید کا نام کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اگرچہ اس کا مقبرہ باضابطہ موجود ہے اور سید یعقوب صاحب (رحمہ) ستورہ سرینگر وغیرہ ہیں۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی تاریخ کی عبارت کے حوالے سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہت سارے سادات کرام کے حالات تاریخ یا تذکروں کیا نہیں ملتے ہیں۔

پھر کہتے ہیں خواجہ محمد اعظم دیدہ مری سید یعقوب ۔۔۔ میں اپنی تاریخ میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"از اکابر سادات است انتساب ایشان با خاندان حضرت مخدوم جہانیاں ثابت شد۔ واز اصحاب مقامات عالیات انزدا را دوست میداشت و نظر بر غیر حق نمے گذاشت چوں رحلت نمود در موضع راول پورہ کہ از شہر مقدار دو میل بیروں ست مضجع فرمود۔ قبرش افضل زیارت گاہ خاص و عام و محل فیض تمام ست و در موضع گرند پرئن بسیرہ وہ ہم مکانی را منسوب با آں بزرگوار می کنند لیکن بجہت عبور جسمانی یا روحانی خواہد بود، والا قبرش در راولپورہ است یزار و تبرک"۔

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے حضرت سید جعفرؒ کا وصال سلطان بڈشاہ کے عہد میں بتایا ہے۔

تاریخ حسن اور تاریخ کبیر کے مورخین اپنی اپنی تاریخ میں سید منصورؒ کو سید جعفرؒ کا بھائی اس طور قرار دیتے ہیں۔:

"سید منصورؒ سید جعفرؒ کے بھائی تھے۔ کشش الٰہی اور خارق عادات رکھتے تھے۔ ایک بڑی مدت کو دنیا کے ملکوں کی سیر کی۔ امداد خداوندی سے مکہ شریف اور مدینہ شریف کی زیارت سے شرفیاب ہوئے۔ بڑے بڑے صاحب دلوں کے ساتھ دوستی رکھتے تھے۔ فتح شاہ کی حکومت کے زمانے میں موسیٰ رینہ کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ زالڈگر کے محلہ میں مدفون ہیں۔"

● — (تاریخ حسن۔ حصہ سوئم صفحہ نمبر ۴۹)

"سید منصورؒ برادر نیک معتر سید جعفر راول پوری است۔ بزیارت شریف حرمین معظمین فائز گشتہ و سیر اطراف واکناف نمودہ

باجمعی از اولیائی کرام و علمائی عظام صحبت نموده در عہدِ سلطان فتح شاہ بتاریخ ۵ رشعبان المعظم سنہ ۹۰۳ھ از دست موسیٰ رینہ در قریۂ ہانجی ویرہ بدرجہ شہادت رسید در محلۂ زالڈگر بر کنارہ کُٹہ کُل (کرٹہ کوہل) قریب راہ عام مدفون است۔

● — (تاریخِ کبیرہ)

مندرجہ بالا تواریخوں کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید منصور کو سنہ ۹۰۳ھ میں موسیٰ ریلا نے شہید کیا تھا۔ مگر شہید ہونے کی وجہ کچھ نہیں بتائی گئی ہے۔ مزید اِن اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سید منصورؒ کے برادر سید جعفرؒ راول پورہ حضرت مخدوم جہانیان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر حضرت سید منصورؒ بھی حضرت مخدوم جہانیاں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

بہرحال ان سادات کرام کے بارے میں جیسا کہ خواجہ اعظمؒ مؤرخِ کشمیر نے لکھا ہے۔ سید موسیٰ اور ان کے دیگر برادران کے حالات کسی تاریخ سے نہیں ملتے۔ اس سلسلہ میں راقم کی تحقیق یہ ہے کہ سید موسیٰ ارحمؒ جن کا مقبرہ برزلہ سرینگر میں ہے۔ ان کے دیگر برادران اس طور ہونے چاہیئں:۔

(۱) سید موسیٰ ارحؒ۔ برزلہ سرینگر (۲) سید جعفرؒ۔ راول پورہ، بڈگام

(۳) سید حیدرؒ۔ حیدرپورہ بڈگام (۴) سید منصورؒ۔ زالڈگر سرینگر

(۵) سید علی اکبر۔ ایمپوریم گارڈن سرینگر (۶) سید علی اکبر سے بالاتر سید کا مقبرہ علایئدہ حج سرینگر۔ (۷) سید یعقوب صاحبؒ سنوار سرینگر

سید منصورؒ کے مزار میں بعض صاحب دل، علماء و فضلاء اور صاحب شوکت افراد بھی مدفون ہیں جن میں بیرہ خان کھکھہ، مبر داد خان، عبداللہ خان وغیرہ شامل ہیں۔

میر شمس الدین اراکیؒ

کشمیر میں شیعہ مسلک کے بانی اور موسس میر سید محمد شمس الدین اراکی کا سلسلۂ نسب قطب الاقطاب سید صفی الدین اردبیلی سے جاملتا ہے جو باب الحوائج حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی پشتِ مبارک سے انیس ویں پیڑھی میں ہو گزرے ہیں جب کہ آپ کی والدہ ماجدہ قزوینی سادات سے تعلق رکھتی تھیں۔ سید صفی الدین کی مناسبت سے میر شمس الدین کی اولاد بعد ازاں صفوی کہلائی۔ اسی صفوی خاندان کی ایک شاخ ہمارے یہاں گذشتہ دو سو سال سے مرجع خلائق ہے اور وہ بڈگام میں حجتہ الاسلام آغا سید یوسف الموسوی الصفوی مرحوم و مغفور کا رخانوادہ ہے۔ تبلیغ دین اور اشاعت مذہب اِمامیہ کے سلسلے میں اس خاندان کی کئی ایک دینی شخصیتوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں انکو کشمیر کی شیعہ تاریخ میں ایک قابلِ قدر باب سمجھا جارہا ہے۔ بڈگام کے اس آغا خاندان کے مقلدوں اور معتقدوں کو "فرقہ جدید" کا نام دیا گیا ہے جب کہ مولانا مولوی افتخار حسین انصاری کے گھرانے کے پیروکاروں کو "فرقہ قدیم" سے۔

یہ عراقی نہیں، بلکہ اراکی ہے۔ جو ایران کا ایک مشہور شہر ہے۔

کہا کرتے ہیں۔

کئی تذکروں میں وارد ہے کہ میر شمس الدین اراکی کا وطن موضع "کگن" (قصبہ سلطان آباد عراق) تھا۔ جہاں آپکی ولادت بقول آغا سید محمد باقر الموسوی الصفوی مصنف "اختر درخشان" ۱۳ رجب المرجب ۷۹۹ھ مطابق ۱۳۹۶ء کو ہوئی تھی۔ جس کی صحت اس وجہ سے مشکوک دکھائی دے رہی ہے کہ میر شمس الدین اراکی جب سلطان حسین مرزا والئی خراسان کی طرف سے سفیر کشمیر مقرر ہو کر یہاں پہلی بار وارد ہوئے تو مورخ حسن کے دعویٰ کے مطابق وہ ۸۹۲ھ کا سال تھا اب اگر میر اراکی کا سالِ ولادت ۷۹۹ھ ہی درست مان لیا جائے تو اس وقت انکی عمر ۹۵ سال کے قریب ہوچکی تھی اور اس عمر میں اُن کا سفیر کشمیر ہوکر آنا بعید از قیاس ہوتا ہے۔ اگر "اختر درخشان" میں درج میر اراکی کا سال ولادت ۷۹۹ء کو ہی درست مان لیا جائے۔ اسلئے مورخ حسن کا بیان غلط ہوسکتا ہے۔

رہا سوال میر شمس الدین کے نام کے ساتھ اراکی (ا+ر+ک+ی) کے بدلے "عراقی" (ع+ر+ا+ق+ی) نسبت کے جُڑ جانے کی۔ یہ میری اپنی تحقیق کے مطابق صحیح نہیں دکھائی دے رہا ہے کیونکہ جتنی بھی مقتدر اسلامی شخصیتیں، مشائخ عظام، مذہبی مبلغ، علمائے دین اور عارفِ ربانی اشاعتِ اسلام اور دینِ محمدیؐ کی تبلیغ و ترویج کے سلسلے میں سرزمین کشمیر پر قدم رکھ کر یہاں کے اطراف واکناف میں اسلامی جوت جگا چکے، اُن سبوں کا تعلق ایران کے کئی اہم شہروں سے ہی تھا نہ کہ مُلک عراق کے کسی بھی شہر سے۔ کسی اہم شخصیت کے نام کے ساتھ اگر کوئی مناسبت ہو بھی تو وہ اُس کے مُلک سے نہیں، بلکہ اُس شہر، ضلع یا قصبے سے ہی ہوا کرتی ہے جہاں اسکی ولادت ہوئی ہو۔

ے بہارستان شاہی مرتبہ، ڈاکٹر اکبر حیدری۔ اختر درخشان از آغا سید باقر الموسوی اور شیعان کشمیر از حکیم غلام صفدر۔

جیسے کہ نجفی، بغدادی، کربی، ہمدانی، شیرازی، اصفہانی، قمی وغیرہ۔ اول الذکر تین شہر ملک عراق اور موخر الذکر چار شہر ایران میں واقع ہیں۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ ملک عراق کے ساتھ گزشتہ سات سو سال کی طویل مدت میں وادی کشمیر کا نہ تو تہذیبی و ثقافتی تعلق رہا ہے اور نہ ہی اس سے تجارتی تعلقات کا کوئی تذکرہ ملتا ہے۔ جب کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ہماری وادی وسطِ انتہائی کے ساتھ ہی اپنے تہذیبی و تمدنی رشتوں کے لحاظ سے جڑ چکی تھی۔ ادھر سے ایران کی راجدھانی طہران کے جنوب و مغرب، ہمدان کے جنوب مشرق اور اصفہان کے شمال مغرب میں ایک شہر اور سیاحتی مرکز "اراک" کے نام سے واقع ہے میری دانست میں میر شمس الدین کا آبائی وطن ایران کا یہی شہر "اراک" ہو سکتا ہے اور دکھائی یہی دے رہا ہے کہ اکثر مؤرخ اور تذکرہ نگار غلطی سے ایران کے شہر اراک کو ملک عراق سمجھ چکے ہیں۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ میر اراکی کی حیات اور کارناموں پر اگرچہ اُن ہی کی ایک اولاد میں سے بڈگام کشمیر کے آغا سید محمد باقر الموسوی الصفوی اور وادی کے ایک مسلّم الثبوت محقق ڈاکٹر حیدری، مولف بہارستان شاہی، مصنف تحفۃ الاحباب اور دوسرے مؤرخوں ماسوائے سید محمد انیس کاظمی چندہ پورہ (بڈگام) سبھوں نے ایران کے شہر اراک کو ملک عراق سمجھ کر میر شمس الدین کے نام کے ساتھ "اراکی" کے بدلے "عراقی" نسبت ٹھہرائی ہے جو میرے خیال میں غلط ہے۔ جمہوری اسلامی ایران کی وزارت ارشاد اسلامی کی طرف سے جو نقشۂ سیاحتی جس کی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے آج سے سات آٹھ سال قبل پرنٹ کیا جا چکا ہے اس میں "اراک" کا شہر جلی حروف میں اسی طرح نمایاں طور دکھایا گیا ہے جس طرح کہ شہر تبریز، شیراز، کرمان، اصفہان، مشہد وغیرہ جیسی جگہیں اور مقامات دکھائے گئے ہیں۔ بانی جمہوری اسلامی ایران امام روح اللہ آیت اللہ خمینی طاب ثراہ شیعوں کے امام اور مجتہد العصر تھے۔ اُن کے وصال کے بعد اگرچہ وہ منصب سابق صدر آیت اللہ خامنی کو دیا گیا

مگر عصری دور میں شیعہ فرقہ سے تعلق رکھنے والوں کے مجتہد آیت اللہ محمد علی اراکی ہیں۔ وہ بھی اسی شہر اراک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس وقت عراق کے حوزۂ علمیہ کے صدرِ صدور ہیں اور عراق میں ہی قیام پذیر ہیں لیکن ان کے نام کے ساتھ اپنے ہی آبائی شہر "اراک" کی نسبت لکھی جاتی ہے نہ کہ عراق کی۔

تاریخی کتابوں میں مذکور ہے کہ میر شمس الدین اراکی اپنے بچپن ہی میں اپنے والد کے سایہ سے محروم ہو چکے تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنے آبائی وطن اراک کو چھوڑ کر شہر اصفہان چلے آئے جہاں ایک کیانی خاندان میں آپ کو متبنٰی بنایا گیا۔ اس ناطے آپ اصفہانی بھی کہلائے۔ اصفہان میں رہ کر آپ نے متداول علوم حاصل کرنے کے علاوہ سلوک و عرفان کے سارے مدارج طے کئے اور اس طرح سے ظاہری و باطنی علوم سے پوری طرح مستفیض ہوئے اور یوں وہ مشائخ عظام میں شمار ہونے لگے۔ میر اراکی اپنے تبحرِ علم اور عارفانہ زندگی سے جہاں عوام الناس میں مقبول ہوئے وہاں شاہی دربار میں بھی انہیں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کئی مؤرخ اور تذکرہ نگار میر شمس الدین اراکی کو شیعہ مسلک سے الگ فرقہ "نوربخشیہ" کے بانی سمجھ چکے ہیں جب کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں آپ اسی طرح ایک صوفی مکتبِ فکر کے بنیاد ڈالنے والے ہیں جس طرح صوفیائے کرام کے بارہ مشہور خانوادوں میں سے قادریہ (منسوب بہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ) نقشبندیہ (منسوب بہ خواجہ نقشبند مشکل کشاؒ) صفویہ (منسوب بہ شیخ صفویؒ) رودسیہ (منسوب بہ شیخ عبد القدوسؒ) نوریہ (منسوب بہ ابو الحسن نوریؒ) شطاریہ (منسوب بہ شیخ عبد اللہ شطاریؒ) یوسفیہ (منسوب بہ شیخ احمد یسفی) انصاریہ (منسوب بہ عبد اللہ انصاریؒ) زاہدیہ (منسوب بہ خواجہ بدر الدین زاہد) قلندریہ (منسوب بہ محمد قلندر) خضرویہ (منسوب بہ احمد خضروی) اور حسینیہ (منسوب بہ حضرت امام حسین علیہ السلام) کے الگ الگ مکاتب فکر

شہرت پاکر اپنے جھنڈے گاڑ چکے ہیں۔ میر شمس الدین اراکی بھی ایک عارف باللہ اور درویش صفت شخص تھے اباً و جداً شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے لیکن کشمیر اور ایران میں "نور بخشیہ" "مکتب فکر" کے اہم رکن مانے جاتے تھے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ اسی "نور بخشیہ" نام کو اکثر مورخین تذکرہ نگار اور دوسرے اہلِ علم جن میں مرزا حیدر دوغلات اور محمد حسان ہادی کاکوروی پیش پیش ہیں اپنی علمی بے بضاعتی سے شیعہ مسلک سے ایک جُدا گانہ فرقہ اور بدون اسلام مذہب سمجھ بیٹھے ہیں جسکی کہ کوئی ساکھ نہیں۔

اس بارے میں اصل واقعہ یہ ہے کہ سلوک و عرفان کے مقامات طے کرنے میں میر شمس الدین اراکی کو شاہ قاسم نور بخش سے تلمذ حاصل کرنا پڑا۔ یہ وہی مشائخ اور صاحب عرفان شخصیت تھی جن کے بارے میں سکندر بیگ ترکمان اپنی کتاب "تاریخِ عالم آرائے صفوی" میں رقمطراز ہیں:۔

"شاہ قاسم نور بخش از اولاد و احفاد کرام قدوۃ السالکین سید محمد نور بخش است در قصبہ طرشت رے مسکن داشتہ اند و آثارِ نجابت و بزرگی و علو شان از ناصیہ احوالش نمایاں و احوالِ ناکیہ اش مذکور افواہ و السنہ عالمیان وجود در درگاہِ معلی منظور انظار مواطف و الطافِ شاہی و مرجع مریدان سلسلہ علیہ نور بخشیہ"۔

شاہ قاسم نور بخش اپنے دور کے پہنچے ہوئے صوفیائے کرام میں سے تھے اور میر شمس الدین اراکی اُن کے مریدِ خاص تھے اور اُن ہی کے حکم کے مطابق اشاعت اسلام کے لئے کشمیر آئے تھے۔ مولوی حشمت اللہ لکھنوی اِس سلسلے میں بیان کرتے ہیں: کہ میر شمس الدین اراکی کے مرشد کے والد سید محمد نور بخش میر سید علی ہمدانی رح کے بھانجے تھے۔[1] معاملہ جب یہ ہو تو میر شمس الدین اراکی کا شیعہ مسلک

---

[1] عالم آرائے بہارستانِ شاہی۔

سے جدا "نور بخشیہ" کو غیر شیعہ ماننا کہاں کی دانشمندی ہے !! ۔ اشاعت اسلام اور تبلیغ دین سے وابستہ جن بزرگوں، صوفیوں، ریشیوں، سادات ایران اور دوسرے صاحبان عرفان کی مساعی جلیلہ کا ذکر خیر مقامی و غیر مقامی مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے کثرت کیا ہے۔ اُن میں سے کئی تاریخ نگاروں نے اپنی فہم و فراست کے مطابق جہاں میر شمس الدین اراکی کی دل کھول کر مخالفت اور اُن کے فلسفۂ زندگی کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنی ہیں اور انہیں غیر شیعہ اور اسلام کے دوسرے اکثر فرقوں سے جداگانہ فرقے کا بانی جتلایا ہے وہاں کئی ایک تذکرہ نگاروں نے اُن کے تبحر علم، اُن کی معاملہ فہمی، جودت طبع اور سیف زبان ہونے کی نشان دہی کرتے ہوئے اپنی مورخانہ ذمہ داریوں کے ساتھ انصاف کیا ہے ۔ اسی نتیجے میں مورخ حسن میر شمس الدین اراکی کے تئیں عصبیت اور مخاصمانہ جذبات رکھنے کے باوجود اس طرح کا اعتراف کر چکے ہیں: "عالم اجل و دانائے بے بدل بود۔ بعض علوم غریبہ می دانست زبانے و حسن بیانے داشت"۔

تاریخ کشمیر سے متعلق قدیم ترین نسخہ "تحفۃ الاحباب" کے گمنام مصنف جس نے نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر اپنے زیر تذکرہ مسودہ میں اپنے والد کا نام جمال الدین خلیل اللہ ظاہر کر کے خود کو پردہ اخفا میں ہی رکھا ہے، نے میر شمس الدین اراکی کو جن مختلف توصیفی ناموں سے یاد کیا ہے، ان میں "قطب المحققین"، "آفتاب سیادت"، "خورشید سپہر و دودمان ولایت"، "مظہر آثار معارف الٰہی"، "حامی قواعد شریعت مصطفٰی"، "مکمل الکاملین"، "اسرار کمالات العوارف"، "شمس الحق"، "الحقیقت و ملت الدین" وغیرہ جیسے القاب درج ہیں۔ ان باتوں سے پوری طرح مترشح ہوتا ہے کہ میر شمس الدین اراکی اُسی درجہ کے عارف باللہ اور راہِ سلوک و عرفان کے سرخیل تھے جس پایہ کے وہ دوسرے درجنوں سادات ایران تھے جنہوں نے کشمیر میں اشاعت اسلام کے لئے کام کیا ہے ۔ اس حقیقت کو تحفۃ الاحباب میں درج یہ اشعار کلیت

واضح کرتے ہیں ؎

محرم رازِ حرمِ کبریا	محی رسم و رہ روش اولیا
عارفِ حق شیخ ولایت پناہ	شمس ہدیٰ قطب فلک دستگاہ
باطنِ او مظہرِ الظاہرِ حق	سینۂ او مخزن اسرارِ حق
دست و عصایش کا امید و بیم	چون ید بیضا عصائے حکیم

کشمیری خاندان کے دسویں بادشاہ سلطان حسن شاہ، جو زین العابدین بادشاہ کا پوتا تھا، کے دورِ حکومت (۱۴۷۲ء - ۸۷۲ھ) میں میر شمس الدین اراکی والئی خراسان کی طرف سے سفیر ہو کر یہاں آئے تو منصب سفارت پر رہتے ہوئے انہوں نے اپنے آٹھ سالہ قیام کے دوران وادیٔ کشمیر میں اپنے اُس مشن کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا، جسے وہ منصف سفارت سے قطع نظر ایران سے اپنے ساتھ لے آئے تھے اور وہ مشن تھا اشاعت اسلام میں شیعہ مسلک کی داغ بیل ڈالنا اسکی ترویج اور ترقی کے لئے دل جمعی کے ساتھ کام کرنا یہاں میر اراکی شیخ الاسلام بابا اسماعیل کبروی کے حلقہ میں شامل ہو کر در پردۂ اخفا اُن کے ارادت مندوں پر حاوی ہو کر انہیں تشیعت کے لئے دعوت فکر دے کر راغب کرا چکے۔ اس سلسلے میں وہ اس وقت کی ایک مقتدر اور صاحبِ ثروت شخصیت حسن آباد کے بابا علی نجار کو سب سے پہلے اپنا ہم خیال بنا چکے تو بابا علی نجار کا اثر و نفوذ لے کر، جو اکثر امراء، وزراء اور علمائے مذہبی عقاید میں میر شمس الدین اراکی کے حلقہ بگوش ہونے گئے۔ اُن میں ملک موسیٰ رینہ، ملک کاجی چک، ملک محمد ناجی اور ملک دولت چک قابل قدر شخصیتیں شامل تھیں۔ ان حقائق کا تذکرہ مصنف "تحفۃ الاحباب" اور مورخ بہارستان شاہی" نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ یہ بھی تواریخی کتب میں مذکور ہے کہ میر شمس الدین اراکی کے قیام کشمیر کے دوران ان کی کوششوں اور انکی تبلیغ سے چوبیس ہزار گھرانے

شیعہ مسلک قبول کرچکے۔

کشمیر میں منصبِ سفارت پر آٹھ سال رہ کر جب میر اراکی ایران کے لئے واپس روانہ ہوئے تو ایران پہنچ کر انہوں نے والیٔ خراسان کی ملازمت کو تج دیا اور شاہ قاسم نوربخش ابن سید محمد نوربخش کے دائرۂ معرفت میں چلے گئے اور نوربخش کی خلافت کے منصب پر فائز ہو گئے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد شاہ قاسم نوربخش نے میر شمس الدین کو تبلیغ دین کے لئے دوبارہ کشمیر جانے پر آمادہ کر لیا "بہارستان شاہی" "تحفتہ الاحباب" اور تاریخ فرشتہ "سلطان فتح شاہ کے دور کے واقعات، بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سنہ ۹۰۲ھ میں شاہ قاسم انوار ابن سید محمد نوربخش کے مرید میر شمس الدین اراکی وارد کشمیر ہوئے اور یہاں آکر مرجع خلائق بن گئے اور یوں اُن کے رُشد و ہدایت کا بازار ایسا گرم ہوا کہ املاک و معابد کے سارے اوقاف کی تولیت اُن کے مریدوں کو ہی سونپ دی گئی۔ اِس فرقہ سے تعلق رکھنے والے صوفی غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو اسلام دشمنانہ اقدامات کی بنا پر مسمار کرتے گئے۔ اس طرح سے میر شمس الدین مکسّر الاصنام بھی کہلائے۔

موٴرخ حسن لکھتا ہے کہ منصب سفارت کی مدت پوری کرنے کے بعد میر شمس الدین اراکی ایران میں بارہ سال قیام کرنے کے بعد بعہد سلطان فتح شاہ شہمیری اپنے مرشد کے کہنے پر دوبارہ کشمیر آئے۔ یہاں پہنچتے ہی انہوں نے شد و مد کے ساتھ تبلیغی کام شروع کر لیا اور اس بار ملک موسیٰ رینہ چاڈورہ اور کاجی چک، جنکا کہ سماج اور شہمیری دربار میں اونچا مقام تھا، نے میر اراکی کے ہاتھ پر بیعت کر دا کے شیعہ مسلک قبول کروانے میں اہم رول ادا کیا۔ ملک موسیٰ، رینہ اور کاجی چک کی بیعت نے میر اراکی کی کامیابی کے امکانات کو روشن سے روشن تر کر دیا۔ اس طرح سے ان لوگوں کے اثر و رسوخ سے میر کی تحریک نور اشاعتِ دین کے

مثبت نتائج برآمد ہوتے گئے۔ وادی کشمیر کے اطراف و اکناف میں شیعہ مسلک کی تبلیغ کر کے میر شمس الدین اراکی اسکردو چلے گئے اور وہاں بودھ مذہب سے تعلق رکھنے والوں کو مشرف بہ اسلام کرا چکے۔ میر اراکی کا یہ تبلیغی دورہ اُن کے لئے بہت سود مند رہا اور وادی کشمیر کے مقابلے میں اسکردو میں انہوں نے کم سے کم وقت میں شیعہ مسلک کی اشاعت میں کامیابی حاصل کی۔ وہاں سے فراغت پاکر واپس کشمیر چلے آئے اور یہاں مستقل طور بود و باش اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔

یہ اس دور کی بات ہے جب جڈی بل میں کوئی آبادی نہ تھی اور یہ خطہ زمین سلطان فتح شاہ کے دور میں ملک موسیٰ رینہ کو بطور جاگیر عطا کیا گیا تھا۔ بعد ازاں ملک موسیٰ رینہ نے وہ خطۂ زمین میر شمس الدین اراکی کو اپنا مسکن اور خانقاہ تعمیر کرنے کے لئے بخش دیا۔ اس واقعہ کا تذکرہ مصنف "تحفۃ الاحباب" بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میر اراکی نے ملک موسیٰ رینہ کے جملہ تحائف ہدایا، جن میں زمین، مکانات، جواہرات اور زیورات شامل تھے قبول کر لئے اور پھر ۹۰۲ھ مطابق ۱۴۹۶ء کے موسم بہار میں خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ قاضی جان محمد قدسی نے اس خانقاہ کی تاریخ اس چھوٹی سی مثنوی کی شکل میں منظوم کی ہے:-

چوں بتائید کردگار علی	حیّ قادر حکیم لم یزلی
نور بخش قلوب اہلِ صفا	ہادیٔ سالکان راہِ ہدیٰ
قاسم فیض و واہبِ توفیق	رہنمائے معارج تحقیق
طلعت افروز شمس دین نبیؐ	شمسہ افرازِ کاخِ مُطّلبی
در بلادِ ممالکِ کشمیر	حرست عن طوارق اللہ میر

پرتوِ شمعِ نوربخش افروخت | دیدهٔ حاسدانِ منکر سوخت
همت ایں بزرگ صاحبِ خیر | فی الحقیقت بغیر منتِ غیر
خانقاه چناں عمارت کرد | که فرشته درد زیارت کرد
بر در و نقش نوشته روح الامین | سالِ تاریخ کاشف المتین

۹۰۲ھ

بر درِ ایں مقام ہمچو بہشت
خیر کرد فتہ البقا کنوشت

"بہارستان شاہی" کا مصنف میر شمس الدین اراکی کے ہاتھوں خانقاہِ ہمدانیہ کی از سرِ نو تعمیر کی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ اس خانقاہ کا سارا انتظام میر شمس الدین اراکی کے ہاتھ میں تھا اور مجاوروں کے تقرر اور برخاستگی اور انصرام انہی کے حدِ اختیار میں تھا۔ سلطان محمد شاہ نے خانقاہ ہمدانیہ کی تولیت کی ساری ذمہ داریاں میر اراکی کو دے رکھی تھیں اور اُن کی تولیت کے دور میں درویشوں کی ایک جماعت کو خانقاہ میں کئی برس تک اربعین (چالیس دنوں کی گوشہ نشینی یا چلہ کشی) میں بٹھایا گیا تھا اور حاجی شمس کو اس جماعت کا پیشوا مقرر کیا گیا تھا۔ میر اراکی کے انتقال کے بعد اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے سید میر دانیال خانقاہ ہمدانیہ کے منتظم اعلیٰ تھے[1]

میر شمس الدین اراکی مبلغِ دین اور عارف باللہ ہی نہ تھے بلکہ تلوار کے بھی دھنی تھے۔ مصنف "بہارستان شاہی" لکھتا ہے کہ وہ بہت بہادر، باہمت اور مردِ میدان تھے۔ ان کا معرکہ "ذالڈگر" جو ۹۱۳ھ مطابق ۱۵۰۷ء میں وقوع پذیر ہوا ایک اہم محاربہ سمجھا جاتا ہے جس میں اُن کے ہمراہ ملک موسیٰ رینہ، ملک علی رینہ،

---

[1] بہارستان شاہی:۔

امیر سید بدلا قاضی محمد قدسی اور مصنف تحفۃ الاحباب کے والد اور دوسرے سرکردہ لوگ شامل تھے یہ جنگ ذالڈگر کے قریب وجوار میں جہاں باغی رینو نام کا ایک مندر تھا لڑی گئی کیونکہ یہ جگہ مے نوشی اور بدکرداری کا مرکز بن چکی تھی۔ کیونکہ یہ کافروں، مبتدعوں، منافقوں، فاسق وفاجر لوگوں اور کسبی رنڈیوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہونے کے ناطے بے ہودگیوں کا اڈا تھا اور غیر اسلامی حرکات کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

میر شمس الدین اراکی کو جب ان بدعات اور بے ہودگیوں کا علم ہوا تو وہ ایک معمولی جماعت لے کر "باغی رینو" کو مسمار کرنے کے لئے چل پڑے۔ اگرچہ حزب مخالف کشمیر تعداد میں تھا مگر اسکے باوجود وہ اس پر ایسے ٹوٹ پڑے کہ وہاں کشتوں کے پشتے لگ گئے اس فتح مندی کے بعد ذالڈگر کا نام "اسلام پور" رکھ دیا گیا۔ قاضی جمال الدین، جو فارسی کے اچھے شاعر اور میر اراکی کے خاص مرید بھی تھے اس جنگ اور فتح مندی سے متاثر ہو کر اپنے مرشد کی اسلام دوستی سے متعلق ۵۷ اشعار پر مشتمل مثنوی تخلیق کر چکے ہیں جس میں سے کچھ اشعار اس طرح کے ہیں[1]۔

آن شمس کہ نورِ معرفت یافت	از مطلع نور بخش برتافت
کشمیر کہ در زمانِ پیشیں	جز کفر نہ داشت رسم و آئین
تا آن کہ زہجرتِ محمدؐ	ہفتاد و سہ سال رفت و ہفصد
سلطانِ ممالکِ معانی	شاہِ ہمدان علیؒ ثانی
از آمدنِ علی ثانی	آن گوہر گنج لامکانی
القصہ دریں کہن بوادی	از ہمت ایں ولی ہادی

---

[1] بہارستان شاہی۔

ہر بتکدہ کہ گشت ویران | شُد خانقاہے بجز صنم آن
قعرے بضلال دُو بت پرستی | جمعے ہواے لعب و مستی
برکند بناے بر بُت پرستاں | برداشت تمام کافرستان
فرمود عمارتے در آن جا | زیبا و مزین و دل آرا

مگر ان تمام کاموں اور دین اسلام کی اشاعت کے باوجود مؤرخین کشمیر، جن میں تاریخ کبیر کے مولف محمد مسکین، واقعات کشمیر کے مصنف خواجہ محمد اعظم دیدہ مری، تاریخ حسن کے پیر حسن کھویہامی، مصنف تاریخ فرشتہ، تاریخ رشیدی کے مولف مرزا حیدر دوغلات وغیرہ شامل ہیں، نے میر شمس الدین اراکی کی زبردست نکتہ چینی کرکے ان کو بہت سے الزامات دیئے ہیں جن میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انہوں نے ہی کتاب "فقہ احوط" تصنیف کی ہے جب کہ کتاب "فقہ احوط" کے عرفانی مرشد سید محمد نوربخش کی تالیف ہے۔ اس کتاب کا وجود کشمیر میں اب تک عنقا ہے۔ صرف تاریخوں میں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں۔ راقم نے آج سے سات آٹھ سال قبل کتاب زیر بحث کے مواد اور نفس مضمون کے بارے میں آغا سید باقر الموسوی الصفوی کے ساتھ اُن دِنوں ترسیل ڈاک رابطہ قائم کیا جب موصوف ایران کے شہر قم کے حوزہ علمیہ میں استفادہ علمی کے مقصد سے عارضی طور قیام پذیر تھے۔ انہوں نے میرے نام اپنے ایک خط مرقومہ ۱۱ مارچ ۱۹۸۳ء "کتاب فقہ احوط" کے بارے میں لکھا کہ "سردست قم ہی میں میرا قیام ہے اور درس و مطالعہ میں منہمک ہوں۔ خوبیٔ قسمت سے "کتاب فقہ احوط" کا قلمی اور چھاپی نسخہ ایک دوست کے ذریعے دستیاب ہوا۔

یہ وہی کتاب ہے، جس کا کشمیری شیعہ تاریخ سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔
آج تک کشمیر میں اس کا وجود عنقا تھا۔ البتہ کتابوں میں اسکے صرف حوالے ملتے ہیں۔

مرزا حیدر کاشغری نے اپنی کتاب تاریخ رشیدی میں اس پر متعصبانہ تنقید کی ہے اور اس کا حوالہ مورخ فرشتہ نے بھی دیا ہے۔ تاریخی قرائن بتلاتے ہیں کہ کاشغری نے شیعوں پر جو پہلی تاریخی غارت ڈالی ہے اس کا جواز اسکے مفروضہ کی بنا پر اسی کتاب کے حوالے سے پیش کیا ہے، جو بالکل غلط تھا۔ کاشغری نے محض اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اس کتاب کو بدنام کر کے اسے شیعوں کے مٹانے کا ذریعہ قرار دیا۔ کتاب کے ناپید ہونے کی وجہ سے ان اعتراضات کا مدلل جواب دینا ممکن نہیں ہوتا تھا جو اس کتاب کی بنیاد پر کشمیر کی شیعہ یکی پر متعصب رقمطرازوں نے کئے ہیں۔ اب تو اہل تحقیق کے لئے دشواری کی یہ منزل آسان ہو گئی اور تاریخ کشمیر کی ایک کھوئی ہوئی کڑی بھی مل گئی۔ میں نے تو ابھی اس کتاب کے دونوں نسخوں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا، ایک سرسری نظر ڈالی جس سے پتہ چلا کہ واقعی متعصب مورخین نے اس کتاب کی نسبت فرضی افسانے بنا کر شیعہ قوم کو بدنام کرنے اسکی تاریخ کو مسخ کرنے کی جہاں توڑ کوششیں کی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کہاں تک حقیقت افسانوں کی اوٹ میں چھپے رہ سکتی ہے؟

اپنے منصوبوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے بعد میر شمس الدین اراکی اچھی خاصی عمر پا کر ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۶ء اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور ان کے جسد خاکی کو جڈی بل میں سپرد خاک کیا گیا۔ مگر بعد ازاں مرزا حیدر کاشغری کی فتنہ انگیزیوں کے نتیجے میں ان کے جسد خاکی کی بے حرمتی کا منصوبہ بنایا لیکن ملکان چاڈورہ سے بعض سربرآوردہ شخص نے اس پلان سے خائف ہو کر ان کی نعش کو سرنگ لگا کر جڈی بل سے منتقل کر کے چاڈورہ پہنچا دیا لیکن ملکان چاڈورہ کو جب گردش زمانہ نے گمنامی کے دبیز پردوں میں چھپا دیا تو میر شمس

الدین اراکی کا مقبرہ بھی گمنامی میں چلا گیا۔ آخر کار حجۃ الاسلام آغا سید مہدی (بڈگام) نے انیسویں صدی میں میر اراکی کے مقبرہ کو زمانے کی دست برد سے محفوظ کر کے اس پر ایک روضہ تعمیر کرایا۔ اسکے بعد ان کے پوتے آغا سید محمد کے بڑے فرزند آغا سید احمد الموسوی مرحوم و مغفور نے ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء میر شمس الدین اراکی کا روضہ نئے سرے سے تعمیر کیا جو آج مرجع خلائق ہے اور ہر سال یہاں وعظ و تبلیغ اور مجلس عزا کا انعقاد کیا جاتا ہے جس کا اہتمام انجمن شرعی شیعان کشمیر بڈگام کرتا ہے۔



حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ

حضرت محبوب العالمؒ سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کے اجداد کا تعلق راجپوتوں کے چندر بنسی خاندان سے تھا۔[1] اس خاندان کے ایک شخص سوسرم چندر اپنے آبائی وطن سے نگر کوٹ کانگڑہ آئے اور وہاں کے حکمران بنے۔[2] بعد میں اُس کا بیٹا فل چندر تخت نشین ہوا لیکن اندرونی ملکی بغاوت کے سبب کشمیر میں پناہ لینے کے

---

[1] ہندوستانی مورخین کے مطابق راجپوتوں کے دو بڑے خاندان تھے۔ چندر بنسی اور سوریہ بنسی۔ چندر بنسی خاندان کی نسبت برہما سے ہے اور اس خاندان کے افراد نے ہندوستان کے کئی حصوں پر حکومت کی ہے۔ مزید دیکھئے تاریخ حسن جلد ۳ صفحہ ۱۶۰+ کشمیر جلد ۱ صفحہ ۱۲ کشمیری مسلمان صفحہ ۱۴۰+ حیات شیخ حمزہ صفحہ ۲۵ تحفہ محبوبی صفحہ ۱۱

[2] واقعات کشمیر نولیو ۲۴۰ (ب) + حیات شیخ حمزہ صفحہ ۲۵+ کشمیر جلد ۱ صفحہ ۱۲ تاریخ حسن جلد ۲ صفحہ ۱۴۹-۱۵۰

لئے مجبور ہوا۔ کشمیر کے راجہ جے سنگھ نے اُس کی عزت کی اور فوج کا سربراہ بنا دیا۔[۳]
اُن دِنوں فوج کے سربراہ یا سپہ سالار کو رینہ کہا جاتا تھا۔ جو کہ در اصل اِس عہدے
کے لئے خطاب ہوا کرتا تھا۔ مُل چندر کے بعد اِس خاندان کے افراد دکھ چندر
(وفات ۶۳۷ھ / ۱۲۳۹ء) بلاد چندر (وفات ۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء) فوج کے سربراہ مقرر

۳ھ دجیز التواریخ فولیو ۲۲ (ا) تاریخ حسن جلد ۲ صفحہ ۱۴۹-۱۵۰ یہاں پر یہ بتانا
ضروری ہے کہ تاریخ حسن کے جلد ۳ صفحہ ۱۶۰ پر درج ہے کہ مُل چند کے بیٹے
سوسرم چندر نے کشمیر میں پناہ لی۔ بہارستان شاہی فولیو ۲ (ا) کے مطابق سہم دیو
کے دورِ حکومت میں ۵۳۵ھ میں نگر کوٹ کے راستے مل چندر نام کا ایک شخص
کشمیر میں وارد ہوا۔ جسے فوج کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ حسن بیگ خاکی نے تاریخ کشمیر فولیو
۲۲ (ا) پر رقم کیا ہے کہ ۵۳۵ھ میں سہم دیو کے دورِ حکومت میں نگر کوٹ کے
حکمران خاندان کے چند افراد وارِدِ کشمیر ہوئے جبکہ عبد القادر خان مصنف حشمت کشمیر
(فولیو ۱۵ (ا) لکھتے ہیں کہ ال چند اور والئ نگر کوٹ سوسرم چند پانچ سو افراد کے
ہمراہ کشمیر آئے اور راجہ جیہ سنگھ کی خدمت کی جنہیں لار کی جاگیر عطا کی گئی۔ راج
ترنگنی مصنفہ جونراج میں جو پہلا تاریخی واقعہ درج ہے وہ یہ ہے کہ سوسرم کا بیٹا ملاو
(مل چندر) وارِدِ کشمیر ہوا جو کہ ترِی گاٹا (تین دریاؤں یعنی راوی۔ ستلج اور بیاس
سے سیراب ہونے والے ملک) کا حکمران تھا۔ اِس مُلک کی راجدھانی
جالندھر تھی اور قلعہ کوٹ کانگڑہ نگر کوٹ تھا۔ مزید دیکھئے:

(۱) —— آرکیولاجکل سروے رپورٹ ۵ صفحہ ۱۴۵-۱۴۸
(۲) —— راج ترنگنی صفحہ ۶۰
(۳) —— واقعات کشمیر فولیو ۲۴ (ب)

ہوئے۔ بلاد چندر کے بیٹے سنگرام چندر کو راجہ سنگرام دیو نے اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ لیکن باغی ہونے کے سبب اُسے قتل کیا گیا[۴] لیکن اُس کے بیٹے رام چندر نے بادشاہ کے تئیں اپنی وفاداری جتلا کر وہی مرتبہ حاصل کیا جو اُس کے باپ کو تھا[۵]۔ سنہ ۷۲۰ھ/ ۱۳۲۰ء میں زلچو[۶] کے حملے کے دوران سہہ دیو کشتواڑ بھاگ

---

[۴] جونراج راج ترنگنی صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں کہ سنگرام دیو کے دورِ حکومت میں بلاد چندر نے سرینگر کے نصف حصہ پر قبضہ کیا تھا اور اپنے نام پر ایک مٹھ کی تعمیر کی تھی جو کہ موجودہ بلدیمر جگہ پر موجود ہے۔ تاریخ حسن جلد ۲ صفحہ ۱۵۸ کے مطابق سنگرام دیو نے بلاد چندر کے بھائی سورج دیو کو فوج کا سربراہ بنا دیا جو بعد میں بغاوت میں شریک ہوا اور اس نے لڑائی کے دوران بلاد چندر کے ساتھ گگنہ گیر کے قلعہ میں پناہ کی۔ بہارستان شاہی فولیو ۴ (ا) اور تاریخ حسن جلد ۲ صفحہ ۱۵۹ کے مطابق سنگرام چندر۔ رام دیو، لچھمن دیو اور سہم دیو کے دور حکومت میں وزیر رہا لیکن جب سہم دیو نے اُسے لار کی جاگیر سے بے دخل کیا تو اس نے بغاوت کر دی اور قتل کیا گیا۔ مزید دیکھیے:
واقعات کشمیر فولیو ۲۶ (ب) تا ۲۷ (ا)۔ تاریخ حسن جلد ۲ صفحہ ۱۵۸
وجیز التواریخ فولیو ۲۲ (ب)۔ تاریخ کشمیر حسن بیگ خاکی فولیو ۲۲ (ب)

[۵] تاریخ حسن جلد ۲ صفحہ ۱۵۹۔ تاریخ کشمیر حسن بیگ خاکی فولیو ۲۲ (ب)۔ وجیز التواریخ فولیو ۲۳ (ا)۔

[۶] ذوالقدر۔ دالچا یا دلچو کے متعلق مختلف تاریخ نویسوں نے مختلف آرا ظاہر کی ہیں۔ تاہم اُن کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ ترکستان کی منگول نسل کا تھا۔ اس نے کشمیر میں اپنے حملے کے دوران زبردست تباہی / بقیہ صفحہ ۵۱ پر

گیا اور رام چندر نے لہارا (گگنہ گیر قلعہ) میں پناہ لی۔ زلچو کے جانے کے بعد جوں ہی کہ رام چندر اپنی تخت نشینی کا اعلان کرتا رینچن نے اُسے ۷۲۵ھ/۱۳۲۶ء میں اندرکوٹ کے قلعہ میں قتل کر دیا اور اُس کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی۔ ساتھ ہی رام چندر کے بیٹے راون چندر کو نہ صرف رینہ بنا دیا بلکہ لار کی جاگیر بھی واپس لوٹا دی۔ راون چندر کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد سے شاہمیری دورِ حکومت میں اس خاندان کے افراد یکے بعد دیگرے سپہ سالار اور حکومت کے کئی عہدوں پر فائز رہے۔ چنانچہ احمد رینہ۔ دولت رینہ۔ ابدال رینہ۔ ہلمت رینہ اور جہانگیر رینہ مختلف بادشاہوں کے ادوارِ حکومت میں بہت ہی اہم عہدوں پر کام کرتے رہے۔ حسن شاہ کے دورِ حکومت میں خانہ جنگی کے سبب اس خاندان کا ایک فرد جہانگیر رینہ ملک احمد یتو کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ان کے چھوٹے فرزند زیتی رینہ نے اپنے باپ کی جاگیر میں ایک جگہ موضع تجرؔ میں پناہ لی اور یادِ حق میں مصروف ہو گئے۔ اُنکے فرزند عثمان رینہ نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر اسی راہ کو اختیار کیا۔ وہ بہت ہی اعلیٰ خصائل کے مالک تھے۔ پابند شریعت اور تصوف کے دلدادہ بھی۔ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ (عُشر) شیخ اسماعیل شامی کی خانقاہ کی دیکھ ریکھ پر خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے تجرؔ کے ہی دولت ملک کی صاحبزادی مریمؔ سے شادی کی جو زبردست پرہیزگار اوصاف حمیدہ کی مالک تھیں۔

محبوب العالم سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف تذکرہ نگاروں کے

بقیہ حاشیہ ۵؎ مچائی۔ اُس کی واپسی پر یہاں کے باشندوں نے اُسے جو راہ دکھائی اُسکی وجہ سے وہ اور اُسکی افواج شمالی کوہستانی خطے میں برف کی نذر ہو گئیں۔

۱؎ ہدایت المخلصین فولیو ۲۱۱ ا۔ ۲۱۴ (ب)

مطابق ۱۴۹۴ء[10] میں عثمان ریشہ اور مریم کے ہاں تجر زینہ گیر میں سنہ ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء میں پیدا ہوئے اور اپنی زندگی کے ابتدائی سال یہیں پر گذارے[11]۔ آپ کے والد عثمان ریشہ اور دادا زیتی ریشہ اپنے قبیلہ کے سردار تھے اور لون نام سے معروف تھے۔ چک خاندان کے امرا اور شرفا سے انکے خاندانی رشتے تھے۔

---

۸ ہدایت المخلصین فولیو ۱۶۵ (ا)۔ ۹۵ (ب)۔ ۱۰۲ (ب) ۱۰۳ (ب) ۱۴۰ (ب)

چلچلتہ العارفین۔ فولیو ۱۳ (ب) ۶ (ا) ۱۰۱ (ا) ۱۱۹ (ب)۔
دستور السالکین صفحہ ۲۰۴۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ تذکرۃ المرشد فولیو ۳۷ (ا) تا ۳۸ (ا)۔

۹ دستور السالکین صفحہ ۴۴۔ تذکرۃ المرشد فولیو ۹۴ (ب) ۱۱۲ (ب)
ہدایت المخلصین فولیو ۱۵۹ (ا)۔ ۲۱۱ (ا-ب)۔ رسالہ سلطانیہ فولیو ۴ (ب)
خوارق السالکین فولیو ۴۳ (ا) مجموعہ التواریخ فولیو ۱۱۱ (ب) واقعات کشمیر فولیو ۱۰۴ (ا)۔

۱۰ گرچہ حضرت شیخ حمزہؒ کے سنہ ۹۰۰ھ میں پیدائش کے متعلق کسی بھی تذکرہ نگار نے اختلاف نہیں کیا ہے تاہم اُن کی ولادت کی تاریخ کہیں نہیں مل پائی۔
میر حیدر تولہ مولی نے ہدایت المخلصین فولیو ۲۱۱ (ب) پر لکھا ہے کہ حضرت شیخ حمزہؒ کی والدہ مریم کا بیان ہے کہ شیخ حمزہؒ جمعرات کے بعد کی شب کو آخری پہر میں تولد ہوئے۔

۱۱ راحتہ الطالبین فولیو ۱۹ (ا)، تحفہ محبوبی صفحہ ۲۱-۲۲،
کشمیر جلد اول صفحہ ۱۲۲

حمزہ کے لغوی معنی شیر ہیں حضرت شیخ حمزہؒ پیدائشی صوفی تھے[12] اور اپنے ہم عمر بچوں کے برعکس تنہائی میں یادِ حق کرتے تھے اور پاکیزہ اور خدا دوست لوگوں سے میل رکھتے تھے۔ بچپن سے ہی نتیجوں کی پرواہ کئے بغیر سچ بولتے تھے[13]۔ گھوڑسواری اور تیر اندازی اُن کے محبوب مشغلے تھے حالانکہ ان کا ایک پیر صحیح حالت میں نہیں تھا[14]۔ تجر میں قرآن پاک کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد[15] اُنکے دادا زینی رینہ نے انہیں

---

[12] دستورالسالکین صفحہ ۴۲
راحتہ الطالبین فولیو ۹ (ا)
رسالہ سلطانیہ فولیو ۴ (ا)
چلچلتہ العارفین فولیو ۶ (ب)
ہدایت المخلصین فولیو ۱۶۲ (ب)
واقعات کشمیر فولیو ۱۰۴ (ا)

[13] دستورالسالکین صفحہ ۴۴ + مختلف تذکرہ نگاروں نے درج کیا ہے کہ ایک بار شیخ حمزہ رح تجر میں مدرسہ کے لئے گھر سے روانہ ہوئے اور راستے میں کھیل کود میں مشغول ہو گئے۔ جب اُن کے والد نے اُن سے دریافت کیا تو سچ بتا دیا۔ والد نے ان کی زبردست پٹائی کی جسکا انہیں پہلے ہی اندازہ بھی تھا لیکن بغیر خوف پھر سچ ہی بولے۔ اس واقع کے بعد ہی انہیں شیخ اسماعیل شامی (کبروی) کی خانقاہ میں داخلہ دلایا گیا۔

[14] دستورالسالکین صفحہ ۴۴ - ۳۰۸

[15] تذکرۃ العارفین فولیو ۳۴۲ (ا) - ۳۰۴ (ب)۔ صاحب تذکرہ رقم ہیں کہ تجر میں انہیں مُلا محمد شریف نے پارہ عم کا درس دیا۔ مزید دیکھئے دستورالسالکین صفحہ ۴۵۔ خوارق السالکین فولیو ۱۴۳ (ا)

شیخ اسماعیل کبروی کی خانقاہ میں داخلہ دلایا جہاں انہوں نے شیخ اسماعیل کے فرزند بابا فتح اللہ خوشخوان سے ایک سال تک قرآن مجید اسکی تفسیر کا درس لیا[16]۔ حضرت شیخ حمزہ رح نے مدرسہ دار الشفا میں تفسیر، فقہ، حدیث، فلسفہ، تصوف، اوراد و اذکار اور اخلاق و ادب کی تعلیم آخون ملا درویش اور آخون ملا لطف اللہ سے حاصل کی[17]۔ یہ مدرسہ خانقاہ شمسی چک سے وابستہ تھا جس کی بنیاد شیخ اسماعیل نے سلطان حسن شاہ کے دور حکومت میں جامع مسجد سرینگر کے نزدیک کمانگر پورہ میں ڈالی تھی[18]۔

حضرت شیخ حمزہ مخدوم رح نے اس خانقاہ میں قیام کرتے ہوئے سلوک کی عملی تربیت حاصل کی۔ اس دوران انہوں نے انتہائی ذہانت اور محنت کا مظاہرہ کیا جس کے متعلق مختلف تذکروں میں کئی واقعات درج ہیں حضرت شیخ حمزہ رح کے بیان کے مطابق جسے اُن کے کئی ہم عصر تذکرہ نگاروں نے درج کیا ہے کہ صغر سنی کی بنا پر انہیں اس خانقاہ میں ایک بزرگ شخص کے ساتھ ایک ہی کمرے میں قیام کے لئے رکھا گیا۔ یہ بزرگ ہر رات سورہ کہف کی تلاوت کرتے تھے۔ کچھ ہی دن بعد

---

[16] دستور السالکین صفحہ ۴۵۔ چلچلۃ العارفین فولیو ۲۷ (ب)۔ خوارق السالکین فولیو ۳۴ (الف) تاریخ حسن جلد ۳ صفحہ ۱۶۱۔

[17] اسرار الابرار فولیو ۱۰۶ (ب)۔ ۱۱۰ (ب) دستور السالکین صفحہ ۴۵ سلطانی صفحہ۔

[18] دستور السالکین (صفحہ ۴۵۔ ۲۸۳) میں بابا داؤد خاکی رح لکھتے ہیں کہ یہ ادارہ ملک شمسی چک نے اپنے والد شیخ اسماعیل عبد القادر خان کے نام پر قائم کیا تھا۔ تاریخ حشمت کشمیر فولیو ۱۸ (الف) پر درج ہے کہ یہ خانقاہ شیخ الاسلام شیخ اسماعیل نے محمد شاہ کے دور حکومت میں قائم کی تھی۔

حضرت شیخ حمزہؒ کو یہ سورۃ حفظ ہو گئی تھی اور جب انھوں نے اِس بات کا تذکرہ اپنے ساتھی سے کیا تو وہ حیران ہو گئے کیونکہ بہت عرصہ سے اِس سورۃ کی تلاوت کرنے کے باوجود بھی وہ یہ حفظ نہ کر سکے تھے۔ اور شیخ حمزہؒ نے اسے چند ہی بار اُنکے سے سُننے کے بعد یاد کر لیا تھا۔[19] حضرت شیخ حمزہؒ فرماتے تھے کہ جب بھی وہ ذرا دیر تک سوتے تھے تو کوئی آواز انہیں خبردار کر دیتی تھی کہ ؎

خیز اے حمزہ چیست خواب دراز[20]

اِس طرح سے یہ اندازہ کرنا مُشکل نہیں کہ حضرت شیخ حمزہؒ نے روحانی مشقتوں کی جو عملی تربیت اِس خانقاہ میں حاصل کی وہ بعد میں اُن کی زندگی کا باقاعدہ حصہ بن کر رہ گئی۔ سلوک کی راہ میں جو منازل حضرت شیخ حمزہؒ نے طے کیں اُن کا تذکرہ شیخ احمد چاگلیؒ کے رسالہ سلطانیہ میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں ملا حیدر تولہ مولیؒ اور خواجہ میرم بزازؒ نے بھی اِن منازل کا قدرے تفصیلی ذکر کیا ہے۔ لیکن اُن کے اکثر تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ شیخ حمزہؒ پہلے مجذوب اور پھر سالک تھے۔[21] مختلف تذکروں میں درج بیانات کی بنیاد پر اگر اُن کی

---

۱۹ دستور السالکین صفحہ ۶۳۔ اسرار الابرار فولیو ۱۱۰ (ب) سلطانی صفحہ ۹۔ تاریخ حسن جلد ۴ صفحہ ۱۶۳ سلطان العارفینؒ۔ قاری سیف الدین۔ ہمارا ادب ۷۷-۱۹۷۶ صفحہ ۵۲

۲۰ اسرار الابرار فولیو ۱۱۰ (ب)

۲۱ دستور السالکین صفحہ ۸-۹ رسالہ سلطانیہ فولیو ۲ (ا) راحتہ الطالبین فولیو ۱۹ (ا) چلچلتہ العارفین فولیو ۱۷ (ب) - ۴۲ (ا) ہدایت المخلصین فولیو ۳۵ (ا)

بابا داؤد خاکیؒ دستور السالکین (صفحہ ۲) میں اِس بات پر بحث کرتے ہوئے انہیں مجذوب کے بدلے محبوب لکھتے ہیں۔ مزید دیکھئے: رشد نامہ فولیو ۱۱ (ا)۔ ۳۸ (ا)۔ ۵۹ (ب)، ۱۶۲ (ا)، ۱۸۸ (ا)

روزانہ مشغولیات کا ایک گوشوارہ ترتیب دیا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ اپنا بیشتر
وقت یادِ الٰہی اور عبادات میں ہی گذارتے تھے۔ ان کے برادر ملا علی رینہ تذکرۃ العارفین
میں لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ حمزہؒ روزانہ تین سو ساٹھ بار قرآن پاک کی تلاوت مکمل کرتے
تھے[22] ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی ریاضت کرتے تھے جو شریعت کی رُو سے ہر مسلمان کے
لئے ضروری یا لازمی حیثیت نہیں رکھتیں لیکن راہ سلوک کے مسافر ایسی ریاضت کو کافی
اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں[23] سہروردیہ سلسلہ کے صوفیائے نے ذکر کو کافی اہمیت دی ہے
اور حضرت شیخ حمزہؒ ذکر حق بہ کثرت کیا کرتے تھے اور اسمیں بہت ہی مست ہوا کرتے
تھے اس حد تک کہ جسمانی حرکات کی وجہ سے انہیں بہت عرصہ تک سر درد کی شکایت رہی۔[24]

---

[22] تذکرۃ العارفین فولیو ۲۳۰ (ا) + اگرچہ یہ بیان بظاہر ناقابل یقین لگتا ہے۔ لیکن
بابا داؤد خاکیؒ نے اس سلسلے میں ایک منطقی جواز یہ دیا ہے کہ حضرت شیخ حمزہؒ کو
وہ روحانی قوت حاصل تھی جسے طےِ حروف کہتے ہیں۔ دیکھئے دستور السالکین
صفحہ ۲۲۴ - ۲۲۵ اسرار الابرار فولیو ۲۱ (ب) - ۹ - ۱۰ (ب) +

[23] حضرت شیخ حمزہؒ کے تذکرہ نگاروں کے مطابق وہ اوراد فتحیہ، ہفت آیات، دعائے
حزب البحر، احزاب کبار، حرز مونس، یا دعائے سیفی، درد اعظم، دعائے لشیخ، چہل اسم
وغیرہ بہ کثرت پڑھتے تھے اور انہیں ان درود و اذکار کو پڑھنے کی اجازت
صوفی بزرگان سے براہِ راست ملی تھی۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے ان کی اہمیت
اور فوائد پہ تفصیلی بحث کی ہے۔ دیکھئے دستور السالکین صفحہ ۸۰۔ ۱۴۱۔ ۱۶۰۔
۱۶۵ اسرار الابرار فولیو ۱۳ (ب) - ۱۲ (و) ۔

[24] دستور السالکین صفحہ ۱۲۹ - اسرار الابرار فولیو ۱۱۰ (ب) واقعات کشمیر فولیو
۱۰۴ (ب) — تاریخ حسن جلد ۳ صفحہ ۱۶۶ ۔

اُن کا ایک بیان جیسا کہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے درج کیا ہے کہ چھوٹی ہی عمر میں اُن کے
دانت گر گئے تھے اور بال سفید ہو گئے تھے جسکی وجہ اُن کی بہ کثرت ذکرِ حق تھی۔[25]
سخت درد کی حالت میں فرماتے تھے ۔

سوختم چندان کہ بر تن نیست دیگر جائے داغ
بعد ازیں خواہم نہادن داغ بر بالائے داغ[26]

اور

حاصلِ عشقم سہ سخن بیش نیست
سوختم و سوختم و سوختم[27]

حضرت شیخ حمزہؒ گرچہ تقریباً اُن تمام طریقوں سے ذکر کیا کرتے تھے جو بزرگ صوفیائے
کرام نے بیان کیے ہیں تاہم چہار ضرب میں لا الٰہ الا اللہ کا ذکر زیادہ پسند فرماتے تھے۔[27]
ذکرِ حق کے اس طریقے میں اندرونی اور سرّیت پر زور دیا جاتا ہے۔ اس لئے پاسِ
انفاس اور ہوش در دم اصطلاحات اس طریقہ کی ذکر سے نسبت رکھتی ہیں۔ اور اسکا
مقصد یہ ہے کہ سالک کی ایک بھی سانس یادِ حق سے چھوٹ نہ پائے۔ سانسوں کی کم
تعداد اور خیال پر زیادہ توجہ اس ذکر کے خواص ہیں جس پر حضرت شیخ حمزہؒ نے عبور
حاصل کیا تھا۔ اور وہ اپنی سانس بہت دیر تک روک سکتے تھے جس کی مدد سے وہ
انتہائی ٹھنڈ میں یخ بستہ پانی سے نہایا کرتے تھے اور جس سے اُن کے سر درد کی

---

۲۵ دستور السالکین صفحہ ۱۷۴-۱۷۶
۲۶ دستور السالکین صفحہ ۱۷۴
۲۷ چلچلۃ العارفین فولیو ۲۰ (ب) ۲۱ (الف) ؛ دستور السالکین صفحہ ۱۶۹ -
۱۷۰ سلطانی صفحہ ۱۵ -

تکلیف بھی دور ہو جاتی تھی۔[28] حضرت شیخ حمزہؒ تنہائی میں یادِ حق کرتے تھے۔ راتوں کو بیدار رہا کرتے تھے۔ انھوں نے خود بھی چہل چلہ رکھا اور اپنے خلفا اور ارادتمندوں کو بھی اِس کی تربیت دی کیونکہ اُن کا کہنا تھا کہ یہ دل اور ذہن تمام دنیاوی خیالات سے پاک کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔[29]

کھانے پینے میں شیخ حمزہؒ اعتدال کے قائل تھے اور بہت ہی کم غذا کھاتے تھے۔ رمضان کے مہینے کے علاوہ بھی اکثر روزہ دار رہا کرتے تھے۔ ضبطِ نفس کی حد یہ تھی کہ بقول حضرت بابا داؤد خاکیؒ (حضرت شیخ حمزہؒ کا بیان ہے) کہ رمضان کے مہینے میں انہیں کچھ ایسے فوائد ہاتھ سے جاتے تھے جو راتوں کو بھوکے رہنے سے حاصل ہوتے اور رمضان میں سحری کے طور کچھ نہ کچھ ضرور کھانا پڑتا۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ ہر کھانے کی چیز کے متعلق پہلے یہ اطمینان کیا کرتے تھے کہ کھانا حلال ہے۔ جو شخص کھانا کھلانا چاہتا ہے وہ یہ کام خلوص سے کر رہا ہے اور اس سے کوئی دنیاوی مقصد وابستہ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک بار حضرت شیخ حمزہؒ تقریباً نصف مہینے فاقہ رہے اور صرف پانی پر گذارہ کیا کیونکہ ایسا کھانا دستیاب نہ ہوا کہ جسمیں ہیں درج ہذا خصوصیات

---

[28] حضرت شیخ حمزہؒ کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ بہت وقت تک اپنی سانس روک سکتے تھے۔ اور اِس سلسلے میں کچھ ماخذوں میں حضرت شیخ حمزہؒ کا یہ بیان درج ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ اگر پانچ وقت کی نماز لازمی نہیں ہوتی تو میں کئی دنوں تک سانس کو روک لیتا۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ اِس ضمن میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب انھوں نے اس بارے میں حضرت شیخ حمزہؒ سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ زبردست ریاضت سے اللہ سالک کو سانس لینے کے لئے ایک دوسری راہ کھول دیتا ہے اور ناک/ بقیہ اگلے صفحہ پر

تعلیں۔[30]

حضرت شیخ حمزہؒ شریعت کے زبردست پابند تھے۔ وہ کبھی بھی ریشمی اور زعفرانی رنگ کے کپڑے نہیں پہنتے کیونکہ شریعت کی رو سے مردوں کو ایسے کپڑے پہننے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔[31]

حضرت شیخ حمزہؒ نے خانقاہ شمسی چک میں تقریباً بیس سال گذارے جہاں انہوں نے مذہب اور سلوک کی اعلیٰ تربیت حاصل کی۔ اس دوران انہوں نے راہ سلوک

بقیہ حاشیہ ۲۸ یا منہ کے بدلے ماتھے کے اوپر سے سانس لیتا ہے جس سے سانس نہ لینے کی تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ دستور السالکین صفحہ ۱۷۱۔ چلچلتہ العارفین فولیو ۸۶ (ا)، تذکرۃ العارفین فولیو ۱۲۱۴ (ب)۔ ۴۱۵ (ب)، ۴۵۶ (ب) تذکرۃ المرشد فولیو ۱۵ (ب)۔ اسرار الابرار فولیو ۱۱۷ (ب)۔

۲۹ درج ہے کہ ایک بار جب حضرت بابا داؤد خاکیؒ کوہ شنگہ پال پر چلہ میں تھے۔ انہوں نے حضرت شیخ حمزہؒ کو ایک خط میں اپنے کچھ شکوک دور کرنے کے لئے مشکواۃ اشریف بھیجنے کے لئے لکھا۔ حضرت شیخ حمزہؒ اس پر ناراض ہو گئے اور انہیں دوبارہ چلہ مکمل کرنے کو کہا کیونکہ اُن کا کہنا تھا کہ بابا داؤد کا دل و دماغ پوری طرح خارجی دنیا سے منقطع نہیں ہوا تھا جسکی وجہ سے اُن کے من میں شبہات پیدا ہوئے۔ ہدایت المخلصین فولیو ۱۱۱ (ا) تذکرۃ العارفین فولیو ۴۵۶ (ب) دستور السالکین صفحہ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۲۸۴۔ چلچلتہ العارفین فولیو ۱۵ (ب)، ۱۶ (ا)، ۱۲۰ (ا)، ۱۲۱ (ب)۔ ۱۱۱ (ا)، تاریخ حسن جلد ۳ صفحہ ۱۶۲۔ ۱۶۴۔

۳۰ دستور السالکین صفحہ ۲۹۰۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ چلچلتہ العارفین / بقیہ اگلے صفحہ پر۔

سے مختلف مقامات سے گئے۔ اسکے بعد انہوں نے کلاشپورہ کے نزدیک سرینگر میں قیام کیا[٣٢] جسے مخدوم منڈو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر وہ یادِ خدا اور تبلیغِ اسلام کے کام میں مشغول رہے۔ منڈو کے سامنے جو زمین تھی اُس سے اُن کا گذارہ ہوتا تھا حالانکہ اُن کے آبائی گاؤں تجر میں اُنکی ملکیتی زمین تھی لیکن وہ مال و دولت کے پیچھے بالکل نہ رہے[٣٣] اپنی منزل حقیقی کو پانے کے لئے انہوں نے نفسانی خواہشات کو ترک کر دیا حتیٰ کہ وہ عمر بھر کنوارے رہے[٣٤]۔

بقیہ حاشیہ ۳۰ فولیو ۱۲۲(ا) ۔ ۱۲۳(ب)

۳۱ دستور السالکین صفحہ ۳۰۰ - ۳۰۵ - مزید دیکھئے کتاب آداب المریدین (انگریزی ترجمہ از نکلسن) صفحہ ۲۵

۳۲ تذکرۃ العارفین فولیو ۲۹۷(ب) ۳۳۲(ا) ۴۵۸(ا)۔ چلچلۃ العارفین فولیو ۴۳(ب)، ۵۰(ب)، رسالہ سلطانیہ فولیو ۱۴(ب) وغیرہ

۳۳ دستور السالکین صفحہ ۱۸۶ - ۱۸۷

۳۴ دستور السالکین صفحہ ۱۲۹ پر اس شعر کی تشریح میں ایک دلچسپ بحث ملتی ہے شعر یہ ہے

همچو عیسیٰؑ زیست بے زن لیک فرزندیست
هر مرید او را پسر هر مخلصہ دختر شد است

چون رسول اللهؐ گفتا هر تقی آلِ من است
شکر کز باغ نبیؐ پیدا گلے نو بر شد است

مختصراً یہاں یوں کہیں گے کہ دو پیغمبران حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ تمام عمر کنوارے رہے۔ کیا شریعت کی رو سے بغیر نکاح رہنا جائز ہے؟ اس سلسلے میں مختلف کتابوں میں صوفیائے کرام کے دلچسپ مباحث ملتے ہیں دیکھئے کتاب آداب المریدین۔ ابو نجیب سہروردی (انگریزی ترجمہ نکلسن) صفحہ ۴۷ / باقی صفحہ ۲۲۷ پر

حضرت شیخ حمزہ مخدوم رح کوہ ماران پر چھ سال تک چلہ گذارتے رہے۔ [35]
اس سے قبل آپ رح نے مختلف خیالات رکھنے والے علما کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا
اور ان کے ذہن میں مختلف ملکوں کے علمائے کے خیالات جان کر ایک ہل چل سی
پیدا ہوئی تھی کہ آیا وہ کس مسلک کی پیروی کریں۔ کتابوں کے مطالعہ اور علما سے
بحث و مباحثہ کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچے تو ایک روحانی تجربے سے خود پیغمبر اسلام
حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے خلفائے رض نے ہدایت دی۔ [36]
حضرت شیخ حمزہ رح کی زندگی کے ایک اہم پہلو کے متعلق ہمارے مورخین اور
تذکرہ نگاروں کے متضاد خیالات ملتے ہیں وہ یہ کہ آپ نہ صرف یہاں کی سیاسی فضا
پر حاوی رہے بلکہ شیعہ مسلک کے خلاف بھی۔ اس ضمن میں کچھ سنی مؤرخین نے انہیں
بطور ہیرو پیش کیا ہے تو شیعہ مسلک سے وابستہ مورخین نے ان کے رول کو یا تو نظر انداز
کیا ہے یا پھر بہت ہی کم ذکر کیا ہے اور موجودہ دور میں اس سلسلے میں جو بھی مضامین
وغیرہ قلمبند ہوئے ہیں ان میں محتاط روی سے کام لیا گیا ہے لیکن ایک بات مشترک
رہی ہے کہ ایسا کرتے ہوئے ہر ایک کی پسند یا ناپسند آڑے آگئی ہے۔ نتیجتاً
حقیقت سامنے نہیں آسکی ہے۔ حضرت بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ اس ضمن
میں لکھتے ہیں۔

لفظ شیعہ پر تاریخی اعتبار سے غور کیا جائے تو یہ ان لوگوں سے منسوب ہے
جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے چوتھے خلیفہ حضرت علی رض سے زبردست محبت

بقیہ حاشیہ [34] احیائے العلوم - الغزالی عبدالقادر گیلانی - غنیۃ الطالبین - فتوح الغیب وغیرہ

[35] تذکرۃ العارفین فولیو ۱۱۱(ا)

[36] دستوار السالکین صفحہ ۱۴۳ - ۱۴۴ - اسرار الابرار فولیو ۱۲ ب ۱۳

رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ (بابا داؤد خاکیؒ) اُنکے پیرو مرشد سلسلہ سہروردیہ کے تمام صوفیاؒ اور تمام تر صوفی برادری حضرت علیؓ سے والہانہ عقیدت اور محبت رکھتے ہیں کیونکہ تقریباً تمام صوفی سلسلے اُنہی سے جا کر ملتے ہیں۔ چنانچہ اگلے وقتوں میں حضرت علیؓ سے والہانہ محبت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کچھ لوگ اُنہیں نہ صرف سب سے برتر سمجھنے لگے بلکہ باقی خلفاؓ اور عظیم المرتبت مسلمانوں کے تئیں بُرے جذبات اور بے بُنیاد نفرت پیدا ہوئی جنہیں کسی بھی قیمت پر شیعہ نہیں کہلایا جا سکتا۔[۳۷]

برصغیر میں سلسلہ سہروردیہ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس سلسلہ سے وابستہ اکثر بزرگوں کے شاہی دربار سے اچھے تعلقات تھے۔ اگرچہ بذاتِ خود یہ صوفیائے کرام کسی ذاتی دُنیاوی فائدے کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے لیکن اُن کا خیال تھا کہ اگر اس طریقے سے حکمران کی صحیح موقع پر صحیح راہنمائی کی جا سکے تو رعایا کا بھلا ہو سکتا ہے۔[۳۸]

---

[۳۷] دستور السالکین صفحہ ۹۶۔ ع ۱۴۳ اسرار الابرار فولیو ۱۱۵ (الف۔ب) سلطانی صفحہ ۱۱ تاریخ حسن جلد ۳ صفحہ ۱۶۳۔

[۳۸] شیخ ابو النجیب سہروردی کا خیال ہے کہ اگر حکمران غیر منصف ہو تب بھی بغاوت پر پابندی ہے۔ حکمران کی فرمانبرداری کی جانی چاہئے ماسوائے اُس صورت میں کہ اللہ کی نافرمانی یا قانون کی عدولی ہو۔ منصف حکمران کے پاس جانا اچھا ہے غیر منصف حکمران سے دور رہنا چاہئے ماسوا ئے اُس صورت میں کہ زیادہ ضروری ہو یا اسے (حکمران کو) غلطیوں سے باز رکھنا مقصود ہو۔ (آداب المریدین۔ انگریزی ترجمہ نکسن) صفحہ ۲۹-۴۸۔
ابوبکر کلابازی لکھتے ہیں کہ صوفیائے کا خیال ہے کہ اگر حکمران غلطی بھی / بقیہ حاشیہ ۶۳ پر

حضرت شیخ حمزہؒ جب سنِ تمیز کو پہنچے اُس دوران کشمیر میں چک خاندان کے حکمران راج کرتے تھے۔ اُس دور میں اندرونِ ملک خانہ جنگی کی سی فضا طاری تھی اور غازی چک کے دورِ حکومت میں فرقہ پرستی کو بھی ہوا لگی تھی۔ عوامی مزاحمت کے ڈر سے غازی چک کافی حد تک پریشان تھا۔ حضرت شیخ حمزہؒ جیسی برگزیدہ شخصیت کو لوگ زبردست احترام سے دیکھتے تھے جسے غازی چک دل ہی دل میں خود کیلئے خطرناک سمجھا ہوگا۔ نتیجاً اسی عداوت کی بنا پر غازی چک نے شیخ حمزہؒ کو سرینگر شہر سے باہر جانے کے لئے شاہی حکم جاری کیا اور حضرت شیخ حمزہؒ اوہنگام پرگنہ بیروہ تشریف لے گئے[۲۹] اور

بقیہ حاشیہ ۲۸ کرے تب بھی اُس کے خلاف تلوار اٹھانا ٹھیک نہیں۔ دکتاب التعارف المذہب اہل التصوف۔ انگریزی ترجمہ (آربری) صفحہ ۴۱

اس ضمن میں صوفیائے کرام کی آرا پڑھ کر کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہے کہ آیا صوفیائے کو سیاست میں دلچسپی لینی چاہئے یا نہیں۔ چنانچہ کئی جگہوں پر صوفی تحریک براہ راست فوجی تنظیموں سے شانہ بہ شانہ چلی۔ وسطی ترکستان میں صوفی تحریک سیاسی مزاحمت کے طور پر کام کرتی رہی۔ شمالی اور جنوبی افریقہ اور شرقی سوڈان میں بھی ایسی ہی صورت حال نظر آتی ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں ترکستان میں شیخ بابا الیاس نے باضابطہ طور سلجوقی سلطان کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور افریقہ میں صوفیائے نے یورپ کی سامراج قوتوں کی دراندازی پر فوجی اندازکی روک لگا دی۔ دیکھئے فضل الرحمان اسلام (انگریزی) صفحہ ۱۵۰ ایم۔ ایس۔ بالجون۔ اسلام اِن افغانستان انڈیا اینڈ پاکستان۔ آربری۔ ریلیجن اِن دی مڈل ایسٹ۔

۲۹ اسرار الابرار ذیلیوہ ۱۲۵ (ب) تاریخ حسن جلد ۳ صفحہ ۱۶۹۔ اوہنگام بیروہ میں ابھی تک ایک ایسا سبزہ زار ملتا ہے جسے "مخدوم بینڈ" کہا جاتا ہے۔

تب واپس سرینگر آئے۔ جب سلطان غازی چک کوڑھ کی وجہ سے مر گیا۔ یہاں پر ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ حضرت شیخ حمزہؒ اور میر شمس الدین اراکیؒ کا براہ راست

۴۰۔ اسرار الابرار فولیو ۱۲۵ (۱)۔ چلچلۃ العارفین فولیو ۱۷۷ (ب)، ۱۷۸ (ب)۔ ہدایت المخلصین فولیو ۱۲۷ (۱۔ ب) محب الحسن کشمیر انڈر دی سلطانز (صفحہ ۱۶۱) میں لکھتے ہیں کہ رفیع الدین احمد مصنف نوادر الاخبار اور ابو الفضل مصنف آئین اکبری کے مطابق غازی چک حضرت شیخ حمزہؒ اور اُن کے خلفا بابا داود خاکیؒ اور بابا ہردی ریشیؒ جیسے صوفیوں کی زبردست قدر اور عزت کرتا تھا۔

۴۱۔ کشمیر کی تاریخ کے مذکورہ دور سے متعلق جو بھی دستاویزات ملتے ہیں۔ اُن میں اُن کا نام میر شمس الدین عراقی درج ہے تاہم اس بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے میر شمس الدین صاحب اراک سے کشمیر تشریف لائے جو کہ ایران کے صوبہ گیلان کے شمال میں واقع ایک جگہ ہے۔ چونکہ یہ جگہ ہمارے لئے زیادہ معروف نہیں اس لئے اکثر صورتوں میں اسے عراق ہی لکھا گیا۔ میر شمس الدین اراکی پندرھویں صدی کے آخر میں کشمیر آئے۔ اُن کے والد کا نام ابراہیم تھا اور والدہ سید موسوی خاندان سے نسبت رکھتی تھی۔ تاریخ رشیدی (صفحہ ۴۳۵) مصنف مرزا حیدر دوغلات کاشغری کے مطابق وہ فتح شاہ کے پہلے دور حکومت میں کشمیر آئے۔ سر ویلزلی ہیگ کے مطابق جیسا کہ صوفی غلام محی الدین نے کشمیر (انگریزی) جلد اول صفحہ ۱۰۹ پر درج کیا ہے وہ کثر سنی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ حکیم غلام صفدر ہمدانی اپنی کتاب شیعیانِ کشمیر (صفحہ ۱۷) پر لکھتے ہیں کہ وہ عراق کے موضع کند میں پیدا ہوئے جو سولغان کے نزدیک واقع ہے۔ لیکن اس بارے میں انھوں نے کوئی تاریخی حوالہ / بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵ پر

کوئی اختلاف نہیں رہا ہے کیونکہ جب میر شمس الدین اراکی واردِ کشمیر ہوئے اُس کے تیرہ سال بعد شیخ حمزہؒ تولد ہوئے۔

حضرت شیخ حمزہؒ کے تذکرہ نگاروں نے پیغمبروں اولیاء اللہ کے ساتھ اُن کی روحانی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے[42] حضرت خضرؑ کے ساتھ ملاقات اور بیعت حاصل ہونے کی وجہ سے انہیں سلسلہ اولیسیہ سے بھی وابستہ کیا جا سکتا ہے[43] اُن کے تذکرہ نگاروں کے مطابق انہیں تصوف کے چودہ خانوادوں سے بیعت حاصل تھی[44] لیکن اس کے باوجود وہ سلسلہ سہروردیہ کے ایک اعلیٰ پایہ صوفی بزرگ مانے جاتے ہیں حالانکہ کئی تذکرہ نگاروں نے اُن کے بعد کشمیر میں اس سلسلہ کو سلسلہ محبوبیہ نام دے کر اُن ہی کے نام سے منسوب کیا ہے[45]

بقیہ حاشیہ ۴۱ فراہم نہیں کیا ہے۔ اُن کے مطابق وہ مرزا اسین والیٔ خراسان کی طرف سے ۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء میں سلطان حسن شاہ کے دور میں بطور سفیر کشمیر آئے۔

۴۲۔ دستورالسالکین صفحہ ۱۰۶ - ۱۰۷ - ۱۲۲ - ۲۹۲ چلچلۃ العارفین فولیو ۵۴ (ب) ۳۰ (ب) تذکرۃ العارفین فولیو ۴۲۸ (ا-ب)۔ ۴۴۳ (ا) ہدایت المخلصین فولیو ۱۷۱ (ب)۔ ۲۴۳ (ا) تا ۲۴۵ (ب)

۴۳۔ دستورالسالکین صفحہ ۱۶۶ - ۱۶۷ - ۳۶۵ تذکرۃ المرشد فولیو ۱۹ (ا) تذکرۃ العارفین فولیو ۴۲۳ (ا)۔ اسرار الابرار فولیو ۱۱۳ (ا)۔ ہدایت المخلصین فولیو ۱۷۱ (ب) ۲۴۶ (ا) تا ۲۴۵ (ب)

۴۴۔ دستورالسالکین ۱۶۶ - ۱۶۷ ہدایت المخلصین فولیو ۱۹۳ (ا) تا ۱۹۶ (ا)۔ ۲۳۰ (ا) تذکرۃ المرشد فولیو ۲۸۲ (ا)۔ چلچلۃ العارفین فولیو ۸۹ (ا) راحت الطالبین فولیو ۲۱ (ا) ـــ حاشیہ ۴۵ صفحہ بعد پر ہے

سلسلہ سہروردیہ میں انہوں نے سید جمال الدین بخاریؒ سے بیعت حاصل کی جو ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء میں کشمیر آئے۔ یہاں آکر انہوں نے پہلے لاپورہ گاؤں میں قیام کیا[۴۶] اور پھر مدرسہ ملک احمد میں تشریف لے آئے جہاں حضرت شیخ حمزہؒ نے اُن سے بیعت اور تربیت حاصل کر کے اجازت نامہ حاصل کیا۔[۴۷] اور ہندوستان جانے سے پہلے

بقیہ حاشیہ[۴۵] چلچلتہ العارفین فولیو ۱۱۷ (ب) ہدایت المخلصین فولیو ۱۹۵ (ب) تذکرۃ العارفین فولیو ۸ (و)

[۴۶] بابا داؤد خاکیؒ رقمطراز ہیں کہ لاپورہ میں انہوں نے مُلا حسرت اکبری قاضی پرگنہ بانگل کے گھر قیام کیا۔ جبکہ بابا داؤد مشکواتی کے مطابق اُن کے میزبان کا نام قاضی حسرت اور پیر غلام حسن کھویہامی کے مطابق جبرات خان تھا۔ اسرار الابرار فولیو ۱۰۵ (و-ب)۔ تاریخ حسن جلد ۳ صفحہ ۵۶۔ خوارق السالکین فولیو ۴۳ اور سلطانی صفحہ ۱۳ تحفہ محبی صفحہ ۳۰

[۴۷] چلچلتہ العارفین فولیو ۸۹ (ب)؛ ہدایت المخلصین فولیو ۱۴۹ (ب)۔ ۱۹۴ (ب) ۱۹۶ (و)؛ اسرار الابرار فولیو ۱۱۴ (و)؛ خوارق السالکین فولیو ۱۴۳ (ب)

واضح رہے کہ شیخ جمال الدین بخاری حاجی عبدالوہاب کے خلیفہ اور سید جلال الدین بخاری المعروف مخدوم جہانیاںؒ کے چھوٹے جانشین تھے۔ پیر حیدر تولہ مولی (ہدایت المخلصین فولیو ۲۱۴ (و)) میں رقمطراز ہیں کہ شیخ حمزہ مخدومؒ کے اجداد مخدوم جہانیاں کے وارد کشمیر ہونے کے وقت آپ کے فیضان سے مشرف ہوئے تھے۔ شیخ حمزہؒ کے خلیفہ اور بابا داؤد ملا علی اوینہ (تذکرۃ العارفین فولیو ۲۰۷ (ب) - ۲۰۸ (ب)) لکھتے ہیں کہ مخدوم جہانیاں ہندوستان کے سفر کے بعد واپس اپنے وطن اُچھ جاتے ہوئے لاہور سے پیر پنجال کے راستے کشمیر آئے۔

تاریخ کبیر کے مطابق آپ ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں وارد کشمیر ہوئے۔ ریاض الاسلام میں بھی اُنکے کشمیر آنیکا ذکر ہے۔ حسن شاہ کھویہامی (تاریخ حسن جلد ۲ صفحہ ۱۷۰) واقعات کشمیر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ سلطان علاؤالدین کے دور حکومت میں کشمیر تشریف لے آئے۔ تاہم اکثر تذکروں میں اُن کے کشمیر آنے سے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔

شیخ جمال الدینؒ نے انہیں سلسلہ نامہ بھی عطا کیا۔ جو اس طرح ہے۔[48]

پیغمبر آخر زمان حضرت محمد مصطفےٰ [49] اُن کے خلفا حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، خواجہ حسن بصریؒ، خواجہ حبیب عجمیؒ، شیخ داؤد طائیؒ، شیخ معروف کرخیؒ، شیخ سری سقطیؒ، شیخ جنید بغدادیؒ [50]، شیخ ممشاد دینوریؒ، شیخ احمد دینوریؒ، شیخ محمد عبداللہ سہروردیؒ، شیخ وجیہ الدینؒ، شیخ ضیاء الدین ابو النجیب یحییٰؒ، شیخ

۴۸؎ یہ سلسلہ نامہ ترتیب دینے میں جن کتابوں اور دستاویزات کا استفادہ کیا گیا ان میں کچھ نام یوں ہیں۔ ہدایت المخلصین، دستور السالکین، سند سلسلہ قادریہ، چلچلۃ العارفین۔ تذکرۃ العارفین، بزم صوفیہ، تذکرۃ المرشد، ہمارے ولی، حیاتِ شیخ حمزہؒ وغیرہ۔

۴۹؎ کئی دستاویزات میں پیغمبر آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کے بعد سلسلہ نامہ میں حضرت علیؓ کا نام لیا گیا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے تین خلفاء کا نام نہیں۔ عام طور پر یہی خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ ہی ہر سلسلہ کے بانی ہیں۔ لیکن سہروردیہ اور نقشبندیہ سلسلہ کے پیروکار خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ سے سلسلہ جوڑتے ہیں۔ ہدایت المخلصین میں حضرت علیؓ کے بعد حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کے نام درج ہیں اور اُن کے بعد اویس قرنیؒ اور پھر خواجہ حبیب عجمیؒ۔ صاحب تذکرہ نے خواجہ حسن بصریؒ کا نام درج نہیں کیا ہے۔

۵۰؎ یہاں پر سلسلہ قادریہ کا سلسلہ نامہ الگ ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے خلیفہ ابو بکر بن شبلیؒ کے ذریعے سے بعد میں سلسلہ قادریہ تشکیل پاتا ہے تاہم کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے سلسلہ سہروردیہ کے بزرگوں کے ساتھ زبردست روحانی مراسم تھے۔

شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانیؒ[51]، شیخ صدر الدینؒ، شیخ رکن الدینؒ، مخدوم جہانیاں[52] سید جلال الدین میران بن شیخ سید احمد کبیر بن سید جلال الدین الحسینی البخاریؒ، شیخ سید حامد کبیرؒ، شیخ سید رکن الدین ابو الفتحؒ، شیخ سید محمود ابو القاسم[53]، شیخ سید محمدؒ، شیخ سید حامدؒ، شیخ سید عبد الجلیل[54]، شیخ سید حاجی عبد الوہابؒ، مخدوم شیخ سید

---

[51] شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانیؒ نے ہی برصغیر ہند و پاک میں سلسلہ سہروردیہ کی بنیاد ڈالی ہے۔

[52] مخدوم جہانیاںؒ [پیدائش ۱۴ شعبان ۷۰۷ھ | وفات ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ بعد نماز عید
۸ فروری ۱۳۰۸ء | ۳ فروری ۱۳۸۴ء]

وقائع کشمیر میں جس کا حوالہ حسن شاہ کھویہامی نے دیا ہے سلطان علاؤ الدین کے دور حکومت (۷۶۱ھ / ۱۳۶۱ء — ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء) میں کشمیر تشریف لے آئے لیکن اُن کے خود نوشتہ سفرنامہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ کشمیر کی بجائے، کاشمر ایران تشریف لے گئے تھے جسے ہمارے مورخین نے کشمیر سمجھا ہے۔ لہٰذا اس بارے میں بحث کی گنجائش ہے۔ مزید دیکھئے مضمون ہٰذا کا حاشیہ ۴۷۔

[53] چلچلتہ العارفین کے جس نسخہ کا میں نے مطالعہ کیا ہے اسمیں پہلے سید محمود ابو القاسمؒ اور بعد میں سید رکن الدین ابو الفتح کا نام ہے۔ یہ شاید کتابت کا بھی سہو ہو سکتا ہے۔

[54] یہ نام صرف چلچلتہ العارفین میں ملتا ہے۔ جبکہ آپکے مرشد سید حامدؒ کا سلسلہ ایک اور ذریعے سے مخدوم جہانیاں سے جا ملتا ہے یہ رابطہ یوں ہے مخدوم جہانیاں، شیخ زین الدین، شیخ کبیر الدین، شیخ صدر الدین المعروف راجو قتال خلیفہ و برادر اصغر مخدوم جہانیاں۔

جلال الدین صدرالدین بخاری۔ سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کشمیری۔[55]

حضرت شیخ حمزہؒ روحانی فضائل اور علم و دانش سے مالا مال تھے۔ انہوں نے یہ فضائل اور علم اپنے تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اپنے بہت سے خلفا اور ارادتمندوں کو فیض پہنچایا جو کہ برابر آج تک جاری ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مختلف تذکروں میں مختلف تالابوں، چشموں اور باقی موجودات کو بھی اُن کا ارادتمند لکھا گیا ہے۔ بابا داؤد خاکیؒ، بابا ہردی کاریشیؒ، میر حیدر تولہ مولیؒ، شیخ احمد چاگلیؒ، خواجہ اسحاق قاری ؒ خواجہ حسن قاریؒ، بابا رومی رشیؒ، ملا علی رینہؒ، شیخ نور وند رشیؒ، خواجہ شمس الدین پالؒ، خواجہ میرم بزازؒ، خواجہ زین الدین پالؒ، مولانا شکر وغیرہ اُنکے ایسے خلفا تھے جنہیں انہوں نے سلسلہ سہروردیہ میں لوگوں کو بیعت کرنے کی اجازت دی تھی۔ اُن کے خلفا میں

---

[55] جیسا کہ پہلے ہی اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت شیخ حمزہؒ کو اُن کے تذکرہ نگاروں کے مطابق مختلف سلسلوں سے بیعت حاصل تھی۔ ان تذکروں کے مطابق انہیں جن بلند و بالا شخصیتوں سے روحانی طور بیعت اور تربیت حاصل تھی اُن میں پیغمبروں میں سے حضرت یونسؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت خضرؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ ؐ اور اُن کے چار خلفا اور اولیا اللہ میں خواجہ اویس قرنیؒ، شیخ شہاب الدینؒ اور شیخ نجم الدین کبراؒ وغیرہ کے نام مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔ جبکہ فارس سے سہروردیہ سلسلہ کے شیخ علاؤالدینؒ نے اور شیخ محمد رفیقؒ خلیفہ شیخ سید جامیؒ نے انہیں اپنے برادر ملا علی رینہ کے ذریعہ خرقہ بھیجا تھا۔

دیکھئے دستور السالکین صفحہ ۱۵۲

تذکرۃ العارفین فولیو ۱۳۹ (ا)۔ ۱۵۴ (ا)

ہدایت المخلصین فولیو ۲۴۷ (ا) تا ۲۴۵ (ب)

سات ایسے بھی تھے جنہیں انہوں نے غلامی سے آزاد کروایا تھا۔ وہ ہیں صوفی الہ داد۔ نور محمد۔ ملا یوسف۔ میاں مہدی۔ شاہ محمد۔ ملا علی اور فتح اللہ + حضرت شیخ حمزہؒ اپنے ارادتمندوں کی قدر دنیاوی حیثیت سے نہیں بلکہ روحانی مقام کے اعتبار سے کرتے تھے۔ اُن کے ارادتمندوں میں حورہ۔ نورہ۔ شاہ۔ زاہدہ۔ عائشہ۔ فاطمہ۔ معصومہ۔ سالکہ۔ زینب وغیرہ بہت سی عورتوں کے علاوہ سینکڑوں غیر ملکی بھی شامل تھے اُن کا طرز بیان انتہائی شاندار اور متاثر کُن تھا جسکی بنا پر لوگ اُن کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ سیاحت کے کافی دلدادہ تھے[56] اور اس دوران لوگوں کو دین کی طرف مائل کیا اور انہیں توہمات سے نجات دلائی۔

عام طور پر صوفیائے کرام نے علم و دانش اور فلسفہ تصوف پر کتابیں اور ملفوظات تحریر کیں ہیں۔ اگرچہ حضرت شیخ حمزہؒ کی از خود نوشتہ کسی تصنیف کا کوئی پتہ نہیں ملتا تاہم اُنکے خلفاء نے کئی کتابیں اور تذکرے تحریر کئے ہیں جن میں اُن کے ملفوظات بھی درج ہیں

---

[56] بابا داؤد خاکی کے مطابق شیخ حمزہ تنہائی میں یادِ حق پسند فرماتے تھے اسلئے اکثر پہاڑوں کی طرف جاتے تھے وہ لکھتے ہیں ؎

گر مسادی بود حضورش خلوت و بازار شد
لیک میل خاطرش اکثر بکوہ و دشت است

کسی تذکرہ میں اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ آیا حضرت شیخ حمزہؒ کبھی وادیٔ کشمیر سے باہر بھی گئے ہیں۔ تاہم یہ بات درج ہے کہ انہوں نے طئے مکان کی ایک خاص روحانی طاقت سے حج بیت اللہ کا فریضہ انجام دیا تھا اور برگزیدہ صوفی بزرگوں کی خانقاہوں اور مدفنوں کی زیارت کی تھی۔ اُن کی کئی اور روحانی طاقتوں کا تذکرہ بھی اِن کتابوں میں ملتا ہے جیسے کشف دل، کشف صورت۔ باقی صفحہ ۱۷ پر

چنانچہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ کی دستور السالکین بقول مصنف حضرت شیخ حمزہؒ نے خود سنی تھی ۔

حضرت شیخ حمزہؒ بلند پایہ کے مبلغ تھے ۔ انہوں نے کئی مساجد بھی تعمیر کی ہیں جن میں نادی ہل اور آہام کی مساجد قابل ذکر ہیں۔ اُس دور کے مُلاؤں کے برعکس وہ لوگوں کو توہمات سے نجات دلاتے رہے سوہ عمل پر زور دیتے رہے۔

انہوں نے عام ملاؤں کے برعکس تعویذ لکھنے سے پرہیز کیا۔ سچائی[۸۶] اُنکا راسخ عقیدہ تھا اور شریعت کے پابند تھے ۔ انہوں نے بہت سی سماجی خدمات بھی انجام دیں ۔ چرس پینے کی جو عام عادت اُس وقت کے نام نہاد قلندروں کی تھی اُسکی انہوں نے حوصلہ شکنی کی[۸۷]

بقیہ حاشیہ [۸۵] کشف قبور، نسخ وقت ۔ طے حروف، عمل دخل وغیرہ اس ضمن میں دیکھئے

آداب المریدین (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۸۱

کتاب التعارف المذہب اہل التصوف (انگریزی) صفحہ ۴۳ ۔ ۱۰۸ ۔ ۱۵۶

کشف المحجوب ۔

دستور السالکین صفحہ ۱۷ ۔ ۲۰۹ تا ۲۱۹ ۔ ۱۲۵ ۔ ۲۲۴ تا ۲۲۷ ۔ اسرار الابرار فولیو ۱۱۹ (ب) ۔ ۱۲۱ (ب) تا ۱۲۲ (ب) ۔

تذکرۃ العارفین فولیو ۲۸۱ (ب) ۔ ۴۹۲ (ب) ۔ ۴۹۳ (ب)، چلچلتہ العارفین فولیو ۹ (ب) ۔ ۸۲ (ب) ۔ ۸۳ (ا) ۔

ہدایت المخلصین فولیو ۲۱۷ (ب) واقعات کشمیر فولیو ۱۰۳ (ب) تذکرۃ المرشد فولیو ۵۵ (ا) ۔ ۹۷ (ب) ۔ ۹۸ (ا) ۔

[۸۶] دستور السالکین صفحہ ۲۴۹ ۔ ۲۴۰ ۔ ۲۸۶

[۸۷] دستور السالکین صفحہ ۲۱۱ ۔ چلچلتہ العارفین فولیو ۳ (ا) سلطانی صفحہ ۹۰ تذکرۃ العارفین فولیو ۴۸۳ (ا)

اُن کی ہمہ جہت شخصیت نے یہاں کی عام زندگی کو متاثر کیا اور یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء میں درانی حکمران عطا محمد خان نے شیخ العالمؒ اور شیخ حمزہؒ کے نام پر ایک سکہ بھی رائج کیا[۵۹]۔

حضرت شیخ حمزہؒ جمعرات ۲۴ صفر سنہ ۹۸۴ھ مطابق ۲۳ مئی ۱۵۷۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے[۶۰]۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ۝ اُن کے جسد خاکی کو کوہ ماران پر اُس جگہ کے بالکل قریب دفن کیا گیا جہاں وہ بہت عرصہ تک یاد حق کرتے رہے تھے اُن کی درگاہ برابر آج تک لوگوں کے لئے فیض پناہ بنی رہی ہے۔ یوسف شاہ چک نے حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کی وفات کے چھ سال بعد یعنی سنہ ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء میں اُنکے برادر ملا علی رینہ کو اُن کی جائداد کا وارث ہونے کا اعلان کیا اور انہیں آستانہ عالیہ کی دیکھ ریکھ کا کام سپرد کیا گیا اور اس جائداد پر تمام محصولات معاف کئے گئے[۶۱]۔ کوہ ماران کی اس جگہ سے شہر سرینگر اور وادی کے اطراف کا ایک دل موہ لینے والا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

---

۵۹ دیکھئے محمد یوسف ٹینگ۔ سکہ شد روشن ز شاہ نورالدین (کشمیر کا پرل آرگنائزیشن علمدار)۔ موتی لال ساقی۔ کشمیر میں مسلمان بادشاہوں کے سکے۔ تعمیر جلد ۱۲ شمارہ ۱۔

۶۰ تذکرۃ العارفین فولیو ۷۰ (ب) خوارق السالکین فولیو ۱۴۴ (ا) چلچلۃ العارفین فولیو ۱۲۶ (ب)۔ اسرار الابرار ۱۲۸ (ب)، واقعات کشمیر فولیو ۱۰۴ (ب)۔ تحفۂ محبوبی صفحہ ۵۰۷۔

۶۱ ۱۰ جون سنہ ۱۹۷۸ء کے روزنامہ "سرینگر ٹائمز" سرینگر شمارہ ۱۳۴ جلد ۱۰ میں اس شاہی حکم نامہ کا متن اور ترجمہ چھپا ہے جسے اخبار ہذا کو انیس کاظمی نے فراہم کیا تھا۔

مغل دورِ حکومت میں ایک فوجی افسر نواب عنایت اللہ خان نے ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء میں مقبرہ کو تعمیر کیا اور سکھ دور میں شیخ غلام محی الدین نامی حاکم نے اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ وفات کے بعد اُسے بھی اِس کے مشرقی طرف دفن کیا گیا۔ مغل شاہزادہ دارا شکوہ نے یہاں ایک مسجد اور لائبریری کے لئے عمارت تعمیر کی جس میں ڈوگرہ دورِ حکومت میں جنگی سامان ذخیرہ کیا گیا لیکن بعد میں لوگوں کی مزاحمت سے اسے خالی کرایا گیا اور اسے واپس حاصل کیا گیا۔ یہ مسجد ابھی تک درگاہ کی مشرقی طرف موجود ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اِس پہاڑی پر زیارت گاہ کے ساتھ ہی ایک تالاب ہے۔ ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء میں اِس تالاب کے لئے ایک واٹر ریزرولیر تعمیر کیا گیا۔ جس میں نلوں کے ذریعہ پانی آتا ہے۔ لیکن اِس سے قبل بھی یہ تالاب ہمیشہ پانی سے بھرا رہتا۔ چنانچہ روایت تھی کہ جب بھی کوئی ناگہانی مصیبت آجاتی تو لوگ وادی کے ہر کونے سے مٹکوں گھڑوں اور برتنوں میں پانی لاکر آستانہ فیض پناہ پر حاضر ہوکر گریہ زاری کرتے اور تالاب بھر کر مصیبتوں سے نجات پا لیتے۔

۱۹۳۶ء میں آستانہ عالیہ تک پہنچنے کے لئے پہاڑی پر پتھر کی سیڑھیاں تعمیر کی گئیں۔ ۱۹۷۵ء میں مسجد سالار بیگ دوبارہ تعمیر کی گئی جسے پہلے ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۶ء میں مغل فوجی افسر سالار بیگ نے تعمیر کیا تھا۔ ۱۹۴۴ء/ ۱۳۶۴ھ میں زیارت مخدوم صاحبؒ کے تعمیراتی کام کو درست لینے کے لئے باضابطہ ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی۔ اسی دوران مشرقی کی طرف کی سیڑھیوں کی جگہ نئی سیڑھیاں بنوائی گئیں، کئی ایک عمارتوں کی ٹین پوشی کی گئی۔ ۱۳۶۵ھ میں روضہ شریف کی چھت کو پیپر ماشی سے مزین کیا گیا۔ اس کام کا بیڑا استاد عبدالغنی کی سربراہی میں تکمیل کو پہنچا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کو اخروٹ کی لکڑی کی پنجرہ کاری سے سجایا گیا۔ تب سے آج تک آستانہ عالیہ کی تجدید کے ساتھ ساتھ دیگر تعمیراتی کام بھی مکمل کئے گئے ہیں۔ آستانہ عالیہ پہ اگرچہ ہر روز عقیدت مند کافی تعداد میں آتے رہتے

ہیں تاہم سوموار اور جمعرات کو زائرین کافی زیادہ تعداد میں آتے ہیں۔ ہر سال ۲۴ صفر کو یہاں عرس کی تقریبات منائی جاتی ہیں۔



منتخبہ کتاب نامہ

بابا داؤد مشکواتی — اسرار الابرار (۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵ء) فارسی مخطوطہ ریسرچ لائبریری کشمیر یونیورسٹی

خواجہ اسحاق قاری — چلچلتہ العارفین (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء) 〃 〃 اندراج نمبر ۵۰۰

میر حیدر تولہ مولی — ہدایت المخلصین (۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء) 〃 〃 〃 ۵۹۳

ملا احمد ابن صبور — خوارق السالکین (۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء) 〃 〃 〃 ۲۳۰

خواجہ حسن قاری — راحتہ الطالبین (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء) 〃 〃 〃 ۵۰۲

شیخ احمد چاگلی — رسالہ سلطانیہ (۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) 〃 〃 〃 ۵۰۱

ملا علی رینہ — تذکرۃ العارفین (۹۷۸-۹۷۰ھ/۱۵۷۰-۱۵۹۴ء) 〃 〃 ۵۹۴

خواجہ میرم بزاز — تذکرۃ المرشد (۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء) 〃 〃 〃 〃 ۶۱۰

خواجہ محمد اعظم دیدمری — واقعات کشمیر — کتب خانہ فاقی

غلام نبی خانیاری — وجیز التواریخ — فارسی مخطوطہ ریسرچ لائبریری کشمیر یونیورسٹی اندراج نمبر ۵۳۲

عبدالقادر خان — تاریخ حشمت کشمیر 〃 〃 〃 〃 ۲۱

بابا داؤد خاکیؒ — دستور السالکین، چھاپ شدہ سرینگر (۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء)

پروفیسر غلام محمد شاد

حضرت بابا ہردی ریشیؒ

حضرت بابا داؤد خاکیؒ حضرت ہردی بابا ریشی المعروف "ریشی مولؒ" کے ہم عصر بھی تھے اور پیر بھائی بھی۔ انہوں نے اُن کی وفات کے بعد ایک طویل قصیدہ بہ نظم "ریشی نامہ" نامیہ میں بہت سے اشعار میں حضرت ریشیؒ کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے اُن کا اسمِ گرامی "ہردی بابا" بیان فرمایا ہے ؎

ہردی بابا آن کہ ریشی بود یعنی زاہدے
کرد با حکمِ حق از دنیا بہ عقبیٰ انتقال[1]

حضرت خاکیؒ اپنے عہد کے اکابر علماء میں ممتاز تھے، مختلف قوی وجوہات کی بناء پر اُن کے بیان کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کے خاص مرید اور خلیفہ حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ کے "نور نامہ" میں حضرت "ریشی مولؒ" (ہردی بابا) کا کوئی ذکر نظر سے نہیں گزرا، البتہ اس میں بابا رجب دین کے مرید اور خلیفہ "ہردی ریشی" مدفون "ناگہ ناڑین" مٹن (اسلام آباد) کا ذکر موجود ہے۔[2] محمد اعظم دیدہ مری نے بابا رجب دینؒ کے خلیفہ شیخ ہردی ریشی کے

ساتھ حضرت ہردی ریشی اسلام آباد کا بھی ذکر کیا ہے[3] حسن شاہ کھویہامی نے بھی دونوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے[4] اور محی الدین مسکین نے انہی کی تقلید کی ہے۔[5]

حضرت ریشی مولؒ کے اسم گرامی سے متعلق اتنی متواتر شہادتیں تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے اسم گرامی کی بامعنی وضاحت اور توجیہہ پیش کی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت موصوف ابھی شکم مادر میں ساتویں مہینے ہی سے گزر رہے تھے جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے حضرت شیخ مخدوم حمزہؒ کو خواب میں آکر بتایا "کہ خدا' باغِ رُوحانیت کے ایک قد آور پودے کو دنیا میں لا رہا ہے، ان کے گھر جا کر اُن کی والدہ سے کہدو کہ اس کا نام "حیدر" رکھیں"۔ حضرت حمزہؒ نے حسب الحکم وہاں جا کر اُن کی والدہ سے ایسا ہی کرنے کی تاکید کی۔ پھر انکی پیدائش کے بعد اُن کا نام حیدر ہی رکھا گیا۔ لیکن یہ نام لوگوں کی زبان پر نہیں چڑھ سکا، فصاحت کی کمی کی وجہ سے لوگوں نے انہیں 'ہیدی' پھر ہردی کہنا شروع کیا اور یہی مشہور ہو گیا۔ یا للعجب!

یہ افسانہ "ہدایت المخلصین" نام کے ایک غیر مستند اور پُراز خرافات تذکرے میں درج ہے جو بلا خوف ربِ قہار کسی مُلّا بابا نے "حیدر بابا تلہ مُلی" سے منسوب کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ حیدر بابا کو "میر" بنا کے 'سادات میں شامل کر کے خود بھی سیّد بن جائے۔ خود ہمارے زمانہ میں بھی ناموس و عزت رسول اکرمؐ سے بے پرواہ مُلّا' اپنے آپ کو سیّد بناتے ہیں' حقیقت میں متقی تذکرہ نگار جیسے حضرت خاکیؒ اور حضرتِ نصیبؒ اور مورخین جیسے اعظمی، حسن اور کبیر' وغیرہ اس بات پر متفق ہیں کہ حیدر بابائے تلہ ملی نسباً سیّد نہیں تھے۔ حضرت خاکی نے اُن کا ذکر بہ حیثیت سیّد نہیں کیا ہے' بابا نصیب کے نور نامہ میں انکا طویل تذکرہ کیا گیا ہے' آٹھ صفحات میں اُن کا نام ستائیس بار" بابا حیدر" کے نام سے آیا ہے۔[6] "میر" اُن کے نام کے ساتھ نہ سابقاً درج ہے نہ لاحقاً۔ ملّا بابوں نے یہ تذکرہ مرتب کرتے وقت " بابا" کو پہلے میر حیدر گجراتی، پھر "تم تیلہ مولی" بنا کے سید کے طور پر پیش کر کے اپنے آپ کو سادات میں شامل کیا، یہ تذکرہ بے سر و پا کہانیوں

کا پشتارہ ہے، اسمیں اولیائے کرام کی عظمت اور مومنانہ زندگی کو غیر شرعی کاموں، اعتقادات اور باتوں کا مرتکب بنایا گیا ہے۔

یہاں بحث طلب امر یہ ہے کہ اگر حضرت ریشی مول ؒ کا نام "حیدر" تھا تو بابا رجب دین ؒ کے مرید و خلیفہ کو شیخ "ہردی" ریشی کیوں کہتے ہیں اور پھر اُن کا اصلی نام کیا رہا ہوگا۔ کیا یہ بھی حیدر سے بگڑتے بگڑتے ہیدی اور ہردی بن گیا۔ وہ حضرت ریشی مول سے بہت پہلے گزر چکے تھے، خود حضرت شیخ العالم کے کلام میں لفظ "حیدر" صحیح صورت میں موجود ہے۔[5] بات سیدھی اور واضح ہے کہ کشمیر میں لوگوں کے مقامی نام ہوا کرتے تھے۔ جیسے نُند، شونت، نوروز، سوزون، لول، وتر، لوڈ، نوس، زوپ، ژون، ہیدر، کوتر، جنگلی، رتنچ لل (محبت بھری) سنقر یا شنقار (باز۔ عقاب، تذکرہ نویسوں نے اسے شنکر بنادیا ہے) وغیرہ۔

اب ذرا "ہردی" لفظ کے معنی پر غور کیجئے گا، اس سے وہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے جس کی طرف آج تک کسی کا بھی ذہن نہیں گیا ہے۔ اگرچہ عربی زبان میں بھی ہو بہو یہی لفظ موجود ہے اور اس کے معنی ریشی مسلک سے ہم آہنگ بھی نظر آتے ہیں۔ باقی اور معنوں کے علاوہ عربی میں اس کے ایک معنی ہیں (کسی شئے پر) قابو پانا۔[8] ریشی طرز زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ بھی نکال سکتے تھے کہ "ہردی" وہ بزرگ ہے جس نے اپنے نفس پر قابو پایا ہو۔ لیکن یہ کھینچا تانی والی بات ہوگی۔ اس کے برعکس ریشی مسلک کے ابتدائی ماحول اور اس کے معمولی اور عمومی مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اکثر ریشی حضرات کے رائج الوقت سنسکرت زبان سے ماخوذ مقامی لئے گئے کشمیری نام تھے۔ جیسے نُند، زدگی، آوت، ارزن، پتی، سنت وغیرہ اسی طرح "ہردی" بھی بنیادی طور پر سنسکرت نام ہی ہے۔ اب اس کے مختلف معنوں کو غور سے ملاحظہ کیجئے گا:

हृदय (HRIDAY) یا HIRDAY صحیح ← یا 'ہردی' हरदी

(THE SEAT OF FACULTY OF THOUGHT & FEELING, THE HEART, SOUL, MIND, LIFE, BREAST, BOSOM, KNOWLEDGE, AFFECTION.

HRIDAY NIKET کام دیو کا لقب ہے۔ مطلب محبت کا دیوتا۔

HRIDAY - VAN = صاحب دل، شریف، مہربان، مونس، شفیق، دوست[9]

حضرت ہردی ریشی کی عملی زندگی کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہ سارے صفات اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ وہ من موہنے اور بہت خوبصورت بھی تھے۔ اسی لئے اُن کا نام "ہردی" رکھا گیا تھا۔ حاصل وہ اسم بامسمّٰی تھے۔ ایسے پیارے نام کو خوابوں کی بنیاد پر بگڑا ہوا ہیدی وغیرہ بنانا احساس کمتری کے شکار متعصب اور بیمار ذہن کی کھینچا تانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

سالِ ولادت

بُرہانِ قاطع کے طور پر قاعدہ کے تحت ضبط تحریر میں لائے گئے ریکارڈ کی بنیاد پر ہم اُن کی بالکل صحیح تاریخ پیدائش بقید وقت، یوم، تاریخ بیان نہیں کر سکتے ہیں۔ آجکل کے دور میں بھی اکثر والدین اپنے بچوں کی تاریخ پیدائش کا ریکارڈ رکھنے میں بالکل لاپرواہ ہیں۔ اور خاص طور پر آبادی کے غریب طبقوں کے لوگ۔ حضرت ریشی کے سال ولادت کے بارے میں تذکرہ اور تاریخ نویس خاموش ہیں۔ تاہم حضرت بابا داود خاکی اُس معاملہ میں کسی حد تک معاملہ کو سلجھا گئے ہیں۔ وہ اُن کا سال وفات "شیخِ دین بُود" بتاتے ہیں جو سنہ ۹۸۶ بنتا ہے اور فرماتے ہیں ؎

اوّلین روزِ مہ ذی قعدہ این سال بود!
ذکر گویاں نیم شب رفتہ بوصلِ ذوالجلال

بود باہشتاد سالش ہفت سال و چند ماہ
سال ہائے عمر اور اگر شماری با ہلال[10]

وہ اوّل ذیلقعدہ ۹۸۶ھ کو، ۷۷ سال چند ماہ کی عمر میں وفات پا گئے۔ اس حساب سے ان کا سالِ ولادت ۹۰۹ھ بنتا ہے۔ اس حد تک تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ مگر محی الدین مسکین نے انکی تاریخ ولادت ۲۹، ماہ رجب ۹۰۸ھ بیان کی ہے۔[11] لیکن اس کا ماخذ وہ بیان نہیں کرتے ہیں۔ دیگر عجوبہ پسند لوگوں نے نہ صرف تاریخ اور یوم، بلکہ زائچہ دیکھ کر طلوعِ آفتاب کے حساب سے وقت بھی تحریر کیا ہے۔

والدین وجائے سکونت

تاریخ اور تذکروں میں حضرت ریشیؒ کے والدین کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتی ہیں۔ زبانی روایت کے مطابق اُن کے والد گرامی کا اسم شریف عبداللہ تھا اور پیشہ کے لحاظ سے وہ لوہار (آہنگر) تھے۔ جیسا کہ محمد اعظم دیدہ مری کی اس اطلاع سے ظاہر ہوتا ہے "حضرت ہردی بابا ریشی مشہور کہ از قبیلۂ آہنگراں بود۔"[12] حضرت ریشی کی والدہ محترمہ کے نام وغیرہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی ہے سوائے اس کے کہ وہ اسلام آباد قصبہ سے تین چار کلومیٹر دور موضع وانتریہ میں پیدا ہوئی تھی۔ حضرت ریشی کا آبائی مسکن موضع "اینچ" (ANEACH) جسکو مغل گورنر اسلام خان نے اسلام آباد نام رکھا اور ڈوگرہ عہد حکومت میں اسے اننت ناگ بنایا گیا) سے ملحق ایک گاؤں ڈیرن (DARUN) میں تھا لیکن حضرت ریشی اپنے ننہیال وانتریہ میں پیدا ہوئے۔ عبداللہ آہنگر کا کسی تذکرے یا تاریخ میں جب نام بھی درج نہیں ہے، تو اُن کی زندگی کے بارے میں کوئی اطلاع تلاش کرنا، یا یونہی گھڑ لینا غیر تاریخی بات ہوگی۔

حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کی وفات کے سو، سوا سو سال بعد ریشی مسلک میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ ریشیوں میں ترکِ دنیا کے رجحانات بڑھتے گئے اور انہوں نے سولہویں صدی کے شروع ہی سے حکمران طبقہ کی لالچ، طمع، حرص، خود غرضی اور مستقل خانہ جنگیوں سے تنگ آ کر دنیا سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ شادی نہیں کرتے اور نہ گوشت

کھاتے اور سوکھی روٹی اور پہاڑ کے جنگلی پھل کھاکر گزر بسر کر لیتے۔ نورالدین اور اُن کے مریدوں کے برخلاف آخری دور کے ریشی زیادہ تر جاہل تھے اور اپنے مذہب کا انہیں کوئی علم نہ تھا۔[۱۳] اکثر ریشی حضرات لکھنا پڑھنا تو درکنار مکتب کی ابتدائی تعلیم سے بھی بالکل بے بہرہ تھے۔ لیکن وہ اپنی شدید نفس کشی، بے انتہا سادگی اور پرہیزگاری کی زندگی گزارتے تھے۔ اور معاشرتی مساوات کے اسلامی اصول کے عملی پیکر تھے۔ اُن کی مجلسوں میں ذات پات اور امیری اور غریبی کی بنیاد پر امتیازی سلوک کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لحاظ سے بھی انہوں نے اسلام کی ترویج و فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

ابتدائی زندگی

حضرت بڑدی بابا ریشی کی ابتدائی زندگی اور عمر شریف کے بہت سے حصے کے حالات بالکل پردۂ اخفا میں ہیں۔ اس بارے میں سب مستند تذکرے اور تاریخیں خاموش ہیں۔ اتنا تو معلوم ہے کہ آپ ایک پسماندہ گاؤں کے غریب لوہار کے گھر میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم سے بھی ناآشنا رہے، تھوڑا بڑا ہو کے باپ کی مدد کرتے تھے اور ان کی معمولی سی کھیتی بھی تھی جس میں وہ کاشتکاری کرتے تھے۔ رہن سہن بالکل عامیانہ اور لہذا سادہ اور قناعت پسندانہ تھا۔ غربت کی وجہ سے ہی اُن کے والدین اُن کو مکتب نہیں بھیج سکے۔ گھر کا سارا ماحول زاہدانہ تھا، اور اسی لیے "آں جناب در عنفوان شباب ذوق خدا پرستی بہم رسانده مشغول به طریقۂ ریشیان شده اُویسی بود که بظاہر بکسی انتساب نه نموده صائم الدهر و قائم اللیل تا آخر عمر گزرانیده وخوارق بسیار از ایشان بظهور می رسید۔ در تذکرۂ شعرائے کشمیر ہم مظهر کرامات بود ـــــ حضرت شہاب الدین پر بیماری کرده۔"[۱۴]

ظاہر ہے کہ وہ کسی مشہور ریشی سے پہلے ریشی مسلک کے زیر اثر یکسوئی کے ساتھ ریاضت شاقہ میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے ترک لذات کیا، نکاح سے بھی مجتنب رہے۔ تجرید و تفرید کی زندگی اپنے اوپر لازم کرکے ذات خداوندی کی یک رنگی اور نیرنگی میں محو و متفکر رہنے لگے۔ کبھی کبھی غلبۂ حال سے مست ہو کر دنیا تک ذات حق کی ... میں مستغرق

ہوکر سماج کے ماحول سے مستغنی اور بے خبر ہو جاتے تھے۔

مرشد کی خدمت میں

حضرت ہردی بابا مدت تک بغیر پیر و مرشد راہبر کے تجرید و تفرید میں ہی عبادات و ریاضات میں مشغول رہے۔ ایسے لوگوں کو تصوف کی اصطلاح میں اویسی کہا جاتا ہے۔ لیکن آخر کار تائید ربانی سے "بصحبت جناب حضرت مخدوم العرفا شیخ حمزہؒ رسید و بہرہ اندوز فوائد کلی گردید، مشہور است کہ بہ حکم شریعت بہ اشارہ حضرت مخدومؒ گوشت خورد و راہ بہ تحقیق برد، بلکہ بواسطہ حضرت مخدومؒ داخل طریقہ سہروردیہ ہم شد و شجرہ پیران گرفت"[15] بابا داود مشکواتی نے حضرت شیخ نور الدینؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت میر محمد ہمدانیؒ سے بیعت ہوتے ہی حضرت شیخ نے "طریق رہبانیہ و برہمنیہ واہی ساخت"[16] اسی طرح حضرت ہردی بابا ریشی اپنی روحانی ترقی کی تکمیل کے لئے طالب حقیقی بن کر حضرت مخدومؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے حال (یعنی بلا مرشد ریشی مسلک میں رہنے) کی درستی کر کے ان سے شجرہ سلسلہ سہروردیہ حاصل کر کے اس کے توسل سے حضرت رسالت مآبؐ سے اپنی نسبت پکی اور مکمل کرلی۔ حضرت داود خاکی فرماتے ہیں ؎

حال خود تصحیح کردہ سلسلہ نامہ گرفت

از جناب شیخ حمزہؒ تا بہ سید جلال[17]

اس اہم واقعہ کے بعد حضرت ہردی بابا ریشی نے حضرت شیخ حمزہؒ کے حکم سے گوشت بھی کھایا اور رہبانیت کے طور طریقوں سے الگ ہو گئے[18] یہی مطلب ہے "حال خود تصحیح کردہ" کا پھر شجرہ سلسلہ اپنے مرشد سے حاصل کیا جس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت خاکی فرماتے ہیں "مریداں را شجرہ پیراں دادن یکی از سنن اولیا است، مرید را ہم باید کہ بعد از ادائی نماز خفتن شجرہ پیراں بخواند ___ نام ہائے اوستادان و راویان حدیث را، خصوصاً سلسلاً تا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بیاموزند و آن را نوشتہ با خود می دارند

ویادمی گیرند ـــ طریقہ مشایخ این است کہ کسی کہ تلقین ذکر ازوے گرفتہ باشد وپس اوبیعت کردہ بدیہی کہ درباب تلقین واردشدہ باشد ازو بشنوند و نام پیران و آلم راویان سلسلہ را تا پیغمبر بیاموزند و پیش خود نوشتہ می دارند ویادمی گیرند و ہمیشہ می خوانند و مستحق برکاتِ ایشاں می باشند و آں مکتوب را سلسلہ نامۂ مشایخ و شجرۂ پیراں می نامیدند[19]

اس کے بعد حسبِ دستور حضرت ہردی بابا حضرت مخدوم سے تلقین وارشادِ ذکر و وظائف سے مستفید ہوگئے۔ پھر اپنے مرشد حضرت مخدومؒ کے دستِ مبارک سے انہیں چند تبرکات عطا ہوتے ہیں جنکا ذکر حضرت داود خاکیؒ اسطرح کرتے ہیں ؎

یک عمامہ با کلاہ ازوے تبرک یافتہ

نیز یک سجادہ کاں بود از پشمِ جمال[20]

(انہوں نے اُن (مرشد) سے ایک دستار، ایک کلاہ اور ایک جانماز (اونٹ کے اون کی بنی ہوئی) بطور تبرک حاصل کئے)

حضرت بابا داود خاکیؒ کے اس واضح بیان سے "ہدایت المخلصین" میں درج تمام بے سروپا افسانوں کی تغلیط و تردید خود بخود ہو جاتی ہے۔

کسب و کار

ریشیان کرام اگرچہ اپنی ابتدائی زندگی میں رہبانیت کی طرف رجحان رکھتے تھے، لیکن مرشد ہادی سے تربیت پانے اور سلسلہ میں باقاعدہ شمولیت کے بعد انہوں نے اُن تمام کاموں سے اجتناب کیا جن کا شریعت میں کوئی جواز نہیں تھا۔ حضرت خاکیؒ اور حضرت بابا نصیبؒ اور بابا داود مشکواتیؒ کی تصنیفات میں ریشیان کرام کے رزق حلال کے حصول کے لئے کسب و ہنر اور کام کرنے سے متعلق بہت سی شہادتیں ملتی ہیں۔ پڑھے لکھے ریشی، مدرسی، کتابت خصوصاً کتابت قرآن و حدیث، طبابت اور ہیچو قسم کے دیگر پیشہ اپنا کے روزی حاصل کرتے تھے۔ باقی ریشی حضرات کاشتکاری، زراعت

پیشہ، معمار، نجار، تھے۔ کچھ آہنگر تھے اور کچھ حضرات کمہار، نداف بھی تھے اور کچھ دکانداری سے اپنا رزق کماتے تھے۔ لیکن وہ خصوصیت کے ساتھ قناعت پسند اور کفایت شعار تھے۔ اسی لئے وہ دنیا اور دنیا والوں کے محتاج نہیں بنے۔

حضرت ہردی بابا آبائی طور پر آہنگر تھے اور قدرتی طور پر اس ہنر سے واقفیت رکھتے تھے لیکن انہوں نے اپنی خصوصی توجہ کاشت کاری اور زراعت کی طرف لگادی۔ وہ اسی پیشہ سے اپنا اور اپنے گھر کا گزارہ چلاتے تھے۔ اپنی زمین پر خود کام کرتے تھے۔ نذر ونیاز اور خیرات وصدقہ کبھی قبول نہیں کرتے تھے۔ محنت شاقہ سے رزق حلال حاصل کرکے خود بھی کھاتے تھے۔ محتاجوں، مساکین اور ناداروں کو بھی کھلاتے تھے اور ہر درجہ کے مسافروں کے لئے باقاعدہ لنگر چلاتے تھے، مہمانوں کی خدمت کو اپنا شعار بنایا تھا، ان کی خاطر تواضع کرنے میں وہ زبردست فیاض تھے۔ اکثر مشائخ اور ریشی لوگوں کو وہ کھیت پر کام کرتے ہوئے ہی مل جاتے تھے۔ وہ خلوص قلب کے ساتھ مومنِ صادق تھے۔ اسی لئے اُن کے قول وعمل میں بالکل ہم آہنگی تھی۔ حضرت خاکیؔ نے اُن کے شغلِ کاشتکاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

کردنِ کشت وزراعت بود اکثر کارِ او
احتیاطِ او بسی بودہ است در اکلِ حلال ؎[21]

لباس

حضرت ہردی بابا لباس کے معاملے میں بھی کفایت شعار، سادگی اور صفائی پسند تھے۔ آرائش وزیب وزینت کے دلدادہ نہیں تھے۔ موٹا کھردرا کپڑا پسند کرتے تھے اور عام طور پر کشمیری اونی پٹو کا پھیرن (PHERAN) کشمیری سوت سے بنی ہوئی کھدر کا پائجامہ اور کشمیری اونی لوئی (چادر) استعمال کرتے تھے۔ سرمبارک پر ہلکی اونی چادر کی پگڑی یعنی "منڈاسہ" بھی باندھتے تھے۔ پاؤں میں، موزہ مُسیّ یا جوتے پہننے کے پابند

ہنیں تھے۔ کبھی کبھی عام دہاقین کی طرح ننگے پاؤں چلتے تھے اور کبھی گھاس کا بنا ہوا خالص کشمیری چپل نما جوتا "پلہور" بھی پہنتے تھے۔ حضرت شاکی اسی بارے میں فرماتے ہیں ؎

از قناعت تحریکِ زینت و در لباسش تحفہ بود
پوشش او صوف بود مہر حق باری تعالیٰ
سوئے کفش دوزد و سر موزہ اش قیدی ہبود
گہ برفتی پا برہنہ گہ زکاہ کردی نعال ؎[۲۲]

وہ اولیٰ درجہ کا "نفی خاطر" یعنی نفس کے خلاف جہاد میں مشغول رہے اور ریاضات شاقہ سے شہوات و حظوظ اور خواہشات نفسانی کو زیر اور مغلوب کیا۔ وہ زاہد مرتاض تھے۔ وہ عمر بھر روزانہ غسل کے پابند رہے چاہے کڑاکے کی سردی ہو یا گرمی، وہ ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے نہاتے تھے۔ بے حد اقناعت پسند تھے۔



اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کی عظمت و بزرگی اور فضیلت و امتیاز کرامات اور خوارق عادات کی نمائش کی محتاج نہیں ہوتی ہیں۔ اگر وہ کبھی شدید مجبوری کے تحت ایسا کوئی کام کرتے بھی ہیں تو اس کا مقصد بھی صرف اللہ کی حقانیت اور صداقت کو ثابت کرنا ہوتا ہے کھیل تماشہ نہیں۔ جیسا کہ اکثر خام خیالی اعتقاد والوں نے سمجھ رکھا ہے۔ ان کی سب سے بڑی کرامت شریعت کی استقامت سے پیروی میں ہوتی ہے۔
حضرت ہردی بابا کی اہم ترین کرامت تو یہی تھی کہ وہ مکمل استقامت اور تقویٰ تام کے ساتھ اپنے قول و عمل سے خالق کائنات کی رضا جوئی میں ہر وہ کام کرتے تھے جو رب کائنات کو پسند ہے۔ وہ کم خور، کم خواب اور کم گفتار تھے۔ اُن کی خواہشات اور دُنیاوی اُمیدیں بہت قلیل تھیں لیکن اُن کے رُوحانی مقاصد جلیل اور اُن کی منزل عظیم تھی۔ وہ حدیثِ نبوی "المؤمن ینظر بنور اللہ" کے مصداق اللہ کے نور سے دیکھتے تھے۔

ران کا قلب مبارک منظر ربانی تھا۔ اور ان کا چہرہ مبارک نورِ حق سے تجلی تھا۔ اسی لئے حضرت بابا داود خاکیؒ نے تحریر فرمایا ہے ؎

ہست معلوم ہمہ یاراں کہ او را دیدہ اند

در رخِ نیکوئی او از نورِ حق بود اشتعال [۲۳]

ظاہری علم سے اگرچہ بے بہرہ تھے، لیکن قدرت کی طرف سے ذہنِ رسا کے ساتھ نہایت مضبوط قوتِ حافظہ پایا تھا۔ قرآن مجید کی طویل سورتیں، طویل دعائیں جیسے "حرز یمانی"۔ اوراد و وظائف اندر جمع ہوتا اوراد فتحیہ انہیں زبانی یاد تھیں۔ حضرت خاکیؒ نے اس کا ذکر مجملاً یوں کیا ہے۔ ؎

ہر صباحے سال ہا اوراد فتحیہ بخواند

این یکی بر راستی اعتقادِ او ست دال [۲۴]

حالات اور واقعات کی یادداشت پر بھی انہیں زبردست عبور حاصل تھا۔ تعبیرِ رؤیا میں بصیرت کے ساتھ ماہر تھے ؎

علمِ تعبیر و وقایع نیک می دانست و بود

اندریں فن اندریں اوقات مثلِ دانیال [۲۵]

سلوک و معرفت اور اسرار و رموزِ تصوف پر، خصوصاً "توحید خداوندی" اور "فنا" جیسے اہم اسرار پر جب کبھی مجلس میں گفتگو اور بحث چلتی تھی، تو علماء اور فضلا ان کے سامنے طفلِ ابجد خواں نظر آتے تھے۔ اس کا اعتراف بابا داود خاکیؒ جیسے علامہ نے بھی کیا ہے ؎

چوں زباں بکشودی اندر بحثِ توحید و فنا

عالمانِ ظاہری ماندند از وے گنگ و لال [۲۶]

یہ تو شرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے۔ حضرت ریشیؒ حسنِ خلق میں یکتا تھے۔ صاحب کشف و کرامت تھے، کشف ارواح میں انہیں کمال حاصل تھا۔ کبھی کبھی ضرورتاً

اپنے مخلصین کو اہم واقعات سے باخبر کرتے تھے۔[27] وہ مستجاب الدعا تھے۔ اُن کی دعاؤں سے لاتعداد روحانی اور جسمانی مریضوں نے شفا پائی۔ وقت کے حکمران سلطان علی شاہ چک اور اُن کا فرزند یوسف شاہ چک دونوں حضرت ہردی بابا کی خدمتِ اقدس میں دُعائے خیر اور شفائے مرض کے لئے حاضر ہو گئے۔ اُن ہی کی بابرکت دعا سے علی شاہ چک برص کی بدنما بیماری سے نجات پا گیا۔ اور باپ بیٹے دونوں اُن کی خدمت میں فیض و برکات سے مستفید ہوتے رہے۔ حضرت خاکی نے بھی اس واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لایا ہے ۔

مستجاب الدعوتے بودہ است و حاصل گشتہ است

مخلصاں را چند مقصودات ازین فرخندہ فال

ہست مشہورِ ہمہ انساں کہ صحت یافتند

بیشتر جا از دُعائیش صاحبانِ اعتدال

والیٔ دوراں علی شاہ دستدار صالحان

پورِ اُو شہزادہ یوسف شاہ با جاہ و جلال

ہر دو ایشان صحبتِ این پیر را دریافتند

ہر دو کردندی دعائے خیر خواندے سوال

اُو دُعا گفتے و ایشان را مبارک آمدی

ہمدریں اشفاقِ ایشان کردازین جا ارتحال[28]

تبلیغ دین

حضرت ہردی بابا نے اپنی زندگی میں لاتعداد لوگوں کے نفس کا تزکیہ اور قلوب کا تصفیہ کیا۔ انکے وعظ و تبلیغ میں خلوص، تاثیر ہمدردی اور نورِ ایمان و بصیرت تھا۔ بہت سے لوگوں نے انکے وعظ و نصیحت سے متاثر ہو کر برائی، بدی اور فسق و فجور سے توبہ کر کے نیکی، تقویٰ شعاری اور دینِ حق کو قلبِ صمیم سے قبول کیا۔ اکثر اُن کے اطاعت شعار مرید

بن کے سلوک و معرفت میں اعلیٰ مقامات پر پہنچے ۔

طالبان صالح شد ندا ز وعظ با تاثیر او

وز دعایش گشتہ بسیار اہلِ فقر اصحاب حال [۲۹]

حضرت ریشی صاحب نظرِ مومن تھے۔ انہوں نے اپنی نگاہ کیمیا اثر سے بہت سے لوگوں کی تقدیر بدل ڈالی۔ ایک شخص صالح آہنگر (ان کا رشتہ دار) ایکدن اُن سے ملنے آئے حضرت ریشی نے اس پر نظرِ کیمیا تاثیر ڈالدی۔ وہ پھر بحرِ سلوک و معرفت کے غواص بن گئے۔[۳۰]

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں حضرت ریشی کی مساعی جمیلہ' اور خدمات جلیلہ کا اعتراف انکے معاصرین نے بھی کھُلے دل سے کر کے ان کی بہت تعریف و توصیف کی ہے۔ وہ اپنی محنتِ شاقہ سے حاصل کی ہوئی حلال کمائی سے متقی کاتبوں اور خطاطوں کو فیاضانہ اجرت دے کر قرآن پاک کے نسخے تحریر کروا کے اطراف واکناف کی مساجد اور خانقاہوں میں تلاوت کے لئے رکھواتے تھے[۳۱] عام اور غریب لوگوں کو ہدیہ اور صدقہ کرتے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ قرآن کریم کی تعلیم عام ہو اور لوگ اس نسخہ کیمیا سے شفایاب اور فیض یاب ہو کر خیرِ دارین حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ قرآن و حدیث اور دینی علوم کی درس و تدریس کا انتظام خود اپنی آمدنی سے کرواتے تھے۔ لوگوں کو شریعت حقہ کی مکمل پیروی پر اُبھارتے تھے اور اشاعتِ شریعت پر خاص توجہ کے ساتھ زور دیتے تھے۔ خود اپنی نگرانی میں' اور اپنے مریدوں اور مخلصوں کے ذریعہ بھی مسجدیں اور خانقاہیں مدرسے اور مسافر خانے تعمیر کرواتے تھے[۳۲] والدین کو اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

رفاہِ عام کے کام انجام دینا' لوگوں کے دُکھ درد میں شریک ہو کر مونس و غم خوار بننا' اور اُن کی بھرپور مدد کرتا ادلیا' اللہ کی خصوصیت رہی ہے۔ حضرت ریشی ان اہم کاموں

میں بھی امتیازی شان رکھتے تھے میوہ دار اور سایہ دار درخت لگانا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔

کرد مسجد ہا بنا و نیز مہمان خانہ ہا

مقبرے ہم خوش مرتب کردہ بر یادِ مآل

دادہ مصحف ہا بہ وقف و خیر جاری دوست داشت

اولاً خود خیر کردی پس شدی بر غیر دال [۲۴۳]

ریشی نامۂ بابا داؤد خاکیؒ

حضرت ہردی بابا ریشی کی حیات مبارک کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جو کچھ بھی مستند معلومات ملتی ہیں وہ حضرت داؤد خاکیؒ کے ریشی نامہ پر مبنی ہیں جسے غلطی سے لوگوں نے قصیدۂ لامیہ یا قصیدہ غسلیہ کا نام دیا ہے۔ حضرت خاکیؒ کے بہم کردہ معلومات بھی زیادہ تر حضرت ریشی کی زندگی کے اُس دور کے بارے میں ہیں جب وہ باقاعدہ حضرت مخدوم کی مریدی میں شامل ہو کر سہروردیہ سلسلے سے منسلک ہو گئے۔ حضرت خاکیؒ اُن کے پیر بھائی تھے لیکن عمر میں بزرگ ہونے کی وجہ سے وہ حضرت ریشی کا احترام پیر صحبت کے طور پر کرتے تھے۔

حضرت ریشی جب حضرت مخدوم سے بیعت نہیں ہوئے تھے، اُن پر لوگ عجیب قسم کی تہمتیں اور الزام تراشتے تھے۔ ایسی باتیں اُن کی وفات کے بعد بھی چلتی رہیں۔ پیر حسن کھوئیہامی کے اس بیان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ "شیخ بابا داؤد خاکیؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے جو اُن (حضرت ریشیؒ) کی طرف شریعت سے لاپرواہ ہونے، ممنوع چیزوں کو استعمال کرنے، گوشت نہ کھانے، نماز جمعہ اور نماز با جماعت کی پابندی نہ کرنے کی باتیں لگائی ہیں یہ من گھڑت اور بہتان ہیں، اگر ابتداء میں مستی اور حال کے غلبہ کے باعث کوئی اس قسم کی بات ظہور میں آئی ہو تو عجب نہیں لیکن جب مشایخ کے ساتھ اُن کی صحبت ہوئی تو انہوں نے کسی سنت کو نہیں چھوڑا۔" [۲۴۴]

جب حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے ریشی نامہ منظوم تحریر فرمایا تو اس میں حضرت ہردی بابا کا ذکر کرتے ہوئے ان کے خلاف تراشے گئے تمام غلط الزامات اور من گھڑت افواہوں کی تردید کرتے ہوئے ان کی حیات مبارکہ کے بارے میں صحیح معلومات واضح ترین انداز میں شایع کیے۔

حضرت خاکیؒ کے اس زیر بحث ریشی نامہ کے اشعار متعلقہ حضرت ریشی کے چند اقتباسات یہاں بطور تبرک پیش کیے جاتے ہیں ؎

گر تو از خاصانِ او تعریفِ او نشنیدۂ

بشنو این وصفش کہ دارد بر فواید اشتمال

مومنی اہلِ صلاح و عارفِ باللہ بود

دوستدارِ مصطفیٰؐ و چار یار و صحب و آل

با امامان و مشائخ معتقد بودہ بصدق

ذکر گفتی ورد میخواندی ہمیشہ ماہ و سال

ہر صباحی سال ہا اوراد فتحیہ بخواند

این یکی بر راستیٔ اعتقاد او ست دال

با جماعت فرض ہا کردی ادا در پنج وقت

نیز سُنت ہا ہمہ کردی ادا با اتصال

دایما کردی نماز جمعہ و عیدین ادا

ترکِ این سنت نکردی بی ضرورت ہیچ حال

نفل ہا در روز و شب کردی ادا خواندی دعا

در مناجاتِ الٰہی کردی از دل ابتہال

ذکرہا می گفت اما اکثر اندر ذکرِ دل

پاس داریٔ نفس را بس نمودی اشتغال

هوش در دم بود شش، خلوت میانِ انجمن
استقامت بودش اندر نفیٔ خاطر لایزال

تن بخلق و جاں بہ خالق داشتی زیرا کہ او
دم گرفتہ دمبدم می کرد ذکرِ قلب و بال

سال ہا حق را عبادت ہائے گوناگون کرد
تا شُد اندر طاعتِ حق قدِ او مانندِ دال

تا ز فضلِ حق تعالیٰ ... اندر جہاد
یافت کُشتہ مارِ نفس رہ بامرادِ خود وصال[۳۵]

حضرت ہردی بابا کا روزِ گار خورشید مبین کی طرح تابناک ہے، اگر شپرہ چشم نہیں دیکھ سکے، تو خورشید ضیا بار کا کیا گناہ ہے۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ کی عینی شہادت اور تصدیق تمام شکوک و شبہات سے بالاتر ہے۔

مُلّا شاہ الیقی نے اپنی منظوم تصنیف "ریاض الاسلام" (تاریخ تصنیف ۱۱۸۶ھ) میں حضرت ہردی بابا ریشیؒ کا ذکر مبارک کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

عجب ریشیٔ بود صاحب صفا — قدم بر قدم بارسولِ خدا
شُدہ تربیت آن معارف مقام — بروحانیت زانبیائے کرام
کراماتِ راذاتِ او مظہری — فیوضاتِ حق را عجب مصدری
بسر بُردہ آن ریشیٔ حق مقام — بہ تجرید و تفرید عمرِ تمام
چو علمِ لدُنی بہ او دادہ حق — ز ارباب توحید بردہ سبق
ہمہ عمرِ او صائم الدہر بود — دگر قائم اللیل و صاحب شہود
چو عمری بطاعت کردہ بسر — سوی شیخ گشتش خدا راہبر
چو در خدمتِ شیخ حمزہؒ رسید — ز دستش یکی جام عرفاں کشید

زمحبوبِ عالم کمالات یافت	ازان قطبِ آفاق حالات یافت
زالطافِ آن قدوۂ اہلِ حال	فزودش کمالِ دگر بر کمال
زمخدومؒ شد داخلِ سلسلہ	درین سلسلہ او شدہ بکدلہ
شدہ سہروردیہ انجام کار	ولایت پناہ و کرامت شعار

سالِ وفات

حضرت ہردی بابا ریشیؒ ۹۸۹ھ (۱۵۷۹ء) میں اوّلِ ماہِ ذی قعدہ کو، ۷۷ سال چند ماہ کی عمر گزار کر آخری وقت میں کھانسی کی بیماری سے کمزور ہوتے گئے اور اسی بیماری میں اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف انتقال فرماگئے اور آپ کا مزارِ شریف قصبۂ اسلام آباد میں واقع ہے۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے انکی تاریخِ وفات لکھی ہے ۔

شیخ دین بود اندریں کشمیر اندر عہدِ خویش

بہرِ فوتش "شیخ دین بود" آمدہ تاریخ سال

اوّلین روزِ مہِ ذی قعدہ این سال بود

ذکر گویاں نیم شب رفتہ مرض بودش سعال[۳۶]

حضرت ریشیؒ کے خلفاء

حضرت ہردی بابا نے لاتعداد بندگانِ خدا کی تربیت فرمائی اور اکثر ان کے خاص مرید اور خلیفہ بھی ہوئے۔ یہاں چند چیدہ چیدہ خلفاء کے اسمائے گرامی مع مختصر ضروری اندراجات، درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ شیخ محمد سعید فرزند حضرت بابا داؤد خاکیؒ مدفن آستانہ حضرت ریشی اسلام آباد[۳۷]

۲۔ بابا نمی ریشی۔ مدفن بہ طرف سابقہ عیدگاہ اسلام آباد[۳۸]

۳۔ بدرالدین ریشی مدفن در موضع ڈبالہ گام اسلام آباد[۳۹]

۴۔ اللہ داد ریشی مدفن در بیجبہارا[۴۰]

۵۔ اہلہ ریشی، موضع سرہامہ (کھرم) کے باشندے تھے، پہلے ہردی بابا ریشی سے پھر خواجہ مسعود پانپوری سے سلوک و معرفت کی تعلیم پائی۔[41]

۶۔ نونی ریشی، مدفن کریوہ اسلام آباد[42]

۷۔ زونی ریشی مدفون کریوہ اسلام آباد[43]

۸۔ شنگ ریشی دوم مدفون کریوہ اسلام آباد[44]

۹۔ لدہ ریشی مدفون لرگام ترال (پرگنہ اولر)[45]

۱۰۔ زیتی ریشی دوم پسر اور شنگ ریشی دوم[46]

۱۱۔ خواجہ مسعود پانپوری، پانپور[47]

۱۲۔ بابا صالح آہنگر[48]

۱۳۔ دولت شاہ، یہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے لیکن حضرت ہردی بابا کو پیر صحبت مانتے تھے۔[49]

۱۴۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ گرچہ حضرت ریشی سے اگرچہ چھوٹے تھے لیکن حضرت مخدومؒ سے حصول خلافت میں سابقون الاولین میں تھے۔ اس لحاظ سے ممتاز اور صاحب فضیلت تھے حضرت ریشی کو عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے اور نہایت انکساری کی وجہ سے اپنا بزرگ مانتے تھے، جبکہ حقیقتاً وہ حضرت ریشی کے پیر بھائی تھے۔ حضرت ہردی بابا کی سوانح اور حالات لکھنے والوں نے ان کے بعض دیگر خلفاء کے نام تحریر کئے ہیں۔ مستند تذکروں اور معتبر تاریخی کتب میں ان کا کوئی ذکر بہ حیثیت خلفائے ہردی بابا نہیں ملتا ہے۔ لہذا ان کا ذکر چھوڑ دیا گیا۔

ماخذ

۱۔ ریشی نامہ لا مینا ملا حم بابا داؤد خاکی، نسخہ خطی مملوکہ مقالہ نگار (تحریر شدہ ۱۲۷۹ھ)

۲۔ سلسلۃ الذہب از ملا بہاء الدین متو، نسخہ خطی مملوکہ مقالہ نگار (ناقص الآخر)

۳۔ شرح ریشنامہ از بابا داؤد خاکی، نسخۂ خطی مملوکہ مقالہ نگار۔
۴۔ ہدایت المخلصین، منسوب بہ حیدر بابا کی تلہ ملی، دو نسخۂ خطی مملوکہ مقالہ نگار (کتابت شدہ ۱۰۱۶ھ و نسخۂ دیگر ۱۱۹۹ھ)
۵۔ نورنامۂ بابا النصیب نسخۂ خطی ریسرچ اینڈ پبلی کیشن محکمہ، زیر نمبر ۷۹۵۔
۶۔ تاریخ کشمیر اعظمی، محمد اعظم دیدہ مری، چھاپ غلام محمد نور محمد ۱۳۵۵ھ
۷۔ تاریخ اعظمی محمد اعظم دیدہ مری (اردو ترجمہ از منشی اشرف علی مدرس مدرسۂ دہلی، چھاپ ۱۸۴۹ء دہلی) زیروکس کاپی حاصل کردہ از خدا بخش لائبریری پٹنہ،
۸۔ تاریخ حسن، جلد سوم "تذکرۂ اولیائے کشمیر" چھاپ غلام محمد نور محمد ۱۹۶۰ء
۹۔ تاریخ کبیر کشمیری محی الدین مسکین مطبوعہ امرتسر بار دوم ۱۳۲۱ھ
۱۰۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں، پروفیسر محب الحسن (اردو ترجمہ) ۱۹۶۷ء
۱۱۔ حیات شیخ بابا داود خاکی از محمد طیب صدیقی ۱۹۶۷ء
۱۲. A DICTIONERY OF URDU, CLASSICAL HINDI AND ENGLISH, BY JOHN. T. PLATTS. OXFORD UNIVERSITY PRESS. LONDON 1974.
۱۳۔ کلیات شیخ العالم (موتی لال ساقی) مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر
۱۴۔ بیان اللسان (عربی اردو لغت) ۱۵۔ اسرار الابرار۔ مشکواتی، نسخۂ خطی مملوکہ مقالہ نگار۔

حوالہ جات

۱؎ ریشی نامہ لاھیہ ص ۱ ۲؎ نورنامہ ص ۲۹۴، ص ۲۹۰

۳؎ تاریخ اعظمی ص ۱۰۴، ص ۱۰۵ ۴؎ تذکرہ اولیائے کشمیر (حسن) ص ۱۴۴، ص ۱۷۲

۵؎ تاریخ کبیر ص ۱۱۱، ص ۱۲۴ ۶؎ نورنامہ ص ۳۰۶ سے ص ۳۱۳ تک

۷ کلیات شیخ العالمؒ ص ۔ ۸ بیان اللسان ص ۸۴۹

۹ ڈکشنری از ولیئس ص ۲۲۵ ۱۰ ریشی نامہ لامیہ ص ۲۲

۱۱ تاریخ کبیر ص ۱۳۴ ۱۲ تاریخ اعظمی ص ۱۰۶ ، ص ۱۰۷ تاریخ کبیر ص ۱۲۶

۱۳ کشمیر سلاطین کے عہد میں ص ۲۵۲ ، ص ۲۵۳ ۱۴ تاریخ اعظمی ص ۱۰۶

۱۵ تاریخ اعظمی ص ۱۰۶ ۱۶ اسرار الابرار خیلی میلوکر مقالہ نگار تا قصص الآخر

۱۷ ریشی نامۂ لامیہ ص ۷ ۱۸ تاریخ اعظمی ص ۱۰۶ و ریشی نامۂ لامیہ ص ۴

۱۹ شرح ریشی نامۂ لامیہ ص ۷۵-۷۶ ۲۰ ریشی نامہ لامیہ ص ۷

۲۱ ایضاً ص ۹ ۲۲ ایضاً ص ۹

۲۳ ایضاً ص ۱۵ ۲۴ ایضاً ص ۲

۲۵ ایضاً ص ۱۶ ۲۶ ایضاً ص ۱۸

۲۷-۲۸ ریشی نامہ لامیہ ص ۲۰ ، ص ۲۱ ۲۹ ایضاً ص ۲۰

۳۰ تاریخ کبیر ص ۱۲۶ ۳۱ ریشی نامہ لامیہ ص ۹

۳۲ ایضاً ص ۹ ۳۳ ایضاً ص ۹

۳۴ تذکرۃ الاولیاء حسن ص ۱۷۳ ۳۵ ریشی نامۂ لامیہ ص ۱ سے ص ۱۵ تک

۳۶ ایضاً ص ۲۱ و ص ۲۲ ۳۷

۳۸ تاریخ حسن ص ۱۸۲ ، کبیر ص ۱۳۲ ۳۹ تاریخ کبیر ص ۱۳۱

۴۰ تاریخ حسن ص ۱۸۲ ، کبیر ص ۱۳۴ ۴۱ تاریخ حسن ص ۱۷۹

۴۲ تاریخ حسن ص ۱۹۲ ۴۳ ایضاً ص ۱۹۲ کبیر ص ۱۳۱

۴۴ ایضاً ص ۱۹۲ کبیر ص ۱۳۱ ۴۵ تاریخ حسن ص $\frac{۱۸۲}{۱۸۳}$ ، کبیر ص ۱۳۱

۴۶ تاریخ حسن ص ۱۸۳ ، کبیر ص ۱۳۲ ۴۷ تاریخ حسن ص ۲۵۰ (تذکرۂ اولیائے کشمیر)

۴۸ تاریخ کبیر ص ۱۲۶ ۴۹ تاریخ حسن تذکرہ اولیائے کشمیر ص ۲۵۲ و ص ۲۵۴ .



رشید تاثیر

حضرت بابا داؤد خاکیؒ



حضرت بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ نہ صرف کشمیر کے اولیائے کرام میں بلند مرتبہ صاحبِ حال وقال صوفی بزرگ گذرے ہیں بلکہ کشمیری قوم کے سرکردہ اور ممتاز مصنفین میں بلند قدوقامت انشاپردازوں اور شعرا کے امام بھی ہیں۔ علم وفضل اور مسائل دینی میں اجتہاد، سخت ریاضت، تحقیق، جدوجہد، غور وفکر سے نئے انکشافات اور نئی باتیں پیدا کرنے اور حقائق تلاش کرنے میں یدِ طولیٰ کے امیر زمان تسلیم کئے گئے ہیں۔ اس نسبت سے آپ کو بالخصوص فرزندانِ کشمیر اور بالعموم اسلامیانِ عالم ابو حنیفہ ثانی کے لقب سے پکارتے ہیں۔ آپ معرفت الٰہی کو سمجھانے میں بحرِ بیکراں کے مالک اور اہل سنت والجماعت کے ایسے بے تیغ سپاہی ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اسلامی اقدار، ثقافت، تہذیب وتمدن اور روحانی منازل کے فروغ وتبلیغ میں آپ کی

بے مثال درویشانہ رہنمائی اور لازوال خدمات کشمیر کے ذرہ ذرہ سے چشمہ نور کے مانند عیاں ہے۔

آپ ۹۰۸ھ میں سرینگر کے محلہ کلاشپورہ[1] کے معروف گنائی[2] خاندان میں تولد ہوئے بعض مورخین نے آپ کی تاریخ پیدائش ۹۲۸ھ لکھی ہے جو تاریخی واقعات کے لحاظ سے درست نہیں ہے البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ جب آپ شنگہ پال کی مسجد میں چلہ کشی میں مصروف تھے آپ چالیس[3] سال کے تھے۔ تذکرہ اولیائے کشمیر کا مصنف پیر غلام حسن کھوہامی آپ کے حوالے سے رقم طراز ہے :

"انہی دنوں میرزا حیدر، سلطان سکندر کاشغری کی لشکر ساتھ لیکر کشمیر پہنچا۔ کوہ شنگہ پال کے دامن میں کیمپ لگایا اور کشمیریوں کے ساتھ لڑتا رہا حضرت خاکی[4] کو اس خطرناک واقعہ کی خبر تک نہیں ہوئی۔"

مرزا حیدر گورگانی کشمیر پر اپنے پہلے حملہ کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے :-

"فصل خزان کے وسط میں ماہ جمادی الثانی ۹۳۹ھ (بمطابق ۱۵۳۲ء) درہ کشمیر سے جس کا نام ذوجیلا ہے حدود کشمیر میں داخل ہوا"

اس حملے میں مرزا حیدر گورگانی نے صرف چھ ماہ کشمیر میں قیام کیا اور پھر واپس لہیہ (لداخ) چلا گیا جہاں سلطان سعید خان والی کاشغر شدید سردی کے باعث دمہ کے عارضہ میں مبتلا

---

[1] کشمیر کے ہندو حکمرانوں کے زمانے میں کیلاش مندر کی نسبت سے کیلاش پورہ کا محلہ کافی مشہور تھا۔ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کے وارد کشمیر ہونے پر جب کالی مندر کے بڑے پجاری شالپور نے آپ کے روحانی کمالات کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اسلام قبول کیا اور لوگ گروہوں میں آکر مشرف بہ اسلام ہوئے تو کیلاش مندر کے پجاریوں نے اس کو ڈھا کر اس جگہ مسجد تعمیر کی۔ بچے کھچے ہنود نے اس محلہ کو قلاش پور/ بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸ پر

ہو تھا اور کاشغر واپس جاتے ہوئے ۱۶ ذی الحجہ ۹۳۹ ہجری کو راہ میں ہی انتقال کر گیا۔ مرزا حیدر گورگان نے ولی عہد سلطان سکندر کو کاشغر کے تخت پر بٹھایا۔ کچھ عرصہ بعد اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بامیر، پشاور ہوتے ہوئے لاہور آیا جہاں ہمایوں نے اُسے لاہور کے گرد و نواح کے انتظامیہ کی دیکھ بھال کا حاکم مقرر کیا۔ ان دنوں لاہور میں کتاب اُخوط کے

بقیہ حاشیہ ۱ از صفحہ ۲۷ (مفلسوں کی بستی) کہنا شروع کیا۔ ۱۰۸۰ھ میں جب موئے مقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وارد کشمیر ہو کر اس مسجد میں آسودہ ہوئے تو یہ محلہ کلاشپورہ کہلانے لگا۔ آثار شریف کلاشپورہ میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بادشاہ کے نام مکتوب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا کوفی خط میں لکھا ہوا قرآن مجید کا ایک سورہ اور دیگر کئی تبرکات محفوظ ہیں جنکی ہر سال عید میلاد النبی اور دوسرے متبرک ایام پر نمائش کی جاتی ہے۔ اُس زمانے میں یہ محلہ خانقاہ معلیٰ سے نایدکدل تک محیط تھا۔ اسی محلہ میں خانقاہ معلیٰ سے تھوڑی دوری پر خانقاہ شمس چک کی دینی درس گاہ قائم تھی۔ جسکی بنا پر اس حصہ کا نام شمس واری پڑا۔ جبکہ بعض مورخین اس محلہ کو میر شمس الدین عراقی کی قیام گاہ کی نسبت سے شمس واری کہتے ہیں۔ اس دور کی دوسری عظیم درس گاہ دار الشفا کاٹی دروازہ کے اندر واقع ہے حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ علیہ دونوں درسگاہوں سے فارغ تحصیل علم ہیں حضرت بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ نے بالعموم شمس چک میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آثار شریف کلاشپورہ سے ذرا فاصلے پر حضرت شیخ حمزہ کی نشست گاہ مخدوم منڈو ہے آپ نے یہیں کہیں انتقال فرمایا۔ آپ کی نشست گاہ کی وجہ سے اس کے ارد گرد کا محل وقوع محلہ مخدوم منڈو کہلاتا ہے۔

۲ کشمیر میں اہل سنت و الجماعت کے مندرجہ ذیل چھ مسلمہ سلسلے ہیں (۱) سلسلہ قادریہ (۲) سلسلہ سہروردیہ (۳) سلسلہ کبرویہ (۴) سلسلہ نقشبندیہ (۵) سلسلہ ریشیاں / بقیہ صفحہ ۲۹ پر

زور دار چرچے گلی کوچوں میں ہو رہے تھے۔ چونکہ مرزا حیدر گورگان اہل سنت والجماعت اور حنفی مسلک کا پُرجوش حامی تھا اس نے ہمایوں کے صلاح و مشورے سے سپاہیوں کا ایک دستہ اپنے ساتھ لیا اور سہارن پور ہوتے ہوئے کشمیری ملکان کی حمایت سے کشمیر پر دوسری بار حملہ کیا۔ یہ واقعہ ۹۴۸ھ بمطابق ۱۵۴۱ء کا ہے۔ چنانچہ تاریخ رشیدی میں

بقیہ حاشیہ ۲ از صفحہ ۸۷ (۱) سلسلہ چشتیہ۔ حضرت بابا داود خاکی رحمتہ اللہ علیہ سلسلہ سہروردیہ سے منسلک ہیں لیکن اس قبیلے کے دیگر اولیاء اللہ دوسرے سلسلوں سے بھی منسلک ہیں اس قبیلے کی بزرگی اور خداشناسی کا اندازہ مندرجہ ذیل بزرگان دین کی ریاضت و روحانی عظمت سے لگایا جاسکتا ہے۔ بابا لدّہی گنائی رح۔ بابا نونی گنائی۔ عرف بابا ند گنائی رح۔ (بابا عثمان گنائی رح بابا اوچیپ گنائی دونوں سلطان زین العابدین کے زمانے کے معروف روحانی پیشوا ہیں ان کے زیارت حرمین شریف سے ایسی پیران کے ہمراہ جناب سید حسین بلدوری رحمتہ اللہ علیہ سرینگر تشریف لائے۔ راجوری کدل میں ان کے آستانہ مبارک پر حضرت شیخ حمزہ رح اکثر و بیشتر شبانہ تشریف لے جاتے تھے ان کے احاطہ کے وسیع قبرستان میں کشمیر کا معروف فارسی گو شاعر غنی کشمیری اور کشمیری زبان کا صوفی شاعر عبد الاحد زرگر آسودہ ہیں) مُلّا جوہر گنائی رح (مُلّا فیروز گنائی رح مُلّا یوسف الماس گنائی رح دونوں علی شاہ چک کے زمانے میں شہید کئے گئے۔) بابا شنگرف گنائی رح بابا شمس الدین گنائی رح بابا یوسف کمو گنائی۔ بابا عبد الشکور گنائی رح بابا شیخ محمود گنائی رح۔ مُلّا حاجی گنائی رح مُلّا حیدر گنائی رح مُلّا حسین گنائی رح۔ قاضی موسیٰ شہید گنائی رح۔ مُلّا رجب گنائی رح مُلّا عبد اللہ گنائی رح اور مُلّا ابو الفیض گنائی رح جیسے صاحب کشف و کمالات عالم اور سیف قلم بزرگ عبارت ہیں۔

اس کا تفصیلی تذکرہ ہے جس کا خلاصہ یوں ہے۔

"بالمجملہ بوقت ظہر دوشنبہ ۸ ربیع الثانی ۹۴۸ھ کو سورۃ الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل مخالفاں کے مصداق حال ہوئی اور الہامات ربانی نے ہمارے کان میں آیہ نصر من اللہ وفتح القریب پھونکی حضرت فتاح جل جلالہ نے تین سو نفر لشکر سے پانچ ہزار سوار اور چند ہزار پیادوں کو شکست دی"

اس تاریخی حوالے سے صاف ظاہر ہے کہ جب حضرت بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ شنگہ پال کی مسجد میں خلوت نشین تھے مرزا حیدر کاشغری نے دوسری بار کشمیر کو تسخیر کیا آپکی کی عمر چالیس سال کی تھی اور اس لحاظ سے آپ کی تاریخ پیدائش ۹۰۸ھ ہی درست ہے۔ والدین نے دولت دار اسم بامسمیٰ رکھا۔ آپ کے ایک برادر بھی تھے جنکا نام حاجی زین الدین تھا اور جو اپنے وقت کے جید عالم دین اور حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کے مریدوں میں سے تھے۔

حضرت بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ کے نسب نامہ اور خاندانی حالات کے مطالعہ سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ آپ حضرت عاصمؓ ابن امیر المومنین وامام المسلمین خلیفہ دوم حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد واحفاد میں سے ہیں۔ جب آپ کا خاندان وارد کشمیر ہوا تو آپ کے بزرگوں نے شاہی دربار کے محاسب کی حیثیت میں کام سنبھالا۔ اُس زمانے میں ہر پڑھے لکھے شخص کو گنائی یعنی منشی یا دبیر کے لقب سے پکارا جاتا تھا جیسے فی زمانہ برصغیر کے ممالک میں دیہاتوں میں پڑھے لکھے کو بابو کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس خاندان کے بیشتر بزرگ علماء وفضلا اور سیف وقلم گذرے ہیں گنائی کہلانے لگے۔ چنانچہ مورخ کشمیر خواجہ محمد اعظم دیدہ مری گنائی کی تشریح میں رقم ہیں۔

"گنائی بہ عہد سابق نوسندہ را مے گفتند از معنی تا پٹواری ہیں لقب بودہ است"

جناب محمد الدین فوقؔ تاریخ اقوام کشمیر حصہ دوم میں گنائی کی وجہ تسمیہ بیان کرتے رقمطراز ہیں۔

"گنائی لفظ خالص کشمیری ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں منشی کاتب اور عالم' اس کے علاوہ سرکاری ملازم کا مطلب بھی لیا جاتا ہے قدیم کشمیری زبان میں قلم کو "گن" اور اہل قلم کو "گنئے" کہتے تھے اور بادشاہوں کی طرف سے اہل علم کو گنائی کا خطاب دیا جاتا تھا۔ صدیوں بعد عوام نے بھی اسکو آزادانہ طور پر استعمال کرنا شروع کیا ــــ یعنی ہر لکھے پڑھے کو گنائی کہنے لگے"۔

تاریخ حسن میں مرقوم ہے کہ کشمیر میں سب سے پہلے ہلمت گنائی نے قصابوں کا کام شروع کیا اس کے بعد جس شخص نے جس قوم سے یہ پیشہ اختیار گنائی کہلایا۔ گنائی کے معنی ٹکڑے کرنے والا ہے۔ اسی وجہ سے قصائی گنائی کہلانے لگے اگرچہ مہتر کے معنی بھنگی اور سائیس کے ہیں لیکن گلگت میں یہ لفظ بادشاہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ مشہور صاحب کشف و کرامات درویش بزرگ جناب سید میر میرک[1]

---

[1] جناب سید میر میرک اندرابی رحمتہ اللہ علیہ کے والد ماجد کا نام سید میر شمس الدین تھا۔ سید میر محمد افضل منطقی اونتی پورہ کی صاحبزادی آپ کی والدہ ماجدہ تھیں آپ رسول مقبول خیر البشر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب شیخ سید عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ کی روحانیت کے باطنی فیوض سے مستفیض ہوئے تھے۔ سید حسین قمی رح کے خلفا الصدق سید عبد اللہ رضوی رح قمی کی صاحبزادی آپ کے نکاح میں تھیں جنکے بطن سے تین بیٹے سید محمد۔ سید احمد قاسم۔ سید یوسف اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ ملارٹہ۔ رتن پور۔ لولاب۔ پوچھل۔ گیرو اور گنڈ دیرہ کے جملہ اندرابی سادات سید میر میرک اندرابی رح کی اولاد ہیں۔ سال وفات ۹۹۰ھ "شیخ سید" سے عبارت ہے۔

اندرابی رحمۃ اللہ علیہ ملارٹہ[1] کی اولاد سے تھیں۔ حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ جب سن رشد کو پہونچے تو انہیں اخوند مُلا بصیر اعمیٰ رح، مولانا میر رضی الدین رح، اخوند مُلا شمس الدین پال رح جیسے مستند علما اور روحانی پیشواؤں کی مشہور و معروف درس گاہوں میں فقہ، حدیث، تفسیر، ادب اور دینیات کی تعلیم سے منور کیا گیا۔ کم سنی میں ہی آپ نے میر افضل کے مدرسہ سے فلسفہ، نجوم، منطق، صرف نحو، عروض، تاریخ، سیرت، طب، ریاضی، الہیات اور ادب لطیف میں اتنی دسترس حاصل کی کہ اپنے ہمعصروں میں علم و فضل، فہم و فراست، ذہن و ذکا میں یگانہ روزگار تسلیم کئے گئے اور بے پناہ متاعِ علم سے منور ہونے کے باعث مُلا دولت داؤد کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لڑکپن سے ہی شعر گوئی سے رغبت تھی اور خاکی تخلص کرتے تھے۔ آپ کی علمی قابلیت اور شہرت سنکر سلطان محمد شاہ نے جب وہ چوتھی بار ۹۲۴ھ میں بادشاہ بنا آپکو ایک سو خروار دھان سالانہ اور ایک صد روپے ماہوار مشاہرے پر شاہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ان کا اتالیق مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد ناظم تعلیمات کا عہدہ تفویض کر کے آپ کو دربار سے منسلک کیا گیا۔ آپ کی حاضر جوابی، معاملہ فہمی اور دانشمندانہ فہم و فراست نے آپکو قاضی الشہر بننے میں راہ استوار کی۔ مختلف مندرلج طے کر کے آخر آپ صدر الصدور (چیف جسٹس) کے عہدے پر سرفراز کئے گئے یہ حقیقت

---

[1] محلہ ملارٹہ کو سید میر میرک اندرابی رح نے اپنا مسکن بنایا۔ اس سے قبل یہ ایک چٹیل میدان تھا جہاں کشمیریوں اور باہر سے آئے ہوئے مُلاؤں میں زبردست ستیزہ آرائی ہوئی تھی جسکی بنا پر یہ "میدانِ ملہ روٹ" یعنی مُلاؤں کو روکنے کا میدان کہلاتا تھا۔ تلفظ کی تبدیلی سے اب ملارٹہ بن گیا ہے فی الوقت شہر سری نگر کے وسط میں واقع ہونے کی بنا پر گنجان آبادی والا علاقہ ہے سید میر میرک اندرابی رح کے پڑپوتوں کے پوتے اسی محلہ میں اقامت پذیر ہیں۔

مسلمہ ہے کہ دینی اور شرعی مسائل پر کما حقہٗ دسترس نے آپ کے فہم ذکا پر سونے پہ سہاگہ کا کام کیا دنیا بھر کی عشرتیں میسر ہونے کے باوجود بچپن سے صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ علی الصبح اُٹھ کر وضو کرکے پابندی سے مسجد میں باجماعت نمازِ فجر ادا کرنا آپ کے معمولات میں شامل تھا۔ لیکن اس کے باوجود جاہ وحشمت، دولت، وثروت سے بھی بہت زیادہ لگاؤ رکھتے تھے۔ بڑے ٹھاٹ باٹ شان وشوکت اور آرام سے رہتے تھے۔ کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر اور کبھی کشتی کے ذریعہ نوشہرہ عدالت عالیہ جایا کرتے تھے۔ اسپ سواری کے روز نقیب اور چوبدار "دور باش دور باش" کی زور دار آوازیں لگا کر راہگیروں کو کنارے ہونے کا انتباہ کرتے تھے اور جب کشتی کے ذریعہ نالہ مار[1] سے گذرتے تھے تو بنسی کے قریب ملاح کشتی کھیدنے سے قبل اپنے چپوؤں میں گھنگرو باندھتے تھے تاکہ آبی گذرگاہ سے گذرنے والی سبھی کشتیاں کنارے ہو جائیں۔ وقت کے اتنے پابند تھے کہ لوگ آپ کے گذرنے پر وقت کا تعین کرتے تھے۔ سینہ بہ سینہ روایات کچھ اور رہی ہیں جنہیں کوئی بھی ذی حس تسلیم نہیں کر سکتا۔[2] ویسے بھی صدر الصدور کے ارفع منصب پر فائز شخص کے بارے کوئی بھی شخص انہیں تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ آج کل کے زمانے میں بھی چیف جسٹس یا ہائی کورٹ جج اپنے آپ کو کسی طرح انگشت نما نہیں کرتا۔ وہ شخص کس طرح خود کو

---

[1] یہ آبی گذرگاہ دراصل نالہ مار کی ایک شاخ تھی جو باغ دلاور خان کے قریب بابا ڈیمب کو ایک جزیرہ میں کاٹکر کلاشپورہ سڑک کے سامنے اور مخدوم منڈو کے عقب سے گذر کر نائد کدل کے قریب نالہ مار میں دوبارہ ملتی تھی۔ اُس زمانے میں باغ دلاور خان جزیرہ بابا ڈیمب کا ہی حصّہ تھا۔ یہ نالہ بچہ مار کہلاتا تھا غلام محمد صادق کے دورِ حکومت میں اس کی بھرائی کرکے اِسے نالہ مار سے ملا دیا گیا۔

[2] کہ چوڑیوں کی کھنک سے ویسے بھی اتنی آواز نہیں آتی۔

انگشت نما کرتا جو کہ شرعی اور قانونی عدالت کا صدر الصدور رہو
اور ساتھ ہی صوم و صلواۃ کا پابند بھی ــــــ ! البتہ اتنا ضرور ہے کہ
اقبال مندی نے جس فیاضانہ انداز میں آپ کی چوکھٹ پر سر بسجود ہوکر دنیاوی جاہ و حشمت
اور مال و زر کی فراوانی مہیا رکھی تھی اُس سے آپ بھرپور استفادہ کرتے رہے تھے حتیٰ کہ
احساس خودنمائی اور خود پرستی نے کبھی آپ کو یہ سوچنے کا موقعہ نہیں دیا کہ نشیمن گاہ سلطان
العارفین رح کے سامنے سے گذرتے وقت احتراماً چوبوں کی جھنکار کی لئے دھیمی کرائی جائے
جب کہ اسی گھرانے کے کئی دیگر بزرگ جن میں آپ کے بھائی خواجہ بابا زین الدین رح بھی
شامل تھے حضرت شیخ حمزہ رح کے دروازے پر اقامت کو سعادت مندی اور فیوض و برکات
کا موجب سمجھتے تھے۔

ایک دن سہ پہر کے قریب جب آپ اسی آبی گذرگاہ سے اپنے دولت
کدہ کی جانب مراجعت کر رہے تھے حضرت شیخ حمزہ رح نماز عصر سے فارغ ہوئے
تھے۔ آپ کے کانوں میں گھنگروں کی آواز گونجی۔ اپنے خادم بابا اللہ داد رح سے
دریافت کیا۔ کیا یہ مُلّا دولت داؤد کی سواری ہے بلا انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔
انہیں خیال آیا کہ اگر ایسا عالم بے معرفت رہا تو مقام تاسّف ہے تامّل کے بعد بابا اللہ داد رح
سے کہا۔ کل جب وہ یہاں سے گذریں گے انہیں میرا سلام پہونچا کر کہنا:

"ایک سائل آپ سے ایک دینی اور مذہبی سوال کے بارے میں دریافت
کرنا چاہتا ہے اگر زحمت نہ ہو تو اُن کے حجرے تک قدم رنجہ
فرمائیے"

آپ کے خادم نے تعمیل حکم کا اقرار تو کیا لیکن دل میں خیال آیا کہ مُلّا دولت داؤد خاکی رح
بڑے بڑے رئیسوں اور با اثر لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں بھلا کیا حیثیت رکھتا
ہوں جو میرے کہنے پر کشتی کو کنارے کرائیں گے ــــ مگر اس خیال کے باوجود انہوں

نے احساس تکمیل ارشاد کی خاطر اگلے دن حاکم وقت مُلاّ دولت داود خاکی کی گذرگاہ پر اُن کی آمد سے قبل ڈیرا جمایا اور اُن کے انتظار میں رہے۔ دُور سے گھنگرُوں کی آواز اور پانی میں لہروں کی ہلچل نے انہیں چونکا دیا اور سوچنے لگے کہ اس تیز رفتار کشتی میں بیٹھ کر کیا وہ میرے ہاتھ کے اشارے کو دیکھ سکیں گے بھی یا نہیں اچانک مُلاّ دولت داؤد خاکی کی کشتی اُن کے قریب آکر یک بیک رُک گئی۔ مُلاّ دولت داؤد کے دریافت کرنے پر ملاّحوں نے بیک زبان کہا:

حضور ہم سبھوں کے بازو ناگہاں شل ہو گئے ہیں۔ ان میں چپو پکڑنے کی سکت نہیں رہی ہے۔ ناؤ کھینے کی بات تو اور ہے۔ اس عجیب و غریب فقرہ کو سنتے ہی بابا اللہ داد نے بڑے ہی استقلال اور صبر و تحمل سے آپ کو مخاطب ہو کر حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ کا پیغام سنایا۔ آپ کی بزرگی خدا شناسی اور فیض و برکات سے آپ پہلے سے ہی واقف تھے فوراً جان گئے ہو نہ ہو اس میں انہی پیر بزرگ کی کوئی مصلحت کارفرما ہو۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور سوچا چلو اس بہانے شرف ملاقات بھی نصیب ہو گی۔ وہ بیاض ہاتھ میں لی جس میں آپ قرآن مجید اور صحیحین سے اہم شرعی اور قانونی مسلوں پر استفادہ حاصل کر کے درج کیا کرتے تھے۔ کاشانہ مخدوم رح میں سلام بجالائے۔ آپ کو بیٹھنے کے لئے کہا گیا معمولی سی چٹائی پر بیٹھتے ہی آپ کی جاہ طلبی اور غرور نفس کا نشہ ہرن ہوا۔ حضرت شیخ حمزہ مخدوم رح نے آپ سے کہا:

"آپ کو زحمت دینے کی وجہ یہ ہوئی کہ مجھے آپ سے یہ دریافت کرنا مطلوب تھا کہ خداوند کریم نے اشرف المخلوقات کو اپنا خلیفہ بنایا ہے بیان کیجئے کہ انسان دن اور رات میں کتنی سانس لیتا ہے"۔

مُلاّ دولت داؤد خاکی نے جواب دیتے کہا:

"جتنے پیغمبر گذرے ہیں جنکی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور
دوسرے اندازے کے مطابق دو لاکھ چوبیس ہزار"
یہ سُنکر جناب شیخ حمزہ رحمتہ اللہ علیہ نے یہ ضمنی سوال کیا۔
"جو انسان اپنی ایک سانس بھی بغیر یادِ الٰہی کے گذارے اُس سانس کے
بارے میں شرعی حُکم کیا ہے۔"
مُلّا دولت خاکیؒ نے جواب دیا۔
"وہ سانس جو یادِ الٰہی کے بغیر گذرے ایک نبی کے قتل کے مترادف
ہے"
ساتھ ہی مُلّا دولت داؤد خاکی نے مسلہ کی تشریح اور وضاحت کے لئے جب اپنی
بیاض کھولی تو وہ کورے کاغذ میں بدل گئی تھی۔ انہیں کہیں کچھ لکھا نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر
حیران و ششدر ہو کر حضرت مخدومؒ کی طرف نظر ڈالی اور پھر نظریں جھکا کر سر خم کیا۔
حضرت مخدومؒ نے آپ سے مخاطب ہو کر دریافت کیا۔
"آپ کی غفلت شعاری، جاہ طلبی اور ظاہری نام و نمود کی جستجو کا
ماحصل کیا ہے"۔
مُلّا دولت داؤد خاکی سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ البتہ سوال کی گہرائی سے اُن کی امارت
کی ساری کائنات خاک بوس ہو کر رہ گئی۔ ندامت اور شرمساری کے عالم میں جانے
کی اجازت لیکر گم صُم واپس گھر لوٹے۔ فکر کی وسعتوں میں استفسار کا جواب
ڈھونڈتے اس نتیجہ پر پہونچے کہ جاہ و حشمت کا ماحصل شعوری اور غیر شعوری طور پر
سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیگانگی اور قربِ الٰہی سے لاتعلقی کے سوا کچھ بھی نہیں۔
ساتھ بھر جاگتے رہے اور اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ کیوں نہ روحانی کائنات کے
شہسوار اس شریعت مرد درویش کے سلوک و طریقت کی تقلید اختیار کر دوں اور

درود و اذکار کے فیض و برکات سے بہرور ہو کر دنیا ومافیہا سے بیگانہ ہو جاؤں۔ غور و فکر کی سنجیدگی نے انہیں فقیرانہ زندگی اختیار کرنے کے عزم پر استوار کیا اگلے دن صبح سویرے نماز فجر اداکر کے نشیمن گاہ سلطانی پر حاضر ہو کر انتہائی انکساری و عاجزی سے حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں استدعا کی کہ مجھے اپنی خدمتگاری کا شرف بخشیں۔ آپ نے انہیں صوفیوں کی استدعا کیلئے کلوخ (مٹی کے ڈھیلے) اور اپنے لئے نماز تہجد کے وضو اور غسل کا پانی لانے پر مامور کیا۔ جونہی آپ اس کام میں منہمک ہوئے آپ کی حالت میں انقلابی تبدیلی آئی آپ ریاضیات اور مشاہدات کی لگن میں محو ہو گئے۔ اپنے نام کے ساتھ جڑے مُلاّ کو خیر باد کہا جس نے دولت کی تمنا چھوڑ دی ہو وہ بھلا اس لفظ کی پیوندکاری سے کیوں اپنے نام کو مغالطہ کا باعث بنواتا۔ صوفیوں میں رہکر صوفی بنکر رہنے ہی میں اپنی عافیت جانی۔ اپنے مرشد کامل سے والہانہ محبت و عقیدت کے اظہار میں مُلاّ دولت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر لفظ بابا کو اس طرح جڑ لیا جیسے انگوٹھی میں نگینہ" اور بابا داؤد خاکیؒ کے اسم با مسمیٰ سے معروف ہوئے۔ سالہا سال تک تفویض شدہ کام کو تن دہی اور انہماک سے انجام دیتے رہے۔

حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ کا معمول تھا کہ اکثر و بیشتر کوہ ماراں کی اُس خانقاہ میں جو آپ نے ۹۲۲ھ میں اپنے مرشد کامل جناب مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جمال الدین بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے قیام کشمیر کے دوران آپ کی اقامت کے لئے تعمیر کرائی تھی جو فی زمانہ ذاکر مسجد کہلاتی ہے قیام فرما کر درود و اذکار اور ذکر جیب میں معروف رہتے تھے"۔ بابا داؤد خاکیؒ نے یہ ذمہ داری از خود اپنے اُوپر عائد کی تھی کہ حضرت مخدومؒ جہاں بھی جاتے اُن کے ہم رکاب رہکر پہرہ داری کے فرائض بھی انجام دیتے تھے تاکہ بے موقعہ کوئی مرید آکر آپ کے اوقاتِ ریاضت میں مخل ہو کر باعث خلل نہ بن پائے۔

ایک دن حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحؒ ذاکر مسجد میں محوِ ریاضت تھے۔ بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ باہر پہرے پر کھڑے تھے۔ اچانک ان کے دل میں خیال گذرا۔ میں بھی کیا چیز ہوں۔ شان و شوکت، مال و زر جاہ و جلال سب کچھ چھوڑ کر فقیری پر قناعت کی۔ آپ اس خیال کی بھول بھلیوں سے ابھی نکل بھی نہ پائے تھے ذاکر مسجد سے حضرت سلطان العارفین کی آواز آئی۔ بابا داؤد میرے لئے کلوخ کا انتظام کرو۔ ارشاد کی تعمیل میں آپ نے کوہ ماراں پر نظر ڈالی ـــــ سارا پہاڑ سونے کا نظر آیا۔ عرض کی حضور یہاں مٹی کا کہیں نام و نشان نہیں ہے پہاڑ کا ہر ذرہ سونے میں مُبدل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تو کیا ہوا سونے کا ایک ڈھیلا ہی لاکے رکھو۔ بابا داؤد خاکی رحؒ نے جواب کہا۔ حضور از روئے شریعت سونا کلوخ کے کام نہیں آسکتا۔ حضرت مخدوم رحؒ نے انہیں خانقاہ کے اندر بلایا اور متبسم ہوتے فرمایا۔ بابا خاکی رحؒ جو سونا کلوخ کے بھی کام نہ آئے اُس کی تمنا چہ معنی۔ بابا داؤد خاکی رحؒ جان گئے یہ میرے گمان کا جواب ہے۔ دل ہی دل میں توبہ کی اور سے نادم اور تائب ہوئے۔

شرم و ندامت کے ملے جلے اثرات کے باوجود حضرت مخدوم رحؒ جانتے تھے کہ ان کے نفس امارہ نا حال دنیاوی چمک دمک اور اپنے تیں عالم و فاضل ہونے کا کیف و سرور رقصاں و غلطاں ہے۔ اس کو ان اور اندیشہ ہائے گوناگوں سے نجات دلانے اور فقیرانہ زندگی اختیار کرانے کے مدعا و مقصد سے واقف کرانے کے لئے لازم ہے کہ ان کے نفس آمارہ کو سنگِ پارس میں بدلا جائے۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انہیں اپنے مرشد کے ہاتھوں ایک ایسے امتحان سے گذرنا پڑا جس میں وسیع القلبی عزائم کی پختگی اور مرشد پر یقین کامل کے جذبے میں ہی کامیابی و کامرانی کا انحصار ہے۔ فنا فی اللہ اور تارک دنیا کی کسوٹی پر کھرا ثابت کرنے کے لئے ایک دن حضرت مخدوم رحؒ نے نماز فجر ادا کرنے کے بعد عیش مقام جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بعض مریدوں اور رفیقوں نے نماز ظہر ادا کرنے کے بعد روانہ ہونے کی

خواہش کی۔ آپ نے کہا آگے کہیں پڑھ لیں گے۔ آپ کے ارشاد سے کسی کو یارا نہ تھا۔
حضرت مخدوم جودر[1] پر سوار ہوئے اور حسب ارشاد بابا داؤد خاکی رح اپنے کرتے کا دامن
اوپر چڑھا کر پاؤں میں گھاس کی جوتی[2] ڈال کر کبھی جودر کی بھاگ پکڑ کر آگے آگے اور
کبھی شطار بند پر ہاتھ رکھ کر ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ اس طرح صبح تڑکے شہر سے چل
پڑے اور عیش مقام کی مسافت ابھی دو پڑاؤ باقی تھے نماز ظہر ادا کی۔ عیش مقام میں چند
دن قیام کے حسب واپسی پر شہر کے قریب پہونچے تو بابا داؤد خاکی رح نے لوک لاج کی خاطر
پیچھے سے اپنے کرتے کے دامن کو کمر سے نیچے کھینچا۔ حضرت مخدوم رح تاڑ گئے کہ
ابھی اس میں خم باقی ہے اور اپنی حالت کا اندازہ لگا کر لوگوں سے شرماتا ہے۔ اگلے دن
آپ نے شہر سرینگر کا گشت لگانے کا ارادہ ظاہر کیا اور بابا داؤد خاکی رح کو حکم ہوا۔
کہ وہ گائے کی کھال پہنکر اور کھال کی ٹوپی سر پر رکھکر پاؤں میں "پلہور" پہن کر
ساتھ چلنے کی تیاری کریں۔ جناب شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ علیہ گھوڑے پر سوار ہوئے اور
اور بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ کے آگے آگے دوڑنے لگے راہ میں جس کسی نے
دیکھا بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ کی حالت پر دکھ اور افسوس کئے بنا نہ رہا ستم ظریفوں
نے تو یہاں تک کہا اللہ کی شان دیکھو جب وہ چاہتا ہے عالم و فاضل کو دیوانہ بنا تا
ہے۔ لوگوں کے چہرے پڑھکر اور فقرے سنکر بابا داؤد خاکی کو یقین ہوا کہ اب میں اہل
شہر کی نظر میں مکمل پاگل ہوں۔ جب نشیمن گاہ پر واپس پہونچے تو حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ
نے کہا بابا داؤد یہ محنت کل کی حرکت کی سزا تھی۔ اس حالت میں دو برس گذر گئے" انا اور

---

[1] حضرت مخدوم رح کے گھوڑے کا نام ہے

[2] گھاس کی یہ جوتی فی الوقت بھی مروج ہے اور اسے کشمیری زبان میں "پلہور" کہتے ہیں۔

غرور چور چور ہو کر خاک میں مل گیا۔ خاکی تخلص کا یہ بشر واقعی خاک میں مل کر خاکسار ہو کے رہ گیا۔

ایک دن حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں پاس بٹھا کر بڑے ہی شفقت سے دریافت کیا اب کیا ارادے ہیں بابا آپ نے متانت وانکساری سے دستِ مبارک پر بیعت کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے انہیں دولت روحانیت دلینے میں داخل کرنے سے قبل اپنی استعمال شدہ کلاہ عطا کرتے ہوئے فرمایا۔

"ایں کلاہ بر سر نہادہ امشب بہ نیت شروع کردن در طریقہ ما استخارہ کن و ایں کلمات خواب رہ تا چہ خواہی دید"

[اس ٹوپی کو اپنے سر پر رکھکر آج کی رات ہماری طریقت شروع کرنیکی نیت سے استخارہ (یعنی کسی عمل کے کرنے نہ کرنے کے بارے میں اللہ سے دعا واستدعا کرنا) کرو اور یہ کلمات پڑھ کر سو جاؤ اور دیکھو خواب میں کیا ہدایت ملتی ہے]

مولانا خاکیؒ نے حسب ہدایت عمل کیا اور رویا میں جو کچھ دیکھا اگلے دن سویرے آپؒ سے یوں بیان کیا:

"دیدم کہ گویا صباح از خواب بیدار شدہ بہ قصدِ نماز فجر از خانہ بر آمدم ناگاہ مے بینم کہ آفتاب از مشرق طلوع نمودہ است وشعاع آن بر من افتادہ و من از جہت تاخیر نماز فجر دستغفر شدم"

[خواب میں میں نے دیکھا گویا میں صبح کو نیند سے بیدار ہو کر نماز فجر ادا کرنے گھر سے نکلا۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ سورج مشرق سے طلوع ہوا ہے اور اس کی کرنیں مجھ پر پڑ رہی ہیں اور میں نماز فجر میں تاخیر ہونے کی وجہ سے حیران ہوں اور توبہ کر رہا ہوں]۔

حضرت شیخ حمزہؒ خواب سُنکر بشاش ہوئے اور کہا:

"دمیدن صبح اشارت است بدمیدن صبح دولت و طلوع آفتاب بشارت است

بہ طلوع نور معرفت و حصول مقصود"

[صبح کا ہونا دولت معرفت سے مالامال ہونے کی بشارت ہے اور صبح شروع کرنے کی طرف اشارہ دیتا ہے سورج کا چڑھنا نور معرفت اور حصول مقصد کے طلوع ہونے کی دلیل ہے]

اور کہا میں نے بھی مکاشفہ میں حضور رسالت مآب خیر البشر جناب محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک میوہ دار درختوں سے بھرے باغ میں رونق افروز دیکھا فرماتے ہیں:

قسلم گفت کہ من شاہ جہانم
بکاتب عاقبت دولت رسانم

"حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم آخری مصرعے کو بار بار دھراتے رہے۔ آپ نے خود ہی اسکی تفسیر یوں فرمائی۔

"کاتب توئی کہ در صنعت کتاب شہرتے داری واشارت بدولت مجب موزون است خصوصاً در حق تو کہ بہ اسم دولت مسماہستی"

[تم کاتب تو ہو ہی کیونکہ کتابت کرنے اور لکھنے میں تم مشہور ہو دولت کی طرف جو اشارہ دیا گیا ہے وہ مناسب اور برمحل ہے خاصکر تمہارے حق میں تمہارا نام ہی دولت ہے]

تمہید بشارت کے بعد بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس موقعہ پر سلطان العارفینؒ نے انہیں چند تبرکات عطا فرمائے جن میں اعصا، جائے نماز، خرقہ، کلاہ اور پشمینہ کا ایک عمامہ شامل تھا۔ ساتھ ہی آپ نے ہدایت کی جب کبھی عمامہ استعمال کرو گے شملہ رکھکر باندھنا لیکن اس

ں یا کسی اور رستے کی عادت بنانا ارادت کے منافی ہے۔

خرقہ[1] اور کلاہ[2] مبارک کے بارے میں یہ بتانا برمحل ہوگا کہ صوفیانہ طریقت میں انہیں بڑی اہمیت حاصل ہے اور بابرکت تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت امیر کبیر

---

[1] خرقہ پانچ قسم کا ہوتا ہے (۱) خرقہ ارادت جو مرشد بیعت کے روز مرید کو پہناتا ہے اور پرہیزگاری کی طرف مائل کراتا ہے (۲) خرقہ محبت جو ٹوپی اور کرُتے پر مشتمل ہوتا ہے یہ مرشد محبت اور شفقت کی بنیاد پر پہناتا ہے (۳) خرقہ بزرگ جو کوئی مرشد کسی دوسرے مرشد کے مرید کو تبرک کے طور پر عنایت کرتا ہے (۴) خرقہ صحبت جو مرشد اپنی زندگی میں یا مرید کو قابل انعام سمجھ کر کسی دوسرے مرشد کی صحبت میں دیتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ مرشد اپنے مرید کو خواب میں کسی دوسرے مرشد کی ہمنشینی کی ہدایت دے تاکہ وہ آگے بڑھ سکے یہ خرقہ خواب میں ہی پہناتا ہے (۵) خرقہ حقیقی مرشد اور جن کے درمیان واسطہ رکھتا ہے مرید کے باکمال ہونے پر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات مقبولِ ازل مرید کو یہ خرقہ پہلی ہی نشست میں عنایت ہوتا ہے اس کے پاتے ہی مرید نہ تو دنیاداری کی لذتوں سے اور نہ دنیا والوں کی چمک دمک، رعب و دبدبہ ناہٹ سے اثر انداز ہوتا ہے بلکہ ماسوائے ذاتِ باری کے کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ کے رسول جناب رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر سختی سے پابند رہکر سرفراز اور سربلند ہوتا ہے۔ یہ تمام خرقے حضرت مخدوم رح نے بابا داؤد خاکی رح کو خراماں خراماں عنایت کئے۔ حضرت داود رح فرماتے ہیں میں نے خرقہ پہنا اپنی ریاضت میں شامل کیونکہ ایسا کرنا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حضرت عبداللہ رض ابن عباس رض سے روایت ہے کہ جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل دنیا فرمایا آپکے جسد مقدس پر ایک پشمینے کا کرتہ تھا جسمیں بارہ پیوند لگے تھے انمیں کچھ چمڑے کے تھے۔ حاشیہ ۲ صفحہ بعد

میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ دوسری بار ۱۸۷ھ میں سلطان قطب الدین شاہ کے زمانے میں کشمیر تشریف لائے تو آپ نے تبرکاً اپنی کلاہ مبارک سلطان کو عنایت کی جو سلطان فتح شاہ کے عہد تک کشمیری سلاطین کے تاج شاہی کی زینت اور حکومت کی ضمانت بنی رہی سلطان فتح شاہ نے اپنی وفات سے بیشتر وصیت کی کہ کلاہ مبارک کو اُن کی میت کے ساتھ دفنایا جائے ایسا ہی کیا گیا۔ اس عمل پر اس زمانے کے سر حلقہ مشایخ مولوی محمد صاحب نے پیش گوئی کی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲ سے [2] مرشد کی نظر میں کلاہ کی دو قسمیں ہیں (۱) لاطیہ (۲) ناشندہ پہلی کلاہ سر کے ساتھ لگی ہوتی ہے اور دوسری جو سر سے نہ لگی ہو اونچی اور ڈھیلی ہو۔ کلاہ عنایت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جو کچھ دنیا میں ہے اُسے اور بادشاہوں اور امیروں کی صحبت سے پرہیز کرے اور نہ وہ پیغمبر آخرزمان امام المتقین خاتم النبین خیر البشر شافعی المحشر جناب محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور مرشدوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔

"اسرار الابرار" میں بابا شیخ داؤد مشکواتی اسرار الاولیاء و برہان اصفیا کے حوالے سے شیخ فرید الدین گنج شکر کی زبانی روایت کرتے ہیں۔ اصل کلاہ خدا کی طرف سے ہے جو جبرئیل نے لائی اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانِ خداوندی ہے کہ یہ کلاہ لے لیں اور اپنے سر مبارک پر رکھ لیں پھر جسکو چاہیں دے دیجئے اور اپنا خلیفہ بنائیے۔ پھر رسول اللہ صلعم نے چار تہہ بتہہ کلاہ سر مبارک پر رکھیں پھر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سامنے حاضر ہوئے ایک تہہ جو خود کی طرف تھی اُن کے سر پر رکھ دی اور دوسری کلاہ جو دوہری تھی حضرت عمر رضؓ کے سر پر رکھ دی اور تیسری کلاہ جو تین گوشوں والی تھی حضرت عثمان رضؓ کے سر پر رکھ دی چوتھی کلاہ جو چار کونوں والی تھی اُتار کر حضرت علی رضؓ کے سر پر رکھ دی اور فرمایا اے علی آپ کی کلاہ ہے صوفیوں میں جسے آپ چاہیں دے دیجئے۔

"راج شاہی از شاہاں کشمیر برافتاد و سرداری آن ہمہ رو بہ نگونساری نہاد۔"

[تاج شاہی کشمیر کے سر سے اُتر گیا اور اُن کی حکومت الٹ گئی]

چنانچہ اس کے بعد ہی کشمیری سلطنت کا زوال شروع ہوا۔

یہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ غضب کے شاعر تھے لیکن انکا بیعت سے پہلے کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ انہوں نے اُسے خود ہی ضائع کیا ہو کیونکہ اُن کے کلام کا جو بھی سرمایہ دستیاب ہے وہ متاعِ مریدی کے دور کا ہے۔ بہر کیف بیعت اور تبرکات کی عطایابی سے مسرور اور مطمئن ہو کر اپنے اظہار تشکر کا اظہار یوں کیا ہے

وقتِ بیعت چون ید بیضائے آن عیسیٰ نفس
داد دستم در زمان دل زندہ و انور شد است

[بیعت کے وقت جب مسیحائے وقت کا نورانی ہاتھ میرے ہاتھ پہ پڑا تو میرا مردہ دل زندہ اور نورانی ہوا۔]

ایں کلاہ پوستیں و یں خرقہ پشمین کہ داد
بندہ را بہ او قبائے شاہی وافر شد است

[آپ کی عنایت کی ہوئی کھال کی ٹوپی اور اونی گوڈی (وہ مال واسباب جو بلا مشقت مل جائے) وہ میرے لئے خلعت و تاج شاہی سے بڑھ کر ہے]

اور بیعت سے مشرف ہونے کے بعد اپنے دل کی کیفیت اور تغیرات کا جائزہ پیش کرتے کہتے ہیں۔

"جب حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے دست بیعت سے مشرف فرمایا

اور مجھ پر اپنا اثر ڈالا میں سب کچھ بھول گیا اور مٹ کر ان کی محبت میں نیست و فنا ہو گیا۔ میں نے اُن کی خدمت کے لئے کمر باندھی۔ دنیا اور دنیا کے تمام کام کاج چھوڑ کر سالہا سال اسی حالت میں گذارے یہاں تک کہ انہوں نے نورِ ولدیت سے میری استقامتِ حال اور مستقبل میں دیکھ لی لیکن مجھے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے جائز و ناجائز ہونیکا فیصلہ دینے کی اجازت نہیں دی۔

ایک دن کسی نے دوسرے سے پوچھا فلاں کام جائز ہے یا نا جائز، میں نے غیر شعوری طور پر اُن کے پوچھے بغیر جواب دیا "ناجائز ہے۔ حضرت شیخؒ نے اندر سے آواز دی۔ میں خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا آج کونسا دن ہے کہ ہندو لوگ مٹی کے لوٹے اور تھال لئے جا رہے ہیں' میں نے عرض کی آج شیوراتری (ہیرتھ) ہے۔ ہندو اپنے دیوتاؤں کے لئے کھانا پکاتے ہیں۔ فرمایا تم بھی جا کر میرے لئے لاؤ۔ ہم بھی اپنے معبود کے لئے کھانا پکائیں گے۔ میں جان گیا اس بے جواز جواب دینے کی نافرمانی کا بدلہ اس کام سے لے رہے ہیں۔ پھر فرمایا جو کوئی تم سے ملے اور ان کے متعلق پوچھے کہدینا کہ میں (حضرت مخدوم رح) "ہیرتھ" منا رہا ہوں۔ میں نے لوٹے اور تھال لائے، مسکرائے اور فرمایا تم جیسے عالم کو کیا یہ جائز ہے کہ ہیرتھ کے لئے لوٹے اور تھال جمع کرے۔ میں نے عرض کی پیر کا جو حکم ٹھہرا۔ فرمایا یہ بھی تو پیر کا حکم تھا کہ کرنے نہ کرنے اور جائز و ناجائز کے جھمیلوں میں مت پڑنا۔ میں اپنی غلطی پر نادم شرمسار اور تائب ہوا"

صدر واقعہ پر اپنے احساسات بیان کرتے حضرت بابا داؤد خاکیؒ جناب مخدوم رح سے اپنی عقیدت اور اعتماد کا یوں اقرار کرتے ہیں۔

"حالانکہ آپ کا مرید بنکر میں نے آپ کی ہر بات اپنائی میں جان و دل سے اس
نیک خصلت مرد کامل کا مرید بن گیا حتیٰ کہ بے خبر لوگوں نے یہ گمان کیا میں دیوانہ
ہو گیا ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ جو کام مرشد مرید کو سونپتا ہے وہ خدائی خلعت
سے کم نہیں ہوتا، مرید جہاں بھی ہو اسی خلعت کے سائے میں ہوتا ہے"
چنانچہ حکم عدولی کے احساس ندامت کے بعد جب حضرت خاکیؒ نے اپنے آپ کو
ٹٹولا تو کھو کھلا پایا جس کا ذکر تے فرماتے ہیں۔

"اس کے بعد میں نے اپنے آپ کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ وہ سارا علم جو مجھے
حاصل تھا بھول چکا ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ اس مرد بزرگ نے مجھے سلوک
کی کوئی بات نہیں بتائی اور چلہ و اعتکاف کو میرے ذمہ نہیں کیا لوگوں نے جو
مجھے دیوانہ قرار دیا اور مجھ پہ دیوانہ کہلر فقرے کستی کر رہے ہیں وہ اب
درست ثابت ہو گا"

حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد کامل سے جس والہانہ عقیدت و محبت
کا اظہار کر رہے ہیں وہ ارادت اور بیعت کے لحاظ سے اُن پر فرض بنکر عاید ہوتا ہے
کیونکہ ارادت کے معنی چاہت ہے اور یہ چاہت ارادت کے ساتھ جُڑ جا بیکے معنی
مرید ہے جسکو مرید بننے کی چاہت ہو وہ بیعت کر کے اپنے مرشد کو خدائی درگاہ میں وسیلہ
بناتا ہے لیکن کبھی کبھی مرید بیعت کے مراحل سے گذر کر اس لئے بے تاب و بے قرار
ہوتا ہے کہ مرشد اُسے وہ سارا علم عرفان بیک لحظ کیوں نہیں سونپتا جس کا وہ متلاشی ہے
اور مرشد کی جانب سے تاخیر پر مرید کا بل قوم کی طرح پگھل کر شمع کی مانند گلہ و شکایات کے
انسو بہاتا ہے یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے جونہی مرشد
کامل اس صورتِ حال کا ازالہ کرتا ہے مرید فرحت مسرت سے جھوم کر مرشد کے وجود
میں گم ہو جاتا ہے حالانکہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ اس صورتِ حال سے دوچار ہونے

سے قبل ہی اپنے مرشد کی والہانہ محبت میں یہ لافانی شعر کہہ چکے تھے ؎

شکر للہ حال من ہر لحظہ نیکو تر شد است
شیخ شیخاں شیخ حمزہ تا مرا رہبر شد است

غرض شکوؤں اور شبہات کی زمین ویسے بھی سخت ہوتی ہے لیکن جب عالم اس طلسمات میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ زمین سنگلاخ بن جاتی ہے۔ اُس حالت میں صرف مرشد کامل ہی اپنی نظرِ عنائت سے اس سنگلاخ زمین کو قابل کاشت اور شاداب بنا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک جانب بابا داؤد خاکی رحمتاللہ علیہ دل و جان سے حضرت شیخ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کی رضا جوئی میں جُٹے ہوئے ہیں اور دوسری جانب دل میں شکوہ و شکایات کا طوفان لئے وظائف واذکار اور چلہ کشی کی اجازت نہ پانے پر لوگوں کے ظن کو درست قرار دے کر پُر ملال نظر آتے ہیں۔

اسی شش و پنج میں آپ ابھی فکر و فہم کے گھوڑے دوڑا ہی رہے تھے کہ حضرت سلطان العارفین کو کشف سے آپ کی اضطرابی کیفیت کا حال معلوم ہوا۔ آواز دیکر آپ کو قریب بٹھا کر فرمایا :

"تم خدمت میں لگے رہو یہی چالیس چلے ہیں۔"

بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں چلے کا اشارہ سمجھ گیا۔ کہ مجھے چالیس چلے سپرد ہوئے ہیں میں نے عرض کی اگر حکم ہو تو علاقہ کھورہامہ کے موضع شنگہ پال میں یہ چالیس چلے کروں۔ حضرت نے اجازت بخشی۔ ان چالیس چلوں کی مُدت ساڑھے چار سال کی تھی۔ بابا داود خاکی رحمۃ اللہ علیہ کی مراد پوری ہوئی اور اپنے پیر کامل کا شکوہ کرنے کے جرم میں اپنے دل کو یہ سوچ کر تسلی ضروری ہوگی ؎

مجھے غیروں سے کیا مطلب جو میں ان سے گلہ کرتا
شکایت تم سے کی ہے تم کو اپنا جان کر میں نے۔

ارشاد کے مطابق جب آپ شنگہ پال کی مسجد شریف میں بیٹھے تو جن بھوت اور پریوں نے شرارتیں کرکے آپ کو مسجد سے باہر نکالا۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ الجھن کو کیسے قابو میں کروں جناب شیخ حمزہؒ کو کشف سے اس تمام واقعہ کا پتہ چلا تھا۔ آپ بہ نفس نفیس سپہر کے قریب تشریف لائے ایک رات اور ایک دن بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ مسجد میں رہے۔ تمام غیبی مخلوق کو تائب کر کے ان سے کہا اب بلا خوف و خطر اپنے کام میں مشغول رہو اس واقعہ کے پس منظر میں آپ ورد المریدین میں فرماتے ہیں۔

ورد کاں کردہ حوالت ذکر کاں تلقین نمود

آن کمان و تیر این شمشیر با جوہر شد است

[جس کسی بھی درود کی آپ نے مجھے اجازت بخشی یا ذکر کی تلقین فرمائی وہ تیر و کمان ثابت ہوئی اور تلوار جوہر آب دار بنی]

ساڑھے چار سال کی چلہ کشی کی اس صبر آزما مدت میں آپ کی خوراک جنگلی سبزی ووپل ہاکؒ کا سنی کا ساگ اور جو کی روٹی پر مشتمل تھی۔ افطار بھی ان ہی سبزیوں سے کرتے تھے۔ آپ کہتے ہیں اس زمانے میں میری نیندیں مرشد کی طرف سے مراقبۂ خدا کی یاد اور محاسبہ تھیں۔ چلہ کشی کے ایام کی یاد تازہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" حضرت مخدوم (رحمتہ اللہ علیہ) کی تشریف آوری کے بعد جب میں اعتکاف میں بیٹھا ہر شب ایک شیر آکر باہر پہرا دیا کرتا تھا اور صبح ہوتے ہی غائب ہو جاتا تھا۔ چنانچہ گاؤں والے اس سے باخبر تھے۔ ان دنوں شیعیت کا زبردست غلبہ تھا اور شاید مجھے تکلیف پہنچانے کے درپے تھے لیکن یہ شیر ان کی راہ میں حائل تھا۔ انہوں نے چوروں کی ایک جماعت کو میری عبادت میں خلل ڈالنے کے لئے تیار

ؒ جو دردِ جگر کے مریضوں کو طبِ یونانی میں بطور دوا کھلایا جاتا ہے۔

کیارات پھر وہ مسجد کے باہر شدید سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ صبح کو جب وہ واپس جانے لگے "گاؤں کے نمبردار سے اُن کا آمنا سامنا ہوا اور گرفتار ہوئے۔ دوران تفتیش انہوں نے اس امر کا اقرار کیا کہ ہم چوری کے بہانے داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ کو اذیت دینے کی نیت سے آئے تھے۔ اقرار جرم کی پاداش میں قاضی الشہر میر عادل نے انہیں سزا کا مستوجب قرار دیا۔ ان میں سے ایک بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اُس نے بعد ازاں آکر معافی مانگی اور میرا مرید بنا۔"

اسی چلہ کے دوران ایک بار آپ کو کسی مسلہ کی تفسیر کی ضرورت محسوس ہوئی خود توجب نہیں سکتے تھے کسی سے گفتگو کرنے پر پابندی عائد تھی البتہ جو خادم خوراک لایا کرتا تھا کافی فہمیدہ اور ذہن تھا۔ آپ نے درپیش مسلہ کو کاغذ پر لکھ کر مسجد کی کھڑکی کے قریب رکھا خادم سمجھ گیا مکتوب جناب شیخ حمزہ تک پہونچانا مطلوب ہے اُٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے چند لمحات بعد مسجد میں جناب شیخ حمزہ کی گرجدار ڈانٹ بھری آواز یہ کہتے گونج اُٹھی۔

"تم تو ملا ہو درویشی تم سے نہیں ہوگی اگر یہی کرنا ہے تو واپس آؤ اور علاؤ الدین پورہ کے مکتب میں بچوں کو درس دو۔"

بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ سخت نادم ہوئے اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگے یہ حضرت سلطان العارفین رحمتہ اللہ علیہ کے کشف اور اپنے خلیفہ سے روحانی رابطہ کی ایک ایسی منہ بولتی تصویر ہے جس نے بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ جیسے عالم کو اُن کی عقیدت میں سرشار بنا کر رطب اللسان بنایا۔ اور جب خادم نوشتہ لیکر نشیمن گاہ مخدوم رحمتہ اللہ علیہ پر پہونچا تو آپ نے خط پڑھے بنا واپس لوٹا دیا۔ چلہ ختم ہونے کے بعد جب خادم نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تو حضرت خاکی نے فرمایا۔ آپ چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ حضرت نے مجھے ایسا درس دیا جسکو میں تازیست بھولے سے بھی نہیں بھول سکوں گا۔ پھر سارا واقعہ

دہرایا۔

غرض ان کی ریاضت، لگن اور مرشد سے عقیدت نے انہیں دوسرے مشائخوں سے برگزیدہ بنایا۔ جبھی تو حضرت سلطان رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اپنا فرزند منصبی بناکر وہ سب کچھ عطا کیا جو انہیں اپنے مرشد جناب جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے ودیعت ہوا تھا۔

اس چلہ کے اختتام پر آپ نے حضرت خضر علیہ اسلام سے کن حالات میں ملاقات کی اُس کی تفصیل آپ نے یوں بیان فرمائی ہے

"ایک رات نماز تہجد کے غسل کے خیال سے میں پاس کے چشمے پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چشمے کے بیچوں بیچ ایک شمشاد قد نورانی بزرگ سفید کپڑوں میں ملبوس پانی کی سطح پر کھڑے ہیں گمان گذرا چشمہ کا مؤکل ہے میں جھجک گیا اور سوچنے لگا اگر واپس چلا جاؤں تو نماز تہجد ہاتھ سے جائیگی آگے بڑھوں تو نہ جانے مؤکل کو زیر کرنے میں کتنا وقت ضائع ہوگا۔ میں نے فیصلہ لیا کہ اللہ کا نام لے کر آگے بڑھوں۔ کیا دیکھتا ہوں حضرت خضر علیہ اسلام ہیں آپ پانی کی سطح پر چلکر میرے سامنے آئے۔ دعا سلام کے بعد انہوں نے فرمایا۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے ایسا کرنا آئین تسلیم و رضا سے بعید ہے۔ میں نے چشموں کے بارے میں سوالات دریافت کئے

انہوں نے اُن کی حقیقت بیان کر کے یہ خوشخبری سنائی آج سے جب بھی چشمے پر جاؤ گے اُس کا مؤکل آپ کا استقبال کرے گا اور مرید ہوگا۔"

چلہ کشی کے اختتام پر آپ نے حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے کامراج کے ایک گاؤں اندرہامہ کے ایک چشمے پر خلوت نشینی کی۔ درود اعظم، مرزبہ مانی، جذب البحر

اسمائے عظام اور سورۂ یاسین پڑھتے رہے۔ اسی دوران انہیں غیبی کائنات کا کشف حاصل ہوا اور پھر جہاں جاتے تھے چشموں کی روحوں کا معائنہ کرتے۔ اُن سے ہمکلام ہوکر اُن کی تربیت کرتے رہے۔ اس ضمن میں بقول آپ کے حضرت خضر علیہ السلام کی امداد حاصل رہی۔ اور جناب بابا حیدر ریشیؒ جو باباہردے[1] ریشی کے اسم گرامی سے معروفِ زماں ہیں آپ کے دوست اور بلند پایہ مشائخوں میں سے ہیں کی مکمل امداد اور رہبری حاصل ہوتی رہی چنانچہ کشف حاصل ہونے کے بعد آپ ایک سو مریدوں کے ہمراہ کوثر ناگ کا مشاہدہ کرنے دیوسر کی پہاڑی پر گئے۔ اس مقام پر پہونچتے ہی گرج چمک کے ساتھ بجلی بارش اور اولے گرے۔ لیکن کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچا۔ آپ چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ چشمے سے ایک آسیب ابھرا اور کنارے پر آیا۔ آپ نے اس کو اپنے توبرہ تھیلے میں ڈالا۔ اور چادر باندھکر چشمے میں اُترے جہاں مؤکلوں کی ایک جماعت اکھٹا ہوئی اور مشرف بہ اسلام ہوکر بیعت کا نوشتہ مانگا۔ جب آپ چشمے سے باہر آئے تو کاغذ پر کچھ کلمات لکھکر سطح آب پر چھوڑا۔ اچانک ایک بڑا سانپ نمودار ہوا۔ تین بار آپ کی جانب سر کو نیچا کرکے کاغذ کو منہ سے پکڑ کر پانی میں غائب ہوا۔

واپسی پر بابا حیدر ریشیؒ (ہردے ریشی) کی ہدایت پر دو سو آدمیوں کی جماعت لے کر ہواسک ناگ اور کاجی ناگ کے چشموں پر گئے۔ وہاں کی غیبی مخلوق کو مسلمان بناکر

---

[1] باباہردے ریشی کے بارے میں کہا جاتا ہے جب حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ ان سے ملنے اسلام آباد گئے تو انہوں نے آپ کو دودھ سے بھری پیالی پیش کی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں علم معرفت سے پرُ ہوں۔ آپ نے پیالی میں گلاب کی چند پنکھڑیاں ڈالیں۔ پیالہ لب ریز ہوا لیکن دودھ نہیں گرا۔ حضرت باباریشیؒ یہ دیکھکر مسرور ہوئے اور اپنے مریدوں سمیت آپکی بیعت کی۔

انہیں بیعت کرلی۔ بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ کے اس ایڈونچر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کے خلیفہ بابا حسین علیؒ نے اپنی تصنیف تذکرۃ الابرار میں یوں لکھا ہے۔

"جب بابا داؤد خاکیؒ چشمے سے نکلے اُن کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پیالا اور مٹی کی ایک سربستہ ہانڈی تھی جو چشمے کے مؤکلوں نے انہیں بطور نذر پیش کی تھیں۔ پیالے میں چند سکے تھے جن کے ایک طرف عورت کی تصویر اور دوسری جانب راجہ ہرش دیو لکھا تھا یہ سکے مدت تک میرے پاس تھے"۔

حسین علی رحمتہ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں۔

"اس کے بعد آپ کوہ شاردا کے چشمہ شالوت ناگ تشریف لے گئے چشمے پہ پہونچکر آپ اس کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ دو آدمی چشمے سے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک چال ڈھال سے شاہزادہ جیسا تھا۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا میں شارک ناگ ہوں اور یہ میرا وزیر نیلہ ناگ ہے۔ ہم جناب کا استقبال کرنے آئے ہیں۔ جب آپ نے اُس سے شاپوتؒ[1] کا مطلب پوچھا اُس نے کہا دراوڑ زبان میں ایک لاکھ بیٹوں کے باپ کو شاپوت کہتے ہیں۔ یہ سارا علاقہ کوہستان دراوڑ کہلاتا ہے جس میں ایک لاکھ چشمے ہیں اور یہ سب میری اولاد ہیں"۔

بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ موضع ابہہ گام میں رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص لوہے کو چھیدنے اور کاٹنے والے عمدہ تیروں سے بھرا ترکش ایک قندیل میں ڈالکر حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے یہ تیر بے حد پسند آئے۔ میری استدعا پر اُس نے ان میں ایک سو تیر مجھے عنایت کئے۔ نیند سے بیدار

---

[1] بعض مورخین نے اسے شالہ پورچ لکھا ہے۔

ہو کر حیران رہا کہ اس کی تعبیر کیا ہے۔ ارادہ کیا شہر پہونچکر آپ کے گوش گذار کروں۔ نشیمن گاہ میں قدم رکھتے ہی حضرت مخدومؒ نے ارشاد فرمایا۔

"آج سے تم ہر نماز کے بعد سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر سو بار پڑھا کرو۔ یہ وہی سو تیر ہیں جو خواب میں تمہارے سپرد کئے گئے تھے۔"

اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگرچہ لا الٰہ الا اللہ سبھی پڑھتے ہیں مگر جب مرید کے سپرد کیا جائے تو اس کے معنی ہیں ترقی درجات ومقامات کا ذریعہ بن جانا اور مرید بھی مرشد بننے اور ارشاد کے قابل بن جاتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت شیخ حمزہ رحمتہ اللہ علیہ انہیں خراماں درجہ بدرجہ درود واذکار اور وظائف کی وساطت سے روحانیت کے منازل طے کراتے رہے ہیں۔

یہ حقیقت اپنی مسلّمہ ہے کہ آپ کو حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفوں اور مریدوں میں سب سے زیادہ ہمرکاب رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس نسبت سے آپ کو ان کے کشف کرامات ومشاہدات کا خاص موقعہ میسر ہوا ہے جس کا قصیدہ ورد المریدین میں آپ نے بار بار اعتراف وانکشاف کیا ہے۔ ذیل کا شعر ملاحظہ فرمائیے

ہم کرامتش ز نوع نشر وقت وطے حرف
همدمان مخلصان را بجہ با کثرت شد است

[بارہا آپکے پرخلوص ساتھیوں نے آپ کی کرامات جن میں نشر وقت
اور طے حرف شامل ہے کا مشاہدہ کیا ہے]

اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے حضرت خاکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت مخدومؒ کی خادمت گذاری میں مجھے تقریباً دو دہائیاں گذارنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ ایک روز نماز عصر کے بعد ہی کھانا دستر خوان پر چنا گیا۔ میں اُن سورتوں اور دعاؤں کو جو میری نماز عصر کے وظیفہ میں شامل تھیں ختم نہیں کر پایا تھا اور رفقا کے احتمال سے دستر خوان پر بیٹھنے میں تاخیر کی۔ جناب مخدومؒ نے میری اس حرکت پر ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا صوفی گری اور درویشی ہے کیا کھانا کھاتے وظیفہ پڑھ نہیں سکتے ہو۔ فی الوقت بھی کچھ ایسے خدا کے بندے ہیں جو کھانا کھاتے ختم تلاوت قرآن پورا کر لیتے ہیں۔"

اس پر تبصرہ کرتے آپ فرماتے ہیں یہ حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کا اپنی جانب اشارہ تھا لیکن ان کی سرزنش سے مجھے تقریباً بیس برس قبل کا وہ لمحہ یاد آیا جب میں نے آپ کے سوال کے جواب میں کہا تھا "وہ ایک سانس جو یادِ الٰہی کے بغیر گذرے ایک نبی کے قتل کے مترادف ہے۔" اپنے مرشد کے قول و فعل، راسخ الاعتقاد، راست گو، متقی اور معتبر ہونے کا سکہ مجھ پر اس طرح بیٹھ گیا کہ میں نے ان کی ہر ادا کی تقلید کو اپنا شعار بنانے میں مزید استواری پیدا کی۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا خاکی رحمتہ اللہ علیہ کے اس نظریہ کو یوں باندھا ہے ؎

نقطہ پرکار حق، مردِ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

۹۴۸ھ/۱۵۴۱ء میں مرزا حیدر کاشغری نے دوسری بار کشمیر پر حملہ کر کے سلطان فتح شاہ کے بیٹے نازک شاہ کو برائے نام کشمیر کا بادشاہ بنا کر خود عنان حکومت سنبھالی۔ اپنے دورِ اقتدار میں وہ شیعیت اور اسکی ترویج و تبلیغ کے خلاف

برسرپیکار رہا۔ خانقاہ جڈی بل کی آتشزدگی اور میر دانیال کا قتل اسی دور کی وارداتیں ہیں۔ وہ اثر ورسوخ بھی کم ہوتا گیا جو بعض شاہمیری بادشاہوں کی شیعہ امرا سے رشتے داری کی وجہ سے دائم وقائم تھا۔ بالآخر یہ حکومت کیسے ختم ہوئی اور غازی چک نے عنان حکومت کیسے سنبھالی تاریخ کشمیر کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے۔[1]

چکوں نے اپنی حکومت کی بنیادیں مستحکم بنانے اور اسے استوار کرنے کی حکمت عملی میں شیعہ فرقہ کے جذبات کو اچھالنے کو شامل کیا۔ شیعیت کو فروغ دینے کی آڑ میں شیعہ سنی منافرت کو بھی ہوا دی۔ غازی چک حضرت شیخ حمزہ مخدومی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی راہ کا بڑا کانٹا سمجھتا تھا اس لئے ان کے درپے آزار رہا اگرچہ انہوں نے حضرت بابا داؤد خاکی رح کے ذریعہ چک حکمرانوں کو یہ باور کرانے کی بھرپور کوششیں کیں کہ اہل سنّت کو شیعہ فرقے سے کوئی عداوت یا بغض وحسد نہیں اور یہ کہ سنی حضرات حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کے حبّ واحترام میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں بابا داود خاکی رح نے امن واتحاد ویک جہتی اور اسلامی مساوات وبرادری اور برابری کے جذبات قائم کرنے کے لئے جولافانی اور تاریخی سعی کی اسکی ناکامی کی تمامتر داری چک حکمرانوں پر ہی عاید ہوتی ہے۔ جب غازی چک ہر محاذ پر ناکام رہا تو بالآخر اس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو شہر بدر ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ رح بیروہ چلے گئے۔ حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد برحق کی اجازت سے بغرض

---

[1] ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں ایک دن بادشاہ وقت سلطان حبیب شاہ سے بھرے دربار میں ہوا خطا ہوئی جسے آداب شاہی کے خلاف کہکر علی شاہ چک نے اسکے سر سے تاج شاہی اتار کر اپنے والد غازی چک کے سر پر رکھ دیا اور اس کی بادشاہیت کا اعلان کیا۔

زیارت بزرگان دین عازم سفر ملتان ہوئے جہاں آپ نے حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریاؒ[۲]
جناب صدر الدینؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید
جلال الدین[۱] بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ مبارک پر حاضری دی۔ اُوچھ میں قیام کے
بعد لاہور میں کچھ عرصہ رہے یہیں آپ کی ملاقات حضرت مخدوم عباسیؒ ملتانی کے فرزند
مخدوم حاجی احمد فارشیؒ سے ہوئی۔ انہیں اپنے ساتھ کشمیر لے آئے۔ حضرت بابا داود خاکیؒ
کی مراجعت پر حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے ۸ ماہ رمضان ۹۶۹ھ میں آپکو
باضابطہ خلعت وارشاد کی سند سے سرفراز کر کے مسند ہدایت پر جلوہ افروز کیا۔

حضرت مخدوم رحمۃ اللہ کے بیروہ چلے جانے کے کچھ عرصہ بعد غازی خان چک
کو جذام کا مرض لاحق ہوا، علاج ومعالجہ سے جب کوئی افاقہ نہیں ہوا وہ سمجھ گیا یہ حضرت
مخدوم رحؒ کی ناراضگی کا نتیجہ ہے اس نے ولیعہد حسین شاہ چک کو آپ کی خدمت میں
بیروہ اس استدعا کے ساتھ بھیجا کہ میرے حق میں دعا کیجئے اور شہر واپس تشریف لائیے۔
آپ نے جواب میں فرمایا جب تک غازی خان زندہ ہے ہم شہر واپس نہیں جائیں گے
بہتر یہ ہے کہ تم فوراً واپس جاؤ اور اپنے باپ سے آخری ملاقات کرو حسین شاہ چک
جونہی شہر کی حدود میں داخل ہوا اُسے بادشاہ کی موت کی خبر ملی۔

---

[۱] آپ حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمۃ اللہ کے مرشد ہیں۔ ۹۳۲ھ میں کشمیر تشریف لائے
تھے اور آپ کو خلعت ارشاد اور سند خلافت عطا کی۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے
کہ کشمیر میں اہل سنت والجماعت کے جو مسلمہ چھ سلسلے ہیں (۱) سلسلہ قادریہ (۲) سلسلہ
سہروردیہ (۳) سلسلہ کرویہ (۴) سلسلہ نقشبندیہ (۵) سلسلہ ریشیاں (۶) سلسلہ چشتیہ۔ انہیں
حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ سلسلہ سہروردیہ سے منسلک ہیں۔

[۲] حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ آپ کے جد امجد ہیں

سلطان حسین شاہ چک اپنے باپ کے عبرتناک انجام سے واقف تھا لیکن اقتدار پر قابض رہنے کی جو پالیسی چکوں نے تشکیل دی تھی وہ اُس پر سختی سے کاربند رہکر طریقہ کار کی عمل آوری میں ردوبدل کو تقاضائے وقت کے مطابق مناسب سمجھا تھا۔ اقتدار کی لاٹھی اس کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ حضرت شیخ حمزہ رحمتہ اللہ علیہ کی روحانی طاقت اور قوت ایمانی سے خائف تھا۔ اس نے انہیں اپنے بس میں کرنے کی خاطر یہ تدبیر سوچی کیوں نہ خوشامد اور چاپلوسی سے کام لے کر ان کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں۔ چنانچہ درباریوں کے صلاح مشورے سے ایک اعلیٰ النسل کا عمدہ گھوڑا بطور تحفہ درباریوں کی ایک جمعیت کے ہمراہ بھیجا گیا۔ ایسا کرتے وہ اس حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھول گئے۔

"مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

یہی کچھ گھوڑے کو بظاہر نذر کرنے کے واقعہ سے ظہور پذیر ہوا۔ آپ نے درباریوں کو بیٹھنے کو کہا اور صوفی اللہ دادؒ سے کہا گھوڑے کو ذبح کرکے اس کا گوشت پکوا کر درباریوں اور صوفیوں کو کھانا کھلاؤ۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ حسین شاہ چک کو جب درباریوں نے گھوڑے کے انجام کا واقعہ سنایا اُسے اپنی ناکامی پر سخت رنج ہوا۔ اُس نے آپؒ کو پیغام بھیجا چونکہ جو گھوڑا آپ کے لئے بطور تحفہ بھیجا مطلوب تھا اس کے بدلے دوسرا گھوڑا آپ کی خدمت میں بھیجا گیا ہے براہِ کرم گھوڑے کو واپس کیجئے۔ بصورت دیگر پانچسو اشرفیاں اس کی قیمت ادا کیجئے۔ آپ نے بادشاہ کو جواب میں کہلا بھیجا کہ گھوڑا تو ذبح کیا گیا ہے رہا پانچسو اشرفیوں کا مطالبہ فقیروں کے پاس اشرفیاں کہاں ہوتی ہیں۔ حسین شاہ اپنے مطالبے پر بضد رہا اور یہ کہکر کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا دھمکیوں پر اُتر آیا۔ بادشاہ کی دھمکی سنکر آپ کا ایک مرید اپنے گھر سے سونے اور چاندی کے زیورات لایا۔ حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ سے ان کی قیمت پانچ سو اشرفیوں سے زیادہ ہے انہیں بادشاہ کو بھیجکر ہمیشہ کے لئے اس کا منہ بند کیجئے۔ سونے اور چاندی کے زیورات دیکھ کر بادشاہ کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا تو اُس نے

گھوڑے کی قیمت کا مطالبہ حذف کر کے گھوڑے کی واپسی کا مطالبہ دہرایا۔ اس پر آپ نے بابا صوفی اللہ دادؒ سے کہا گھوڑے کی کھال اور ہڈیاں جمع کر کے میرے سامنے لاؤ۔ حکم کی تعمیل ہوئی لیکن ایک ٹانگ کی ہڈی نہیں ملی اور وہ لکڑی کی بنوائی گئی۔ حضرت مخدومؒ نے قُم باذن اللہ کہا۔ گھوڑا اُٹھ کھڑا ہوا اور حسین شاہ کو بھیجا گیا۔ بادشاہ نے لکڑی کی ایک ٹانگ دیکھ کر کہا میرا گھوڑا گوشت پوست کا تندرست و توانا تھا اس بیکار گھوڑے کو لیکر کیا کروں گا۔ گھوڑا واپس کیا گیا۔ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ملا بابا احمد چاڈگیؒ کہتے ہیں آپ نے مجھ سے کہا "بابا احمد اس لکڑی کی ٹانگ پر ہاتھ رکھو اور خدا کی قدرت کا نظارہ کرو"۔ جونہی میں نے لکڑی کی ٹانگ پر ہاتھ رکھا وہ گوشت پوست کی بنی۔ گھوڑا بادشاہ کو بھیجا گیا اور وہ خاموش ہو گیا۔

اسی رات کو بادشاہ کے بدن پر بھگندر کے زہریلے پھوڑے ظاہر ہوئے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ حکیموں نے اسے لاعلاج قرار دیا۔ سب جانتے تھے کہ یہ حضرت مخدومؒ کے تئیں کی گئی گستاخی کی سزا ہے۔ لیکن ہیبت شاہی سے ہر لب بند تھا حسین شاہ چک کے حرم میں دو سُنّی بیگمات بھی تھیں انہوں نے حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آکر بڑی انکساری سے اپنے شوہر کی صحت یابی کے لئے دعا کی استدعا کی۔ آپ نے ان کی حال پر رحم فرما کر کہا "جاؤ اُس سے کہو آئندہ ایذا رسانی کی نیت سے توبہ کرے"۔ بادشاہ صحت یاب ہوا لیکن کچھ مدت بعد پھر اسی راہ پر گامزن ہوا۔

حضرت بابا داؤد خاکیؒ کو اپنے مرشد کی کرامات اور بادشاہ کی نادانیاں دیکھ کر جناب سرورِ کائنات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یاد آئی۔

"علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل"

[میری اُمت کے علمائے ربانی (اولیاء اللہ) بنی اسرائیل کے نبی جیسے ہیں]

اور دل کی گہرائیوں کو چھو کر اُن کے لبوں پر یہ دو شعر آئے ؎

فکر از باو رندار و این کرامت دور نیست

ہمے بو جہل سیہ دل معجزہ باور نداشت

[اس میں تعجب کی کونسی بات ہے اگر آپ کے منکرین کو اس کرامت پر یقین نہیں آیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے معجزہ کو دیکھ کر ابو جہل جیسے سیاہ دل کو اسلام کی صداقت اور نبی برحق کی نبوت پر یقین نہیں آیا۔]

منکرا انکار جانش سوئے کفرت مے کشد

کو ز خود فانی است ز و اوصاف حق مظہر شد است

[اے منکر تم ان کے بلند مرتبہ سے انکار کر کے کفر کے قریب تر پہونچے ہو جبکہ آپ فنافی اللہ ہیں اور آپ کی ذات گرامی سے اللہ تبارک تعالیٰ کے اوصاف ہویدا ہوتے ہیں۔]

حسین شاہ چک کی ناعاقبت اندیشی نے ملک میں طوائف الملوکی پھیلانے اور بغاوت کے شعلے بھڑکانے کو ہوا دی جس پر قابو پانے کے لئے اُس نے ۹۸۲ھ میں اپنے بھائی علی شاہ کے حق میں تاج و تخت سے دستبردار ہونے کا اعلان کیا۔

علی شاہ چک کے دورِ حکومت میں چکوں کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی آئی لیکن شاہزادہ یوسف شاہ چک کی بغاوت اور اقتدار پر قابض ہونے کی ہوس نے اُسے پریشان کیا۔ اسی دوران ۷ ماہ صفر ۹۸۴ھ کو حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ علیہ درد سر کے عارضہ میں مبتلا ہوئے اور ۲۴ ماہ صفر ۹۸۴ھ کو غسلِ دنیا کیا۔ آپ رح کے جنازے میں دو لاکھ کے قریب لوگوں نے شرکت کی جن میں بادشاہ وقت علی شاہ چک بھی شامل تھا۔ آپ کی وفات پر حضرت بابا داؤد خاکی رح نے فرمایا۔

" آپ بزرگ ترین ابدالوں میں سے تھے ۔ آپ نے ریاضت میں کمالات

حاصل کیئے۔ ہمیشہ قرب اور خوف خدا میں رہتے تھے اور انہیں علم الدنی حاصل تھا۔ علم الدنی کے معنی ہیں وہ علم جو پرہیزگاری کے صلہ میں خدا تعالیٰ انبیاءؑ اور مقرب اولیاءؑ کو علم بلاواسطہ غیرے سکھاتا ہے اور ایسے طالب کو عالم لدنی کہتے ہیں۔

اور پھر اس کی تشریح اپنی معرکۃ آرا تصنیف دستوار السالکین میں یوں کرتے ہیں۔

"جب سالک باللہ توحید کی حقیقت جانتا ہے اور پا لیتا ہے تو خداوند کریم اسے بغیر کسی واسطے کے علوم سے روشناس کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جس سے انبیاؑ اولیائے کرام کو سرفراز کیا گیا۔ اسی کا نام علم الدنی ہے اور یہ علم اللہ تعالیٰ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ اصحاب میں بعض کو ان کی ضرب ریاضت کے پیش نظر بغیر کسی رابطہ یا استاد کے عطا کرتا ہے اور وحی خفی کے کاتب کے مخفی صفحہ پر درج ہوتا ہے۔ اس کا اونچا درجہ ہے جو نہ تقریر میں آسکتا ہے اور نہ اسکی عظمت کو تحریر سے احاطہ کیا جاسکتا ہے۔"

علم الدنی کے عالموں کی وضاحت کرتے بابا داود خاکی رحمتہ اللہ علیہ مشکواتی اپنی تصنیف ابرالاسرار میں لکھتے ہیں۔

"ظاہری عالم زمین اور ملکوں کے لئے باعث زینت ہے اور باطنی عالم آسمان اور ملکوتیت کی زینت ہیں اور ظاہری عالم باطنی عالموں کی برتری کا اعتراف کرتے ہیں۔"

۹۸۷ھ میں علی شاہ چک عیدگاہ سرینگر میں پولو کھیلتے گھوڑے سے گر کر انتقال کر گئے اور مرنے سے پہلے اس نے یوسف شاہ چک کو بادشاہ بنایا۔ ۹۸۸ھ میں اسے مبارک خان بیہقی نے معزول کرکے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا لیکن چھ ماہ کی مدت پوری

نہ کر پایا تھا کہ لوہر چک نے اقتدار سنبھالا اور یوسف شاہ چک کشمیر سے بھاگ کر فتح پور سیکری چلا گیا۔

شورشوں اور طوائف الملوکی کے اس عالم میں حضرت بابا داؤد خاکیؒ بحیثیت سجادہ نشین شیعہ سنی اتحاد اور آشتی باہمی امن کے لئے کوشاں رہے۔ یہ دور کتنا صبر آزما اور امتحان کا ہوگا اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔

وردالمریدین کا یہ شعر جس میں رسول مقبولؐ اور اہل بیتؓ کے تئیں محبت و عقیدت موجزن ہے اس امر کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ اس دور میں کیا کیا ریشہ دوانیاں تھیں کہ حضرت خاکیؒ کو کہنا پڑا۔

حُب اہل بیتم وجان محبوب ما
حضرت شبیر و دیگر حضرت شبر شد است

[ہم اہل بیت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستدار ہیں اور حضرت امام حسن مجتبیٰؓ اور حضرت امام حسینؓ شہید رضا رضی اللہ عنہما ہمارے محبوب ہیں]

آپ نے حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کے بعد کم و بیش تیس سال تک بڑے ہی صبر و ضبط سے نہ صرف اسلامی اخوت، رواداری، برابری اور برادری کے اصولوں کو اجاگر کرنے میں تن دہی سے اپنے شب و روز گذارے بلکہ تالیف و تصانیف کے اس علمی ذخیرے کو بھی پایہ تکمیل تک پہونچایا جو گذشتہ پانچ صدیوں سے اسلامیان کشمیر کو خداشناسی اور رشد و ہدایت دینے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ قصیدہ وردالمریدین ——— حضرت شیخ حمزہؒ کے حالات و مکاشفات
۲۔ قصیدہ جلالیہ ——— در مدح حضرت مخدوم جلال الدین بخاریؒ

۳۔ شرح قصیدہ جلالیہ ——— فارسی نثر

۴۔ دستور السالکین ——— قصیدہ دروالمرین کی شرح فارسی نثر

۵۔ قصیدہ لامیہ ——— در مدح حضرت شیخ حیدر ریشی عرف بابا ہردی ریشی رحمۃ اللہ علیہ

۶۔ مجموعۃ الفواید ——— در بیان دینی مسائل

۷۔ ضروری کلان ——— در بیان مسائل فقہ متعلق نماز، وضو، زکواۃ۔ وغیرہ

۸۔ قصیدہ غسلیہ ———

۹۔ ضروری خورد ——— مسائل دینی

۱۰۔ شرح قصیدہ لامیہ ——— فارسی نثر

اس عظیم الشان کارنامے کے علاوہ اس مدت میں آپ کے دست حق پرست پر حضرت ابو الفقراء بابا نصیب الدین غازیؒ، حضرت بابا داؤد بہ ناویؒ، حضرت بابا داؤد گھنیؒ، اور حضرت بابا داؤد مشکواتیؒ جیسے پایہ کے باوقار عالموں اور اولیاء اللہ نے بیعت کی۔

اسی مدت میں یوسف شاہ چک نے فتح پور سیکری میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر سے باجگذاری کے وعدے پر امداد حاصل کی اور مغل فوج کے ساتھ لاہور پہونچا جہاں اس کے وزیر اعظم محمد بٹ نے جلاوطنی کے عالم میں فوج جمع کی تھی۔ یوسف شاہ چک نے اس کے مشورے پر مغل افواج کو چکمہ دے کر اسی فوج سے حملہ کر کے ۹۸۶ھ میں لوہر چک کو شکست دیکر دوبارہ کشمیر پر قبضہ کیا اور اپنے بیٹے یعقوب شاہ چک کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ حضرت ایشان یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ کو مغل دربار میں کشمیر کا سفیر مقرر کر کے بھیجا۔ ایک سال فتح پور سیکری میں رہکر حضرت یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ اکبر کا یہ واضح حکم

وہدایت لیکر واپس لوٹے کہ شہنشاہ کی اطاعت گذاری کے لئے ذاتی طور حاضر ہو جاؤ۔ یوسف شاہ چک نے اکبر بادشاہ کے حکم کو ٹالنے کی خاطر یعقوب شاہ کو فتح پور سیکری بھیجا جو سال بھر وہاں رہکر بھاگ کر کشمیر واپس آیا جس پر اکبر بادشاہ کا برفروختہ ہونا قدرتی امر تھا اس نے سلطان کشمیر کی فریب کار کے جواب میں طیش میں آکر بھگوان داس کی سرکردگی میں کشمیر پر یلغار کی لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے اُسے پسپا ہونا پڑا۔ بھگوان داس نے مراجعت سے قبل یوسف شاہ چک کو پیغام بھیجا تمہارے لئے بہتر یہ ہے کہ شہنشاہ کے سامنے اطاعت گذاری کے لئے حاضر ہو جاؤ ورنہ موسم بہار میں تم پر ایک لاکھ فوج سے حملہ کیا جائے گا۔ اسی دھمکی سے حواس باختہ ہو کر اُس نے خود سپردگی کے طور پر اپنے آپ کو بھگوان داس کے حوالے کیا اُسے گرفتار کر کے قیدی بنایا گیا۔

کشمیر میں مسلسل خانہ جنگی، اقتصادی بدحالی، مذہبی اور سیاسی رسہ کشی، سرحدوں پر دشمن کی فوج کا اجتماع اور امن داماں کے فقدان کے دوران یعقوب شاہ چک نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا جسکو منجملہ کشمیریوں نے قبول کیا لیکن یعقوب شاہ چک نے مندرجہ صدر خطرات سے لاپرواہ ہو کر اپنی پہلی فرصت میں اپنے کچھ پیشروؤں کی پالسی اپنائی لوہر چک نے سُنیوں کی ناراضگی اور غم وغصہ سے شہ پاکر بادشاہ کی معزولی اور نئے بادشاہ کی حیثیت میں شمس چک کپواری کا نام تجویز کیا۔ وزیر اعظم علی ڈار نے لوہر چک کا ساتھ دیا۔ محمد بٹ نیا وزیر اعظم بنایا گیا۔ سنی مسلمانوں کی جانب سے قاضی موسیٰ نے، جو مفتی اعظم کے عہدے پر مامور تھے، باغیوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور سات دن کی شدید معرکہ آرائی میں میدان جنگ یعقوب شاہ چک کے ہاتھ آیا شمس چک کپواری گرفتار کیا گیا۔

یعقوب شاہ چک نے جنگ جیتنے کے نشہ میں اذان کے مسئلے کو لیکر مفتی اعظم قاضی موسیٰ کو بھرے دربار میں قتل کرنیکا حکم دیا۔ قاضی موسیٰ کے نام کیساتھ شہید کا لفظ گذشتہ پانچ سو برسوں سے

یعنی انگوٹھی میں نگینہ کے مانند جڑ گیا ہے اس روز شہر میں زور کی آندھی چلی۔ بجلی کڑکی جس سے یعقوب شاہ کے محل میں آگ لگی علی ڈار کی بیوی اور کئی دوسری عورتیں آندھی کی تباہ کاری کے نتیجہ میں ہلاک ہوئیں۔

قاضی موسیٰ کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ملک کشمیر کے خاور و باختر میں آناً فاناً پھیل گئی، اطراف و اکناف سے لوگ سرینگر میں جمع ہو کر اُن کے نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے، انہیں ملہ کھاہ[1] کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ وفات لکھی۔

قاضی دیں در رہ رب مجید
بہر دیں جام شہادت در کشید
بہر تاریخ وصالش گفت دل
از تجلی آمد ایں موسیٰ شہید
۹۹۳ھ

قاضی[2] موسیٰ کو قتل کرنے کے پسِ منظر میں ایسی سیاسی و مذہبی بالادستی قائم کرنا مطلوب تھی جس میں انفرادی اور اجتماعی آزادی کا گلا گھونٹ کر فردِ واحد کے آمرانہ ذہن کے فکری منصوبوں کو روبعمل لایا جاتا۔ چونکہ قاضی موسیٰ شہید قاضی القضا

---

[1] ملہ کھاہ کا یہ قطعہ ارض حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان قطب الدین کے زمانے میں خرید کر مسلمانوں کے قبرستان کے لئے مخصوص کیا۔ اُس زمانے میں اس کے حدود خواجہ یاربل سے نوہٹہ تک تھے لیکن مسلمانوں کی غفلت شعاری سے اب اس میں گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے سڑکیں، کھیل کے میدان کے علاوہ بعض لوگوں نے مکانات بھی تعمیر کئے ہیں۔ اگر اوقاف اسلامیہ چاہئے تو آج بھی یہ قبرستان مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا نمونہ بن سکتا ہے۔ حاشیہ[2] اگلے صفحہ پر

کے اہم عہدے اور سنی عقائد و سیاست کے محور تھے۔ اس لئے یعقوب شاہ چک نے انہیں ہدف ستم بنا کر یہ تاثر دینے کی سعی کی کہ جو کوئی بھی میری راہ میں حائل ہو گا اُسے خس و خاشاک کی طرح اُڑایا جائیگا۔ اسکے اس ناعاقبت اندیشانہ فعل نے ہر ذی ہوش فرد کو چونکا دیا۔ حضرت شیخ بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت کا ارادہ کیا۔ آپ کے جانثار مرید جمع ہو گئے۔ آپ سے استدعا کی کہ آپ ہمارے ہاں تشریف رکھئے یعقوب شاہ سے ہم نپٹ لیں گے۔ آپ نے جواب میں کہا۔ "پھر ہجرت کیسے ممکن ہوگی"۔ بہر کیف آپ کہاں ہوتے ہوئے سیالکوٹ پہنچ گئے" ادھر حضرت شیخ یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی رازداری سے صاحب الرائے با اثر اور فہمیدہ اصحاب پر مشتمل ایک وفد تشکیل دیا جس میں بہرام خان سپہ سالار افواج کشمیر، فتح خان رئیس دربار، حیدر چک (یعقوب شاہ چک کا بھائی) اور کئی دوسرے سرکردہ احباب شامل تھے، فتح پور سیکری روانہ ہوا۔ سیالکوٹ میں حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ نے شمولیت کی۔ وفد اور شہنشاہ اکبر کے مابین ایک معاہدہ طے پایا اور مغل افواج نے امیر البحر قاسم خان کی سربراہی میں کشمیر پر حملہ کیا اور ۷ ماہ ذی القعدہ سنہ ۹۹۴ھ بمطابق ۲ اکتوبر ۱۵۸۶ء کو مغل افواج

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۵: سلطان زین العابدین کے دور میں میر علی محمد قاضی القضات کے عہدے پر متعین تھے۔ ان کے داماد میر سکندر کے دو بیٹے تھے قاضی محمد ابراہیم اور قاضی موسیٰ۔ قاضی موسیٰ نے اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر کے قاضی القضات کا منصب حاصل کیا۔ حضرت شیخ حمزہؒ کے مرید اور دامن سے وابستہ تھے۔ سنی مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی قائدین میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ ملہ کھاہ کے قبرستان میں آج ان کی قبر محفوظ ہے جسے دیکھ کر ہر حریت پسند انسان کا سر احترام جھک جاتا ہے اور اس باجرات باوقار و سرفروش مجاہد کے عزم و استقلال کو مرحبا کہتا ہے۔

کشمیر میں داخل ہو گئیں۔

معاہدہ طے ہونے کے ساتھ ہی حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت بزرگان دین کے لئے وہیں سے ملتان چلے گئے اور مراجعت کے دوران اُن کو ملیریا کا عارضہ لاحق ہوا۔ سرینگر میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد حضرت بابا ہردے ریشی[1] رحمۃ کے آستانہ کی زیارت کے لئے اسلام آباد چلے گئے جہاں ۱۴ ماہ صفر ۹۹۴ھ کو اٹھاسی سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی انا للہ وانا علیہ راجعون کچھ عرصہ بعد آپ کے مرید اور خادم حضرت زین الدین رحمۃ رینہ واری نے خواب میں حضرت شیخ حمزہ رحمۃ کو خواب میں یہ ہدایت دیتے دیکھا کہ بابا خاکی رحمۃ کو میرے پہلو میں آسودہ کرو۔ آپ نے یہ خواب کئی دوستوں کو سنایا اور یہ طے پایا کہ آپ کے جسد مبارک کو سرینگر پہونچانے میں مغل فوجی گورنر قاسم خان کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اور یہ مہم اس کی نگرانی میں اختتام پذیر ہوئی۔ کہا جاتا ہے جب گورکن نے قبر کھولی تو وہ یہ دیکھکر حیران ہوا کہ بابا ہردے ریشی رحمۃ آپ پر اپنی باہیں ڈالے لیٹے ہوئے ہیں وہ گھبرا کر میت کو ہاتھ لگائے بنا قبر سے باہر نکل آیا۔ اور قاسم خان کو سارا واقعہ سناتے ہوئے کہا انہیں بابا ہردے ریشی رحمۃ اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ قاسم خان نے قدرے تحمل سے جواب دیا۔ آپ جا کر بابا ہردے ریشی رحمۃ کے کان میں کہہ دیجئے یہ حضرت مخدوم رحمۃ کا حکم ہے۔ بات گورکن کے پلے پڑی۔ قبر میں واپس جا کر صرف بابا داؤد خاکی رحمۃ کے جسد مبارک کو دیکھا غرض اسطرح آپ کو بڑے ہی عزت و احترام کے ساتھ اسلام آباد سے لاکر آستانہ حضرت سلطان العارفین رحمۃ کے روضہ مبارکہ میں حضرت مخدوم رحمۃ کے پہلو میں آسودہ کیا گیا۔

---

[1] حضرت بابا ہردی ریشی رحمۃ ۹ ماہ رجب ۹۰۹ھ بروز جمعہ موضع کاونی اپنے جواب اسلام آباد کہلاتا ہے میں شیخ عبداللہ جو پیشہ کے لحاظ سے لوہار تھے کے ہاں تولد ہوئے۔ بڑے ہی کشف و کرامات اولیاء ہیں۔ حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ نے آپکے روحانی کمالات سے متاثر ہو کر قصیدہ لامیہ آپ مدح میں لکھا ہے آپ ۱۴ غرہ ذالقعدہ ۹۸۶ھ کو اسلام آباد میں نقل دنیا کر گئے۔ آپکی زیارت گاہ مرجع خاص و عام ہے۔

کتابیات:-

۱۔۔ سوانح حیات حیات سلطان العارفین شیخ حمزہؒ ــــــ پروفیسر طیب شاہ صدیقی

۲۔۔ شیخ حمزہ ــــــ مولانا سیف الدین قاری

۳۔۔ وردالمریدین ــــــ بابا داؤد خاکیؒ

۴۔۔ سلطانی منظوم ــــــ مولانا بہاؤالدین متو

۵۔۔ تصوف جزیات دستور السالکین بابا داؤد خاکیؒ مترجم ــــــ مولانا سیف الدین قاری

۶۔۔ دستور السالکین فارسی ــــــ بابا داؤد خاکیؒ

۷۔۔ رسالہ سلطانیہ ــــــ بابا شیخ احمد چاگلیؒ

۸۔۔ تحفۂ محبوبی ــــــ خواجہ غلام محی الدین مدیر اخبار کشمیر امرتسر ۱۹۳۱ء

۹۔۔ سیرت النبیؐ ــــــ مولانا شبلی نعمانی۔ سید سلیمان ندوی

۱۰۔۔ بہارستان شاہی ــــــ

۱۱۔۔ الفاروق ــــــ مولانا شبلی نعمانی

۱۲۔۔ اسرار الابرار ــــــ حضرت بابا داؤد مشکواتیؒ

۱۳۔۔ تاریخ اولیائے کشمیر ــــــ پیر حسن شاہ کھویہامہ

۱۴۔۔ تاریخ اقوام کشمیر ــــــ محمد الدین فوقؔ



پروفیسر محمد ابراہیم

شیخ یعقوب صرفیؒ

حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کشمیر کے ایک بلند پایہ روحانی پیشوا ہی نہیں، ایک بلند پایہ شاعر، مستند عالم اور سیاستدان بھی تھے۔ آپ کا نام شیخ یعقوب اور صرفی تخلص تھا۔ باپ کا نام میر حسن تھا جو ذات کے گنائی تھے۔ حضرت صرفیؒ اپنے والد کے بارے میں کہتے ہیں ؎

پدرش کہ بخشش باد خشنود رواح	بروحش ز حق صد ہزاراں فتوح
حسن نام او ہمچو اخلاق او	کف داصغان کوتہ از طاق او
یکار جہاں بودہ است از ملوک	براہ ایش قدم در سلوک
بہ معنی و صورت فضیلت شعار	دلش بہ گنج اسرار پروردگار
بفضل حق از حشمت دینوی	میسر شدش دولت معنوی
ملوے کہ کسبی است آموختہ	کمالات وہبی ہم اندوختہ
بظاہر در اشغال دنیا مدام	بباطن ہمہ کار دینش تمام

صاحب تحائف الابرار فی ذکر الاولیا الاخیار صفحہ ۱۴۳ پر بابا عثمان اُچپ گنائی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ گنائی اس مُلک (یعنی کشمیر) کی زبان میں لکھنے والے کو کہتے ہیں اور یہ لفظ مفتی سے پٹواری تک سب پر عام ہے۔ مفتیانِ کشمیر پر غالباً لفظ گنائی کے اطلاق کی وجہ یہ ہے کہ وادی کشمیر میں سب سے پہلا قبیلہ جو بکثرت علوم دینیہ عربیہ کی جانب متوجہ ہوا وہ یہی گنائی قبیلہ تھا۔ چنانچہ کشمیر کے بیشتر نامور علما اور مفتیانِ کرام اسی قبیلہ میں ہوئے۔ بہرکیف ابو محمد حاجی محی الدین مسکین (تحائف الابرار فی ذکر الاولیا الاخیار صفحہ ۱۴۳) کے بقول واعظ مولوی محمد یحیٰی متوفی ۴ر رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ (سنیچر ۔ ۷ر مئی ۱۸۹۲ء) نے حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری کو حضرت عاصم بن عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے احفاد (پوتوں) سے بتایا ہے۔ اس کی تائید عبدالوہاب شائق کے اِن اشعار سے بھی ہوتی ہے ؎

زہے مظہرِ لطفِ پروردگار ۔۔۔ بعلم و عمل عارفِ نامدار
بود عاصمی آن محیطِ علوم ۔۔۔ کہ قاصر شد از وصفِ ذاتش فہوم
ز احفادِ عاصم کہ آن نیک خو ۔۔۔ بُدہ ابن فاروقِ اعظم نکو
ز شیخ حسن بود این خوش نسب ۔۔۔ ز اعیانِ کشمیر بودش لقب
گنائی لقب داشت این عاصمی ۔۔۔ کشادہ خدایش درِ محرمی
گنائی است دانا بعرفِ دیار ۔۔۔ بعثمان گنائی شد او یارِ ہمد
بآن شیخ عثمان نظیر آمدہ ۔۔۔ وے علم این دل پذیر آمدہ
ز کشمیر مثلش کسے بر نخاست ۔۔۔ ز وصفش مقصر فہوم رساست
ز لطفش حق داد فہم و ذکا ۔۔۔ بعلم لدُنّی دلش باصفا

[شیخ یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ کیا خوب مظہر کردگار (کرم کردگار کی ظاہر ہونے کی جگہ) تھے اور علم و عمل میں عارف نامدار ـــــ

آپ عاصمی علم کے سمندر تھے۔ آپ کے اوصاف سے عقول قاصر ہیں۔ اس نیک خو کا تعلق عاصم ابن فاروق رضؓ کے پوتوں سے تھا اور شیخ حسن گنائی کی اولاد سے تھے۔ گنائی کا لقب، آپ کو اعیانِ کشمیر سے ملا تھا۔ عاصمی گنائی پر اللہ نے محرم اسراریت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس ملک کی زبان میں گنائی دانا کو کہتے ہیں۔ شیخ حسن گنائی عثمان گنائی کا یار غار ہونے کے ناتے اُس کی نظیر تھا۔ تاہم شیخ یعقوبؒ علم میں دل پذیر تھے۔ اُن جیسا کشمیر سے کوئی نہیں اُٹھا ہے۔ عقول اُن کے اوصاف سے قاصر ہیں۔ طفولیت ہی سے از طرف خدا مالک ہاہم دُنکا تھے نہ علم لدنی (خدا کی طرف سے عطا کردہ علم) سے اتصاف تھا]

تاہم صاحب تحائف کا "می گویند" (کہتے ہیں) کا تعبیر، متذکرہ صدر روایت کے ضعف کو ظاہر کرتا ہے۔ بہر کیف اللہ رب العزت حقیقت حال بہتر اور خوب جانتا ہے۔

حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کے والد ماجد شرفائے کشمیر سے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو سات فرزند عطا کئے تھے جن کے نام بشمولیت حضرت شیخ صرفیؒ یہ ہیں: شیخ کمال، شیخ محمد شریف، شیخ نوروز، شیخ محمد، شیخ ابراہیم، شیخ حیدر اور شیخ یعقوب صرفی رحمتہ اللہ علیہ۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

ہمہ ہفت تن بودہ اور اپسر	چو ہفت اختر آسماں جلوہ گر
کمالش بہر فن و نامش کمال	کمالاتش افزوں از حد مقال
مرا زاں میاں رتبہ حد وسط	کلاں تر ز من لیک یک کس فقط
ز من خورد تر آں بفطرۃ لطیف	کہ نام وے آمد محمد شریف

انزو خورد تر شاہِ نور وز نام | بحسب کمالات عالی مقام
پس انزوے محمد کہ آمد بہ من | ازاں جملہ ہم صحبت و ہم سخن
براہیم انزو خورد تر آمدہ | ز اسرار دیں باخبر آمدہ
انزو خورد تر حیدر رنگ خوست
فرشتہ خصال و ملک خوے اوست

بموجب نگارشِ عبد الوہاب شایق جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری علیہ الرحمتہ ۹۲۸ھ (۱۵۲۲ء) میں متولد ہوئے[1]۔ اس سلسلے میں شایق[2] کا یہ شعر ہے ؎

سنہ نہصد و بیست و ہشت بود | کہ ایں شیخ دین آمدہ در وجود

(سنہ ۹۲۸ھ تھی کہ دین کے یہ شیخ (بزرگ) وجود میں آئے تھے۔)
سات برس کی عمر میں درس قرآنِ پاک سے فراغت پالی تھی[3] اور اردو کی اس شہرہ آفاق ضرب المثل کے مطابق کہ "ہونہار برواکے چکنے چکنے پات" اسی عمر میں حضرت شیخ نے ایک فارسی غزل لکھی تھی جسکا مطلع یہ ہے ؎

اے رُخِ مہ طلعتاں آئینہ روئے توام | میل خوباں ندہوائے روئے نیکوئے توام
گر بیوم عنبرِ سارا و گر مشکِ ختن | در دماغ جاں نمی آید مگر بوئے توام

(اے ماہ طلعتوں کے چہرہ میں تیرے چہرہ کا آئینہ ہوں اور تیری حسین وجمیل صورت کا آرزومند ہوں۔ خواہ عنبر سونگھوں یا مشک ختن، دونوں صورتوں میں میرے دماغ میں صرف تیری ہی خوشبو آتی ہے۔)

---

[1] شیخ جی "سال پیدائش" ہے جس سے ۹۲۸ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں
[2] مسکین نے بھی یہی سال نظم کیا ہے۔
[3] واقعات کشمیر کے مطابق سات برس کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

گویا حضرت صرفیؒ نے شعر گوئی کا آغاز سات آٹھ سال کی عمر میں کیا۔ ابتدا میں اپنے والد ماجد سے اصلاح لیتے رہے اور بعد ازاں ملا آنی سے درس و تدریس حاصل کی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

چو در سالِ ہشتم نہادم قدم	ز طبعم رواں گشت شعرِ عجم
پدر کردے اصلاح اشعارِ من	باصلاح بودے مددگارِ من
سپردند آنگہہ مرا با یکے	کہ بود ست از اولیائے شکے
محمد ورا نام و آنی لقب	ز جامی گرفتہ فنونِ ادب
فن تعمیہ بردم از وے بکار	بنوعے کہ گشتم دراں نامدار
معما کہ فکرے است نزدِ خرد	بدیہہ ہمی گفتمے بے عدد
بہ سنِ صغیرم نہ کردہ نظر	مرا در تصوف شدہ راہبر

برسم تخلص منظم کلام

مرا صرفی آں نامور ماند نام

انہی دنوں معما گوئی میں بھی مشق سخن بہم پہنچائی تھی۔ حضرت شیخؒ نے عربی و فارسی کی اعلی التعلیم کے لئے مولوی محمد آنی کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ روایت کے مطابق مولوی محمد آنی عارفِ نامی مولانا نور الدین عبد الرحمان جامی قدس سرہ کے شاگرد بلاواسطہ تھے۔ انہوں نے شہر ہرات (افغانستان) میں مولانا جامی متوفی ۱۸ محرم الحرام ۸۹۸ھ (مطابق جمعرات ۸ نومبر ۱۴۹۲ء) سے تحصیل علم کی تھی۔ علاوہ ازیں فن معمہ میں حسین نیشاپوری سے تلمذ تھا۔ مولانا محمد آنی نے حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کو جامی ثانی کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جو خیال مولانا آنی غور و فکر کے بعد کہا کرتے تھے مولانا صرفی اُسے فی البدیہہ اور بہتر طور پر ادا کر دیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ عبد الوہاب نوریؒ کے بقول حضرت

شیخ یعقوب رح کا تخلص صرفی بھی مولانا محمد آنی ہی کا تجویز کردہ ہے۔ لکھتے ہیں:

"در باوجود صغر سن کہ ہمت ایشان مصروف بمرضیات الٰہی یافت صرفی تخلص شان گذاشت۔"

(اور چونکہ طفولیت ہی سے آپ کا ارادہ خدائی خوشنودیوں کی جانب تھا، مولانا آنی نے آپ کا تخلص صرفی (خدا کی جانب پھرنے والا) کر دیا)۔

حضرت شیخ یعقوب صرفی رحمتہ اللہ علیہ انیس ۱۹ برس کی عمر میں علوم عالیہ کی تحصیل سے فراغت پا چکے تھے۔

● ——— (فتحات کبرویہ قلمی ورق ۲۲۶ الف)

اندازہ ہے کہ کشمیر میں مولانا محمد آنی کا ورود ساٹھ یا پینسٹھ ۶۵ برس کی عمر میں ہوا ہوگا، کیونکہ باتفاق جملہ تذکرہ نگاران مولانا نور الدین عبد الرحمان جامی علیہ الرحمتہ ۷ محرم الحرام ۸۹۸ھ مطابق روز جمعرات، ۸ نومبر ۱۴۹۲ء میں اس سرائے فانی سے رخصت ہوکر اپنے معبود حقیقی سے جا ملے تھے۔ جامی کی وفات کے وقت مولانا محمد آنی کی عمر اگر بیس برس کی فرض کی جائے تو اس مفروضہ پر ۹۴۷ھ میں جو حضرت شیخ صرفی رح کی تعلیم کا سالِ اختتام ہے تو مولانا آنی ستر برس کے ہوتے ہیں اور اس کے گیارہ برس بعد یعنی ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں جب مولانا مرحوم ہو گئے تو اُس وقت اٹھتر (۷۸) کے ہو نگے۔ ملا آنی کے علاوہ مُلا بصیر خندہ بونی[1] اور

---

[1] مولانا بصیر خندہ بونی المعروف بہ ملا بابا اعمیٰ در زاد صاحب استعداد شد اداد بود۔ چشم از ماسوائے بستہ بہ دنیا آمدہ۔ از پرگنہ کامراج بشہر رسیدہ۔ ضبط علوم بے پایاں بدستور، حفظ قرآن در صغر سن کردہ باوجود عدم بصارت / باقی صفحہ ۳۱۲ پر

ملا رضی سے بھی استفادہ کیا۔ ملا رضی سے صرف و نحو میں استفادہ کر کے صرفی تخلص کو چار چاند لگائے۔ کہتے ہیں ؎

شدم در علوم دگر بہرہ گیر | ز ملا رضی در زحافظ بصیر
من ددو الدین مربائے او | بجاں بندہ خاص و مولائے او
از و علم صوفیہ آموختم | دقیقاتِ عقلیہ اندوختم
فنِ منطق و اصطلاحِ کلام | بدیع و بیان و معانی تمام

رضی آں بلند شاں و فضلش شگرف
ازو فقہ آموختہ وہم نحو و صرف

بقیہ حاشیہ گزشتہ: صوری؛ در بصیرت قلبی ہمتا نہ داشت۔ در عہد خود مرجع فضلا و فقرا بود و گویند بخضر علیہ السلام ملاقات کردہ فیوض و فتوح یافتہ۔ در سنہ نہصد و چہل و شش (۹۴۶ھ) وفات یافت۔ در خندہ بون مدفون گشت۔ حضرت شیخ صرفی در مرثیہ او چند بیت انشا فرمودہ آخرش ایں بیت است ؎

آں حافظ علم و ادب بودہ بصیر از فضل رب
تاریخ فوتش زاں سبب شد "عالم تفسیر داں"   (واقعات کشمیر صفحہ ۵۸)

۹۴۶ھ

---

۲ مولانا رضی الدین: از فضلائے وقت فخار بر روزگار بود و جامع علوم عقلیہ و نقلیہ در اواخر عہد سلاطین و اوائل زماں تسلط مرزا حیدر بدرس مدرسہ محلہ قطب الدین پورہ بود۔ در اکثر علوم تالیفات می کرد۔ چوں ارتحلت نمود۔ تاریخ وفات او یکے از اکابر گفتہ "میر در سجدہ جاں سپرد بحق" : ۹۵۶ھ

(واقعات کشمیر صفحہ ۸۲)

جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیریؒ علیہ
الرحمتہ ایامِ طفولیت میں اپنے ہم عمر دیگر لڑکوں کی طرح کھلنڈرے تھے ایک
دن والدِ ماجد کے فرمان سے ایک گاؤں میں تشریف لے گئے تھے (تذکرہ نگار
اس گاؤں کے نام کے ذکر سے خاموش ہیں) ہمجولیوں نے جب اس امر کی اطلاع
پائی تو بھوت کی طرح پیچھے ہو گئے۔ چونکہ یہ لنگوٹیا یار پابند شرع نہ تھے۔ انہوں
نے آپ کو بھی ساتھ ملانا چاہا۔ ہر چند آپ نے معذرت چاہی لیکن وہ بولے ؎

گر شکستہ شدہ یکے توبہ   صد تواں کردنش ازاں اولیٰ
ور شود شیشۂ شکستہ چو دل   ہست پیوند آں بسے مشکل

(اگر ایک توبہ ٹوٹ چکی ہے تو اس سے بہتر سو توبائیں کی جا سکتی
ہیں۔ لیکن اگر شیشۂ دل ٹوٹ گیا ہے تو اس کا پیوند انتہائی
مشکل ہے)۔

والد میر حسن کو جب اس امر کی اطلاع ملی تو فوراً آپ کو پاس کے گاؤں سے
بلوا بھیجا۔ دوسرے روز نماز فجر با جماعت ادا کرتے ہوئے یکایک شیخ یعقوب
صرفیؒ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور بیہوش ہو کر گر پڑے۔ نماز سے فارغ ہونے
کے بعد والدِ ماجد اور حاضرین کیا دیکھتے ہیں کہ آپ کا پاؤں زخمی ہے اور کپڑے
خون سے لت پت ہیں۔ گھر لیجانے پر معلوم ہوا کہ نماز فجر کی دوسری رکعت میں شاہ
ہمدان رحمتہ اللہ علیہ آپ پر جلوہ گر ہو کر محتسب[1] سید خلیل سے فرما رہے ہیں کہ اس

---

[1] محتسب حسلب لینے والا ــــ لیکن گذشتہ زمانوں میں اسلامی حکومتوں میں
ایک شرعی حاکم ہوتا تھا جو یہ دیکھتا تھا کہ مسلمان نماز، روزہ، حج اور زکواۃ اور اسی قسم
کے مذہبی امور پر عمل پیرا ہیں۔ جو لینے ذر شراب نوشوں کو / باقی بر صفحہ ۳۱۲ پر

گھوڑے کے پٹھے کاٹ دے تاکہ بھاگ نہ سکے۔ عین اسی وقت سید خلیل محتسب نے تلوار ماری اور آپ زخمی ہو کر گر پڑے۔ اس واقعہ کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے ؎

میر سید خلیل را فرمود   پے بکن ایں گریزپا را زود

[(حضرت امیر کبیر قدس سرہ نے) سید خلیل سے ارشاد فرمایا کہ اس گریزپا کے جلد ہی پٹھے کاٹ دے]

جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی رحمۃ کا عہد تصوف و عرفان کا تھا۔ علوم شرعیہ کے ساتھ ساتھ، جن کو علوم ظاہر کہا جاتا ہے، علوم باطنیہ یعنی روحانیت پر بھی زور رہتا۔ کشمیر چونکہ ایک چھوٹا سا ملک ہے اس لئے یہاں جدید رسوم جلد ہی رواج پذیر ہو جاتی ہیں۔ یہی معاملہ سلوک و معرفت کے ساتھ پیش آیا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ مائل بہ تصوف ہو گئے۔ بہر کیف حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری علیہ الرحمۃ جب علوم ظاہریہ سے سند فراغت حاصل کر چکے تو روحانیت

بقیہ حاشیہ ۱ درّے مارنا اور ان کی شرابیں گرا دینا محتسب کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔ ڈاکٹر بیلیو (DR. BELLEW) اپنی کتاب "کشمیر اینڈ کاشغر" کے صفحہ ۲۸۱ پر اس امر کا مفصل بیان لکھتے ہیں کہ محتسب کاشغر کے بازاروں میں اپنے مذہبی فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ مذہبی امور میں محتسب کی شدت حافظ شیرازی کے اس شعر سے بھی معلوم ہوتی ہے ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است   ببانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است

(ہوا اگرچہ فرحت بخش ہے اور پھولوں کی مہک چھان رہی ہے پھر بھی ستار کی آواز پر شراب نہ پی کیونکہ شاہ شجاع جسکو حافظ محتسب کہا کرتے تھے سخت تیز و تند ہے)

اور خدا طلبی کا ذوق و شوق دل میں جاگزین ہوا۔ آپ عمر کے بیسویں یا اکیسویں برس میں ہونگے کہ ایک پیر روشن ضمیر، جو بلند قامت اور سرخ چہرہ والا تھا خواب میں جلوہ گر ہو کر کہنے لگا کہ میں شیخ حسین خوارزمی ہوں۔ شاہ ہمدانؒ کی طرف سے میں تیری باطنی تربیت اور غور و پرداخت پر متعین ہوا ہوں۔ اس لئے فی الفور خود کو ادراک الہٰ پہنچا۔ اس خواب کے کچھ روز بعد خانقاہ معلی سرینگر کشمیر میں بقصدِ استخارہ خلوت اختیار کی۔ یہاں پر ایک رات شاہ ہمدانؒ خود جلوہ گر ہو کر فرما رہے ہیں:

"بیٹے میں نے تجھے مخدوم اعظم کی تحویل میں دے دیا ہے اس لئے فی الفور خوارزم پہنچ تب ہی ہمارے فیوض و برکات کا حقدار ہوگا۔"

اس واقعہ کے فوراً بعد سفر کی تیاری میں لگ گئے۔ والدین اس کٹھن مسافرت سے مانع ہوئے کیونکہ سولھویں صدی عیسوی میں بیرونِ کشمیر کا سفر مترادفِ مرگ متصور ہوتا تھا اس لئے کہ اُس وقت کے آدمی کی دُنیا بے حد مختصر تھی۔ بہر کیف والدین کی ممانعت بے سود ثابت ہوئی اور وہ راضی برضائے خدا ہوگئے۔ والدین کی اجازت کے بعد حضرت شیخ چار اشخاص کے ہمراہ (جن کے نام ہیں شاہ نوروز برادر شیخ، کوکہ یوسف، بوڑہ صوفی اور شیخ بہرام) اس دشوار اور کٹھن سفر پر براہِ پاہال روانہ ہو گئے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ ایک دن حضرت ایشان آگے جا رہے تھے کہ بوڑہ صوفی کا پاؤں پھسل گیا۔ قریب تھا کہ برف میں دھنس جاتا کہ امداد کے لئے حضرت شیخ کو پکارا۔ چنانچہ فی الفور پہنچکر اُسے مخمصے سے نجات دلائی۔ اسی طرح دوسرے رفیق یوسف کوکہ کو بھی موت کے منہ سے بچا لیا۔ سمرقند پہنچکر مخدوم عالم کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ حضرت مخدوم کے مکان کے سات دروازے تھے اور ہر دروازہ پر ایک خلیفہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب انہیں طلب کیا گیا تو حضرت مخدوم عالم انہیں اور وہ

آپ کو دُور سے ہی پہچان گئے کیونکہ اسی بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا تھا۔

دستور کے مطابق یہاں نو مرید کو خلیفہ کی تحویل میں دیا جاتا تھا مگر حضرت صرفیؒ کی بابت حضرت مخدوم عالم نے فرمایا کہ اس کشمیری نوجوان کا معاملہ جداگانہ ہے اسکی تربیت و نگہداشت میں خود کروں گا۔ تلقین اذکار کے بعد آپ کے ذمّہ یہ مقرر ہوا کہ آپ مخدوم عالم شیخ کمال الدین خوارزمی کے مطبخ کیلئے جنگل سے روزانہ لکڑی کاٹ کر لایا کریں۔ بعد ازاں چلہ نشینوں کی طہارت گاہ کی صفائی کا کام سپرد ہوا۔ یہ کام آپ کو سردی کے موسم میں بھی انجام دینا پڑتا تھا بہر کیف جب اس امتحان میں کامیاب رہے تو انہیں لنگر کے لئے پانی لانے پر مامور کیا گیا۔ آخر میں حضرت صرفی نے اُستادِ محترم کے کہنے کے مطابق خانقاہ ہی کے ایک تنگ حجرے میں چلّہ کشی اختیار کی اور حضرت شیخ سے علوم و فنون کے علاوہ روحانی و دینوی مسائل میں جانکاری حاصل کرتے رہے۔ اس دوران حضرت خوارزمیؒ نے زیارتِ حرمین شریف کے لئے عزمِ سفر کیا اور حضرتِ صرفی خطِ ارشاد لے کر از راہِ خراساں واردِ کشمیر ہوئے۔

حضرت صرفیؒ جتنی دیر سفر میں رہے اُس دوران میں اُن کی شہرت وطن کے گوشے گوشے میں پھیلتی رہی اور لوگ غائبانہ طور پر اُن کے علمی و روحانی کمالات کا چرچا سُن کر اُن کے گرویدہ ہوتے گئے چنانچہ جب آپ وطن واپس لوٹے تو عقیدت مندوں نے آپ کی خدمت میں جوق در جوق آنا شروع کیا اور آپ اُنہیں اپنے ارشادات سے مستفید کرتے رہے۔

جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفی علیہ الرحمتہ کا پہلا سفر جیسا کہ مذکور ہوا انیس برس[19] کی عمر میں ہوا۔ جس وقت آپ اپنے پیر و مرشد مخدوم عالم شیخ کمال الدین حسین

خوارزمی کی خدمت میں برائے استفادہ ترکستان تشریف لے گئے تھے۔ مراجعت پر کچھ عرصہ کشمیر میں قیام کے بعد دوبارہ از راہِ بغداد حرمین شریفین چلے گئے۔ بغداد شریف میں امام اعظم امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا جبۂ مبارک ہمراہ لائے۔ مشہد مقدس میں امام موسیٰ علی رضا رضی اللہ عنہ کا جو فرقہ اثنا عشریہ امامیہ کے آٹھویں امام ہیں عصائے مبارک اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی کلاہ مبارک حاصل کی۔ آگرہ میں حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقی ہوئے اور آپ سے طریقۂ چشتیہ کی اجازت حاصل کر لی۔ دہلی میں نماز معکوس (الٹی نماز) بموجب ارشاد نبوی شیخ عبد العزیز دہلوی سے حاصل کی۔ اور دہلی میں امام ربانی مجددِ الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ موخر الذکر کو آپ نے اجازت درس حدیث اور ارشاد نامہ سلسلہ کبرویہ عطا کیا۔

دوران سفر آپ نے ابن حجر ہشیمی ؒ سے درسِ حدیث لیا۔ اس سلسلے میں صاحب "تحائف الابرار فی ذکر الاولیا الاخیار" صفحہ ۱۰۱ پر رقمطراز ہیں۔

" و از خدمتِ قدوۃ المحدثین شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ در حرمین معظمین

ؒ شہاب الدین احمد بن محمد بن علی حجر شافی ۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۳ یا ۱۵۰۴ء میں مصر کے محلہ ہشیم میں پیدا ہوئے تھے۔ والدِ بزرگوار کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا تھا چنانچہ وقت کے بعض جلیل القدر اشخاص کی کفالت سے جامع ازہر میں جا کر مشغولِ علم ہو گئے۔ فقہ شافعی کے علاوہ دیگر علوم و فنون میں کامل دسترس حاصل کی۔ ہشیمی مذہب تسنن میں زیادہ پختہ اور متشدد تھے۔ ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء سے وفات تک جو ۹۷۴ھ یا ۹۹۴ھ بالترتیب ۱۵۶۶ء/ ۱۵۸۷ء) میں واقع ہوئی۔ مکہ میں مقیم مفتی حجاز تھے۔ آپ پانچ کتابوں کے مصنف ہیں۔

باخذِ سندِ احادیث و اجازتِ علم حدیث سرفراز و ممتاز گردید۔"

(اور محدثین کے پیشوا جناب ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسروں سے حرمین شریفین میں سندِ حدیث اور اجازتِ علم حدیث سے ممتاز اور سربلند ہوئے)

حضرت صرفیؒ کی وطن میں واپسی پر والیانِ کشمیر کی خانہ جنگیوں سے افراتفری اور اتھل پتھل کا بازار گرم تھا۔ مسلکی تعصب نے، جسے اہلِ اقتدار نے اپنی گدی بچانے کے لیے بطور ڈھال استعمال کیا، خفیہ سیاسی گروہ بندی وجود میں لائی جس میں ریاست کے وہ اہلِ قلم اور علماء و مشائخ بھی شامل ہوئے جو بادشاہ وقت کے طریقہ کار سے اختلاف رکھتے تھے اور ملکی نظام میں اہم تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ چنانچہ حضرت صرفیؒ کی معیت میں ایک وفد مغل شہنشاہ اکبر سے ملاقی ہوا۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ جو ان دنوں وطن سے باہر تھے، کو بھی اس وفد میں شامل کیا گیا ایک معاہدہ طے پانے کے بعد مغل افواج مرزا قاسم خان میر بحر یہ کی کمان میں ایک بڑے لشکر نے کشمیر پر دھاوا بول دیا۔ جنگ میں ایک بار مغلوں کو شکست ہوئی تو چک سرداروں کے ہاتھوں حضرت صرفیؒ کے قید ہونے اور آپ سے آپ کی علمی و روحانی فضیلت کے پیش نظر شایان شان سلوک روا رکھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ آخر کار یعقوب شاہ چک کی ہار ہوئی مغل اور افواج سلطنت کشمیر میں ذی قعدہ ۹۹۴ھ / جولائی ۱۵۸۶ء میں کشمیر میں داخل ہوئیں جب ملک میں حالات سدھر ے تو حضرت صرفیؒ نے پھر سے حرمین شریف کی زیارت کا ارادہ باندھا۔ اس سفرِ سعید میں انہوں نے کم و بیش ایک سال گزارا اور واپسی پر اپنے ساتھ مختلف ممالک سے تفسیر، فقہ، حدیث اور دیگر علوم کی بیش بہا کتابیں اور علمائے دین کی چیدہ چیدہ تصانیف ساتھ لائے۔ مشہور ہے کہ حضرت صرفیؒ کے کتب خانے

میں نادرِ روزگار مخطوطات کی تعداد ۵ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔
بروایت صاحب نفحات کبرویہ (ورق ۲۴۴ الف) چار آدمی اہلِ کشمیر پر اپنا حق رکھتے ہیں۔ اشاعتِ اسلام اور معرفت میں امیر کبیر علی ثانی میر سیّد علی ہمدانی قدّس سرہ کا حق ہے۔ کشمیر میں صنعت و حرفت اور کتب تفاسیر کی جمع آوری جو حرمین شریفین سے اس ملک میں لائی گئی ہیں سلطان زین العابدین حقدار ہیں۔ دیوان خانہ، حمام اور محل سراؤں کی تزئین کا سہرا میرزا حیدر کاشغری کے سر ہے، جبکہ کابل سے میوے اور پیوندی شاخیں جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی علیہ الرحمتہ کی بدولت لائی گئیں ہیں۔ البتہ نفحات کبرویہ کے ایک نسخہ میں میووں اور پیوندی شاخوں کا کابل سے کشمیر میں لانا ظفر خاں احسن کی طرف منسوب کیا گیا ہے جو بہ عہدِ شاہ جہاں جنت بے نظیر کشمیر کا صوبیدار تھا۔
حضرت صرفی رح کی شادی ۲۵ برس کی عمر ۹۵۲ھ میں سید علاؤ الدین ابن سیّد قیام الدین کی صاحبزادی سے ہوئی جن کے بطن سے ایک فرزند محمد یوسف پیدا ہوا لیکن انکا عالم جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ حضرت صرفی کی شہرت اُن کی زندگی میں ہی دُور دُور تک جا پہنچی تھی۔ چنانچہ وادی اور بیرون کشمیر کے سینکڑوں طالبین اور خواہشمند و سعادت مند شاگردوں نے اُن سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ ایک روایت کے مطابق اُن کے حلقۂ ارادت میں ایک ہزار سے زائد طلبا شامل تھے۔ اس بات سے تو سبھی واقف ہیں کہ حضرت صرفی کا شمار بلند پایہ علمائ اور مفکروں میں ہوتا ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے پیچیدہ سے پیچیدہ فنی اور علمی باریکیوں کی گرہ کشائی نہایت ہی نفاست اور احسن طریقے پر کرنے کے اہل تھے۔ حضرت صرفی رح نے تصوّف و معرفت، علم تفسیر و حدیث، شریعت و طریقت اور شعر و شاعری، غرض ہر مضمون پر قلم اُٹھایا ہے اور اپنی ذہنی اُپج و استعداد

کی بدولت ہمعصر علماء اور اہل قلم میں منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل رہے ۔ چنانچہ آئین اکبری کے مصنف کے بقول "در تمام انواعِ شعر و علوم مختلف تسلطِ کامل داشت" پڑھنا پڑھانا اُن کا زندگی بھر مشغلہ رہا ہے ۔ اِس کے علاوہ جب کبھی فارغ ہوتے تو اپنے ہمعصر علماء سے دینی اور مذہبی مسائل پر تبادلہ خیال بھی کیا کرتے ۔

دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) میں خطۂ کشمیر کے باہر وہ شخصیت جس سے جامع الکمالات کے خصوصی مراسم تھے "ملا عبد القادر بدایونی" کی تھی ۔ غالباً دونوں کا باہمی تعلق اور ربط اس وجہ سے تھا کہ ابوالفضل، فیضی اور راجہ ٹوڈرمل کی طرح اکبر کے نورتنوں (نو ہیروں) سے تھا ۔ دربار کا یہ تعلق بڑھتے بڑھتے دوستی اور یگانگت میں مبدّل ہو گیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ مُلّا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ میں جو اُسکی وفات کے بعد ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں بعہد جہانگیر منظر عام پر آئی" آپ کا ذکر بالتفصیل پاتے ہیں ۔ بقول مُلّا عبد القادر بدایونی شیخ یعقوب صرفی کشمیری علیہ رحمتہ جامع بزرگی و علمیت تھے ۔ مخدوم عالم شیخ کمال الدین حسین قُدّس سرّہٗ متوفی ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) سے نہ صرف روحانی فیض پایا تھا بلکہ براہِ راست جانشین اور خلیفہ تھے ۔ آپ کو حاجی الحرمین ہونے کا شرف بھی حاصل تھا ۔ دو بار حجِ بیت اللہ سے مشرّف ہوئے تھے ۔ حدیث شریف میں شیخ ابن حجر مکّی ہیثمی متوفی ۹۷۴ھ یا بقول بعض ۹۹۴ھ (بالترتیب ۱۵۶۶ یا ۱۵۸۶ء) سے تلمّذ تھا ۔ آپ نے عربی لباس زیب تن کر کے ممالک فارس، شام، ترکستان اور ہندوستان کا سفر کیا تھا اور مشائخ اولیاء کی مصاحبت سے مستفید ہوئے تھے ۔ ہندوستان اور کشمیر میں ارادت مندوں یعنی معتقدین کی تعداد بکثرت تھی ۔ آپ نہایت ہی عمدہ اور عالی شان کتابوں کے مصنّف ہیں ۔ نظامی گنجوی کے تتبع میں فارسی میں ایک خمسہ منظوم کیا ہے ۔ فن معمّا میں کئی ایک رسالے اور تصوّف رباعیات و غزلیات یادگار ہیں ۔ آپ کی تصانیف کا ذکر چند

سطور میں نا مکتفی بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ علوم کے تمام شعبوں پر حاوی اور قادر تھے۔ بالخصوص تفسیر و حدیث اور علوم عربیہ میں قابلِ اعتماد مذہبی و دینی رہنما تھے۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل قرآن پاک کی عربی تفسیر[1] لکھنا شروع کی تھی مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور یہ نیک کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ گزشتہ اور موجودہ شہنشاہوں (مراد ہمایوں اور جلال الدین محمد اکبر شہنشاہان ہند سے ہے) کے مقرب اور معتمد تھے۔ دونوں عزت و احترام سے پیش آتے تھے[2] اور دونوں نے آپ کو مصاحبت میں رکھ لیا تھا۔ معاصرین میں شیخ رحمہ موصوف سب سے زیادہ سخی اور دریا دل تھے ——— اتنے سخی کہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کہاوت کے پیش نظر کہ "عالم شاعر نہیں ہوتا" شاعری آپ کے مرتبہ سے بہت کم تھی اور اس لئے اس میں کمزور ہیں۔ البتہ اِدھر بھی متوجہ رہتے ہیں۔ لاہور سے اپنے محبوب وطن کو لوٹتے وقت جناب شیخ نے دریائے راوی کے پار سے بہت دور مجھے ایک خط لکھا تھا جسکو میں نے بطور ایک قیمتی یادگار کے اپنے پاس محفوظ رکھ لیا ہے، لکھا تھا:

"میرے معاون و طاقتور! صحیح دوستی کی دُعا اور سلام کے بعد آپ کے آفتاب جیسے روشن دل پر واضح ہو کہ تقاضئے دوستی تو یہ تھا کہ آپ اپنے دوست کی صحیح رہنمائی کرتے مگر بحالتِ موجودہ آپ یہ کام انجام نہ

---

[1] عربی کی اس تفسیر کا نام مفید الطالبین ہے۔ اس کا ایک عدد قلمی نسخہ جو انتہائی زشت خط ہے محکمہ تحقیق و اشاعت حکومت جموں و کشمیر کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔

[2] اس سے معلوم ہوتا کہ جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی رح کشمیر پر جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ ہند کے قبضہ سے قبل بھی خصوصی مراتب رکھتے تھے۔ (محمد ابراہیم)

دے سکے۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ آپ میری یاد نہ بھلاتے ہوئے غائبانہ یاد رکھنے کی عادت ڈالیں گے۔ مسودات کے لئے اگر آپ کو کشمیری کاغذ کی احتیاج ہے تو لکھئے تاکہ کشمیر سے آپ کے لئے روانہ کر سکوں۔ اس کاغذ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے روشنائی دھوئی جا سکتی ہے اور نشان باقی نہیں رہتا ہے۔ فقط والسلام مع الاکرام"۔

کشمیر پہنچنے پر جامع الکمالات کا دوسرا خط ملا عبدالقادر بدایونی کے نام اس مضمون کا تھا:

"منحی شیخ عبدالقادر کے حضور میں جو جملہ تعریفات سے آزاد ہیں یعنی علم دوانی میں ہمارے پیشوا ہیں۔ بدایونی علم میں یقیناً دوانی[1] سے بڑھ کر ہیں۔ جہاں تک میرے نام وقتاً فوقتاً آپ کے خطوط کا تعلق ہے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ لاثانی ہیں پھر بھی ایک مخلص دوست کا قلم ان کے جواب سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ امید ہے کہ جس وقت آپ فیضی فیاضی[2] کے حجرہ میں بیٹھے ظریفانہ گفتگو میں لگے ہوں گے، تب مجھ سے غم کے اسیر کو بھی ضرور یاد کریں گے۔ از راہِ کرم اپنے نیک اور عزیز فرزند شیخ محی الدین محمد کے لئے میرا آداب قبول فرمائیں گے۔ امید ہے کہ میران سید

---

[1] دوانی سے اشارہ علامہ جلال الدین گازرونی دوانی صدیقی متوفی ۹۰۲ھ مطابق ۱۴۹۷ء یا ۱۴۹۹ء کی طرف ہے جو منطق و فلسفہ کے عالم تھے۔ علامہ جلال الدین دوانی کیجانب ایک سو سے زیادہ تصانیف منسوب ہیں۔ یہاں شیخ صرفی نے دوانی اور بدایونی کے الفاظ میں بہ تکلف رعایت لفظی کا التزام کیا ہے۔

[2] ابوالفیض فیضی فیاضی شیخ مبارک ولد شیخ خضر ناگوری کے فرزند / باقی بر صفحہ ۱۲۵ پر

قطب الدین کے برعکس میرے مراسلہ کے جواب میں بے اعتنائی نہ برتیں گے۔ منظومات کی وہ نقل مجھ سے گم ہوگئی ہے جو میں نے اسمٰعیل خانی انداز میں لکھی تھی جس میں وہ کچھ تھا جو گذشتہ نقل میں نہ تھا۔ کیا آپ جیسے باعزت دوست نے وہ نقل مجھ سے لی ہے؟ اگر ایسا ہے تو نقل کی نقل مجھے بھیج دیجئے۔ اگر آپ خط کا جواب دیں گے تو بہت خوب ہوگا۔"

حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری علیہ الرحمۃ کو مُلّا عبدالقادر بدایونی کا جواب یہ تھا۔

"آپ کا میں کس طرح مدح سرا ہو سکونگا جبکہ آپ عبدالقادر کے سپاٹ اور بے کیف اسلوب سے بے نیاز ہیں۔ جو آدمی بھی آپ کے فصیح اسلوب کو میرے اسلوب سے امتزاج کی کوشش کریگا وہ درحقیقت

بقیہ حاشیہ ۃ - تھے۔ آزاد خیال ہونے کے باعث معاصرین میں بدنام تھے۔ روایت کے مطابق اکبر کے دین الٰہی کی تائید و اشاعت میں دیگر ہم خیال افراد کی طرح فیضی کا زبردست حصّہ تھا۔ بھائی ابوالفضل اکبر کا وزیر اعظم اور فیضی ملک الشعرأ تھے۔ فیضی کی کنیت ابوالفیض اور لقب فیاضی دونوں اپنے چھوٹے بھائی ابوالفضل اور اُس کے لقب علّامی کی متابعت میں تھیں فیضی ۱۰ صفر سنہ ۱۰۰۴ھ (اتوار ۵ اکتوبر ۱۵۹۵ء) میں فوت ہوکر اکبر آباد یعنی آگرہ میں دفن ہوئے۔ یہ شعر اُن کی جانب منسوب ہے ؎

زاہد سخن ز مشربِ توحید می کنی ۔۔۔ تحقیق کردہ ایم کہ تقلید می کنی

"قاعدۂ الحاد شکست" مادہ تاریخِ وفات ہے۔

سمندر کو بوتل میں سمونے کا قایل ہے۔ (یہاں ایک فارسی رُباعی دانستہ قلمزد کر دی گئی ہے) جب سے آپ اپنے وطن عزیز کو جہاں آپ رہتے ہیں رخصت ہوئے ہیں تب سے راز غیبی کے ترجمان نے تہوار کی آمد سے قبل تھوڑا سا خوش کیا ہے۔ بادشاہ سلامت نے جو عظمت و علو شان آفتاب ہیں میری طرف سے بلا کسی درخواست کے زبانِ مبارک سے اجمیر کے اعلیٰ وارفع مقام پر واقع درگاہ (مراد آستانہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ) کی تولیت کے سلسلے میں میرا نام لیا ہے تاہم ابھی تک اس منصب پر فایز نہیں ہوا ہوں۔ توقع ہے کہ اس منصب پر سرفرازی پردۂ غیب سے ظاہر ہوگی۔ اُس وقت میرا دل روزانہ کی زندگی کے گرداب اور ہر ایک مُلک کی ناخوش گواری سے آزاد ہو جائیگا۔ صداقت کی ٹھنڈک میرا مقدر بن جائیگی۔ اُس وقت خواہش دریا سراب (دھوکہ) ہوگی۔ میری بدنصیبی[1] مجھ سے یہ اشعار کہلوا رہی ہے۔ آپ کے خیر خواہ کا منشا یہ ہے کہ آپ دینی اور روحانی امور میں میری مدد فرمائیں تاکہ اجمیر جانے سے قبل جس کا وزن کشمیر سے متعلق ہے، آپ کو یاد کر سکوں، کیونکہ دونوں یعنی کشمیر اور اجمیر مسرت و خوشی کے محور ہیں۔ آپ کے غلام کا فرزند محی الدین محمد بدایوں گیا ہوا ہے جہاں آپ کے حق میں مصروف دُعا ہے۔ اللہ کرے آپ کا بلند سایہ کبھی کم

---

[1] باوجود سر توڑ کوشش کے مُلّا عبد القادر بدایونی درگاہ عالیہ اجمیر شریف کی تولیت نہ پا سکے تھے۔ غالباً اس کا سبب مُلّا کے برخلاف اُنکے ... ین کی ریشہ دوانیاں تھیں جنہیں علامی ابو الفضل اور فیضی فیاضی پیش پیش تھے۔

ہو۔ تحریر بتاریخ سنہ ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء)"۔[1]

حضرت صرفیؒ سے تقریباً دو درجن تصانیف صفحۂ روزگار پر یادگار ہیں جن میں سے اکثر زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو پائی ہیں۔ خواجہ محمد اعظم دیدمریؒ[2] نے اُن کی مندرجہ ذیل تصانیف کی نشاندہی کی ہے "مسلک الاخیار" "وامق و عذرا" "لیلیٰ مجنون" "مغازی النبیؐ" "مقاماتِ مرشد" "مناسک الحج" "شرح صحیح بخاری" "حاشیہ توضیح" "مطلب الطالبین" "روایح" "رباعیات صرفی" "مناقب الاولیا" اور "دیوان صرفی"۔ ان کے علاوہ اربعین کنز الجواہر، بعض اور سواطع الالہام بھی حضرت صرفی کی ہی تصانیف قرار دی گئی ہیں۔[3] ان میں سے اکثر تصانیف حکومت کشمیر کے محکمۂ تحقیق کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

اب مختصراً ان تصانیف کے بارے میں:-

- مسلک الاخیار: اس مثنوی میں ۵۲۰۴ اشعار ہیں۔ تصنیف سنہ ۹۹۳ھ۔
- وامق عذرا (مطبوعہ) اس مثنوی میں ۳۶۰۴ شعر ہیں، جو نظامی کی شیرین و خسرو اور جامی کی یوسف و زلیخا کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ تصنیف سنہ ۹۹۳ھ۔
- لیلیٰ مجنون: اس مثنوی میں ۲۶۰۴ اشعار ہیں اور یہ سنہ ۹۹۵ھ کی تصنیف ہے۔

---

[1] خط کے دوستانہ اور انداز لب و لہجہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں شیخوں کے مابین کس قدر قریبی تعلقات تھے۔ مکتوب بنام داؤد کا مکتوب شیخ صرفیؒ کے نام سنہ ۱۰۰۳ھ کے ابتدائی شہور (مہینوں) میں تھا کیونکہ اس سال کے ماہ ذی قعدہ میں حضرت شیخ واصل بہ حق ہو چکے تھے۔

[2] واقعاتِ کشمیر صفحہ ۱۰۱۔

[3] رشحاتِ کلامِ صرفی۔

● مغازی النبیؐ : پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی اور غزوات کے واقعات پر مشتمل اس مثنوی میں ۳۳۸۰ اشعار ہیں۔ تصنیف ۱۰۰۱ھ (مطبوعہ)۔

● مقاماتِ مرشد : ۳۵۰۰ اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں حضرت صرفیؒ نے اپنے پیرو مرشد حضرت کمال الدین شیخ حسین خوارزمیؒ کے حالات قلمبند کئے ہیں تصنیف ۱۰۰۱ھ۔

● رباعیاتِ صرفی : یہ مجموعہ ۱۰۰ رباعیات پر مشتمل ہے۔ تصنیف ۹۹۴ھ۔

● مناسکُ الحج : عربی زبان میں لکھی گئی اس کتاب میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں اُن مسائل اور فضائل پر عالمانہ بحث کی گئی ہے جن کا جاننا ہر مومن مرد اور خاتون کے لئے لازمی ہے۔

● حاشیہ توضیح : علم فقہ میں مذہب توضیح وتلویح پر حاشیہ از علامہ شیخ سعد الدین

● مطلب الطالبین : تفسیر بیہ کے جواب میں قرآن شریف کے آخری دو پاروں کی تفسیر

● روایح : حضرتِ جامیؒ کی تقلید میں ۹۷۶ھ میں قلمبند کی گئی جس میں معرفت اور سلوک وتصوف کے مدارج کا بیان ہے۔

● اربعین : حضرت صرفیؒ نے اس کتابچے میں حضرتِ علی مرتضیٰؓ اور اہلِ بیعت کی شانِ اقدس میں صحاحِ ستہ سے احادیث جمع کر کے چالیس چالیس حدیثیں فارسی نظم میں پیش کی ہیں۔

● کنز الجواہر : فنِ تعمیہ پر ایک تحقیقی کتاب تصنیف ۱۰۰۲ھ

● یدِ بیضا : اس کتاب میں اپنے تمام معموں کو یکجا کیا گیا ہے اور ان کی شرح بھی لکھی گئی ہے۔

• مواطع الالہام : تفسیر فیضی پر عربی میں بے نقطہ تقریظ۔

• مناقب الاولیا اور قصائد : اس میں حضرت صرفیؒ کے وہ مناقب شامل ہیں جو انہوں نے خلفائے راشدینؓ صحابۂ کبار اور اہل بیعت کی شان میں وقتاً فوقتاً تحریر کئے ہیں۔ قصائد یعنی چہار ان باصفا حضرت امیر کبیرؒ اولیائے کرام اور اپنے مرشد حضرت شیخ خوارزمی کی تعریف و توصیف میں لکھے گئے قصیدے شامل ہیں۔ پروفیسر اکبر حیدری کے مطابق صنیغم کشمیری نے صرفیؒ کے ۳۳ فارسی قصیدے دریافت کئے ہیں۔

• دیوان صرفی : مشتمل بر سے غزلیات (۸۵۰) جو ۹۸۰ھ تک لکھی گئی ہیں۔

ان کے علاوہ حال ہی میں ڈاکٹر اکبر حیدری نے حضرت صرفیؒ کی علم عروض و قافیہ اور فن شعر پر لکھی گئی ایک غیر مطبوعہ تصنیف "تحفۃ الشعرا" کا پتہ لگایا ہے۔ جس کا (تحفۃ الشعرا کا) حوالہ حضرت صرفیؒ کے سلسلے میں اُن کی نظر سے اور کہیں نہیں گزرا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ (شیرازہ اُردو جلد ۲۶ شمارہ ۵-۱۱)

•

اور اب ذکر چند کرامات کا

• حضرت ایشاں بغداد سے جب بارادہ مکۂ معظمہ باہر نکلے تب ایسی جگہ گزر ہوا جہاں پانی کا مطلق نشان نہ تھا۔ ایک بیمار ہمراہ تھا جو پیاس سے جاں بلب تھا۔ قافلہ کے دیگر اشخاص بھی شدت پیاس سے مضطرب اور پریشان تھے۔ جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری علیہ الرحمۃ بول پڑے اچھا لوگو میں پانی کی تلاش میں

جاتا ہوں۔ ہر چند کہ لوگ مانع ہوئے اور اس فعل کو مبنی بر سادگی قرار دیا تاہم آپ جانے پر بضد ہوئے۔ چند ہی قدم دور گئے ہونگے کہ حق تعالیٰ سے درخواست آب کی۔ یہ لفظ ابھی ذہنِ مبارک سے نکلا ہی تھا کہ آناً فاناً پانی کا ایک چشمہ اُبل پڑا۔ یہ دیکھکر اہل قافلہ بجد متحیر ہوئے۔

● اسی طرح مسجد حرام کے طواف کے بعد رفقا محتاجِ اخراجات ہو کر آپ کے روبرو تنگدستی کے شاکی ہوئے۔ یہ سُنکر حضرت ایشان نے راستہ میں پڑا ہوا ایک بڑا بھاری پتھر اٹھایا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہ پتھر نہیں بلکہ سونا ہے۔ آپ نے اُٹھا کر پتھر رفقا کو دیدیا۔ انہوں نے فروخت کر کے اُس سے حوائج ضروریہ پوری کر لیں۔

● ایک بار ہندوستان میں ایک قوال کا لڑکا آپ سے علم کیمیا گری سیکھنے کا مشتاق ہوا۔ آپ نے یہ شعر اُس کے روبرو پڑھا ؎

صنعت کیمیا ندانم لیک خاک را زر کنم بہمت خویش

(اگرچہ میں نہیں کیمیا نہیں جانتا البتہ دُعا سے مٹی کو سونا بنا سکتا ہوں)

لڑکا اس خیال سے تائب ہو کر حلقہ مریداں میں داخل ہو گیا۔

● نیز ہندوستان میں کسی نے برسبیل تذکرہ کہا کہ قدیم زمانہ میں اہل اللہ کی نظر سے پتھر سونا ہو جاتا تھا۔ یہ سنکر آپ کے کسی محب نے کپڑے میں لپٹا ہوا پتھر آپ کے روبرو پیش کیا۔ جونہی آپ کی نظر اِس پتھر پر پڑی فی الحقیقت وہ سونا تھا۔ بعد ازاں یہ پتھر محفل میں موجود ایک شخص کو دیدیا۔

● حضرت ایشان مدینہ منورہ میں چلہ کش تھے اور ساتھ ہی مسلسل روزہ دار بھی۔ اعتکاف پر ابھی ۳۶ دن ہی گزرے تھے کہ کسی حاسد نے آپ پر تہمت " انا الحق " (میں خدا ہوں) لگادی۔ ایک محب نے جب یہ سُنا تو دوڑتا ہوا آپ کے پاس آیا اور آپ کو وطن واپس جانے کی صلاح دی۔ محب کو حوصلہ نہ ہارنے کو کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس بدباطن سے ارض پاک پاک ہو گئی۔

● ایک بار خطۂ گجرات میں ایک ایسے شخص کے پاس ٹھہرے جو حضرت امام اعظم امام ابو حنیفہ رضؓ کی اولاد سے تھا۔ اس شہر کی سردار ایک خاتون تھی۔ خواب میں اُس سے کسی نے کہا کہ یہ کُرتہ حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری علیہ الرحمتہ کی تحویل میں دیدے۔ یہی خواب دوسرے دن بھی نظر آیا۔ ناچار عورت مذکور نے یہ کُرتہ جو حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا تھا آپ کو دیدیا۔ قدوۃ المحققین حضرت خواجہ حبیب اللہ نوشہری قُدِّسَ سِرُّہٗ متوفی ۱۹ ذی الحجہ روز منگل سنہ ۱۰۲۷ھ (۴ دسمبر سنہ ۱۶۱۸ء) نے یہ واقعہ نظم کے پیرایہ میں یوں قلمبند کیا ہے۔ اور اُس کے مشاہدہ کا ادعا کیا ہے:

نظم:

بندہ آن جامۂ مبارک دید	شیخ دین گاہ گاہ می پوشید
لیک آن جامۂ مبارک پاک	کرتۂ ہست تا گریبان چاک
عمر آن جامہ گرچہ نہصد بود	پارہ ہرگز نبود کہنہ نبود
بین چہ عزت بہ پیر ما بودہ	کس عزیزے چو او کجا بودہ
خرقۂ بو حنیفۂ کوفی	آنکہ بودہ است عالم و صوفی
ثانی بو حنیفہ پیرم بود	قدر او را ازاں سبب بگزید

(اس بندہ نے دیکھا ہے کہ وہ مبارک جامہ شیخ دین کبھی کبھی زیب تن کیا کرتے تھے۔ تاہم یہ مبارک جامہ ایک کُرتہ ہے جو گریبان تک چاک ہے۔ اس کُرتہ کی عمر اگرچہ نو سو برس تھی تاہم نہ تو پُرانا ہوا تھا اور نہ پھٹا ہوا تھا۔ دیکھو ہمارے پیر کی کیسی عزت تھی۔ اُس جیسا دوسرا عزت والا کہاں ہے۔ ابو حنیفہ کوفی کا یہ خرقہ میرے مرشد نے دیکھا ہے جو ثانی امام اعظم رضؓ تھے۔)

● حضرت ایشاں کے خدام کا بیان ہے کہ ایک روز آگرہ میں آپ مصروف

قیلولہ (دوپہر دن کی نیند) تھے کہ اچانک ایک عظیم جنبش آپ میں پیدا ہوئی۔ کچھ دیر بعد ایک چاک کیڑا جسم پر نمودار ہوا۔ بیدار ہونے پر جب آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ جناب رسالت مآب مخدوم عالم کے ہمراہ تھے۔ مخدوم عالم نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ یہ شخص ہمارا مرید ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنا لباس مخدوم عالم کو دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ لباس شیخ یعقوب صرفی کو دیدے۔ چنانچہ ہاتھ میں آتے ہی میں نے اُسے پہن لیا۔ یہ جنبش اسی سلسلے میں تھی۔ یہ لباس آخیر عمر تک آپ کے پاس تھا۔ وفات پر خواجہ حبیب اللہ نوشہری علیہ الرحمتہ کی تحویل میں چلا گیا تھا۔ اپنے بعد یہ لباس انہوں نے اپنے خلیفہ شیخ زین الدین علی دار کو دیدیا تھا۔ ملّا عبدالوہاب نوری اس لباس کے بچشم خود دیکھنے کے مدعی ہیں۔

● ــــــ (فتحات کبرویہ ورق ۲۳۴ سے ۲۴۴ تک)۔

● بہدایت صاحب فتحات کبرویہ (ورق ۲۳۹ب) حضرت ایشاں جب بمقام قزوین پہنچے تو شاہ طہاش (طہماسپ) نے جو وہاں کا والی تھا آپ کی تشریف ستانی کر دربار میں بلایا۔ یہ پوچھا اس حدیث کے کیا معنی ہیں۔ اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوسیٰ (تو میرے لئے وہی ہے جو موسیٰؑ کے لئے ہارونؑ تھے) پھر کہا یہ حدیث قطعی طور پر شاہ ولایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت دیگر تمام صحابہ پر ثابت کرتی ہے۔ حضرت ایشاںؒ نے فرمایا اس امر کا فیصلہ حدیث کے شانِ نزول سے ہے اور وہ یہ کہ جب رسول اکرمؐ غزوہ تبوک پر تشریف لے جانے لگے اور شاہ ولایت کو پیچھے چھوڑ دیا تو یہ امر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے موجب کلفت ثابت ہوا۔ اس پر آنحضرتؐ نے آپ کو گھر میں اپنا خلیفہ بنا دیا جو صرف مکان کی خلافت تک محدود ہے۔ اور یہ بھی ایک امر قطعی ہے کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے فوت ہوئے تھے۔ اس سے حضرت

علیؓ کی فضیلت تمام صحابہ پر لازم نہیں آتی ۔ یہ تقریر سنکر تمام حاضرین پر سکوت طاری ہو گیا۔

● صاحب فتحاتِ کبرویہ (ورق ۲۳ الف) کی رو سے حضرت ایشانؒ جب براستہ بانہال پیرو مرشد مخدوم عالم شیخ کمال الدین حسین خوارزمیؒ کی خدمت میں خوارزم تشریف لے جارہے تھے کہ راستے میں ایک رفیق یوسف کوکہ کا تمام جسم برودت سے شل ہو چکا تھا۔ حرکت اور چلنے پھرنے کی مطلق طاقت باقی نہ رہی تھی۔ بہدایت بوعلی صوفی جونہی یوسف کوکہ نے آپ کا نام لیا فوراً متحرک ہو گیا۔

● محمد سعید نامی ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اُس سے کہہ رہا ہے کہ سلطان العارفین کشمیر سے تشریف لا رہے ہیں۔ اُن کی خوشنودی طلب کر محمد سعید اعزاز و اکرام کے ساتھ مکان پر لایا اور پرتکلف ضیافت کی۔ اسی دوران اندھیرے میں کوئی شخص آپ کا لوٹا چرا لے گیا مگر جاتے ہی بیمار پڑ گیا۔ بالآخر شرمندہ ہوا اور چرایا ہوا لوٹا آپ کو لوٹاتے ہوئے مسلمان ہو گیا۔

● اسی طرح شہر قرمز کا حکمران کافر تھا۔ اُس نے آپ کو اپنے ملک میں آنے سے باز رکھا۔ رات کو خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اُس سے کہہ رہا ہے کہ خود کو مستحق عذاب نہ کر۔ دوسرے روز کامل احترام کے ساتھ اپنے شہر میں لایا۔ خود بھی مسلمان ہوا اور بارہ آدمی اور اُس کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ وہاں کی مسجد جو اغیار نے اپنے قبضے میں لے لی تھی ان لوگوں نے اُسے دوبارہ مسجد میں تبدیل کر لیا۔

● سیالکوٹ میں مولوی محمد نام کا ایک عالم و فاضل آدمی تھا۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ چاروں امام یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اُس سے کہہ رہے ہیں کہ حضرت میرؒ کے استقبال کے لئے جانا چاہیئے۔ پوچھا کہ کونسے میر بابا۔ کہا میر یعقوب۔ بیدار ہوتے ہی ورودِ قافلہ کی اطلاع ملی۔ مولوی

محمد نے جاتے ہی پہچان لیا اور آپ کے قدموں پر گر پڑا۔

● خطۂ لاہور کے قاضی صدرالدین نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ شیخ شرف الدین اُس سے کہہ رہے ہیں کہ جناب امیر کشمیر سے آرہے ہیں۔ جا اور ہاتھ چوم۔ قاضی نے ایسا ہی کیا اور جب معانقہ کرنا چاہا تو کہا کہ بس کر، تجھے اتنی ہی اجازت تھی۔

● لاہور سے روانگی پر آدم خان اور اسلام خان کے مابین تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ آدم خان مغلوب ہوگیا۔ مگر جب باطنی طور پر حضرت ایشانؒ سے طالب امداد ہوا تو ناکامی کامیابی میں تبدیل ہوگئی۔

● کابل پہنچنے پر ہمایوں اور کامران مرزا کے مابین جھگڑا شروع ہوگیا۔ اسی دوران دو افغان دزدانِ عرب کے حیلے سے آپ کا سامان اُڑا کر لے گئے۔ مگر گھر جاتے ہی دونوں کوڑھی ہوگئے۔ یہ دیکھکر دونوں نے معافی طلب کی اور چرایا ہوا مال حضرت ایشانؒ کو لوٹا دیا۔ ایسا کرنے کے بعد دونوں پہلے کی طرح چاق و چوبند اور تندرست ہوگئے۔ کابل میں ایک شخص محمد امین لاری نے مرید ہونا چاہا مگر بلا اجازتِ مرشد آپنے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ البتہ اپنی صورت کے اختصار کی تلقین کر دی اور بالآخر کامیاب ہوگیا۔

● خوارزم سے کشمیر کو مراجعت کے بعد حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری علیہ الرحمتہ ایک روز ایک درویش کی ملاقات کو تشریف لے گئے۔ رفقائی کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔ درویش نے اپنے لئے صرف ایک سیر کھانا تیار کیا تھا۔ بڑا سٹ پٹایا۔ گوش گزار کرتے ہوئے کہا یا حضرت ماحضر نہایت قلیل ہے۔ فرمایا بسم اللہ کر سب کو پہنچ جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جو فرمایا تھا۔

● ایک موقعہ پر حضرت ایشاں کے خادم نے صرف دس آدمیوں کے لئے کھانا تیار کیا تھا۔ اہل سماع دو سو کے لگ بھگ تھے۔ خادم حیران تھا کہ کیا کرے۔ فرمایا گھبراست۔ خدا کی برکت سے بہت ہے۔ تقسیم کرنے پر سب کو کھانا پہنچ گیا۔

● ایک دن بعد از نماز مغرب حضرت ایشاں صاحب بے ہوش ہو گئے۔ افاقہ پر حاضرین نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا ایک مرید سمرقند میں ڈاکوؤں کے پنجے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اُس نے میری دہائی دی تھی لہذا طے مکان کے ذریعہ فی الفور اُس کی امداد کو پہنچا اور چھڑا دیا۔

● حضرت ایشاں شیخ یعقوب صرفی کو اس بات کی شدید تمنا تھی کہ وہ مکہ معظمہ میں اپنے مرشد مخدوم عالم شیخ کمال الدین حسین خوارزمی سے ملاقی ہوں۔ چنانچہ احرام حج باندھکر از راہ خشکی حجاز کو چل پڑے۔ شہر بخارا میں تین واسطوں سے ابو سعید معمر حبشی سے مصافحہ کیا۔ اس سفر میں جب آپ کا ورود مشہدِ مقدس میں ہوا تو فرقہ امامیہ کے آٹھویں امام علی ابن موسیٰ رضی اللہ عنہ کے (آستانہ) پر حاضری دی۔ یہاں فاطمہ نام کی ایک نابینا عورت تھی جو علاوہ فاضلہ ہونے کے شاعرہ بھی تھی۔ آفتی تخلص تھا۔ رات دن گریہ و زاری کیا کرتی اور کہا کرتی کہ اے خدا جو بھی اس مشہد پر آتا ہے اُسکی حاجت روا ہوتی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ میں بھی سوانکھی ہو جاؤں۔ حضرت ایشاں کو جب اس عورت کا حال معلوم ہوا تو پوچھا اے عورت تو کس مذہب کی ہے۔ بولی میں معتزلی ہوں اور خلفائے ثلاثہ کے خلاف۔ آپ نے فرمایا اگر تو اپنے مذہب سے تائب ہو جائے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ تو سوانکھی ہو جائے گی۔ عورت تائب ہو گئی۔ دوسرے روز بی بی آفتی نابینگی کی آفت سے چھٹکارا پا چکی تھی۔

● ——— (فتحات کبرویہ فارسی، ورق ۳۹)

جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی عرف حضرت ایشاں صاحب رح

شب جمعرات بعد از نمازِ عشاء ۱۲ ذی قعدہ سنہ ۱۰۰۳ھ مطابق ۱۰ ار جولائی بر سنہ ۱۵۹۵ء بعمر ۷۵ برس انتقال فرما گئے۔ حضرت ایشانؒ کی تاریخ وفات کے سلسلے میں یہی خیال اکثر تذکرہ نگاروں کا ہے جن میں ملّا عبد الوہاب نوری مؤلفِ فتحاتِ کبرویہ اور ملّا ابو محمد مسکین حاجی محی الدین سرائے بلی مصنّفِ تحایف الابرار فی ذکرِ الاولیاء الاخیار صفحہ ۱۷۲ کا ہے۔ لیکن حضرت شیخ کے محب اور مخلص دوست ملّا عبد القادر بدایونی نے اپنی تاریخ "منتخب التواریخ" میں آپ کی تاریخ وفات ۸ ار ذی قعدہ سنہ مذکورہ قلمبند کی ہے۔ اس صورت میں آپ کا روزِ وفات منگل ۵ ار جولائی ۱۵۹۵ء ہوتا ہے۔ واللعلم عند اللہ۔ بہرکیف وفات کے سلسلے میں چھ دن کا اختلاف اُس زمانہ کے حالات کے بموجب ایک معمولی سی شے ہے۔ آپ کی تاریخ ہائے وفات مختلف اشخاص نے قلمبند کی ہیں۔ اِس ضمن میں آپ کے خلیفہ حضرت خواجہ حبیب اللہ نوشہری قدّس سرہُ (متوفی بروز منگل ۲۹ ار ذی الحجہ ۱۰۲۷ھ (۲۳ ار نومبر ۱۶۱۸ء) آپ کی وفات پر یہ اشعار قلمبند کئے تھے۔

شاہِ یعقوب قطب و مرشدِ راہ	قَدَّسَ اللّٰہُ رَبُّنَا سِرّہٗ
سوئے عرش بریں نمود عروج	بر براقِ اجل چو شد ناگہ
چشمِ ظاہر اگرچہ محروم است	دیدۂ باطنم برو آگہ
آری آری ولی نخواہد مرد	فَھُوَ حَیٌّ یَکُوْنُ فِی الْجَنّۃ
چوں فنا فی اللہ آمدہ صفتش	شدہ موصوف از بقا باللہ
گفت حبّی بسالِ تاریخش	پنج و ہفتاد سال بود آن شاہ

ڈاکٹر اکبر حیدری نے ۲۰ ار ذی قعدہ مطابق ۲۵ ار جولائی ۱۵۹۴ء لکھا ہے۔ (م۔ و۔ ی)

(مرشد اور قطب راہ شاہ یعقوب (اللہ آپ کی رُوح کو پاک کرے)

براقِ اجل پر سوار ہو کر عرش بریں کو عروج کر گئے۔ چشمِ ظاہر آپ کے دیدار سے اگرچہ محروم ہے لیکن تاہم چشمِ باطن آپ سے آگاہ ہے۔ ہاں ہاں ولی یعنی خدا دوست نہیں مرتا، وہ جنت میں زندہ ہے۔ آپ کا وصف چونکہ فنا فی اللہ تھا، اس لئے بقا باللہ سے موصوف ہو گئے۔

حُبّیؔ نے آپ کا سالِ تاریخ "پنج ہفتاد سال بود آن شہ" (وہ بادشاہ پچھتر سالہ تھا کہا ہے)۔
۱۰۰۴ھ

حُبّیؔ کی تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ جہاں اس سے صراحتہً آپ کی زندگی کے برس معلوم ہوتے ہیں وہیں مصرعہ "پنج ہفتاد سال بود آن شہ" سے صرف ایک عدد کے فرق سے آپ کی تاریخ وفات بھی بحساب حروف جمل نکلتی ہے۔ آپ کی وفات ۱۰۰۳ھ میں ہوئی جبکہ اس مصرعہ کے اعداد ۱۰۰۴ ہوتے ہیں اور آئینِ اکبری میں بقول ابوالفضل وفیات اور تعمیرات میں ایک یا دو برس کی کمی بیشی جائز ہے۔

نیز یہ تاریخ بھی حضرت حُبّیؔ علیہ الرحمتہ سے ہے ؎

گفت حُبّیؔ سالِ تاریخش   پنج و ہفتادو سالہ آن شد
ہست "فخر الانام" تاریخش   گر نباشد نہ بندہ تو بخشش

(آپ کی تاریخ "فخر الانام" ہے "اگر بندہ پر آپ کی جھڑک نہ ہو)۔

نیز یہ تاریخ بھی حضرت حُبّیؔ علیہ الرحمتہ سے ہے ؎

فاضلی گفت سالِ تاریخش   فاضلا "اکمل افاضل" گو

(کسی فاضل نے آپ کا سالِ تاریخ کہا۔ ارے فاضل "اکملِ افاضل" کہہ)

نیز آپ کی تاریخ ہے ؎

دیگرے گفت چون شدہ واصل   دو نماندہ یکے شدہ حاصل

سالِ تاریخِ او اگر گویم "لَیْسَ شَیٌٔ کَمِثْلِہٖ" گویم

(ایک اور شخص نے جب آپ واصل ہو گئے، دو نزرہا ایک ہی حاصل ہوا آپ کی تاریخ اگر کہونگا تو "لَیْسَ شَیٌٔ کَمِثْلِہٖ" (اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے) کہونگا)

یہ تاریخ درست نہیں ہے کیونکہ اس کے اعداد ۱۰۰۵ھ ہوتے ہیں جبکہ حضرت شیخ کا سال وفات ۱۰۰۳ھ ہے

ایک اور تاریخ وفات یہ ہے ؎

سالِ تاریخ نقل رہبر دین اوّل و آخرِ چراغ بین

(رہبر دین کے سال انتقال کے لئے لفظ چراغ کا پہلا اور آخری حرف یعنی چ اور غ دیکھ)۔

اس میں "چ" ۳ اور غ کے ۱۰۰۰ اعداد ہیں جسکا مجموعہ ۱۰۰۳ ہوتا ہے، اور یہی آپ کا سالِ وفات ہے۔

اسرار الابرار موٴلفہ بابا داوٴد مشکاتی متوفی ۲۷ ربیع الاوّل ۱۰۹۷ھ (جمعات، ۱۱ فروری ۱۶۸۶ء) مدفون محلہ گندرپور، عیدگاہ، سرینگر نے حضرتِ ایشان کی تاریخ وفات میں یہ ابیات قلم بند کئے ہیں:

زبعد مصطفیٰ تاریخ دوران رسیدہ یکہزار و سہ بہ ایشان

کہ شیخ یعقوب صرفی سوئے یزدان سفر کردہ ازیں گردونِ گردان

(حضرت مصطفےٰ ﷺ کے بعد زمانہ کی تاریخ سے ایک ہزار تین برس ہو چکے تھے کہ شیخ یعقوب صرفی رح نے خدا کی جانب سفر کیا یعنی فوت ہو گئے)

نیز یہ بیت بھی اسرار الابرار میں آپ کی تاریخ وفات کے متعلق ہے ؎

رفت از جہاں بخانی صرفی فاضل عالم گفتند سالِ وصلش "مفتاحِ گنج عرفان"
۱۰۰۳

(صرفی جہانِ فانی سے چلے گئے اور اہلِ عالم نے آپ کا سالِ وصال "مفتاحِ گنجِ عرفان" (گنجِ عرفان کی کنجی) کہا ہے۔

شیخ عبدالقادر بدایونی نے "شیخ امم بود"[1] تاریخِ وفات کہی۔ انہوں نے حضرت صرفیؒ کی وفات پر نہایت رنج و الم کے ساتھ کہا تھا ؎

یاران ہمہ رفتند و راہِ کعبہ گرفتند   ما مست قدم بر در خمار بماندیم

از نکتۂ مقصود نہ شد فہم حدیثے   لا دین و لا دنیا بیکار بماندیم

وفات کے بعد حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ محلہ زینہ کدل، سرینگر میں دریائے جہلم کے مابین کنارے پر دفن ہوئے جہاں آپ کا مزار زیارتگاہِ خاص و عام ہے۔ بقول شخصے ؎

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود   سالہا سجدۂ صاحب نظران خواہد بود

(جس زمین پر بھی تیرے کفِ پا کا نشان ہو گا وہ سالہا سال اہلِ نظر کی سجدہ گاہ ہو گی)۔



---

[1] اُن کا سالِ وفات "پیرِ حافظ"، "شیخ الباطن"، "فخر الانام" اور "افضل انام" سے بھی نکلتا ہے (م-ا-ا)

محمد صدیق نیاز مند

حضرت خواجہ حسن قاری رحمۃ اللہ علیہ

سرزمین کشمیر نے جہاں اپنے ظاہری حسن و جمال اور فطری مناظر کی دلکشی کی وجہ سے چار دانگ عالم میں شہرتِ لازوال حاصل کی ہے وہاں علوم وادبیات اور تاریخ و فلسفہ کے علاوہ تصوف و عرفان میں ایسے باکمال اولیائے کرام اور ریشیانِ عظام پیدا کئے ہیں جو اپنی ریاضات و عبادات اور مکاشفہ و استغراق کی وجہ سے ہمیشہ کشمیر کے افق پر ستاروں کی مانند نور افشاں رہیں گے۔ ایسے ہی تابناک ستاروں میں خواجہ حسن قاریؒ کی بصیرت افروز شخصیت بھی شامل ہے۔

خواجہ حسن قاریؒ، خواجہ اسحٰق قاریؒ کے بڑے بھائی اور حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ کے جلیس اور مقرب تھے۔ اس لحاظ سے انہیں بھی اپنے بھائی کی طرح کہکشانِ سلطانیہ کے روشن ستاروں میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بحرِ عرفان کے اس تیراک نے اپنے مرشدِ طریقت کی راہنمائی اور سرپرستی میں تصوف و عرفان کی وہ بلند ترین منزلیں طے کیں جہاں عقل و ادراک پرواز نہیں کرسکتی۔ رہبرِ کامل اور پیرِ طریقت حضرت مخدوم پاکؒ کے ایماء پر وہ موضع شیوہ میں اس یکسوئی کے ساتھ یادِ خدا میں لگ گئے کہ پھر نہ دنیا اور نہ ہی اہل دنیا کی طرف پلٹ کر دیکھا بلکہ فنافی الشیخ کے درجے تک پہنچے۔ ایک ولیِ کامل ہونے کے علاوہ خواجہ صاحب کو فارسی شعر و ادب میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ فارسی نثر میں ان کی شہکار تصنیف "راحت الطالبین" ہے۔

خواجہ صاحب شہر سرینگر کے بلدیمر محلے میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ "راحت الطالبین" میں اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں :

"در محلۂ بلدیمر کہ مسکن و مولد فقیر است، جوانی بود .....[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

فقیر الحقیر کاتب الحکفا حسن قاری بلدیمری[2]

خواجہ صاحب ایام طفولیت سے ہی ذہین ثابت ہوئے چنانچہ انہوں نے کمسنی میں ہی قرآن ازبر کرلیا۔ انہوں نے اپنے زمانے کے ایک مشہور قاری مخدوم حاجی احمدؒ سے قرأت میں کسب فیض کیا اور آہستہ آہستہ ہفت قرأت میں مہارت حاصل کرلی۔ اسی مناسبت سے وہ قاری کے لقب سے مشہور ہوگئے[3]۔ تحصیل علوم کے بعد خواجہ صاحب نے دکانداری کا پیشہ اختیار کیا اور کپڑے فروخت کرنے لگے[4]۔ رضائے حق کی خاطر درس و تدریس بھی کرتے تھے لہذا ایک بڑی جماعت انکے شاگردوں میں شامل تھی[5]۔ حضرت شیخ حمزہؒ اس زمانے میں محلۂ فلاک پورہ میں فروکش ہوچکے تھے جنکی ریاضت و تقویٰ کا شہرہ سن کر خواجہ صاحب کے دل میں انکے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کا جذبہ اور شوق پیدا ہوا چنانچہ والدہ ماجدہ انہیں حضرت مخدومؒ کی خدمت میں لے گئیں اور وہ دل و جان سے انکے مرید ہوگئے[6]۔

اگرچہ خواجہ صاحب کا تعلق ایک متمول گھرانے کے ساتھ تھا اور انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی مرفہ الحالی اور فارغ البالی میں بسر کی تاہم دنیاداری کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف سے انہیں دینداری کا جذبہ بھی ودیعت ہوچکا تھا۔ انکے افراد خانوادہ پرہیزگاری کے مجسمہ تھے جن کے انگ انگ میں خداترسی کا جذبہ موجزن تھا۔ پرہیزگاری اور دینداری کا ہی یہ ثمرہ تھا کہ انکے والدین حضرت مخدوم پاکؒ کے ارادت مند تھے۔ خواجہ صاحب جب اپنی والدہ ماجدہ کے توسط سے حضرت مخدومؒ کی خدمت میں شرفیاب ہوکر حلقۂ مریدی میں داخل ہوئے تو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ حضرت مخدومؒ کے خاص خلیفوں اور مقربوں میں شمار ہونے لگے[7]۔ وہ فنافی الشیخ کے درجے تک پہنچے۔ حضرت مخدومؒ کی ان پر خاص نظر عنایت تھی[8]۔ حضرت بابا حیدر تیلہ مولیؒ خواجہ حسن قاریؒ اور انکے چھوٹے بھائی خواجہ اسحٰق قاریؒ کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں :

"خواجہ حسن قاری اور خواجہ اسحٰق قاری (خدا ان پر رحم کرے) دونوں مرشد طریقت حضرت حمزہ مخدومؒ کے برگزیدہ خلیفے اور مرید ہونے کے ساتھ ساتھ انکے تربیت یافتہ ہیں۔ دونوں بھائی اعلیٰ درجے کے مالک ہیں اور دونوں

تصوف میں کامل اور عظیم رتبے تک پہنچے ہیں۔ دونوں علوم ظاہری و باطنی میں دستگاہ رکھتے ہیں۔[۹]

سلوک کے ابتدائی مرحلے میں حضرت مخدومؒ نے خواجہ صاحب کو اپنے خادموں کے استنجا کے لئے کلوخ اور پانی لانے کا کام سپرد کیا۔[۱۰] عام طور پر راہ سلوک میں گامزن ہونے والے سالکوں سے ایسے کام اس لئے لئے جاتے تھے تاکہ انکے ذہنوں سے نخوت اور غرور کے جذبے کو دور کیا جاسکے اور وہ یکسوئی اور صدق دل کے ساتھ راہ سلوک میں گامزن ہوں۔ خواجہ صاحب اگرچہ شہر کے اشراف میں سے تھے اور ایسا ادنیٰ کام انجام دینا ان کے شایان شان نہیں تھا لیکن سلوک کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ یہاں تک کہ اپنا مال و متاع اور جاہ و حشمت سب کچھ قربان کیا اور ایسے ادنیٰ کام انجام دینے میں انہوں نے ذرہ بھر عار محسوس نہ کی اور سلوک کے ممتاز درجے تک پہنچے اور کشمیر کے واقعہ نویس مقرر ہوئے۔[۱۱] خواجہ صاحب کے جذبۂ طلب کے پیش نظر حضرت مخدومؒ نے انہیں ذکر چار ضرب کی تلقین فرمائی۔ خواجہ صاحب یکسوئی کے ساتھ ذکر اور ریاضت میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ انہیں سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔ ذکر کی حالت میں ان پر ایک خاص قسم کا حال طاری ہو جاتا اور وہ منہ میں ایک خاص قسم کی حلاوت اور مٹھاس محسوس کرتے۔ خواجہ صاحب نے جن مریدوں کو ذکر کی تلقین فرمائی وہ بھی منہ کی اس حلاوت اور مٹھاس سے لطف اندوز ہو جاتے۔ حضرت خاکیؒ نے ذکر کی حقیقت پانے کی ان علامات کو یوں شعر میں ڈھالا ہے ؂

خدمت خواجہ حسن قاری بلدیم شد راست　　زود از تلقینِ او محظوظ شیرینیِ ذکر

حضرت خاکیؒ مندرجہ بالا شعر کی تشریح کرتے ہوئے "دستور السالکین" میں رقمطراز ہیں کہ

"اس (خواجہ حسن قاری) نے قرأت کے استادوں سے الگ ہو کر حضرت مخدوم پاکؒ کی تربیت اور ارشاد و رہبری کرنے والی درگاہ میں لازمی طور آمد و رفت شروع کی اور عقیدت اور بیعت کے شرف سے مشرف ہو گیا۔ پورے خلوص کے ساتھ حضرت مخدوم پاکؒ سے ذکر چار ضرب کی تلقین حاصل کی اور اکثر اوقات اس ذکر میں مشغول رہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن آکر بیان کیا کہ مجھ کو حضرت مخدومؒ کی اس تلقین کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے صبر و سکون اور اطمینان قلب عنایت کیا ہے اور وہ یوں ہے کہ جب تنہائی کے کونے میں تلقین کی گئی کیفیت کے ساتھ ذکر میں مشغول ہوتا ہوں، میرے دل کے اندر ایک

خوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے پسند نہیں آتا ہے کہ بغیر ذکر کے اور کوئی کام کروں اور میرے منہ میں ایک قسم کی مٹھاس کی لذت آجاتی ہے جس کو میں بیان نہیں کر سکتا ہوں۔ حضرت مخدومؒ بہت بشاش ہوگئے اور آپ نے فرمایا کہ تجھے مبارک ہو کہ طریقت کی بعض علامتیں تم سے ظاہر ہونے لگی ہیں اور یہ ذکر کی حقیقت تک پہونچنے کی علامت ہے اور اس حقیقت کو سلوک کے شہد کا چکھنا بھی کہتے ہیں اور ذکر کی حلاوت کا پانا اسی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت مخدوم پاکؒ کے شفقت بھرے دم سے خواجہ صاحب کے دل کی کلی کھل گئی اور روشن ہوگئی"۔ ۱۲؎

خواجہ صاحبؒ زندگی کے آخری ایام میں مرشدِ طریقت کے حکم پر پرگنۂ زینہ گیر میں سوپور سے کوئی بارہ کلومیٹر دور موضع ہردوشیو میں فروکش ہوئے۔ خواجہ صاحبؒ جب تک بقیدِ حیات تھے یہیں مقیم رہے اور لوگوں کی ہدایت اور رشد و ارشاد میں مشغول رہے۔ تاہم جب انکی حق طلبی کے جذبہ میں اضافہ ہوا تو ریاضت کے بغیر جتنے بھی شغل تھے ان کو ترک کیا اور گوشہ نشین ہوگئے۔ رات دن ریاضت، ذکر و فکر اور مجاہدہ میں مصروف رہے جس کے دوران کئی بار عجیب و غریب حالات انکو میسر آئے۔ کئی بار انہوں نے آقائے نامدار حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ ﷺ کو خواب میں اور بارہا واقعہ میں دیکھا۔ چنانچہ آپ سے غائبانہ امداد بھی حاصل کرتے رہے۔ ۱۳؎

خواجہ صاحبؒ بڑے اہتمام کے ساتھ تلاوتِ کلامِ پاک فرماتے۔ انکے تلاوت کلام پاک کرنے کا یہ عالم تھا کہ اگر اس میں کبھی سہو و خطا سرزد ہو جاتی تو امیرالمومنین حضرت عثمان غنیؓ حاضر ہو کر انکی مشکل حل فرماتے۔ ۱۴؎

خواجہ حسن قاریؒ نے اپنی زندگی تقویٰ اور پرہیزگاری میں بسر کی اور اپنے عیال کے اخراجات وہ اپنی کمائی سے پورے کرتے تھے۔ کسی سے نذرانہ وغیرہ لینا عار سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ انہیں غلہ بطور نذرانہ پیش کیا گیا۔ لیکن خواجہ صاحب نے کمالِ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس میں سے رتی بھر بھی اپنے یا اپنے عیال کے مصرف میں لانے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ فقیروں اور محتاجوں میں تقسیم کرایا۔ اگرچہ انکے بیٹے نے اس کے لینے کے لئے کافی اصرار کیا اور کہا کہ صاحب عیال ہونے کی وجہ سے ہم اسکے حقدار ہیں۔ مگر خواجہ صاحبؒ نے یہ جواب دے کر انکو خاموش کرایا کہ عیال داری حقداری کا باعث نہیں بن سکتی۔ حقداری یہ ہے کہ اپنی قوت عبادت میں صرف کی جائے اور بندگی میں پوری طاقت صرف

کی جائے۔ یہی شکرگزاری ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے مجھ سے عبادت نہیں ہوسکتی اور تجھ سے شکرگزاری نہیں ہوتی کہ تم مغرور ہو' اسلئے ہماری حقداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[15] خواجہ صاحب ہمت کے بلند اور فروتنی میں یکتائے روزگار تھے۔ وہ دنیاوی مال و متاع سے نفرت کرتے تھے بلکہ اسکو ناپاک سمجھتے تھے۔ انہوں نے موضع ہردوشیو میں ۹۹۹ھ میں انتقال کیا اور وہیں پر سپرد خاک ہوئے۔[16] خواجہ صاحبؒ کی زیارت مرجع خاص و عام ہے اور ہر سال وہاں ماہ صفر کی ۲۷ تاریخ کو عرس منایا جاتا ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں انکے عقیدت مند شرکت کرتے ہیں۔ عرس کی خاص بات یہ ہے کہ اس تقریب پر خواجہ صاحبؒ کے تبرکات مثلاً کمر بند اور عصاءِ شریف وغیرہ کی نشاندہی کی جاتی ہے۔[17]

خواجہ حسن قاریؒ کی زیارت ۲۲ فٹ لمبی اور ۱۹ فٹ چوڑی ہے۔ حال ہی میں اسکے جنوب کی جانب ایک دالان تعمیر کیا گیا ہے جس کے بیچ میں زیارت گاہ میں داخل ہونے کے لئے سیڑھی تعمیر کی گئی ہے۔ اسی زیارت گاہ کے اندر خواجہ صاحبؒ کا روضہ واقع ہے جو تقریباً ۱۵ فٹ لمبا اور ۱۳ فٹ چوڑا ہے۔ اس میں خوبصورت پنجرے لگے ہیں۔ روضہ کے چاروں اطراف غلام گردش ہے جسکی چھت دیدہ زیب ختم بند سے آراستہ ہے۔ روضہ کی دیواروں میں شیشے لگے ہیں۔ زیارت گاہ کی "چار بام" چھت کی ٹین پوشی کی گئی ہے جسکے درمیان میں (پختہ) مٹی کا بنا ہوا برج ہے۔

خواجہ صاحبؒ کی زیارت کی بغل میں مغرب کی جانب ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے جسمیں خواجہ صاحبؒ کے چھوٹے بھائی خواجہ اسحٰق قاریؒ ریاضت و مجاہدہ میں مصروف ہوکر چلہ کاٹتے تھے۔ اس کوٹھری کے اردگرد خواجہ صاحبؒ کے ایک عقیدت مند شہی ٹار نے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ مذکورہ کوٹھری آجکل اسی مسجد کے اندر موجود ہے۔ اس مسجد کی چھت میں لگے لکڑی کی کشتی کے ایسے تختے بھی موجود ہیں جن کے متعلق روایت ہے کہ خواجہ حسن قاریؒ اس کشتی میں بیٹھ کر سفر کیا کرتے تھے۔[18]

قرأت اور تجوید میں مہارت حاصل ہونے کے علاوہ خواجہ صاحبؒ کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں دستگاہ حاصل تھی۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق وہ شعر بھی کہتے تھے۔ معرفت اور تصوف کے بارے میں انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ انکے ایک معاصر تذکرہ نگار حضرت بابا علی رینہؒ نے خواجہ صاحبؒ کی تصنیف و تالیفات کے بارے میں یوں لکھا ہے:-

"در بیان معرفت نسخۂ چند ترتیب دادہ و از مقامات مرشد خود نیز ذکر ہا فرمودہ"[19]

آگے چل کر بابا صاحبؒ نے خواجہ صاحب کی ایک تصنیف "رسالۂ قائد السالکین" کا یوں ذکر کیا ہے:

"اکثر جناب حضرت مخدوم الیشان را قائد سالک نام نہادندی و رسالۂ قائد السالکین

نام تصنیف از ایشانست"[20]

البتہ بابا حیدر تیلہ مولیؒ نے واضح الفاظ میں انکی صرف ایک تصنیف "راحت الطالبین" کا نام لیا ہے جسکے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب حضرت مخدوم پاکؒ کے حالات و مکاشفات اور ریاضات سے متعلق ہے' وہ رقمطراز ہیں :

"خواجہ حسن قاری کہ صاحب تصنیف نسخۂ راحت الطالبین است و در آن از تصوف واذکار وافکار و مراقبات و مشاغلات ..... از ہر کدام چیزی مذکور کردہ"[21]

"تذکرۃ العارفین" کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ صاحبؒ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن کا آجکل سراغ نہیں ملتا۔ خوش قسمتی سے خواجہ صاحبؒ کی "راحت الطالبین" کا کم از کم ایک قلمی نسخہ جموں و کشمیر محکمہ تحقیق واشاعت کے مخطوطات سیکشن میں زیر شمارہ ۵۰۱ محفوظ ہے جو کہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

"راحت الطالبین" صرف بائیس اوراق پر مشتمل تصنیف ہے۔ دراصل یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جسے مصنف نے درج ذیل تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔

- فی تعلیم المبتدی لطریق الشیخی فی الابتداء
- فی عظمۃ ولایۃ و کرامۃ رتبہ بہ شیخنا بلطف اللہ تعالیٰ
- فی الکشوف والظہور الاحوال الباطن بحکمۃ اللہ تعالیٰ

"راحت الطالبین کی فصلِ اول" "بہ پیر طریقت کے ہاتھوں سالک مبتدی کی ابتدائی تعلیم و تربیت" کے بارے میں ہے۔ اس فصل میں خواجہ صاحبؒ راہِ سلوک میں گامزن ہونے والے سالک کو ان لازمی اصول وضوابط سے آگاہ کرانا چاہتے ہیں جو حصولِ حق کے لئے ممد ومددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ اس باب میں سالک کی راہنمائی کے ضمن میں قارئین سلسلۂ سلطانیہ کے عقائد و آراء، تعلیمات اور اذکار و افکار سے آشنائی حاصل کر لیتے ہیں۔ خواجہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مرشد کو سالک مبتدی کی تعلیم و تربیت کرتے وقت ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ جب کوئی طالب اسکے پاس تربیت کی غرض سے آئے تو سب سے پہلے اسے قرآن کی تلاوت سکھائے۔ قرآن کی تلاوت میں اس قدر اسکی تربیت کرے کہ اسے قرآن ازبر ہو۔ اسے لکھنا سکھائے تاکہ وہ لازمی علوم سے آشنائی حاصل کر سکے۔ اسکے بعد سالک مبتدی کو تفسیرِ قرآن اور تصوف کی کتابیں جیسے عوارف المعارف اور عین العلم پڑھنے کی طرف مائل کرے اور پھر اسے سلوک کی راہنمائی کرے۔

خواجہ صاحبؒ کے مطابق جو سالک گلشنِ طریقت کی خوشبو سے اپنے دل و دماغ کو معطر

کرنا چاہتا ہو اُسے چاہیئے کہ وہ لازمی طور پر شریعت محمدیؐ کا پابند ہو اور شریعت کے احکام پر اس طرح عمل کرتا ہو کہ اسکے اعمال کی آبیاری سے گلستانِ شریعت سرسبز و شاداب ہو جائے ورنہ معرفت کے پھل اسکے لئے شیریں اور لذیذ ثابت نہیں ہو سکتے۔

راہ سلوک میں گامزن ہونے والے سالک مبتدی کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ پیرِ طریقت کے احکام پر ثابت قدم رہے کیونکہ پیرِ طریقت ہی سالک کو سلوک کی بھول بھلیوں سے نکالکر تجلّیٔ حق تک رہنمائی کرتا ہے۔ لہٰذا سالک کو چاہیئے کہ وہ پیرِ طریقت کی اطاعت میں استقامت کا مظاہرہ کرے اور اس کے ہی حکم پر سرِ تسلیم خم کرے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسکے حکم پر اپنی جان تک نثار کرنے کے لئے آمادہ رہے۔ سالک اپنے آپ کو مرشد کے ہاتھوں میں ایک مردہ تصور کرے کہ مردہ (لاش) کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور اسکی تجہیز و تکفین کرنے والا جیسے بھی چاہے اس کے ساتھ کر سکتا ہے، عین اسی طرح ایک سالک کو اپنا سارا اختیار اپنے مرشد کے ہاتھوں میں سونپ دینا چاہیئے تاکہ وہ آبِ ریاضت سے اسکے مکدر دل کو دھو ڈالے اور اُسے ذکرِ الٰہی کی شمع سے روشن کرے۔ غرض یہ کہ سالک اپنے آپ کو ایسی کشتی تصوّر کرے جسے سمندر کے طوفان نے گھیرا ہو۔ اس کشتی کو ساحل سے ہمکنار کرنے کے لئے ایک ایسے ناخدا کی ضرورت ہے جو اُسے طوفان سے نکال کر صحیح سلامت کنارے تک لا سکے۔ سلوک میں ناخدا کا رول پیرِ طریقت انجام دیتا ہے۔

پیرِ طریقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے بعد سالک کو حصولِ معرفت حق کے لئے پہلے اپنے نفس کو پہچاننا اور نفسانی خواہشات پر قابو پانا ضروری ہے۔ خواجہ صاحبؒ سالک کو سیپی صفت بننے کی تلقین کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس طرح پانی کے ایک قطرے پر قناعت کرکے سیپی موتی میں تبدیل ہوتی ہے اسی طرح سالک اپنے اندر خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرے اور معرفتِ حق سے لطف اندوز ہو۔ تاہم سلوک کے احوال کسی پر فاش نہ کرے۔

خواجہ صاحبؒ کے بقول تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے بعد سالک سے بعض چیزیں واقع ہوجاتی ہیں۔ اور وہ یوں ہیں:

• اخلاص • صبر • قناعت • تواضع • رضا • تحمل • توکل • صداقت • کرامت • مروّت • فتوّت • فرصت • سخاوت • شجاعت • جود • حیا • علم۔

خواجہ صاحب مندرجہ بالا اصطلاحات کی شرح اجمالی طور پر یوں کرتے ہیں:۔

• اخلاص یہ ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن کے ساتھ نیکی کی جائے۔

- صبر یہ ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو نیکی یا بدی نازل ہو اُس کے لئے گِلہ شکوہ نہ کیا جائے۔
- قناعت یہ ہے کہ جو کچھ عالم غیب سے ملے اُس پر راضی رہیں۔
- تواضع یہ ہے کہ ہر خاص و عام کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔
- رضا یہ ہوتا ہے کہ اپنی جان قضا و قدر کے حوالے کی جائے۔
- تحمل یہ ہے کہ حوادث روزگار سے جو کچھ میسر ہو اس کو صبر و اطمینان کے ساتھ برداشت کیا جائے۔
- توکل یہ ہے کہ تنگدستی، عسرت اور فاقہ سے خائف نہ ہوں۔
- صداقت یہ ہے کہ زبان سے جو کچھ کہا جائے اُس پر یقین ہو اور کسی کی مبالغہ کے ساتھ تعریف نہ کی جائے۔
- کرامت یہ ہے کہ کسی کو آزردہ خاطر نہ کیا جائے اور کسی کا دل نہ توڑا جائے۔
- فتوت یہ ہے کہ خدا کے کام میں مردانگی اور شجاعت یعنی بہادری کا مظاہرہ کیا جائے۔ اور خدا کے بغیر کسی سے خائف نہ ہوں۔

اگر تیغ عالم بجنبد ز جای نبرد رگی تا نخواہد خدای

- سخاوت یہ ہے کہ مال و متاع کو محتاجوں میں بانٹا جائے۔
- شجاعت سے مراد یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے سے دریغ نہ کیا جائے۔

راحت الطالبین کی فصل دوم میں خواجہ صاحب نے حضرت شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ کے مقامات اور صوفیا میں انکے مرتبہ پر بحث کی ہے۔ زیر نظر فصل میں بعض ایسے اولیائے کرام کے نام بھی درج ہیں جنہوں نے ہندوستان، ایران اور وسط ایشیا جیسے دور و دراز علاقوں سے مہاجرت اختیار کر کے حضرت سلطان العارفینؒ کا تقرب حاصل کیا۔ ان میں سے کئی ایسے بھی ہیں، جنہوں نے حضرت مخدومؒ سے تلمذ کیا۔ ان میں سے بطورِ مثال میر محمد سعید سمرقندیؒ (برگ ۱۴۸ اب)، خواجہ مشتاق شیرازی (برگ ۱۵۴ اب) شیخ عبدالصمد ملتانی (برگ ۱۴۹ اب) وغیرہ شامل ہیں۔ اس فصل میں حضرت مخدوم پاکؒ کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے، خواجہ صاحبؒ نے انکے بعض خوارق عادات اور کشف و کرامات کو بھی درج کیا ہے۔

"راحت الطالبین" کی تیسری فصل میں خواجہ صاحب نے حضرت مخدومؒ کے باطنی کمالات و کرامات پر بحث کی ہے۔ اس فصل کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حضرت مخدومؒ کے کشف و کرامات

بیان کرنے کے ضمن میں خواجہ صاحبؒ نے اپنے مرشد طریقت کے عقیدت مند خلفاء کے حالات نہایت اجمال کے ساتھ درج کئے ہیں۔ جن خلفاء کے تذکرے اس باب میں درج ہیں۔ انکے اسمائے گرامی یوں ہیں:

- حضرت ہردی بابا ریشیؒ
- خواجہ زین علیؒ
- حضرت بابا داوٗد خاکیؒ
- خواجہ یوسفؒ
- حضرت شیخ حیدر تیلہ مولیؒ
- شیخ شمسی کامراجیؒ
- حضرت روپی ریشیؒ
- حضرت میر سید قاسم رانیواریؒ
- شیخ احمد چاگلیؒ
- میر سید سکندر پوریؒ
- حضرت خواجہ اسحاق قاریؒ
- حضرت خواجہ شریف کولؒ
- حسن قاری بلدیمریؒ

مندرجہ بالا خلفاء کے علاوہ جو صوفیائے کرام حضرت مخدومؒ کی خدمت میں تشریف لے جاتے تھے اور انکے عقیدت مند تھے اُن میں سے چند ایک کے نام یوں ہیں:-

- خواجہ بہادر گنائی (برگ ۱۴۹ الف)
- خواجہ موسیٰ بقال (برگ ۱۵۶ ب)
- حاجی شریف (برگ ۱۵۸ الف)
- میاں مانک شاہ مجذوب (برگ ۱۵۹)
- خواجہ میرم سکندرپوری (برگ ۱۵۸ ب)

"راحت الطالبین" کا فارسی متن آج تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے بھی بہت کم یاب ہیں۔ اس کا جو مخطوط خط نستعلیق میں مخطوطات سکیشن محکمہ تحقیق و اشاعت میں محفوظ ہے، اس میں کافی غلطیاں موجود ہیں۔ اس نسخہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

"الحمد للہ الذی ھو المطلوب الطالبین (الاغنیٰین) والمنہ.....[۲۳]

اس کی آخری عبارت یوں ہے:

"این نسخہ راحت الطالبین من الہجرت سنہ اثناو ثمانین وتسع ماتہ (۹۸۲ھ) (باتمام) یافت

واللہ اعلم بالصواب"[۲۴]

"راحت الطالبین" سنہ ۹۸۲ھ میں مکمل ہوئی ہے یعنی خواجہ صاحبؒ نے یہ کتاب حضرت مخدومؒ کی وفات سے دو سال قبل تصنیف کی۔ اسلئے اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ یہ کتاب حضرت مخدومؒ کی نظروں سے بھی گذر چکی ہوگی۔ یہ بھی بعید نہیں کہ "راحت الطالبین" حضرت مخدومؒ کے اُن خلفاء کے زیر مطالعہ رہی ہو، جنہوں نے اسکے بعد کتابیں تصنیف کیں ــــ ان میں ہدایت المخلصین، تذکرۃ المرشدین اور تذکرۃ العارفین

خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

"راحت الطالبین" ایک مختصر کتاب ہونے کے باوجود کشمیر میں متصوفانہ فارسی نثر کی پیش رفت میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی زبان شستہ اور رواں ہے۔ کتاب کے اکثر و بیشتر حصے میں حضرت مخدومؒ اور انکے خلفاء کے کشف و کرامات کی تفصیل درج ہے جس کی بدولت اگر اس کتاب کو تذکرہ کے نام سے بھی موسوم کیا جائے تو بجا ہوگا۔ اسلوب نگارش سادہ اور بے پیرایہ ہے۔ عبارات میں کوئی الجھاؤ نہیں اور نہ ہی سبک ہندی کی نگارشات کی طرح اس میں خیال بافی یا پیچیدہ تشبیہات و استعارات ہیں۔ مصنف نے مغلق الفاظ اور دور از ذہن اصطلاحات سے اجتناب کیا ہے۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ خواجہ صاحبؒ شعر و شاعری کا بھی مذاق رکھتے تھے۔ تاہم کسی بھی تذکرے میں ان کا نمونۂ کلام درج نہیں۔ خواجہ صاحبؒ کے اشعار کا ایک بڑا حصہ انکی تصنیف "راحت الطالبین" میں درج ہے۔ جو انہوں نے مختلف موقعوں اور حالات سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔

"راحت الطالبین" میں شعر و شاعری کے جو نمونے دستیاب ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی شعر و شاعری کو مذہبی اور دینی معاملات کے دائرے تک ہی محدود رکھا تھا۔ اُن کے عمدہ اشعار وہی ہیں جن میں انہوں نے راہِ سلوک میں حائل مشکلات اور مرشد طریقت کے روحانی کمالات اور مقامات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ شعر کے رشتے میں پرویا ہے۔ بطور مثال درج ذیل چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

شمۂ گویم ز وصفِ سرّ خویش — من چہ دانم گفت اندر پیر خویش
شکر حق از لبِّ کہ پیری قطب حق — دل گرفت از بخت خوشی تاثیر خویش
غوث الاعظم خواند اورا خود خدای — نورِ حق بارید از تنویر خویش
در عطا و جود اوراہست گنجی معرفت — با ہمہ کس لطف خواہد می کند تقصیر خویش
در عرفان، در ایقان، در عشقِ او، در شوق او — از کلام گنج وحدت میکند تقریر خویش
خانۂ دل کرد خالی از ہمہ ماسوی او — فرش عشق حق گسترد در دل تعمیر خویش
فیض یا کش جن وانس و ہم ملایک میبرند — نفس ظالم ہم شیطان دیداز تحریر خویش
ہر چہ اندر کائنات است در دلش اعیان بود — یک نگاہش زر لبساز د جملہ راز اکسیر خویش
سر بلندی ہم چو ہمراہ یافتہ مخدوم می — از کمالِ لطف ایزد یافتہ تقدیر خویش
او بحق محبوب ہست و ہم ہذا محبوب اوست — شیخ حمزہ شیخ اعظم مفخر ند [ ] خویش
ای حسن ہر دو گنجی از یقین و معرفت — در پذیر از گنج اورا دور کن [ ] خویش[25]

ایک اور منقبت جو خواجہ صاحبؒ نے حضرت مخدومؒ کی مدح میں کہی ہے، کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

از نسیم گلستانِ ذکر پیر | ای کہ ایم پر گلاب و عنبرست
غوث اعظم آمدش از حق ندا | شیخ ما کہ شیخ حمزہ برترست
از حسن یک نکتۂ احسن شنو | پیر ما در ہر دو عالم اطہرست[۴۹]

خواجہ صاحبؒ کا کلام تصوف و عرفان، عشق و سرمستی اور پند و نصایح سے مملو ہے۔ اس میں صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کا ایک الٰہی پیغام ملتا ہے۔ جو مسلمانوں کو اسلامی فرائض انجام دینے اور اپنی عاقبت سنوارنے کے ساتھ ساتھ عبادات و ریاضات میں مشغول ہونے کا درس دیتا ہے۔

شیوہ مستان رحمان دیگرست | خرقۂ رندان بسان دیگرست
بہر وصل یار ہر دم (نالہ زار) | فرقۂ اللہ گویان دیگرست
در دو عالم ہر کہ غیرِ حق بجست | کافرست آن و مسلمان دیگرست
ترکِ جنت، ترکِ دنیا، ترکِ دین | این چنین کس ای جوانان دیگرست
گوہر عرفان ز گنج دل بجو | ای حسن ویرانہ جان دیگرست

عشق و عاشقی اور ہجر و وصال سے متعلق راحت الطالبین میں درج ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

ہر کرا این عشق بازی در ازل آموختند | تا ابد در جان او شمعی ز عشق افروختند
واندلی را گر برای وصل او افروختند | ہم چو بازش از دو عالم دیدگان بر دوختند
پس در این منزل چگونہ تاب ہجر آرند بلا | بیدلانی کاندرین منزل بوصل آموختند
لاجرم چون شمع گاہ از ہجر او بگداختند | گاہ چون پروانہ ز شمع وصالش سوختند

خواجہ صاحبؒ کے وہ اشعار جو عشق و عاشقی سے متعلق ہیں دراصل انکے اشعار کے عمدہ نمونے ہیں۔ ایسے اشعار میں وہ عام طور پر اپنا ذاتی درد و غم، سوز و گداز اور ہجر میں گذارے جانے والے لمحات کا نہایت موثر انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ درج ذیل چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

شمع عشقی از دلم افروختست | نخلِ تن را تا سراپا سوختست
چشم من از ہر دو عالم غیر دوست | کس ندید از غیر تم بر دوختست
من نگفتم این چنین پیرم نگفت | علم او طفلِ دلم آموختست

مست باش و هرچه گوئی مست شو — این خیالی کز بهور دوستست
عاشقان و عارفان فتویٰ زدند — هرکه عاشق نیست او یک گوشتست
ای حسن غافل مشو از حسن دوست — تا تو خود هرگز نباشی او ستست[27]

"راحت الطالبین" میں خواجہ حسنؒ کے اکثر اشعار حضرت مخدومؒ کی مدح میں ہیں۔ ان میں ہر جگہ خواجہ صاحب نے اپنا تخلص حسن لکھا ہے۔ حضرت مخدومؒ کی مدح میں کہی ہوئی ایک طویل منقبت کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:-

بترس از باطن مخدوم زینهار — بدوزخ میگیرند چون موم در نار
هرآنکس منکرِ مخدوم باشد — بر نزدِ هر ولی مردود هم خوار
ز صحبتِ منکرانِ او حذر کن — ز سگ ناپاکتر باشد و مردار
مشو منکر بطلب آستانش — که گردی در دو عالم بس گرفتار
هرآنجمی که منکر شانِ مخدوم — بدان از پشت شیطانند صد بار
سراپا غرق لعنت باد منکر — دراین دنیا چو شیطان هم دران دار
ز جان و دل بیا مخدوم گویان — بذکر و فکر خاطر با قرار
که غوث اعظمش خود خواند الله — بروز یکهزارش را و یکبار
جزان چنگ از دل و جانش بداماں — ز شیخان شیخ حمزه تو مگذار
حسن در معرفت شد چشم بینا — چو کحل خاکپایش کرد یکبار[28]

خواجہ حسن سات قرأتوں کے ماہر، عالمِ دین اور سلسلہ سلطانیہ کے اہم ارکان میں شامل تھے۔ انہوں نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں حضرت مخدومؒ کے ہمراہ کشمیر کے طول و عرض میں بہت سے سفر کئے۔ وہ ایک مدت تک موضع شیوا میں رشد و ارشاد میں مشغول رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے بہت سے خلفا کی تربیت کی۔ رات دن ریاضت میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے اور اپنے عیال کی کفالت کے لئے محنت کرتے اور اپنے ہاتھ سے کھاتے تھے اور اس کو متاع بے بہا سمجھتے تھے۔ انکی فراغ دلی اور مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی شخص ان کے دسترخوان سے بھوکا نہیں اُٹھتا۔ اُن کے متعلق مشہور ہے کہ ایک بار وہ حضرت مخدومؒ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک صوفی داخل ہوئے اور حضرت مخدومؒ سے عرض کیا کہ ہندوستان کے درویشوں کی ایک جماعت آئی ہے۔ انکی رہائش اور خورد و نوش کا بندوبست کیا جائے۔ حضرت مخدومؒ نے انہیں مسجدِ جامع میں بیٹھنے کا حکم دیا اور خواجہ صاحب کے ساتھ انکے

خورد و نوش کے بارے میں مشورہ کرنے لگے کہ خواجہ صاحب اُٹھ کر اپنے گھر چلے گئے کچھ کپڑے فروخت کئے جتنی نقدی حاصل ہوئی وہ حضرت مخدومؒ کے دست مبارک پر رکھ دی اور چالیس دن تک مہمانوں کے خورد و نوش کا انتظام اپنے ذمے لیا۔[29]

خواجہ صاحب کی پرہیزگاری اور زہد و تقویٰ اس پائے کے تھے کہ وہ تصفیہ نفس اور تزکیہ قلب کے علاوہ تطہیر بدن کے لئے روزانہ سات بار غسل کرتے۔ جاڑے کی سردی ہو یا موسم گرما میں سورج کی تمازت، وہ غسل کرتے۔ سردیوں کے موسم میں جب پانی یخ سے جما ہوا ہوتا تھا خواجہ صاحبؒ یخ توڑ کر غسل کرتے اور ریاضت میں محو ہو جاتے۔ صاحب واقعات کشمیر کے بقول خواجہ حسن فنافی الشیخ کے درجے تک پہنچے تھے۔ حضرت مخدومؒ کو ان کا خاص خیال تھا۔ کمال اعتقاد رکھنے کی وجہ سے خواجہ صاحب ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ اور یا حضرت مخدوم کہتے جسکی وجہ سے انہیں کافی معنوی فائدے نصیب ہوئے۔[30]

●

حواشی و تعلیقات

۱۔ راحت الطالبین از خواجہ حسن قاری برگ ۱۵۲ الف
مخطوطہ مملوکہ محکمہ تحقیق و اشاعت، کشمیر یونیورسٹی شمارہ ۵۰۱

۲۔ ایضاً برگ ۱۶۲ الف، واقعات کشمیر ص ۱۲۲ میں درج ہے کہ خواجہ حسن قاری قریہ چندہ پور کھاورپارہ کے رہنے والے تھے۔

بلدیمر کا علاقہ آج کل صفاکدل اور نواکدل کے درمیان میں بریڈی مر نام سے مشہور ہے یہاں پر ایک ہندو راجہ راج دیو (۱۲۱۳ - ۱۲۳۶) کے زمانے میں بلدی چندرن نے اپنے نام پر بلدی مٹھ نام کی ایک سرائے برہمنوں کے لئے تعمیر کرائی تھی۔ اسی سرائے کے نام کی مناسبت سے اس محلے کو بلدیمر کہتے تھے۔ ——— کاشر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ ص ۴۷
مطبوعہ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی ۱۹۸۶ء

۳۔ چلچلۃ العارفین از خواجہ اسحق قاری برگ ۲ الف۔ مخطوطہ مملوکہ محکمہ تحقیق و اشاعت نمبر ۵۰۰

۴۔ ہدایت المخلصین از بابا حیدر تیلہ مولی برگ ۱۱۲ الف مخطوطہ مملوکہ محکمہ تحقیق و اشاعت نمبر ۱۹۷

۵۔ ریاض الاخیار (اردو ترجمہ اسرار الابرار از مشکواتی) ص ۲۶۹

۶۔ ہدایت المخلصین برگ، ۱۱۲ الف

۷۔ تذکرۃ العارفین از بابا علی رینہ، برگ ۲۳۵ الف و ب نسخہ مملوکہ کلچرل اکادمی

۸۔ واقعات کشمیر ص ۱۲۲ مطبوعہ، حرز المبین (اردو ترجمہ دستور السالکین) ۲/۱۶۶ مطبوعہ،

۹۔ ہدایت المخلصین برگ ۱۱۱ ب ۱۰۔ تذکرۃ العارفین برگ ۲۳۶ ب

۱۱۔ چل چلۂ العارفین برگ ۵ الف، تذکرۃ العارفین برگ ۲۳۶ ب

"واقعہ نویسی" کی تفصیل خواجہ اسحٰق قاری کے ضمن میں درج ہے۔

۱۲۔ حرز المبین ۲/۱۶۷، ۱۶۹ ۱۳۔ ریاض الاخیار ص ۲۶۹

۱۴۔ تذکرۃ العارفین برگ ۲۲۹ الف و ب ۱۵۔ ریاض الاخیار ص ۲۷۰ ۱۶۔ ریاض الاخیار ص ۲۷۰

۱۷۔ کاشُر انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ ص ۱۱۷ مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ تذکرۃ العارفین برگ ۲۲۵ ب ۲۰۔ تذکرۃ العارفین ۲۲۶ الف

۲۱۔ ہدایت المخلصین، برگ ۱۱۱ ب

۲۲۔ خواجہ حسن قاری نے راحت الطالبین برگ ۱۶۱ الف میں حضرت مخدومؒ کے خلفاء کی یہی فہرست درج کی ہے

۲۳۔ راحت الطالبین برگ ۱۴۰ الف ۲۴۔ راحت الطالبین برگ ۱۶۲ الف

۲۵۔ راحت الطالبین برگ ۱۴۸ ب آخری دو اشعار کے قوافی اچھی طرح سے پڑھے نہیں جا سکتے۔

۲۶۔ راحت الطالبین برگ ۱۵۰ الف ۲۷۔ راحت الطالبین برگ ۱۴۵ ب

۲۸۔ راحت الطالبین برگ ۱۵۷ الف و ب ۲۹۔ تذکرۃ العارفین برگ ۲۳۸ ب

۳۰۔ واقعات کشمیر ص ۱۲۲



محمد صدیق نیاز مند

حضرت خواجہ اسحاق قاری رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ اسحٰق قاری رحؒ کا شمار کشمیر کے برگزیدہ اولیائے کرام اور صوفیائے عظام میں ہوتا ہے۔ وہ ایک پرہیز گار عارف، صاحب نظر صوفی، اعلیٰ پایہ ادیب و مفکر اسلام اور علمِ تجوید کے ماہر تھے۔ حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم رحؒ کے برگزیدہ خلیفہ ہونے کے ناطے وہ کہکشانِ سلطانیہ کے تابناک ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے "چلچلتہ العارفین" تصنیف کر کے تصوف و عرفان کی جو قندیل روشن کی وہ بلاشک و تردید آج کل کے مادہ پرست دور میں بھی طالبانِ حق کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہے۔

اپنے زمانے میں خواجہ صاحب رحؒ "قاری" کے لقب مشہور تھے البتہ ان کے معاصرین میں سے حضرت بابا داؤد خاکی رحؒ نے لکھا ہے کہ اُن کا لقب حلیم تھا۔ فرماتے ہیں ؎

از کمالِ تربیت با خواجہ اسحاق حلیم
گشتہ ملہم مخبر و مانع زما اخمر شد است[1]

خواجہ صاحب رحؒ کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ تذکروں میں نہیں ملتے۔ البتہ انکی زندگی کے بارے میں انکی تحریر کردہ کتاب "چلچلتہ العارفین" میں بعض خفیف اشارے ملتے ہیں جن سے انکے خاندان، مسکن یا جائے پیدائش و سکونت پر تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے[2]۔ "چلچل العارفین" کے مطالعے سے معلوم

ہوتا ہے کہ خواجہ اسحٰق ایک علم پرور اور ادب نواز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ علم و ادب کی سرپرستی اور دینی علوم کی آبیاری کرنا ان کے خاندان میں عرصے سے جاری تھا۔ چنانچہ اس خاندان سے خواجہ حسن قاریؒ اور خواجہ اسحٰق قاریؒ جیسے دو اعلیٰ پایہ کے فنکاروں کا بیک وقت پیدا ہو کر کشمیر کے آسمانِ ادب پر جگمگانا اس کی بہترین دلیل ہے۔ خواجہ صاحبؒ شہر سرینگر میں بلدیمر کے علاقے میں رہائش پذیر تھے۔[۳] یہیں پر پیدا ہوئے، پلے بڑھے، نشوونما پائی اور یہیں پر ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ اگرچہ اپنے بھائی خواجہ حسن قاریؒ سے ایک سال عمر میں چھوٹے تھے لیکن عقل و فراست، زہد و تقویٰ، علم و ادب اور ریاضت و پرہیزگاری میں ان سے گوے سبقت لے گئے۔

خواجہ صاحب ایامِ طفولیت سے ہی حضرت سلطان العارفینؒ کے ارادت مند تھے جسکی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں اُن کا قوت حافظہ کمزور تھا اسلئے اُنہیں آسانی سے قرآن شریف ازبر نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے استاد سے کئی بار التجا بھی کی تھی کہ اسکے لئے کوئی علاج یا تدبیر وضع کریں لیکن انکی تمام کوششیں اور تدابیر ناکام ہوگئیں۔ اسکی اطلاع جب انکی والدہ کو ملی تو وہ خواجہ صاحب کو حضرت مخدوم پاکؒ کی خدمت میں لے گئیں۔ حضرت مخدومؒ اُس وقت نمازِ عشا کے بعد طعام تناول فرما رہے تھے۔ طعام سے فارغ ہوکر جب حضرتؒ نے ہاتھ دھوئے تو خواجہ کی والدہ سے بغیر استفسار کئے اُنہیں اپنے قریب لانے کے لئے کہا۔ جب خواجہ صاحب نزدیک آئے تو حضرت مخدوم پاکؒ نے طشتری میں سے تھوڑا سا آبدست اٹھا کر انکے منہ میں ڈالدیا اور یہ دعا فرمائی "ربِ اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃً من لسانی یفقہُ قولی ربِ زدنی علما"۔ اسکے بعد جب خواجہ صاحب اپنی والدہ کے ہمراہ گھر پہنچے اور حسبِ عادت قرآن کھولا اور تلاوت کرنے لگے تو جو کچھ ہوا اسکے متعلق خواجہ صاحب خود یوں لکھتے ہیں :-

"میں نے دیکھا کہ مصحف مجید ابتداء سے آخر تک مجھے یاد ہو چکا تھا اور اسکے قواعد و ضوابط بھی مجھے اچھی طرح سے یاد ہو چکے تھے۔ اگلے دن جب میں اپنے استاد کی خدمت میں گیا قرآن کھول کر انہوں نے جہاں کہیں بھی مجھے تلاوت کرنے کا حکم دیا میں خدا کے فضل سے آسانی کے ساتھ اسکی تلاوت کرسکتا تھا۔ مجھ میں اچانک تبدیلی دیکھ کر میرے اُستاد حیران ہوگئے۔"[۴]

خواجہ اسحٰق قاریؒ اور انکے بھائی خواجہ حسن قاریؒ نے اپنے زمانے کے ایک جید عالم مخدومی حاجی احمدؒ سے جو ہفت قرأت میں ممتاز تھے، دینی علوم اور خاص طور پر قرأت سیکھی۔ رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں

کو اس میں اتنی مہارت حاصل ہو گئی کہ دونوں قاری کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ چلچلۃ العارفین میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں :۔

عرضیکہ بعد از تحقیق و تشخیص قواعد قرأۃ برادر عزیز خواجہ حسن قاری نیز درین علم کامل گشتہ، لہٰذا مشہور بلقب قاری و معروف بآن گشتیم "[۵]

حضرت مخدوم پاکؒ کے مرید بننے سے قبل خواجہ اسحٰق ایک مجذوب درویش کے عقیدت مند تھے۔ مذکورہ مجذوب چوری چھپے ایسے کام بھی کرتا تھا جو شرعاً جائز نہیں تھے۔ وہ اکثر بھنگ اور افیون پیتا تھا۔ اس کا اثر خواجہ صاحب پر بھی پڑا تھا۔ جب خواجہ صاحب حضرت مخدوم پاکؒ کے پاس تربیت کی غرض سے تشریف لے گئے تو حضرتؒ کو غیبی طور پر الہام ہوا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو نصیحت کی جس کو انہوں نے دل و جان سے قبول کر لیا۔ اور ناجائز کام انجام دینے سے پرہیز کیا۔ حضرت خاکیؒ "دستور السالکین" میں اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں :

"خواجہ اسحاق قاریؒ، جن کا لقب حلیم تھا، کو انتہائی تربیت کی وجہ سے پوشیدہ طور اس کے ممنوع مشروب یعنی بھنگ پینے سے آقائے نامدار کو الہام ہوا اور آپ نے اُسے بھنگ پینے سے ممانعت فرمائی۔ چنانچہ مخدوم خواجہ اسحاق قاریؒ جو کہ اپنے بھائی خواجہ حسن قاریؒ کی طرح علم قرأت دیانتداری اور بردباری میں کامل تھا، اس سے پہلے کہ وہ آقائے نامدار کی صحبت سے مشرف ہو کسی مجذوب درویش یا قلندر کی صحبت میں رہا کرتا تھا اور اس کی پیروی کرتے ہوئے پوشیدہ بھنگ پیتا تھا اور اس کو بڑا کام تصور کرتا تھا.... جب پختہ اعتقاد کے ساتھ اپنے بھائی کے ہمراہ اس نے اس مرشد کامل کی خدمت میں آنا شروع کیا۔ آقائے نامدار کو کمال تربیت اور انتہائی توجہ سے جو کہ ان کو خلوص والے ملاقاتیوں کے ساتھ ہے۔ خواجہ اسحاق مذکور کے بارے میں الہام ہوا کہ اس خواجہ کو فرما دیجئے کہ کیوں پوشیدہ طور بھنگ پیتا ہے۔ حالانکہ وہ خلاف شریعت اور حرام ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ اس سلسلۂ شریف میں اس کی تربیت اُن مرشدوں کے ذریعہ، جو کہ سب شریعت کے زیور سے آراستہ تھے ؛ ہو تو پھر اُسے چاہیئے کہ اس سے اور اس کے بغیر تمام ممنوعہ چیزوں سے توبہ کرے۔ جب اس کلام سے خواجہ مذکور کو خبر دی گئی بہت خوش ہوا اور آقائے نامدار کی کرامت کا اقرار کیا۔ اس کے بعد خواجہ مذکور

کو تسلی و تشفی ہوئی اور اس نے (بھنگ پینے اور) تمام ممنوع چیزوں سے توبہ کی

اور مرید بن گیا۔ [76]

اس واقعہ کی تفصیل "چلچلۃ العارفین" میں یوں درج ہے:۔

"راقم الحروف (اسحاق قاری) اس ملک کے ایک مجنون صفت درویش کی خدمت میں پوشیدہ طور پر جایا کرتا تھا اور اس کا بڑا معتقد تھا۔ وہ مجھ سے نقد و جنس حرام و حلال ماکولات و مشروبات طلب کرتا اور میں کافی کوششوں کے بعد اسکی فرمائشوں کو پورا کرتا تھا۔ وہ بعض اوقات مُسکر جیسے بھنگ، افیون اور دوسری مُعزرات بھی پیتا تھا جسکے پینے کے بعد وہ مست ہو جاتا اور مستی کے عالم میں بہت سے کشف و کرامات کا دعویٰ بھی کرتا تھا۔ اس سے میرا اعتقاد اُس پر اور بھی بڑھتا تھا۔ راقم اُن زمانے میں حضرت مخدومؒ کی خدمت میں بہت کم جایا کرتا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی خواجہ یوسف کے بغیر اور کسی کو یہ واقفیت نہ تھی کہ میں اس مجنوں درویش کے پاس جایا کرتا ہوں۔ مجنون درویش مجھے بھی مجبور کرتا رہتا تھا اور کہتا تھا کہ اے اسحاق بھنگ پی لو تاکہ اسرار نہانی تجھ پر فاش ہو جائیں اور اللہ کا قرب آسانی سے نصیب ہو۔ مجھے جب اصرار کرتا رہا تو ایک دن میں نے عزم جزم کر لیا کہ اس مجنون کا طریقہ اپنا لوں اور اس پر عمل کروں۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ میں اس فعل کا مرتکب بھی ہوا۔ بھنگ پی کر میں مست و مدہوش پڑ گیا۔ اسی بدحواسی کے عالم میں میں نے دیکھا کہ حضرت مخدوم پاکؒ حاضر ہوئے اور عصا کا ایک ضرب میرے سینے پر اور دوسرا ضرب اس مجنون کے سر پر مارا۔ ضرب لگتے ہی میں ہوش میں آیا۔ دیکھتا ہوں کہ واقعی اس مجنون کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور میرے سینے پر ایک زخم لگا تھا۔ شام کو جب گھر پہنچا تو کافی شرمندگی اٹھانا پڑی۔ اس خوف کی وجہ سے میں روحانی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ جو واقعہ پیش آیا اسکے بارے میں کسی کو واقف نہیں کیا۔ دوسرے دن جب میرے بھائی خواجہ حسن قاری حضرت مخدومؒ کی خدمت میں گئے تو انہوں نے خواجہ حسن قاریؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ واپس جا کر گھر سے خواجہ اسحٰق کو بھی اپنے ساتھ ہمارے پاس لے آؤ۔ خواجہ حسن واپس گھر آئے

اور مجھے حضرت مخدوم رہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی بشارت سنائی۔ میں
فوراً غلطاں و خیزاں حضرت مخدوم کی خدمت میں گیا۔ آداب بجالائے۔ انہوں
نے میری نصیحت اور تربیت فرمائی۔ ۷ء

خواجہ صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان کی والدہ نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ انکی والدہ نے انکے لئے ابتدائی استاد اور رہنما کے فرائض انجام دئے۔ والدہ نے نہ صرف انکی تربیت کی بلکہ انہیں ریاضت جیسے "کم خوردن، کم گفتن و کم خفتن" کی تلقین بھی کی اور انہیں پابندی کے ساتھ صوم و صلوٰۃ انجام دینے کی رہنمائی کی۔ واقعہ یوں ہے کہ خواجہ صاحب کی حق طلبی کا بیج انکے دل میں انکی والدہ نے ہی بویا تھا جو بعد میں حضرت سلطان العارفین رہ کے دست شفقت اور تربیت سے پھل پھول کر ایک ثمردار درخت کی صورت میں نمودار ہوا۔ ۸ء

خواجہ اسحٰق رہ کے والدین حضرت سلطان العارفین رہ کے مرید اور عقیدت مند تھے ۹ء اس سے پہلے وہ کبروی سلسلہ سے وابستہ ایک درویش کے مرید تھے۔ حضرت سلطان العارفین رہ کو اس زمانے میں اتنی شہرت حاصل نہ تھی۔ صرف اہل دل میں سے بعض عارف ان سے واقف تھے۔ یہ درویش ایک بار خواجہ صاحب کے گھر میں موجود تھے کہ انکے بڑے بھائی خواجہ حسن قاری بیمار ہوئے۔ انکے والد صاحب نے درویش سے التجا کی کہ انکے بیٹے کے حق میں دعا کریں۔ درویش نے دعا کی لیکن بیمار کی حالت میں سدھار نہ ہوا۔ ہر چند کہ اطبا نے بھی علاج و معالجہ کیا لیکن بیمار کا افاقہ نہ ہوا۔ خواجہ صاحب کے والد صاحب پریشانی کی حالت میں مسجد میں عجز و انکساری کرتے رہے۔ انہوں نے ایک بزرگ شخص کو مسجد کی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے بعد ذکر و اذکار میں محو دیکھا۔ انکے قریب گئے اور انہیں اپنے بیٹے کی بیماری سے متعلق آگاہ کیا۔ ان سے التجا کی کہ انکے ہمراہ گھر آکر بیمار کے حق میں دعائے نیک فرمائیں۔ حضرت مخدوم رہ خواجہ کے گھر تشریف لے گئے۔ انہوں نے اپنے دست مبارک سے بیمار کے منہ میں پانی کی چند بوندیں ڈالیں اور دعا فرمائی۔ بیمار کو ہوش آیا اور چند ہی روز میں ٹھیک ہوگیا۔ ۱۰ء اسی دن سے خواجہ صاحب کے والدین نے حضرت سلطان العارفین رہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور انکے مرید بن گئے۔

خواجہ اسحٰق قاری رہ نے قرآن و حدیث کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی زیادہ تر توجہ قرآن ازبر کرنے کی طرف مبذول کی اور قلیل عرصے میں فرقانِ حمید حفظ کرلیا۔ اسکے بعد انہوں نے توضیح کا مطالعہ شروع کیا۔ لیکن پیر طریقت نے انہیں مشکوٰۃ شریف کا مطالعہ کرنے کی طرف راغب کیا۔ یہ

مکمل کرنے کے بعد خواجہ صاحب نے بابا داؤد خاکیؒ کا تلمذ کیا اور ان سے "عوارف المعارف" پڑھی۔ شعرو شاعری میں بھی ان سے اصلاح لیتے رہے۔ "عین العلم" اپنے بڑے بھائی خواجہ حسن کی خدمت میں رہ کر مکمل کی۔ بابا محمد علی رینہؒ سے علم حدیث میں تربیت پائی۔ ع[11]

تصوف و عرفان میں خواجہ اسحٰق نے اکثر و بیشتر حضرت بابا حیدر تیلہ مولیؒ سے تربیت پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب بابا علی رینہؒ بھی بابا حیدرؒ سے تربیت حاصل کر رہے تھے۔ جب بابا داؤد خاکیؒ کو حضرت مخدومؒ کی طرف سے خلافت تفویض ہوئی تو اسوقت خواجہ اسحٰق ولایت کے درجے پر فائز ہوئے۔ ع[12]

حضرت مخدوم پاکؒ نے خواجہ صاحب کو علوم عقلی و نقلی میں تبحر حاصل ہونے کے بعد اپنی خانقاہ میں امامت کے فرائض انجام دینے پر مامور فرمایا۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"اما فقیر در غایت بندگی سعی می نمودم تا بعد از چند گاہ امام خانقاہ خود کردند و فقیر را بخدمت امامت سرافراز فرمودند"۔ ع[13]

حضرت بابا داؤد خاکیؒ اس واقعہ سے متعلق دستور السالکین میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"اس کے بعد آقائے نامدار نے خواجہ اسحاق حلیم کو اس کی اچھی فرمانبرداری اور ذکر اللہ میں ہمیشہ مشغول ہونے سے انتہائی تربیت کر کے اور ظاہر و باطن میں شفقت فرماکر اپنی جماعت کا امام بنایا تاکہ اسکو یہ موقع ملے کہ وہ اکثر بار صحبت سے مشرف ہوا کرے۔ اس کے بعد صحبت کے اوقات میں جو کرامتیں اس نے دیکھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں"۔

حضرت مخدومؒ کی خانقاہ میں امامت کے فرائض انجام دینے کے دوران خواجہ صاحبؒ کو حضرت مخدومؒ کے نہایت قریب رہ کر ان سے فیضان پانے کا موقع میسر ہوا۔ حضرت مخدومؒ کے کشف و کرامات کا عینی مشاہدہ کیا اور ان کی ریاضت و عبادت اور مکاشفہ سے متاثر ہو کر انہیں بھی طریقت کا شوق دامنگیر ہوا۔ پیر کامل کے کہنے پر بُرے کاموں سے تو توبہ کر ہی چکے تھے۔ جب حضرت مخدومؒ نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ صدیقوں کی تو یہ دو اہم چیزیں ملحوظ نظر رکھنا لازمی ہیں۔ پہلی چیز ترک دنیا اور دوسری فعل عملی۔ خواجہ صاحبؒ نے جونہی پیر کامل سے یہ بات سنی تو ان کے حضور سے اٹھ کر چلے گئے۔ جو کچھ بھی مال و متاع اپنی ملکیت میں تھا اُسے عزیزوں، مفلسوں اور ناداروں میں تقسیم کیا حتیٰ کہ اپنی جوان سال بیوی کو بھی طلاق دی اور دل سے اسکی محبت نکال دی۔ پیر طریقت نے اسکے خلوص و محبت اور ترک دنیا کے جذبے کو بھانپ لیا اور فرمایا کہ ترکِ دنیا تو پورا ہو گیا۔ اب فعل عملی باقی ہے جسکی ابتدا

مرشد کی خدمت سے ہوتی ہے کیونکہ مرشد ہی بارگاہ ایزدی میں رہنمائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔[15]

خواجہ اسحٰق کو حضرت مخدوم پاکؒ نے بہت ہی خدمات انجام دینے کا حکم دیا۔ کچھ عرصہ تک وہ تخت سلیمان (پہاڑ) سے کلوخ لاکر مستراح میں رکھنے کے کام پر مامور ہوئے۔ اسکے بعد انہیں پیر طریقت نے یہ حکم دیا کہ انکے گھوڑوں کے لئے بازار سے کندھوں پر چارہ لایا کریں۔[16] انہیں بھیڑ کی کھال پہنادی گئی اور باورچی کی خدمات سرانجام دینے کا حکم ہوا۔ ایسے ادنیٰ درجے کے کام انجام دلانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انکے دل و دماغ سے نخوت اور غرور کو نکالا جاسکے۔ ایک مدت تک جماعت کے پیش امام تھے اور اس زمانے میں وہ حضرت مخدومؒ کے چہیتے مقرب تھے۔[17] خلوت میں وہ انکے جلیس اور سفر میں اُنکے ہم رکاب ہوا کرتے تھے۔ حضرت مخدومؒ بھی اُن کے شفیق اور مہربان تھے۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں خواجہ صاحبؒ کی رہنمائی کی۔ شفیق و مہربان ہوتے ہوئے بھی حضرت مخدومؒ خواجہ صاحب کی کسی غلطی کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ ایک بار خواجہ صاحب سے ایسی غلطی سرزد ہوئی جو درویشوں کے حال کے مناسب نہیں ہوتی۔ حضرت مخدومؒ نے انہیں سو کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ خواجہ کی حق طلبی کا یہ عالم تھا کہ اُنہوں نے اُف تک نہ کی[18] اور نہ ہی جذبہ اور خلوص میں کوئی تبدیلی نمودار ہوئی۔

پیرِ طریقت نے خواجہ اسحٰق کو چہل چلہ ازار یعنی خلوت در انجمن اور چہل چلہ خلوت کے لئے مامور کیا۔ اس کے بعد ہی خواجہ صاحب نے وصول حق کی راہ پائی۔ خواجہ صاحب اپنے مرشد طریقت کے حکم پر زینہ گیر کے علاقے میں سوپور سے کوئی بارہ کلومیٹر شمال میں واقع ایک گاؤں شیوہ میں خلوت نشین ہوئے۔ خواجہ صاحب بائیس سال تک وہاں متمکن ہو کر ریاضات و عبادات میں مصروف رہے۔

خواجہ صاحب کا دل عشقِ الٰہی سے سرشار تھا۔ وہ معرفتِ حق کے حصول کے لئے گویا تڑپتے تھے۔ اُن کا دل درد و سوزِ حق سے بھرا پڑا تھا۔ وہ جہاں بھی گئے یہ درد و کرب انکے دل میں جاگزین تھا۔ ان کے سوزِ درون سے متعلق صاحب "تذکرۃ العارفین" یوں رقمطراز ہیں:

"در ہر جا کہ با ما بود بجز درد و محبت حق از ایشان چیزی ظاہر نگشت"[19]

ایک بار خواجہ صاحب نے درد و سوز کے ساتھ آہ کھینچی۔ وہاں نزدیک ایک پتھر موجود تھا جو اسکے سوزِ درون کی تمازت سے پاش پاش ہوگیا۔ جب بابا علی رینہؒ نے اُن سے اسکے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اسوقت چونکہ میں ذکرِ اسم ذات میں مصروف ہوں جسکی تلقین مجھے اپنے مرشد کامل نے کی ہے مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر نگاہیں کسی پر ڈالوں وہ جل نہ جائے۔[20]

خواجہ صاحب زندگی کے آخری ایام میں کشمیر کے بعض دوسرے علماء و فضلا کی طرح نقل مکانی کرنے

کے لئے مجبور ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ کشمیر میں ۹۹۲ھ ہجری میں جب یوسف شاہ چک کے بیٹے یعقوب شاہ چک نے عنان حکومت سنبھالی تو اُس نے بنیاد پرستی کا برملا اظہار کیا اور سنی مسلک سے وابستہ لوگوں خاص کر دانشوروں اور قلمکاروں کا قافیۂ حیات تنگ کیا۔ چنانچہ قاضی موسیٰ جو کشمیر میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے 'اُن' کے ناعاقبت اندیش ظلم و جبر کا شکار ہو کر شہید کئے گئے۔ جس کے پیش نظر بہت سے علماء و فضلا کشمیر سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ خواجہ اسحٰق قاری نے کشمیر میں قتل و غارت کا خون آشام ماحول دیکھا تو انہوں نے بھی دوسرے علما کی طرح جن میں بابا داؤد خاکی، شمس الدین پال، حضرت بابا روپی ریشی، حضرت بابا میر حیدر تیلہ مولی وغیرہ شامل ہیں، کشمیر کو خیرباد کہا۔ اس ضمن میں صاحب "تذکرۃ العارفین" نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مفہوم یوں ہے:

> ہمارے مرشد طریقت حضرت مخدوم کی رحلت کے بعد سرکشوں کی ایک جماعت بے لگام ہو گئی اور ہمیں تکلیفیں پہنچاتے رہے۔ ہم حضرت مخدوم کے سارے مرید اپنے پیر طریقت کے مرقد پر جمع ہو گئے اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کر لیا کہ کشمیر سے ہجرت کریں۔ بعض مرید پکھلی چلے گئے، بعض نے چکار کا رُخ کیا اور ایک بڑی جماعت شالکوٹ گئی۔ چنانچہ حضرت بابا روپی ریشی اور حضرت بابا حیدر تیلہ مولی چکار تشریف لے گئے اور کچھ دنوں تک وہاں قیام کرنے کے بعد کشمیر میں مراجعت کی۔ خواجہ اسحاق قاری اور بابا داؤد خاکی شالکوٹ (سیالکوٹ لاہور) چلے گئے۔

جب کشمیر پر مغلوں کا تسلط ہو گیا تو حضرت محبوب العالم کے خلفا جن میں حضرت روپی ریشی میر حیدر تیلہ مولی بابا داؤد خاکی وغیرہ شامل ہیں اطراف و اکناف سے کشمیر واپس تشریف لائے۔ البتہ خواجہ اسحاق قاری کچھ دیر تک کے لئے سیالکوٹ میں ہی فروکش تھے۔ بعد میں وہ لاہور سے ہی زیارت حرمین شریفین کی غرض سے عازم مکہ معظمہ ہوئے۔[21] لاہور میں قیام کے دوران خواجہ اسحٰق قاری اور حضرت بابا علی رینہ کے درمیان رسل و رسایل اور نامہ پیام کا تبادلہ بھی ہوتا رہا۔[22]

خواجہ صاحب کے سنہ ولادت کی طرح تذکروں میں انکا سنہ وصال بھی درج نہیں ہے جس کے پیش نظر ان کا سنہ وصال متعین کرنا قدرے مشکل ہے۔ البتہ اتنا یقینی ہے کہ انہوں نے ۹۹۴ھ ہجری یعنی مغلوں کی فتح کشمیر کے بعد انتقال کیا تھا۔ جہاں تک صاحب اسرار الابرار اور صاحب واقعات کشمیر کے بیانات کا تعلق ہے دونوں نے خواجہ صاحب کے وصال سے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ طواف

بیت اللہ کے بعد خواجہ صاحبؒ نے مدینہ منورہ میں روضہ مطہرہ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ ڈیڑھ سال تک وہاں مقیم رہنے کے بعد خواجہ صاحبؒ نے وہیں پر وفات پائی۔ وفات پانے کے بعد انہیں مزار بقیع میں مدفون کیا گیا۔[۲۳]

جیسا کہ قبلاً اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خواجہ صاحبؒ نے اپنی زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ ریاضت و عبادت اور مکاشفہ میں بسر کیا۔ وہ بائیس سال تک موضع شیوہ میں خلوت نشین ہو کر مصروف عبادت رہے۔ ان بائیس سالوں کو چھوڑ کر خواجہ صاحبؒ نے اپنے پیرِ طریقتؒ کے ہمراہ کشمیر کے طول و عرض میں کافی سیر و سیاحت کی۔ انہوں نے سفر کے دوران بہت سے اولیائے کرام کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ دوران سفر وہ اپنے مریدوں کی تربیت بھی کیا کرتے تھے۔ وہ جہاں جہاں گئے اسلامی تبلیغات میں مصروف رہے۔ غیر مسلموں کو زیورِ اسلام سے آراستہ کرتے رہے اور مسلمانوں کی ہدایت کرتے رہے۔

خواجہ صاحبؒ نے کشمیر سے باہر اسوقت سفر کیا جب نامساعد سیاسی حالات کی بنا پر بہت سے کشمیری علماء و فضلا کو اپنے وطنِ عزیز سے ہجرت کرنا پڑی۔ انہوں نے پکھلی تک کا سفر کیا اور پکھلی سے سیالکوٹ لاہور چلے گئے۔ انکی زندگی کا سب سے طولانی سفر فریضۂ حج بیت اللہ انجام دینے کا (سفر) تھا۔ اس سفر میں بھی وہ لوگوں کے لئے باعث ہدایت بنے۔ "تذکرۃ العارفین" میں درج ہے کہ خواجہ صاحبؒ ایک مرتبہ ایک کاروان کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس قافلے میں حاجیوں کے بھیس میں ایک قزاق سفر کر رہا تھا جو موقع کی تاک میں تھا تاکہ مسافروں کے مال و اسباب پر ہاتھ مار سکے۔ وہ خواجہ صاحب کے ہمراہ سفر کر رہا تھا اسلئے خواجہ صاحب کو قریب سے جانچنے کا موقع میسر ہوا۔ وہ خواجہ صاحبؒ کی ریاضت و عبادت اور پاکیزگیٔ نفس سے بہت متاثر ہوا۔ ایک بار خواجہ صاحبؒ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانے والے ہیں۔ خواجہ صاحبؒ نے جواب دیا کہ "از عالم شوق آمدم و بعالم ذوق میروم" اس بات سے راہ زن پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے قزاقی کو خیر باد کہا، توبہ کر لی اور خواجہ صاحبؒ کا مرید بن گیا۔ خواجہ صاحبؒ اپنے سفر حج کے دوران حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے روضہ کی زیارت سے بھی فیضیاب ہوئے ہیں۔[۲۴]

خواجہ صاحبؒ نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کب کیا اس کے بارے میں ہمارے پاس فی الحال کوئی ٹھوس دلیل موجود نہیں اور یہ امر بھی ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے کہ انہوں نے کل کتنی تصنیفات باقی چھوڑی ہیں۔ باعث تعجب ہے کہ "اسرار الابرار" اور "واقعات کشمیر" کے مصنفین، جو کہ خواجہ اسحٰق قاریؒ کے

قریب العصر تذکرہ نویس ہیں، نے خواجہ صاحبؒ کی کسی بھی تخلیق کا نام درج نہیں کیا ہے۔ جبکہ خواجہ صاحبؒ کے معاصرین میں سے حضرت بابا حیدر تیلہ مولیؒ، حضرت بابا علی رینہؒ اور خواجہ میرم بزاز نے اپنی مصنفات میں خواجہ صاحب کی تصنیف "چلچلہ العارفین" کا متعدد بار تذکرہ کیا ہے۔ بابا حیدرؒ لکھتے ہیں:۔

"خواجہ اسحاق قاری رحمۃ اللہ علیہ در نسخہ چل چلہ العارفین مذکور کردہ است کہ مذکر را باین ذکر شغل گیرد" ۲۵

مندرجہ بالا شواہد و براہین کے پیش نظر یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے کہ خواجہ صاحب نے اگر اور تصنیفات نہیں تو کم از کم" چل چلہ العارفین" ضرور تصنیف کی جسکی تصدیق ما بعد کے مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں میں سے حاجی محی الدین مسکینؔ ۲۶ اور غلام حسن کھویہامی نے بالترتیب تحائف الابرار اور تذکرہ اولیائے کشمیر نامی تذکروں میں کی ہے۔

چل چلہ العارفین خواجہ صاحبؒ نے اپنے مرشد کی اجازت سے مرتب کی ہے۔ اُن کے بقول مرشد کے کشف و کرامات بیان کرنے میں بھی انہوں نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ حضرت مخدومؒ کے سبھی مریدوں کو اپنے پیرِ طریقت کے احوال پر کتابیں تصنیف کرنے کی خواہش ہے۔ ۲۷

زیر نظر تخلیق کو خواجہ صاحب نے ۹۸۲ھ ہجری میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حضرت مخدوم پاکؒ بقید حیات تھے۔ کتاب مرتب کرنے کے بعد خواجہ صاحبؒ نے اسکے مسودے کو اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت مخدومؒ نے اسکے مطالعے کے بعد خواجہ صاحبؒ سے فرمایا کہ اسے زمانے کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اسکے علاوہ اس شخص کے حق میں بھی دعا فرمائی جو اس کتاب کا مطالعہ کرے یا اس کو اپنے گھر میں محفوظ رکھے۔ انہوں نے یہ دعا بھی فرمائی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے کے ایمان کو کامل بنا دے۔" چل چلہ العارفین" میں درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمایئے:

"چون این نسخہ کہ مسمی بچہل چلہ العارفین است در سنہ نہصد و ہشتاد و دو از ہجرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم گذشتہ بود کہ در حالہ حیاتیٔ آنحضرت مخدوم مدظلہ مرتب گشتہ و چون بعد از اتمام در نظر آنحضرت مخدوم گذرانیدم و بعضی از احوال کلام صوفیہ و در بعضی اقوال تصوف و مسایل سلوک را مطالعہ کردہ فرمودند کہ این نسخہ از محو کردن باز داریدو درین باب فاتحہ خیر از حضرت مخدوم حاصل نمودہ شد

کہ ہر کہ این نسخہ را مطالعہ نماید و یا بخواند و یا در خانۂ خود نگاہدارد حق سبحانہٗ و تعالیٰ

اورا در حفظ حمایت خود نگاہداشتہ از دنیا با ایمان بسوی آخرت بر آرد۔"[28]

یہ کتاب تقریباً اڑھائی مہینوں کے قلیل عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ایک جگہ انکی طرف خواجہ صاحب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"و آنچہ در چشم من حقیر و گوش این فقیر در آمدہ، خواستم کہ آنرا جمع بیاورم و بنوعیکہ پسند خاطر یاران ترتیب بدہم۔ از کثرت اشغال و از قلتِ فرصت در اندک مدت قریب دو نیم ماہ این نسخہ را شروع کردہ با تمام رسانید"۔[29]

"چل چلہ العارفین" سلطان علی شاہ چک (۹۷۸ - ۹۸۷ھ) کے زمانہ اقتدار میں تحریر کی گئی کشمیر کی ایک اہم متصوفانہ نثری تخلیق ہے۔ اس کتاب میں مرشدِ طریقت کے حالات قلمبند کرنے کے علاوہ مصنف نے تصوف و عرفان کے بعض باریک نکتوں کی وضاحت اور راہ سلوک کے مختلف مقامات و مسائل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ زیر نظر تخلیق کو سات مختلف ابواب میں یوں تقسیم کیا گیا ہے :-

- باب اوّل۔ در ارادت خود بجناب حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ مدظلہ
- باب دوم۔ در سلوک طریقت و ریاضت و عبادت و طاعت
- باب سیوم۔ در طریق چل چلہ خلوت و آداب آن
- باب چہارم۔ در تبدیل اخلاق و در خلاف نفس و رضاء حق کہ عبادت عاشقانست
- باب پنجم۔ در اقوال معرفت و عبادت و طاعت عارفان
- باب ششم۔ در محویات و استغراق رحمانی
- باب ہفتم۔ در مقامات و کرامات و مراتب عالی درجات مرشدی و مخدومی و مربی سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ مدظلہ و در بعضی اصحاب با کمال الیشان وغیرہ

اور اب ان ابواب کا مختصر سا خاکہ ——

۱۔ چل چلہ العارفین کا یہ باب اگرچہ کمیت کے لحاظ سے مختصر ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے اس باب کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس باب میں مصنف نے حضرت مخدوم پاکؒ کے ساتھ اپنی ارادت، عقیدت اور انکے حلقۂ شاگردی میں داخل ہونے کی وجہ بیان کی ہے۔ نیز اس میں مصنف نے اپنی ابتدائی زندگی، خاندان، والدین اور اپنے بھائی حسن قاریؒ وغیرہ کے بارے میں بھی بیش قیمت اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ لہذا یہ باب مصنف کی نجی زندگی اور راہ سلوک میں انکے وارد ہونے کے بارے میں سب سے مستند ماخذ

کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ حضرت مخدوم پاکؒ کے حلقہ مریدی میں داخل ہونے کے لئے خواجہ اسحاق قاریؒ کو اپنی والدہ نے ترغیب دی جس کا اعتراف وہ اپنی ماں کی زبانی یوں کرتے ہیں: "تمہارے والد حضرت سلطان العارفینؒ کے معتقدوں میں سے تھے۔ خود میں بھی انکی بارگاہ کے حقیر خادموں میں شامل ہوں، تمہارا بڑا بھائی خواجہ حسن قاریؒ بھی اسی درگاہ کے مخلصوں اور معتقدوں میں سے ہے۔ یہ جو قرآنی علوم اور دوسری فیوض کا دروازہ تم پر کھل چکا ہے۔ یہ سب حضرت مخدومؒ کی بے پناہ محبت کا نتیجہ ہے۔ اب تمہیں چاہیئے کہ اطاعت اور سجدہ بجالانے والی جبین کو حضرت عرش آشانی (حضرت مخدومؒ) کے آستانہ پر رکھکر گرتے رہو کیونکہ تم پر اسکے بغیر اور کوئی دروازہ نہیں کھلے گا جو حقیقت کی طرف تمہاری رہنمائی کریگا۔ والدہ محترمہ کی یہ نصیحت سن کر میں (اسحاق قاری) اسی وقت باطنی طور پر حضرت مخدوم پاکؒ کا معتقد ہوگیا لیکن ظاہری طور پر میں انکی خدمت میں بہت کم جاتا رہا۔" نمبر ۳۰

خواجہ صاحبؒ کی حقیقت بیانی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اپنی نجی زندگی سے متعلق بعض ایسے مخفی گوشوں سے بھی پردہ کشائی کی ہے جن کو عام انسان سر عام بیان کرنے سے نہ صرف کتراتے ہیں بلکہ عار محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ بچپن میں ایک درویش کے کہنے پر بھنگ پی کر مدہوش ہوئے وغیرہ جیسے واقعات خواجہ صاحب کی ذاتی زندگی کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں اور ایسے گوشوں پر سے پردہ ہٹانا کمال جرأت کا کام ہے۔ بالغرض اگر ایسے واقعات خواجہ صاحب نے قلمبند نہ کئے ہوتے تو آج ان سے کوئی بھی شخص واقف نہ ہوتا۔

"چل چلہ العارفین" کا یہ باب اس لحاظ سے اور بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں خواجہ صاحبؒ نے اپنی تعلیم و تربیت کے علاوہ ان اساتذہ کے نام درج کئے ہیں جن کی رہنمائی سے وہ سلوک میں داخل ہوکر سلسلہ سلطانیہ کے اہم ارکان میں شامل ہوئے ہیں۔ اسکے علاوہ چونکہ اس باب میں خواجہ صاحبؒ نے حضرت مخدوم پاکؒ کے ساتھ اپنی ارادت کا اظہار کیا ہے لہذا اس باب میں حضرت مخدومؒ کے بعض خوارق عادات اور کشف و کرامات بھی درج کئے گئے ہیں۔

۲۔ چل چلہ العارفین کا دوسرا باب طریقت، ریاضت، عبادت اور طاعت کے بارے میں ہے۔ یہ باب پہلے باب کے مقابلے میں زیادہ مختصر ہے۔ اس باب میں خواجہ صاحبؒ اس امر کی صراحت کے ساتھ وضاحت کرتے ہیں کہ طریقت کے لئے شریعت کا پابند ہونا لازمی ہے یعنی اسلام نے مسلمانوں پر جو فرائض عاید کئے ہیں ان کو پابندی کے ساتھ انجام دینا طریقت کی پہلی شرط ہے۔ اسی موضوع پر بحث آگے بڑھاتے ہوئے خواجہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ہر حال میں و عام مسلمان پر قلت فرصت کے باوجود پانچ نمازیں بطور فرض

واجب قرار دی گئی ہیں اور سال بھر میں ایک مہینہ روزوں کے لئے مختص ہے۔ یہ دراصل عبادت نہیں بلکہ وہ دینی فرائض ہیں جن کا انجام دینا بہر حال ہر مسلمان کے لئے فرض ہے۔ ان کے انجام دینے والے کے لئے خدائے لایزال نے عظیم اجر مقرر کیا ہے اور یہ عمل صالح باعثِ نجاتِ عذاب اور سبب دخولِ جنت ہے۔ البتہ جو شخص ان پانچ اوقات کی نمازوں کے علاوہ عبادتِ حق میں مصروف رہیں جیسے علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا (والذینَ اوتوا العلم) اور صوم وصلوٰۃ کے علاوہ نماز تہجد ادا کرنا، اسی کا نام درحقیقت عبادت ہے۔ گناہوں سے اپنا دامن بچانا، اپنا کردار صالح بنانا، گناہوں سے توبہ واستغفار کرنا، دل میں قبر اور آخرت کا خوف رکھنا، آخرت کے عذاب سے خدا سے پناہ مانگتے رہنا، حرام کی کمائی سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرنا، حلال کھانا اور خداوند کریم جو کچھ عطا کرے اُس پر صبر کرنا اور مطمئن رہنا، یہی عبادت ہے۔ عبادت کا بہترین طریقہ حضرت مخدومؒ نے طالبانِ سلوک کو بتلادیا ہے اُس پر عمل کرنا عبادت ہے کیونکہ پہلے پہل اپنی استعداد کے مطابق دینی علوم تحصیل کرنا اور اسکے بعد اُس پر عمل کرنا، پھر مرشد تلاش کرنا اور اسکے ارشاد کی بدولت سلوک پر گامزن ہونا ان سب کے بارے میں حضرت مخدومؒ نے اپنے مریدوں کی تربیت کی ہے۔ طلب کے لئے یہ شرط لازمی ہے کہ خدا اور اسکے پیارے نبیؐ کے امر کو بجالایا جائے، اور ہر عمل خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق ہو کیونکہ اسکے متعلق قرآنی حکم ہے:

"یا ایھا الذینَ آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"۔ اولی الامر سے مراد آنحضور سرورِ کائناتؐ یا اولیائے کرام گذشتہ کی اطاعت یا تابعت کرنا ہے۔ لہٰذا یہاں پر اولی الامر سے مراد مرشد ہے۔ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے بعد مرشد کے امر کی اطاعت لازم اور واجب ہے کیونکہ شریعت میں اطاعتِ امر خدا و رسولؐ فرض ہے اور طریقت میں مرشد کے حکم پر ثابت قدمی سے عمل کرنا ضروری ہے۔ مرشد کے قول پر عمل کرنا خدا کے احکام کی عمل آوری ہے۔ سالک مبتدی کے لئے مرشد خدا کے رسولؐ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ جب مرشد فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے درجے تک پہنچے سالک کو اسوقت بہر صورت اسکے قول وامر پر عمل کرنا ہوگا کیونکہ طریقت میں مرشد کا حکم سالک کے لئے فرض بن جاتا ہے چنانچہ قرآن میں آیا ہے: "یا ایھا الذینَ آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون"۔

یہاں مجاہدۂ حق کے لئے پہلا وسیلہ قرآن ہے اور راہنما بھی۔ دوسرا وسیلہ مرشد ہے۔

مجاہدۂ نفسِ ظاہر کے لئے ظاہری طریقے درکار ہیں تو مجاہدہ نفس باطن کے لئے باطنی طریقے۔ چنانچہ مجاہدۂ نفسِ ظاہر عام طور پر ترکِ لحم، ترک ماکولات ... دائمی صوم وصلوٰۃ، کم کھانے بولنے وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے اور مجاہدۂ نفسِ باطن ذکر دائم، ... نفس، عبادت دا... اور قلب کی صفائی اور روشنائی

سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ "قلبُ المؤمنِ مِرأۃ" یعنی مومن کا دل آئینہ ہوتا ہے۔ جب دل کا زنگ کدورتوں اور آلائشوں سے صاف ہو تو روشنی بخشتا ہے۔

آگے چل کر عارف اور عابد میں فرق بیان کرتے ہوئے خواجہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عابد قبر کے خوف سے یا قیامت کے عذاب سے خائف ہو کر عبادت کرتے ہیں۔ اس طرح کی عبادت کرنے والا عابد یا زاہد کہلاتا ہے بلکہ عارف نہیں کیونکہ ایک عارف کے لئے عبادت عذاب سے رستگاری کا سبب نہیں ہوتی بلکہ اسکی عبادت رضائے حق کے لئے ہوتی ہے۔ درحقیقت عارفوں کو کسی قسم کا ڈر نہیں ہوتا کیونکہ قرآن کا بھی حکم ہے ــ الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون"۔ وہ کہتے ہیں کہ عبادت اس طرح کرنی چاہیئے کہ گویا معبود سامنے ہو۔ عبادت، حصولِ حق اور کشفِ ہدایت کے لئے ہونی چاہیئے۔

حضرت مخدومؒ کی عبادت و ریاضت کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مخدومؒ اویسیہ طریقہ پر عمل کرتے رہے۔ ظاہری مجاہدہ کے لئے انہوں نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ باوجود اس کے کہ اپنے استاد اور پیرِ طریقت سے پوری تربیت پائی تھی لیکن پھر بھی کتب متداولہ کا مطالعہ لازمی سمجھا۔ حضرت مخدومؒ بیس سال تک مجاہدہ اور ریاضت میں مشغول رہے۔ ظاہری طور پر عابد اور زاہد کی طرح عبادت کرتے رہے اور غار میں بیٹھے لیکن شہرت حاصل کرنے کی غرض سے نہیں اور نہ ہی ان دوستوں کی طرح جنہوں نے ایسا کر کے شہرت پائی ہے۔ بلکہ اپنی بیس سالہ عبادت کے بارے میں انہوں نے کسی بھی شخص کو کوئی اطلاع تک نہ دی[21] یہی طریق عبادت ہے اور سالک کو اسی طریقِ عبادت و ریاضت کی پیروی کرنی چاہیئے۔

۳۔ چل چلہ العارفین کا یہ باب خواجہ اسحٰقؒ کی اس کتاب کا اصلی مدعا اور مقصد پیش کرتا ہے اور مصنف اس باب میں چالیس چلوں کے آداب اس طرح بیان کرتا ہے کہ ایک سالک کو اپنے ہاتھ کی کمائی پر گذر بسر کرنا چاہیئے۔ ایک کفنی اس نیت سے کہ "موتوا قبل ان تموتوا" (یعنی مر جاؤ اس سے پہلے کہ موت واقع ہو) پہن لینی چاہیئے جیسے ایک مردے کو پہناتے ہیں۔ چالیس چلے گزارنے والے سالک کو چاہیئے کہ وہ اپنے چلوں کے بارے میں کسی کو مطلع نہ کرے۔ چہل چلہ کی دوسری شرط یہ ہے کہ کسی بھی عورت یا مرد کو چلے کے دوران نہ دیکھے اور نہ ہی کسی کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے۔ (ہر) دن رات یعنی چوبیس گھنٹوں میں سات سات غسل کرتا رہے۔ اگر کسی وجہ سے سات غسل نہ کر سکے تو کم از کم ہر پانچ نمازوں سے پہلے روزانہ غسل کرنا اپنے لئے فرض سمجھے۔

۴۔ خواجہ صاحبؒ نے تبدیلِ اخلاق اور نفسِ امارہ اور رضائے حق کو عاشقوں اور سالکوں کی عبادت کا

نام دیا ہے کیونکہ حصول رضائے حق اور معرفت الٰہی کے لئے لازمی ہے کہ سالک کو اپنے نفسِ امارہ اور قوت ارادی پر اتنی قدرت حاصل ہو کہ ہر کام اس کی پسند اور خواہشات کے خلاف انجام دے سکے۔ یعنی نفس امارہ جس چیز کے انجام دینے کا مشورہ دے، دینی اور دنیاوی امور اسکے برعکس انجام دیئے جائیں تاکہ نفس امارہ مغلوب ہو جائے اور اس پر رضائے حق غالب آجائے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں بھی ارشاد ربانی ہے کہ "ان الشیطان للانسان عدوٌ مبین" اور یہاں شیطان سے مراد انسانی نفسِ کافر ہے۔

دنیاوی مال و متاع کے ساتھ محبت کی اصل وجہ نفسِ امارہ کی خواہشات ہوتی ہیں۔ لہٰذا دنیاوی خواہشات کے ترک کرنے کے لئے پہلے اپنے نفسِ امارہ کے ساتھ جنگ لازمی ہے۔ اسکو مغلوب کیا جانا چاہیئے کیونکہ اصل مشرک تو نفس کا فر ہی ہوتا ہے۔ نفسِ امارہ کے مغلوب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کی خواہشات میں کمی لائی جائے۔ مثلاً اگر نفس جاہ و حشمت حاصل کرنے کا طلبگار ہو تو اس خواہش کو ترک کرنا چاہیئے۔ غرض یہ کہ شریعت اور طریقت دونوں میں جو چیز منع کی گئی ہو اس سے اپنے نفس اور روح کو پاک رکھنا لازمی ہے۔ بلکہ اپنی تقدیر کی زمام اختیار رضائے حق کے ہاتھ میں دینی چاہیئے تاکہ وصالِ حق نصیب ہو۔

جب سالک نفسانی خواہشات کو مغلوب کرتا ہے تو اسکے اخلاق ذمائم یعنی خواہشاتِ شہوانی و شیطانی، رحمانی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح سے سالک کے نفس میں "رحمٰن" جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

نفس کے تین اقسام ہیں۔ نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمینہ۔ نفسِ امارہ چونکہ انسان کو برُے کاموں اور لذاتِ دنیا کی طرف راغب اور مایل کرتا ہے، اس لئے سالک کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو نفس امارہ کی آلائیشوں اور برائیوں سے صاف و پاک رکھے۔ نفسِ لوامہ انسان کو اپنے آپ سے سرزنش اور ملامت کراتا ہے اور گناہوں کا اگر مرتکب ہو تو اس فعل پر اپنے آپ سے نفرت کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اولیاء اللہ صالحین اور نیکوکار لوگوں کا یہی نفس ہوتا ہے۔ نفس مطمینہ انسان کو ہر وقت بری باتوں سے دور رہنے، اپنے آپکو پاک رکھنے اور حکم الٰہی پر چلنے کی تلقین کرتا ہے اور اسے نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے روبرو جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ خواجہ اسحٰق قاریؒ کے بقول سالک نفسِ امارہ کی خواہشات کو توڑ کر پہلے نفسِ لوامہ اور بالآخر نفسِ مطمینہ میں اللہ کی جلوہ گری دیکھتا ہے۔ جب نفس مطمئن ہو جاتا ہے تو اخلاق حمیدہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نفسِ مطمینہ میں جو بھی عمل ظاہر ہوتا ہے وہ انبیاء اور اولیاء کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔

نفسِ مطمینہ کے لئے ضروری ہے کہ سالک حرام کھانے پینے اور ایسے لباس زیبِ تن کرنے سے احتراز کرے جس کو حلال کمائی سے حاصل کئے جانے پر شک ہو۔ سالک کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ سلیم النفس ہو۔ درج ذیل تیرہ مقام اور حالتوں سے سالک نفسِ مطمینہ پر قابو حاصل کر کے حق تعالیٰ کی قربت حاصل کر سکتا ہے۔

۱۔ **توبہ** ۔ وہ یوں ہے کہ سالک اپنی خودی سے توبہ کرے۔

۲۔ **زاہد** ۔ زہد کے اگرچہ بہت سے معنیٰ ہیں لیکن یہاں زہد سے مطلب سالک کی محبت اور طلبِ آخرت ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔: "الدُّنیا حَرَامٌ عَلیٰ اَهلِ الآخِرَة وَالآخِرَة حَرَامٌ عَلیٰ اَهلِ الدُّنیا وَهمَا حَرَامَان عَلیٰ اَهلِ اللّٰہ تَعَالیٰ"

۳۔ **توکل** ۔ خداوند کریم کا حکم ہے کہ " یتوکل علی اللّٰہ فهو حسبهٗ " اور حدیثِ قدسی میں آیا ہے۔ "الدنیا جیفتهٗ وطالبها کلابهٗ " یہاں پر توکل سے مراد یہ ہے کہ سالک کے دل میں کسی بھی طرح دنیا طلبی کی خواہش اور آرزو نہ ہو اور جاہ و حشمت پر فریفتہ نہ ہو جائے۔

۴۔ **قناعت** ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فراوانی کے ساتھ کوئی چیز میسّر ہونے کے باوجود بھی اسکا کم استعمال کیا جائے اور دل سے زیادہ ضیافتوں، کھانے پینے وغیرہ کے علاوہ جاہ و حشم کی فراوانی کی تمنا کو نکال دیا جائے۔

۵۔ **عزلت** ۔ عزلت سے مراد لوگوں کی صحبت سے دور رہنا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں حکم ہوا ہے کہ "لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا بند کرو۔ وہی بہتر اور افضل ہے۔" بعض لوگوں کے خیال میں عزلت سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ میل جول ہونے کے باوجود یادِ خدا سے غافل نہ ہو۔ اسی کو خواجہ اسحاق قاریؒ نے خلوت در انجمن کہا ہے اور لکھا ہے کہ ایسے عارف بہت کم ملتے ہیں۔

۶۔ **مروت** ۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر دولت ہو تو فقیروں، محتاجوں اور ناداروں کی مدد کرتے رہو اور ہر ایک پر ایک جیسی نظر ڈالو۔

۷۔ **توجہ** ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خدائے قادر کی طرف مکمل طور پر توجہ مبذول کی جائے اور ایک لمحہ بھی خدا سے غافل نہ رہیں۔

۸۔ **صبر** ۔ صبر سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ بھی اللہ کی جانب سے حاصل ہوتا ہو یا نازل ہوتا ہو اس پر صبر کیا جائے۔

۹۔ **رضا** ۔ نفسانی، روحانی اور جسمانی حرکات و خواہشات سے رضائے حق ظاہر ہونا چاہیئے۔

یعنی اپنی رضا اور خواہش میں اللہ کی رضا اس طرح پائی جائے جیسے ایک مردہ کسی زندہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور زندہ جیسے بھی چاہے اسکی تجہیز و تکفین کرتا ہے۔ رضا میں ذات کا تصور ختم ہو کر حقیقت حق کا تصور باقی رہنا چاہیئے۔

۱۰۔ **مراقبہ** — مراقبہ سے یہ مطلب ہے کہ اپنی ذات اور خودی کو ترک کر دینا اور اللہ کی مشیئت پر یقین رکھنا۔ یعنی دل کی آنکھ دھو کر تجلیات رحمانی میں مشغول ہونا مراقبہ ہے۔

۱۱۔ **حق نمائی اور خود نمائی** — اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو راہِ ہدایت کی طرف دعوت دینا اور اپنے آپ کو درمیان داری کی شہرت سے دور رکھنا۔ یعنی خود یہ تصور نہ کیا جائے کہ فلاں شخص کی ہدایت مجھ سے ہوئی ہے اور وہ میرا طالب یا مرید ہے۔

۱۲۔ **معاونت** — اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی وقت پیر طریقت کسی کام کی مصروفیت کی وجہ سے طالب یا سالک سے ملنا نہ چاہتے ہوں اور اسی دوران میں کوئی مفلس یا محتاج بھی ان سے ملنا چاہتا ہو مفلس یا محتاج کو داخل ہونے کی اجازت نہ دے بلکہ اسی دوران میں کوئی دولت مند آئے اسے آنکھوں پر بٹھائے۔ ایسا مرشد ابلیس کے مانند ہوتا ہے۔

۱۳۔ **فقر** — یہ کمال کا درجہ ہے۔ فقر کے مختلف معنیٰ ہیں البتہ عارفوں کے یہاں اسکے دو مطلب لئے جاسکتے ہیں۔ فقرِ ظاہر، فقرِ باطن۔

فقرِ ظاہر یہ ہے کہ اپنی زندگی ابتدا سے آخر تک نہایت فقر کے ساتھ گذاری جائے اور دولتمندی یا اہلِ ثروت کا تظاہر نہ کیا جائے۔ ظاہری طور پر خرقہ محمدیؐ پر اکتفا کیا جائے۔ ماکولات میں سے صرف روٹی اپنے مصرف میں لائے۔

فقرِ باطن سے یہ مراد ہے کہ ظاہری طور پر کوئی مال و دولت اور ثروت کے لحاظ سے بادشاہوں کا جیسا ہو یا جاہ و حشمت میں امراء جیسا لیکن باطنی طور فقیر۔ فقر ظاہر محتاجوں اور مسکینوں میں بلا امتیاز مال و دولت صرف کرے جسکو دے پوشیدہ طریقے پر دیدے۔ ایسے نہ دے کہ جو بعد میں اسکی شہرت کا باعث بنے۔

اس باب کے آخر میں خواجہ اسحاق قاریؒ نے سالکِ مبتدی کو اسی طریقے کی پیروی کرنے کی تلقین کی ہے جو حضرت مخدومؒ اور ان کے خلفا نے اختیار کیا تھا۔

۵۔ یہ باب معرفت، طاعت اور عبادت کے بارے میں عارفوں کے اقوال پر مشتمل ہے۔ صوفیاء کی نظروں میں عبادت سے مراد معرفتِ حق ہے۔ حق تعالیٰ نے جس وقت بنی نوع انسان کی روحوں

کو خلق کیا اور پوچھا "الست بربکم" ان میں سے جنہوں نے وہاں "قالو ابلیٰ کہہ کر جواب دیا ان کو وجود میں لایا گیا۔ درحقیقت انہوں نے خالقِ کل کی عظمت و سطوت کو پہچان لیا لہٰذا وہ اسکی معرفت کے سمندر میں مستغرق ہو گئے، اور جوش و جنون کے عالم میں وہ اسی کے عشق میں گرفتار ہو کر رہ گئے۔ انہیں جب اللہ کے ساتھ اتصال کا احساس ہو گیا تو قربت کے گلشن میں عشق کے ایک ہی جھونکے نے اُن کے دل و دماغ کو اتنا معطر کر دیا کہ اسکی روحوں نے ابدی زندگی اور حیاتِ سرمدی پائی۔ اگر معرفت درمیان میں نہ ہوتی تو عارف اور معروف کے درمیان امتیاز ہی قائم نہ رہتا اور اگر حق تعالیٰ اپنے آپ کو معشوق کی حیثیت سے آراستہ نہ کرتا اور بنی نوع انسان میں عشق نہ پھونکتا تو عاشق کے دل سے عشق نہ پھوٹتا۔ مسجدوں یا بت خانوں کی راہ کوئی نہ لیتا۔ اس طرح سے خواجہ اسحٰق قاریؒ نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روح میں اپنے اصل کے ساتھ ملنے کی جو تڑپ موجود ہے اُس کا اصل سرچشمہ محبت اور عشقِ الٰہی ہے۔ یہی عشق انسان کو جنون کی سرحدوں تک لے جاتا ہے۔

جو دل عشقِ الٰہی سے سرشار ہو وہ گرد و غبار اور آلودگیوں سے صاف و پاک ہونا چاہیئے۔ اللہ ہر ایک کے دل میں ساکن ہو سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مومن کا دل ہو۔ اسکے لئے قرآن میں واضح حکم موجود ہے کہ "قلب المومین عرش اللہ تعالیٰ" اور جو شخص مال و دولت کے ساتھ ہی زیادہ محبت رکھتا ہو اور خدا سے بھی تو لگانے کا دعویٰ کرتا ہو وہ مومن نہیں۔

عشق کا درد سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے جسکا کوئی علاج نہیں۔ چنانچہ عشق میں عاشق شہید ہو جاتے ہیں اور عشقِ الٰہی میں مر جانے والا عاشق شہید کہلاتا ہے اس حدیث کے تحت "من عشق وعف وکتمہ ومات مات شہیداً"

خواجہ اسحٰقؒ نے سوز و گدازِ عشق کے بارے میں لکھا ہے کہ جس کسی عاشق کے دل میں عشق کی آگ دہک رہی ہو وہی اس آگ کی تمازت کو محسوس کر سکتا ہے۔ بے خرد لوگ جو خود عشق کی چاشنی سے غافل اور ناواقف ہیں، عشقِ الٰہی کی آگ میں جلنے والے عاشقوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ چونکہ وہ عشق سے بہرہ ہوتے ہیں اسلئے وہ عشقِ الٰہی کی آگ میں تڑپنے والے عاشقوں کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتے۔ اس ضمن میں خواجہ صاحب نے اپنے مرشد طریقت حضرت مخدومؒ کے درد و سوز کی کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

آگے چل کر خواجہ صاحب حصولِ معرفتِ حق کا پہلا زینہ نماز قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ نماز ہی ایک ایسا طریقہ ہے جو قربتِ خدا کا سبب بن سکتا ہے۔ اسکے بعد خود نما عابدوں اور ریا پیشہ زاہدوں

کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ نماز میں محو ہوتے ہوئے بھی ایسے عابدوں اور زاہدوں کے دلوں میں محبوبِ حقیقی جاگزین نہیں ہوتا کیونکہ وہ صرف دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے ہیں بلکہ اُن کا دماغ نفسانی، شہوانی اور شیطانی اعمال میں پریشان ہوتا ہے۔ برعکس اس کے عارف ہمیشہ معرفتِ حق حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ اُن کا ہر لمحہ اور ہر لحظہ نماز کا وقت ہوتا ہے۔ غافل تو مؤذن کی اذان تک کو اَن سُنی کرتے ہیں جب کہ عارف ہمیشہ اللہ کے حضور میں محو ہوتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی نظروں میں علوم ظاہری وصولِ حق کے لیے مانع ہوتے ہیں اور علوم باطن حق طلبی کے لئے ممد و مددگار۔ اُن کے مطابق جو عالم اپنے علم کو روزی روٹی کمانے کا ذریعہ یا پیشہ بنائے۔ دولتمندوں کے گھر جاکر مصاحبت اختیار کرے، اپنے علم کو لقمۂ غذا کے عوض بیچتا رہے، وہ قیامت کے دن سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔ اس باب کے آخر میں خواجہ صاحب نے طاعت و معرفت اور عبادت کے بارے میں حضرت مخدومؒ کے علاوہ کشمیر اور کشمیر سے باہر کے بعض اہم اولیائے کرام کے اقوال درج کئے ہیں۔

۶۔ چل چلتہ العارفین کے چھٹے باب میں حضرت مخدومؒ کے اُن اذکار و افکار اور استغراق و محویات کا ذکر ملتا ہے جن کی تعلیم انہوں نے اپنے اکثر مریدوں اور بالخصوص خواجہ اسحٰق قاریؒ کو دی تھی۔ اس باب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خواجہ صاحب نے حضرت مخدوم پاکؒ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے کے بعد مریدوں کو اذکار و افکار اور بیعت کے طریقوں سے آگاہ کیا ہے۔

خواجہ صاحبؒ اس باب میں عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ قرار دیتے ہیں بلکہ عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کے لئے راہنما تسلیم کرتے ہیں۔ خواجہ صاحبؒ کے مطابق استغراق کی حالت میں جب ایک سالک دریائے وحدت میں غوطہ زن ہو جاتا ہے تو اُسے ہر شے میں خدا کی وحدت نظر آتی ہے۔ اس طرح سے خواجہ صاحبؒ صوفیوں کے ہمہ اوست یعنی وحدت الوجود فلسفہ کے قائل ہیں۔

خواجہ صاحب کے مطابق مرشد کو چاہیئے کہ وہ اپنے مریدوں کو اپنی نگرانی میں رکھا کرے اور انکی تربیت کی طرف خاص توجہ مبذول کرے۔ مریدوں کو ذکر و فکر میں مشغول رہنے کی تلقین کرے۔ اگر مریدوں کی تعداد زیادہ ہو تو انہیں اپنے اردگرد حلقہ باندھ کر بٹھائے۔ خواجہ صاحبؒ کے مطابق حضرت مخدومؒ کے مرید انکے اردگرد حلقہ باندھ کر تربیت حاصل کرتے تھے۔

خواجہ صاحبؒ نے سالکوں کی چار قسمیں بتائی ہیں:- ● مجذوب سالک ● سالک مجذوب۔ ● مجذوب مطلق ● سالک مطلق۔ یہ چاروں قسم کے سالک جذبہ خلوص اور استغراق کی وجہ سے سلوک

کی منازل طے کر کے ایک خاص مقام پر پہنچتے ہیں۔

۷۔ ساتواں باب حضرت مخدومؒ کی کرامات و مقامات پر حاوی ہے۔ اس باب میں خواجہ صاحبؒ نے حضرت مخدومؒ کے خلیفوں کے حالات اور روحانی کمالات درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ مصنف نے اعتراف کیا ہے، اس باب میں حضرت مخدومؒ کے ایسے مقامات و کرامات کا تذکرہ ملتا ہے جو حضرت بابا داؤد خاکیؒ کی منظوم تصنیف وردالمریدین میں نہیں ملتے۔ ان مقامات و کمالات کے درج کرنے میں یہ مقصد کار فرما رہا ہے کہ گمراہی کی دلدل میں ڈوبے لوگوں کی ہدایت کی جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت مخدومؒ کے خلفا کے احوال بھی درج کئے گئے ہیں تاکہ وہ بھی توجہ کے مرکز بنیں۔

حضرت سلطان العارفینؒ کی زندگی کے بعض گوشوں پر بھی اس باب میں روشنی پڑتی ہے۔

"چل چلۃ العارفین" کا ایک تنقیدی جائزہ

چل در حقیقت چہل کا مخفف ہے جسے اردو میں چالیس کہتے ہیں اور چلّہ بھی چہلہ کا مخفف ہے۔ چلّہ سے مراد درویشوں اور عارفوں کے وہ چالیس دن جو کہ وہ گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت اور صوم و صلواۃ میں گزارتے ہیں۔

چل چلہ العارفین سے دراصل سالکوں، عارفوں اور پرہیزگاروں کے وہ چالیس چلّے مراد ہیں جو وہ عزلت اور تنہائی میں ریاضت و عبادت میں بسر کرتے ہیں۔ چالیس چلّے چار سال چار ماہ اور تقریباً بیس دن کے برابر ہیں۔ یعنی کہکشان سلطانیہ کے ساتھ وابستہ سالک اپنے مرشدِ طریقت کے حکم پر تقریباً سوا چار سال سے زائد عرصہ تک کسی خاص جگہ فرد کش ہو کر اللہ کی عبادت میں محو ہو جاتے تھے۔ اور اسی کو چل چلہ (چہل چلہ) کہتے تھے۔ حضرت مخدوم پاکؒ نے نہ صرف یہ کہ ذاتی طور پر کئی بار چالیس چلوں کے دوران ریاضت کی بلکہ وہ اپنے مریدوں اور خلیفوں کو بھی ان چالیس چلوں کے گزارنے کی تلقین فرماتے رہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا بیان کی تقویت چل چلہ العارفین میں درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

"سلطان العارفین..... اکثر یاران و مخلصان و طالبان عمل بچہل چلہ میسفرمود چنانچہ ہر کدام لعمل آوردند۔"[۳۲]

حضرت سلطان العارفینؒ کے خلفا نے جو تصنیفات باقی چھوڑی ہیں ان میں چل چلہ العارفین کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں حضرت مخدوم پاکؒ اور انکے خلفا کے حالات اور روحانی کمالات کے علاوہ چالیس چلوں کی کیفیت اور آداب درج ہیں۔ خواجہ صاحبؒ نے اس موضوع پر جس شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے حضرت مخدومؒ کے خلیفوں میں سے کسی دوسرے نے اتنی تفصیل سے

اس موضوع کو زیرِ بحث نہیں لایا ہے۔

چل چلہ کے بہت سے آداب بتائے گئے ہیں۔ سب سے اہم یہ ہے کہ سالک کا لقمہ حلال ہونا چاہیئے یعنی وہ حلال کی کمائی ہوئی ایسی روٹی پر گزر بسر کرتا ہو جو اُس نے اپنے ہاتھوں اور اپنی محنت سے کسب کی ہو۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: " وکلوا ممارزقکم اللہ حلالا طیبا واتقوا اللہ الذین انتم " یعنی ہر خاص و عام کو حلال طریقے سے کسب کئے ہوئے معاش پر گزر اوقات کی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ یہی لقمہ حلال بالآخر ایک سالک کے لئے قربِ الٰہی کا ذریعہ اور عذابِ جہنم سے نجات کا موجب بنتا ہے۔

عام لوگ حرام و حلال میں کوئی امتیاز نہیں کرتے لیکن چل چلہ العارفین میں سالک کے لئے حلال کی کمائی کو خاص اہمیت ہے کیونکہ طالبانِ حق کے لئے حلال طریقے کسبِ معاش کرنا شرطِ اوّل ہے تاکہ لقمۂ حرام قربِ الٰہی کے لئے مانع بن کر سالک کے لئے باعثِ رنجش نہ بنے۔ اولیائے کرام نے کسبِ معاش کے جو خاص طریقے اپنائے ان میں کاشتکاری، کتابت، تجارت وغیرہ جیسے پیشے ہیں۔ ان پیشوں کے متعلق اُن کا یہ خیال ہے کہ یہ پیشے بغیر آلائش ہوتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے چل چلہ کے آداب میں دوسرے درجے پر کم خوری یعنی کم کھانے پینے کو اہم قرار دیا ہے۔ انکے مطابق کم خوری (کم کھانے پینے) سے بیداری کی قوت بڑھ جاتی ہے اور دل میں قوت آجاتی ہے۔ روح کو ذاتِ حق کے مکاشفہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے پینے سے بدن میں ظاہری طور قوت تو آجاتی ہے لیکن شیطانی اور شہوانی خواہشات کی رغبت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔

خواجہ صاحب نے چالیس چلوں کے قاعدے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سالک کو اگر بادشاہ، امیر یا کسی دولت مند سے غذا ملے تو اُسے چاہیئے کہ وہ اسے بھوکے فقیروں اور محتاجوں میں تقسیم کرے۔ اسی طرح اگر بطور نذرانہ نقدی ملے تو اُسے چاہیئے کہ وہ اُس سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرے بلکہ محتاجوں میں بانٹے۔

اسی طرح جس سالک کو مرشد کی طرف سے چل چلہ کی اجازت ملے اُسے چاہیئے کہ اس کا لباس ایسا ہو جیسے کسی مردے کی کفنی۔ وہ کسی سے چلوں کے بارے میں تذکرہ نہ کرے۔ بلکہ یہ راز صرف مرشد اور مرید کے درمیان رہنا چاہیئے۔ بے سود بات چیت سے احتراز کرے۔ چل چلہ کے دوران کسی دوسرے شخص کو اپنے پاس غذا یا پانی لانے کے لئے نہ رکھے۔ صرف جَو کے آٹے پر گزارہ کرے۔ قسم قسم کی ضیافتوں کے کھانے سے پرہیز کیا جائے۔ اگر کوئی سالک کسی جنگل میں چلے گزار رہا ہو تو جنگلی ساگ، کاسنی کھائے۔

چل چلہ کے دوران اپنے پاس کسی کو بھی آنے نہ دیا جائے۔ کسی عورت کی صورت نہ دیکھے۔ روزانہ سات غسل کرے۔ اگر سات غسل کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہو تو کم از کم روزانہ پانچ غسل کرنا اپنے لئے فرض سمجھ لے۔

خواجہ اسحٰق نے چل چلہ کے آداب و شرائط تحریر کرنے کے بعد چل چلہ کے گزارنے یا طے کرنے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ چالیس چلے گزارنے والے سالک کو پہلے دس چلوں کے دوران اپنے مرشدِ طریقت کی اجازت سے ذات باری کے ناموں میں سے کسی ایک نام کا رات دن ورد یا ذکر کرنا چاہیئے۔ دوسرے دس چلوں کے دوران اُسے لا الٰہ الا اللہ کے ذکر میں مشغول ہونا چاہیئے۔ اور ماسوائے اللہ کے اپنا تعلق ہر کسی سے منقطع کرنا چاہیئے۔ ذکر میں کوتاہی نہیں برتنی چاہیئے تاکہ اُسکے زنگ آلود دل کے آئینہ کا اس حدیث نبوی کے پیش نظر صیقل کیا جاسکے "لکل شئی صیقل لا الٰہ الا اللہ" سالک کو قرآن کے اس حکم کے تحت " فاذکرونی اذکرکم واشکرونی ولا تکفرون" ذکرِ حق سے سکونِ قلب حاصل ہوگا۔ کیونکہ ذکر ہی ایک ایسا شعلہ ہے جو ذاکر کے عشق کو بھڑکاتا ہے اور ذکر کے اسی فیض سے سرشار ہو کر ذاکر مست ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ذکرِ لا الٰہ الا اللہ کے بہت سے طریقے ہیں لیکن خواجہ صاحب کی نظر میں اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حبس نفس کرکے ذکر کیا جائے۔ تیسرے دس چلوں کے دوران سالک محاسبہ اور مراقبہ میں مشغول ہو کر مکاشفہ سے مستفیض ہو سکتا ہے۔ چوتھے دس چلوں کے دوران سالک اپنے وجود کو وحدت کے سمندر میں اس طرح ضم یا فنا کر دے تاکہ اُسے بقا نصیب ہو۔

چل چلہ کے گزارنے میں حضرت مخدوم پاک یا انکے خلفاء میں سے کسی ایک سے اجازت طلب کرنا سالکوں کے لئے شرط ہے۔ کیونکہ صرف سلسلۂ سلطانیہ سے وابستہ مشایخ ہی اس کے بارے میں سالکوں کی راہنمائی کر سکتے ہیں اور انہیں اجازت دے سکتے ہیں۔ وہ سالکوں کو ان کے شوق طلب کے مطابق چل چلۂ بازار اور چل چلہ خلوت کی اجازت دے سکتے ہیں۔ حضرت مخدوم پاک نے خواجہ اسحٰق قاری کو موضع شیوہ میں واقع ایک پہاڑی کے دامن میں گوشہ نشین ہو کر چل چلہ خلوت کی اجازت دی۔ اسی طرح حضرت بابا داؤد خاکی نے موضع شنگیال کی پہاڑی پر اپنے پیر و مرشد کی اجازت سے چل چلہ خلوت گزارا۔ حضرت بابا داؤد خاکی نے چل چلہ بازار اپنے پیرِ طریقت کے ساتھ ہی سرینگر میں مکمل کیا۔ حضرت شیخ محمد علی رینہ کو چل چلہ بازار حج بیت اللہ کے سفر کے دوران انجام دینے کی اجازت ملی۔ مندرجہ بالا حقائق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چل چلہ کی دو قسمیں ہیں۔ پہلا چل چلہ خلوت اور

دوسرا چل چلہ بازار۔ جیساکہ اوپر بیان کیا گیا کہ ان دونوں کی اجازت حضرت مخدومؒ نے اپنے مریدوں کو دی تھی۔ حضرت سلطان العارفینؒ کے سلسلۂ سلطانیہ کے طریق تصوف میں یہ چلّے کچھ اپنا مقامی رنگ لئے ہوئے رائج ہیں۔ جب کہ کشمیر سے باہر سہروردی سلسلہ کے عارفین میں یہ دو اصطلاحیں "خلوت در انجمن" اور "خلوت در بازار" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان دونوں کا تذکرہ حضرت بابا داود خاکیؒ کی تصنیف دستور السالکین کے علاوہ حضرت مخدومؒ کے دوسرے شاگردوں کی تصنیفات میں بھی ملتا ہے۔

اگرچہ بلاشبہ چل چلہ العارفین میں حضرت مخدومؒ اور انکے خلفاء کے احوال اور کشف و کرامات کے لئے کتاب کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔ لیکن اس بات سے قطع نظر یہ کتاب کشمیر میں فارسی نثر کی متصوفانہ کتابوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ حضرت مخدومؒ کے اکثر خلفا نے اس کتاب کو اپنی تصنیفات کے لئے مشعل راہ بنایا ہے۔ چل چلہ العارفین کی سب سے زیادہ اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ یہ کتاب مصنف نے اُس وقت ضبط تحریر میں لائی ہے کہ جب انکے مرشد حضرت مخدومؒ بقید حیات تھے اور انہوں نے خود بھی تصوف و عرفان سے متعلق اس کتاب میں درج بعض مسائل کا نہایت دلچسپی سے مطالعہ کیا ہے اور خواجہ صاحب سے اس کتاب کے محفوظ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحبؒ لکھتے ہیں :

"چون این نسخہ .... در حالۂ حیاتی آنحضرت مخدوم مدظلہ مرتب گشتہ و چون بعد
از اتمام در نظر آنحضرت مخدوم گزرانیدم، در بعضی از احوال صوفیہ و در بعضی اقوال
تصوف و مسایل سلوک را مطالعہ کردہ فرمودند کہ این نسخہ از محو کردن باز دارید"[۴۲]

زیر نظر کتاب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہ حضرت مخدومؒ کے ان خلفا کے زیر مطالعہ رہی ہے جنہوں نے اس کے بعد تصنیفات تحریر کی ہیں جن میں خاص طور پر بابا حیدر تیلہ مولیؒ مصنف ہدایت المخلصین بابا علی رینہؒ مصنف تذکرۃ العارفین اور خواجہ میرم بزاز مصنف تذکرۃ المرشدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں تخلیق کاروں نے اپنی تصنیفات میں چل چلہ العارفین کا حوالہ دیا ہے۔

چل چلہ العارفین میں خواجہ صاحبؒ کا اسلوب نگارش انکے ہمعصر فارسی نثر نگاروں سے جدا نہیں یہ اُن کے ہی جیسا سادہ اور بے پیرایہ اسلوب ہے اور یہ حضرت مخدومؒ کے خلفاء کے فارسی نثری آثار کی نمایاں خوبی ہے۔ اس کی عبارات میں کہیں بھی الجھاؤ نہیں۔ زبان سلجھی ہوئی اور آسان ہے۔ مصنف نے عبارت آرائی سے ہر جگہ اجتناب کیا ہے۔ کوئی عرفانی نکتہ ہو یا کوئی عمومی مسئلہ، مصنف نے ہر مطلب کے بیان کرنے میں سادگی کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ بعض اوقات مصنف نے اپنے مطالب کی وضاحت

کے لئے فارسی کے بڑے بڑے متصوفانہ شعراء جیسے عطارؔ، مولویؔ، سنائیؔ، حافظ شیرازیؔ، جامیؔ وغیرہ کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کبھی کبھی فارسی نثر کے ساتھ اپنے اشعار اس مہارت سے جوڑے ہیں کہ اگر ایک کو دوسرے سے الگ کیا جائے تو عبارت کا تسلسل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کے ایک بڑے حصے پر تصوف و عرفان سے متعلق مباحث درج ہیں اس لئے اس میں بہت سی صوفیانہ اصطلاحات بھی درج کی گئیں ہیں۔ ان میں سے اکثر اصطلاحات کی خواجہ صاحب نے شرح اور توضیح بھی لکھی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ حضرت مخدومؒ نے کشمیر میں جس نئے سلسلۂ تصوف یعنی سلسلۂ سلطانیہ کی داغ بیل ڈالی، اس کے اوراد و اذکار، طریقِ حصولِ حق، مقامِ مرشد، رہبانیت جیسے موضوعات کے علاوہ حضرت مخدومؒ کے صوفیانہ عقائد اور آراء کے سمجھنے میں یہ کتاب ایک مستند مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

خواجہ صاحبؒ نے بعض اوقات فارسی عبارات کو قرآنی آیات و احادیث سے بھی مزین کیا ہے جس سے انکی فارسی عبارات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا وہ حصہ جو طریقت اور راہ سلوک سے متعلق ہے اپنی خاص افادیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کتاب کے اس حصے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جس میں مصنف نے اپنے بعض معاصر عارفوں اور ادیبوں کے احوال اور انکے کارناموں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح سے مذکورہ کتاب تصوف و عرفان کی ایک اہم دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ چک اور مغل دور کے ابتدا کے صوفیا کا اہم تذکرہ بھی ہے۔ اس کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ ملتا ہے، ان میں بعض کے نام یوں ہیں :-

- حضرت شیخ ہردی بابا ریشیؒ (برگ ۹۸ الف، ۶ب) • بابا روپی ریشیؒ (برگ ۷۷ الف)
- حضرت بابا حیدر تیلہ مولیؒ (برگ ۱۰۲، ۶ب) • شیخ احمد چاگلیؒ (برگ ۱۰۲ب)
- مولوی فیروزؒ (برگ ۶۱، ۱۲ الف) • میاں مانک شاہ مجذوبؒ (برگ ۷۳ب)
- خواجہ میرم سکندر پوریؒ (برگ ۹۲ب) • شیخ داؤد خاکیؒ (برگ ۸۲ب)
- حضرت مخدوم شیخ علی ریندؒ (۸۲ الف) • صوفی الھدادؒ (برگ ۹، ب، ۸۴ الف)
- میاں یوسف سیستانیؒ (برگ ۸۲ب)۹ب • خواجہ شہابؒ (برگ ۷۰ الف)
- علی صوفیؒ (برگ ۷۱ الف) • سید میر میری خانؒ (۱۰۶ب)
- ملک نوروزؒ (۱۰۴ب)
- ملا عبدالعزیز برادر شیخ احمد چاگلی (برگ ۱۰۲ الف) • ملا ابراہیم برادر شیخ احمد چاگلی (۱۰۳ الف)

- حاجی موسٰی (برگ ۶ الف) • مہدی میر (۸۹ ب)
- شیخ ابوالہادی • ملا یوسف (برگ ۹۶ ب)
- خواجہ یوسف برادر خواجہ اسحٰق قاری (۹۲ ب) • شیخ بہادر (برگ ۴۴ ب)
- خواجہ زین علی مانجو (۴۲ ب)

چک سلاطین کے دور میں کشمیر کی فارسی نثر میں حد درجہ کی سادگی پائی جاتی ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کشمیر کا فارسی ادب ابھی تک سبک ہندی کی عبارت آرائی، خیال بانی، معنی آفرینی اور پیچیدہ تشبیہات و استعارات سے آشنا نہ تھا۔ اس لئے اس زمانے میں فارسی نثر کا اسلوب تصنع سے عاری نظر آتا ہے۔ اس زمانے کی نثر کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں فارسی کے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو آج کل مستعمل تو ہیں لیکن ان کے معنیٰ تبدیل ہوئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے الفاظ پر یہاں کا مقامی رنگ غالب ہو۔

چل چلہ العارفین آج تک زیور طباعت و اشاعت سے آراستہ نہیں ہو پایا ہے۔ اسکے قلمی نسخے بھی بہت کم تعداد میں دستیاب ہیں۔ محکمہ تحقیق و اشاعت کے محفوظات میں اس کا ایک مخطوطہ زیر شمارہ ۵۰۰ محفوظ ہے جو کہ خط نستعلیق میں ہے اور مکمل اور صحیح حالت میں موجود ہے۔ نسخے کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"الحمد للہ حمداً کثیراً و شکراً و اسیعاً علی نعمایہ .... اما بعد فیقول
العبد الضعیف والفقیر النحیف اسحاق کشمیری المعروف والمشہور بالقاری ساکن
محلہ بلدیمر بزار رسالۃ المسمیٰ بچل چلہ العارفین کہ بفرمودۂ غوث الاعظم ......"[۲۴]

اسکی آخری عبارت یوں ہے:

چو جستم سال تاریخ وفاتش	برابر یافتم مخدوم مرحوم
الٰہی نہر ہای رحمت خود	بقبرش کن روان تا یوم معلوم[۲۵]

خواجہ اسحٰق قاری فارسی نثر کے ایک منجھے ہوئے قلمکار اور ادیب تھے۔ انہیں شعر و شاعری کا بھی ذوق و شوق تھا۔ ان کے طبع زاد اشعار انکی تصنیف چل چلہ العارفین میں موجود ہیں۔ یہ اشعار انہوں نے یا تو کسی عرفانی نکتے کی وضاحت میں یا پھر اپنی فارسی عبارات کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے لکھے ہیں۔ چونکہ ان اشعار کی تعداد بہت کم ہے لہٰذا انکی شعر و شاعری کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لینا ناممکن ہے۔ خواجہ صاحب کی ایک غزل بطور نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ یہ غزل انہوں نے اپنے مرشد طریقت کے مقام عالی کی مدح میں کہی ہے ہے:

بر عاشقان داغ جبین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

بر عارفان فخر مبین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

روشن بخاتم چون نگین در آسمان و ہم زمین

بر اولیای عالمین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

شمس الضحیٰ نور الھدیٰ بدر الدجیٰ صدر العلیٰ

مہ بر ورش سر بر زمین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

حیران ملک، حیران فلک، حیران زمین حیران زمان

از قربتِ شیخی چنین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

یکتا چو درّ بی بدل در رشتہای اولیاء

از بحرِ رحمت بر زمین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

از خرمنِ پُربار او ہر یک ولیٔ کاشمیر

از کمترینِ خوشہ چین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

سلطان عارف در جہان باشد چو روشن بر ہمہ

ہم غوث اعظم از یقین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

محبوب عالم شیخ من در عرش بین اسمای او

از ہر چہ خوانم خوشترین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

از خادمانِ سلسلش پاپوش شو پاپوش شو

گو از غلامم کمترین چون شیخ حمزہ پیرِ ما

زاسحاق بشنو این سخن در گوش کہ از ہوش خود

کو پیر ماپے بر ازین چون شیخ حمزہ پیرِ ما (؟)

۳۶ع

خواجہ صاحبؒ کی شاعری کا انداز واعظانہ اور ناصحانہ ہے۔ وہ شعر و شاعری سے پند و موعظت نصایح اور تبلیغ دین کا کام لیتے ہیں۔ نماز سے متعلق انکی درج ذیل طویل غزل ملاحظہ فرمایئے ؎

نماز خلق تسبیح و سجودست — نماز عاشقان ترک وجودست

نماز عارفان اندر نہانست — بوصل لامکان در عین جانست

نماز عارفان ترک نیازست — نماز وصلان در عین خانست

نماز اولیا از عین قلب است — نماز زاہدان از روی نانست
نماز قایمان تا صبح وصلست — نماز عابدان بہر زمانست
نماز عاشقان ترک تمام است — نماز صالحان صلحی میانست
نماز عاملان وصل وصالست — نماز جاہلان سہو عیانست
نماز عالمان از قیل و قالست — نماز کاملان در لامکانست
نماز مفسدان فصل تمام است — نماز عاجزان آب روانست
نماز مقبلان از امر رحمٰن — چو تیر تیز باہم در نشانست
نماز صبح خیزانِ الہٰی — برای قرب للّٰہِ جاودانست
نماز مردمانِ ظاہرای دل — نہ او ہمچون نماز سالمانست
نماز کان برای روی خلقست — حجاب حق و کار مشرکانست
نماز رو بقبلہ دل بصد جا — خری او کار و بار احمقانست
نماز کان بسا از بہر مردم — گذارد ہر کہ کافر مسلمانست
نماز ای دل کلید ہفت دوزخ — کہ او را یک ریائی درمیانست
نماز ای دل کلید ہشت جنت — کہ خالی از ریائی ناکسانست
نماز ای دل برای قرب حقست — برای او کہ آن از جسم و جانست
نماز ای دل بصبح و شام بگذار — کہ بر خوانندہ حق بس مہربانست
نماز عارفان در عرش باشد — اگرچہ سجدہ اش زین آستانست
نماز عارفان مقبول حضرت — ز ہر شی و ز ہر جای و مکانست
نماز شاربان وصل ایزد — ز ترک خویش و ہم از خانمانست
نماز پیر ما را رو بحق است — بترک این جہان و آن جہانست
نماز پیر ما کان غوث اعظم — بجسم و روح و دل از افترانست
نماز پیر ما از وصل قلب است — بعرش حق کہ اورا آستانست
نماز پیر ما و شرع و صفتش — دو عالم دفتر یک داستانست
نماز پیر ما از ہرچہ گوییم — مبرا و منزہ بگمانست
نماز پیر ما در پنج گانہ — چو معراج حضور مردمانست

نماز پیر ما آن شاه مرسل — امام و مقتدا این وه چه شالست

نماز پیر ما مخدوم حمزه — ز مسجد هم ز خانه بایگالست

نماز اولیا و هم محبانش — بدین اوصاف همچون خاصه کالست

ازین تا روز محشر هر که از وی — بود در آخرت شاه شهالست

ز دیدار خدا خالی بدوران — جمیع منکران چون آسیالست

سزای او بجز لعنت نباشد — چو ابلیسی که وی از منکرالست

چو شیطان هر که در انکار بالیست — بنار دوزخ او از مخلدالست

ببارد هر زمان لعنت چو باران — بروی منکران از آسمالست

بزناری که از انکار در رفت — کجا او مسلمان از کافرالست

بغیبت هر که بد بر شیخ گوید — کجا او مومن او از رافضالست

لباس کس شان بظاهر گفته مسلم — ولیکن معنیً از منفقالست

بود در آخرت قومی ز انکار — همه با کافران چون کاروالست

بسمع هوشدار و این سخن را — هر آنکو عاقل و هم کاروالست

اگر باشد شنیدن یک سخن بس — وگرنه گفت و گو از غافلالست

بحق خالق معبود مطلق — همه مغفور ذیل سلسلالست

بیادر خاندان شیخ حمزه — رحیم و غافر او بر عاصیالست

بدرگاه عظیم و هم غفورش — شود پاک از جرایم هر که زالست

جناب حضرت مخدوم حمزه — که او سلطان دیگر همچو خالست

غفارت بر مرید و خاکسارش — زهی شاهی که از وی رایگالست

ازین دم تا بنفخ صور دایم — همین حال از برای مخلصالست

مرا ملجا و ماوای دگر هم — پناه و پادشاه بیکسالست

بدیدار و بجنت ضامنم من — هر آنکو دست زده زین خاندالست

شنو این چند بیت از قول اسحاق — که بر احوال شیخ از واقفالست [۳۷]

کشف و کرامات

جیساکہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ کشمیر کے اولیائے کرام میں [illegible] کا مرتبہ بلند ہے۔

وہ نہ صرف صاحب حال صوفی تھے بلکہ صاحب قال عارف بھی۔ وہ معرفت الٰہی میں اس قدر مست اور مستغرق ہو جاتے تھے کہ کبھی کبھی اپنی سدھ بدھ بھی کھو بیٹھتے۔ ایسے صاحب حال صوفی اور ولی کامل کشف و کرامات پر یکسر خطِ البطال کھینچنا ایسی ہی بات ہے جیسے کہ ان کو حضرت مخدومؒ کا مرید اور خلیفہ تصور کرنے سے انکار کرنا۔ تذکروں میں انکے بہت سے خوارق عادات اور کشف و کرامات درج ہیں اگرچہ مقالے کی تنگ دامانی کے پیش نظر ہم یہاں پر ان سب کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں پھر بھی موضوع کی مناسبت سے یہاں پر نشتے از خروارے ان میں سے چند ایک کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں

● "تذکرۃ العارفین" میں درج ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ صاحب دریا کے کنارے پر بیٹھے تھے کہ وہاں ایک نورانی صورت والے ایک شخص نمودار ہوئے اور خواجہ صاحب کے ساتھ کچھ دیر تک کے لئے محوِ گفتگو رہے۔ اسی اثنا میں وہ بجلی کی مانند آسمان کی فضاؤں میں اُڑ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے خواجہ صاحب بھی اُڑے۔ فضا کی لامنتہا حدود میں انہوں نے اتنی بلندی پر پرواز کی کہ راوی حضرت بابا علی رینہؒ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بابا صاحب نے خود اس صورت حال کا مشاہدہ کیا۔ وہ حیران رہ گئے۔ انہوں نے یہ ماجرا پیر طریقت اور اپنے بڑے بھائی حضرت مخدوم پاکؒ کو سنایا۔ حضرت مخدومؒ نے جواب دیا کہ جس شخص نے پہلے عروج کیا وہ میر شیخ حیدر تیلہ مولی تھے۔ وہ خواجہ صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ دونوں مکہ معظمہ میں نماز پڑھنے گئے۔ چونکہ دونوں ذکر و فکر الٰہی میں ڈوبے رہتے ہیں اسلئے وہ جب چاہیں اڑ سکتے ہیں اور اس پر اُن کو ملکہ حاصل ہے۔[۳۸]

● ایک دن خواجہ صاحب حضرت مخدومؒ کی خدمت میں بیٹھے تھے۔ حضرتؒ نے انہیں حکم دیا کہ محلہ علاءالدین پورہ جاکر انکے ایک مرید کے بیٹے کی، جو کہ سخت بیمار تھا، عیادت اور تیمارداری کریں۔ خواجہ صاحبؒ نے حکم بجالایا اور وہاں چل پڑے۔ جب وہاں پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ بچہ چند لمحے قبل انتقال کر گیا ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے واپس آنے کا ارادہ کیا لیکن چونکہ اپنے مرشد کے حکم کا لحاظ اور احترام تھا کہ احوال پوچھ کر آئیں اسلئے وہ اس کمرے میں داخل ہوئے جسمیں مردہ بچہ رکھا ہوا تھا۔ لاش کے اردگرد عورتیں ماتم اور نوحہ کر رہی تھیں۔ خواجہ صاحبؒ لاش کے قریب گئے اور شہادت کی انگلی اس کے منہ میں ڈال کر کلمہ شہادت پڑھا۔ جونہی لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ واشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ پڑھا مردے کی زبان گویا ہوئی اور اس نے دوبارہ زندگی پائی۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑی۔ خواجہ صاحبؒ واپس حضرت مخدومؒ کے دربار میں آئے۔ جب داخل ہوئے تو حضرت مخدومؒ نے استفسار کیا کہ بیمار کی حالت کیسی ہے؟ خواجہ صاحبؒ نے جواب دیا کہ آپ پر تو سارا حال عیاں ہے۔ حضرت مخدومؒ

نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ آج جو کچھ آپ سے ہوا ہے وہ ٹھیک ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ زندگی دینا یا لینا دستِ قدرت میں ہے لہٰذا آپ کو اس پر فخر نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی اثنا میں لڑکے کا باپ حضرت مخدومؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس نے اپنی ساری جائیداد منقول وغیر منقول اپنے بیٹے کے زندہ کرانے کے صلے میں حضرت مخدومؒ کو بخش دی لیکن فقر کی دولت سے مالامال اور دنیاوی مال و متاع سے مستغنی حضرت مخدومؒ نے لینے سے انکار کیا۔ عـ[۳۹]

● صاحب تذکرۃ العارفین نے خواجہ صاحبؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ صاحبِ حال صوفی تھے جب ان پر رقت طاری ہو جاتی تو اُس وقت پرندے نمودار ہو جاتے اور اُس جگہ کے اردگرد پرواز کرتے رہتے جہاں خواجہ صاحبؒ مصروفِ ذکر ہوتے۔ اگر کسی حجرہ یا مکان میں ہوتے تو پرندے اُس مکان کی چھت پر جمع ہو کر اسکے اردگرد چکر کاٹتے رہتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خواجہ صاحبؒ گھر سے باہر کھلے میدان یا صحرا میں ہوتے' اُن پر حال طاری ہو جاتا تو انکے سر کے اوپر سے پرندے جوق در جوق رقص کرتے اور جھومتے چلے جاتے۔ خواجہ صاحبؒ کو قرآن شریف حفظ تھا۔ انکے ذکر اور کلام مجید کی تلاوت میں اتنی تاثیر تھی کہ جب بھی تلاوت فرماتے تو انکے سر کے اوپر سے ایک پرندہ اڑکر آسمان کی فضاؤں میں پرواز کرتا رہتا۔ عـ[۴۰]

خواجہ صاحبؒ کی "چلچلۃ العارفین" میں حضرت مخدومؒ کے متعدد خوارق عادات درج ہیں ان میں بہت سے معنوی کمالات ایسے ہیں جن میں خواجہ صاحب نے اپنے آپ کو شامل دکھایا ہے۔ چنانچہ حضرت مخدومؒ کے معنوی کمالات کے ضمن میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

● ایک دفعہ فقیرِ حقیر حضرت سلطان العارفینؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ عشا کی نماز کے بعد رمضان المُبارک کے ایام میں شب قدر تھی۔ مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کے بارے میں اختلاف تھا۔ میں تشویش میں مبتلا تھا کہ آیا شب قدر کی نماز پڑھنی چاہیئے یا نہیں۔ میں اسی وہم و گمان کی حالت میں حضرت مخدومؒ کی خدمت میں گیا تاکہ عرض کروں کہ شب قدر کی نماز ادا کریں یا نہیں۔ حضرت مخدومؒ نے فرمایا کہ اے اسحٰق ذرا ٹھہرو۔ دو مہمانوں کا انتظار ہے۔ تھوڑی دیر میں دو نورانی شخص داخل ہوئے۔ حضرت سلطان العارفینؒ نے انہیں احترام اور عزت کے ساتھ بٹھایا۔ یہ کچھ لمحے گذرنے کے بعد فرمایا کہ اُٹھئے اور نماز شروع کیجئے۔ میں نے امامت کے فرائض انجام دیئے۔ جب تک نماز اور قرآن کی تلاوت (ختم قرآن) مکمل ہوئی رات کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ نماز کے بعد اُن دو نورانی صورت رکھنے والے اشخاص نے حضرت سلطان العارفینؒ سے فرمایا کہ اُٹھئے کیونکہ وقت

ہوگیا۔ حضرت سلطانؒ نے شفقت بھری نگاہیں مجھ فقیر پر ڈالیں۔ اُن دو اشخاص کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ اس فرزند (خواجہ اسحٰق) کے لئے کیا حکم ہے۔ انہوں نے میری آنکھوں پر آپ دہان ملا اور نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ عرش عظیم پر بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوں۔ وہاں پر تمام انبیا علیہم السلام اور سارے اولیاء اللہ کچھ روحانی طور اور کچھ بہ جسد حاضر تھے۔ پورے مجموعے کی امامت سرور کائنات حضرت محمدؐ نے فرمائی اور دوسرے انبیاء و اولیاء نے اقتدار کی۔ سارے انبیا و اولیاءؒ نے آنحضورؐ کی خدمت میں اپنی حاجات وغیرہ پیش کیں۔ چار یار باصفا کے بعد حضرت مخدومؒ نے بھی اپنی طرف سے استدعا کی۔ حضرت سلطان العارفینؒ جو حضرت علیؓ کے قریب تشریف فرما تھے نے رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰؐ کی خدمت میں مجھ حقیر اور میرے بھائی خواجہ حسن قاریؒ کے بارے میں عرضداشت پیش کی۔ اُسی وقت اعلان ہوا کہ خواجہ اسحٰق اور اس کا بھائی خواجہ حسن قاری، جوکہ دونوں حضرت مخدومؒ کے مرید ہیں، کو واقعہ نویس اور دوسرے کو واقعہ خوان مقرر کیا گیا۔ اس ملک کا رجسٹر ملائکوں کے ذریعے میرے اور میرے بھائی کو تفویض کیا گیا تاکہ ہم ہر شب قدر کھول کر کشمیر کے حالات اور حقایق لکھا کریں۔ اس کے بعد حضرت مخدومؒ نے آنحضورؐ سے اجازت طلب کی اور ہم واپس آئے۔ میں نے حضرت مخدومؒ سے پوچھا کہ وہ دو اشخاص جنہوں نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی کون اصحاب تھے۔ جواب ملا کہ وہ حضرت خضرؑ و حضرت عیسیٰؑ تھے۔ دوسرے دن اس ملک کے تمام اولیاء نے مجھے اور میرے بھائی خواجہ حسن قاریؒ کو مبارک باد دی۔ کشمیر کے وہ تمام عارف جو عشق و معرفت سے سرشار ہیں ان کے احوال تاقیام قیامت حضرت مخدومؒ کے توسط سے ہم پر عیاں ہونگے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس پر اولیاء اللہ فخر کرتے ہیں اور یہ مرتبہ حضرت سلطان العارفینؒ کے بہت کم مریدوں کو حاصل ہے۔[۱۴]

● ایک بار سلطان العارفینؒ بعض خلفا کے ہمراہ جن میں خواجہ اسحٰق قاریؒ بھی شامل تھے جھیل ولر میں ایک کشتی میں سوار تھے۔ اچانک سخت تیز ہوا چلی۔ خواجہ صاحبؒ ہوا کے تیز چلنے سے گھبرا گئے اور حضرت مخدومؒ سے عرض کی کہ خطرناک ہوا سے کشتی الٹنے کا خطرہ ہے لہٰذا خدا سے پناہ مانگنی چاہیئے اور سعدی کا یہ شعر پڑھا:

چہ غم دیوار امت را کہ باشد چو تو پشتی بان

چہ باک از موج بحر آنرا کہ باشد نوح کشتی بان

یہ سن کر حضرت مخدومؒ نے فرمایا کہ کشتی کو یہیں چھوڑ دیں اور چلے جائیں۔ حضرتؒ کشتی سے اتر کر پانی

پر سے چلنے لگے۔ کشتی میں جتنے بھی خلفاء سوار تھے سب کے سب حضرت مخدومؒ کی عنایات اور فیوض کی برکت سے پانی پر چلتے گئے یہاں تک کہ صحیح سلامت کنارے تک پہنچ گئے۔[42]

خواجہ صاحب ایک صاحب استعداد فنکار ہی نہیں بلکہ ایک باکمال عارف اور کہکشان سلطانیہ کے ایک باکمال عالم تھے۔ وہ صاحب کشف و کرامات صوفی تھے۔ انکی نظم و نثر دونوں پر صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ انکے علمی تبحر اور دینی علوم میں انکی چابکدستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں رہبر طریقت حضرت مخدوم پاکؒ نے اپنی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینے کے لئے منتخب کیا تھا۔ خواجہ صاحب اپنے مریدوں اور شاگردوں کی تربیت انہماک سے کرتے چنانچہ انکے حلقۂ تلمذ میں اور لوگوں کے علاوہ بعض نامور عالم بھی شامل تھے جن میں ملا محمد حسین جنازہ صاحب "ہدایت الاعمیٰ" اور ملا جوہر نانت (ناتھ) صاحب تفسیر قرآن بھی شامل ہیں۔[43]

حواشی و تعلیقات

۱۔ حرز المبین اردو ترجمہ دستور السالکین از بابا داؤد خاکیؒ ۲/۱۰ مطبوعہ

۲۔ چل چلہ العارفین از خواجہ اسحاق قاریؒ برگ ۶ ب مخطوطہ مملوکہ کتب خانہ محکمہ تحقیق و اشاعت کشمیر یونیورسٹی شمارہ ۵۰۰

۳۔ چلچلتہ العارفین برگ ۱ الف

۴۔ چلچلتہ العارفین برگ ۲ الف ۵۔ چلچلتہ العارفین

۶۔ حرز المبین جلد ۲ ص ۱۱۔۱۲ (اردو ترجمہ دستور السالکین)

۷۔ چلچلتہ العارفین برگ ۲ ب و ۳ الف ۸۔ چلچلتہ العارفین برگ ۶ ب۔ ۷ الف

۹۔ تذکرۃ العارفین برگ ۲۴۲ الف مخطوط مملوکہ کلچرل اکادمی

۱۰۔ چل چلہ العارفین برگ ۱۲ب ۱۳ الف ۱۱۔ چلچلتہ العارفین برگ ۶ الف

۱۲۔ تذکرۃ العارفین از بابا علی رینہ برگ ۲۴۲ ب مخطوطہ مملوکہ کلچرل اکادمی

۱۴- چلچلہ العارفین برگ ۴ الف ۱۴-

۱۵- ریاض الاخیار ص ۲۷۲ مطبوعہ (اردو ترجمہ اسرار الابرار)

۱۶- تذکرۃ العارفین برگ ۲۴۳ الف ۱۷- تذکرۃ العارفین ریاض الاخیار ۲۷۳

۱۸- ریاض الاخیار ص ۲۷۳ ۱۹- تذکرۃ العارفین برگ ۲۴۲ ب

۲۰- تذکرۃ العارفین ۲۴۵ الف ۲۱- تذکرۃ العارفین ۲۴۵ ب' ریاض الاخیار ص ۲۷۳

۲۲- تذکرۃ العارفین ۲۴۶ الف

۲۳- ریاض الاخیار ص ۲۷۴' واقعات کشمیر ص ۱۲۹ مطبوعہ

۲۴- تذکرۃ العارفین برگ ۲۴۷ ب و ۲۴۸ الف

۲۵- ہدایت المخلصین برگ ۱۶۶ ب مزید دیکھئے برگ ۱۵۵ الف' ۱۶۷ الف' ۱۶۹ الف

۲۶- تحائف الابرار - از محی الدین مسکین برگ ۱۴۳ الف؛ مخطوطہ مملوکہ محکمہ تحقیق و اشاعت کشمیر یونیورسٹی شمارہ ۲۰۴۸

۲۷- چل چلہ العارفین برگ ۵۶ ب ۲۸- چلچلتہ العارفین برگ ۱۲۳ ب و ۱۲۴ الف

۲۹- چل چلہ العارفین برگ ۸۷ ب ۳۰- چل چلہ العارفین برگ ۶ الف

۳۱- چل چلہ العارفین برگ ۱۳ ب تا ۱۶ ا ۳۲- چل چلہ العارفین برگ ۲۱ ب

۳۳- چل چلتہ العارفین برگ ۱۲۵ الف ۳۴- چلچلتہ العارفین برگ ۱ الف

۳۵- چلچلتہ العارفین برگ ۱۲۷ الف ۳۶- چلچلتہ العارفین ۱۷ ب و ۱۸ الف

۳۷- چلچلتہ العارفین برگ ۴۸ الف تا ۴۹ الف ۳۸- "تذکرۃ العارفین" برگ ۲۴۹ الف

۳۹- تذکرۃ العارفین برگ ۲۴۶ ب ۴۰- تذکرۃ العارفین برگ ۲۴۸ ب

۴۱- چلچلہ العارفین برگ ۴ ا تا ۵ ب ۴۲- چلچلتہ العارفین ۹۲ الف

۴۳- ملا محمد حسین خباز شہر سرینگر کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے خواجہ اسحٰق قاریؒ سے علوم معقول و منقول دونوں میں تربیت حاصل کی۔ جب انکے پیر طریقت یعنی خواجہ اسحٰق قاریؒ حج بیت اللہ کی غرض سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے تو انہیں بھی حرمین شریفین جانے کا شوق دامنگیر ہوا۔ اکبر آباد ہند میں خواجہ عبد الشہید کے ہاتھوں بیعت کرلی۔ مولانا خباز دہلی میں عبد الباقی دہلوی سے بھی باطنی فیوض سے بہرہ ور ہوئے۔ تحصیل علوم ظاہری و باطنی کے بعد مولانا نے جب کشمیر میں مراجعت کی تو وہ شریعت محمدیؐ کی ترویج میں مصروف ہوکر گمراہوں

کی تربیت میں سرگرم ہو گئے۔ مولانا حسین کو اپنے معاصر صوفی شاعر حبیب اللہ نوشہری المتخلص بہ حبیؔ کے ساتھ موسیقی سننے اور گویوں کی صحبت میں رہنے پر مباحثے اور مناظرے ہوتے رہتے تھے۔ ملّا صاحب کی تصنیفات میں "ہدایت الاعمیٰ"، "کفایۃ الاعتقاد" سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کا انتقال ۱۳ ذی الحجہ ۱۰۵۲ھ میں ہوا۔ وفات کے بعد انہیں محلہ گوجوارہ میں دفن کیا گیا جہاں پر ان کا روضہ اب تک موجود ہے۔

مولانا جوہر نانت (ناتھ) کشمیر کے ایک نامور عالم دین تھے۔ واقعات کشمیر میں ان کا نام ملا جوہر گنائی درج ہے۔ ملا صاحب نے سلطان قطب الدین کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ علوم متداولہ میں مہارت پاکر انہوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ انہوں نے حضرت بابا داود خاکیؒ بابا حیدر تیلہ مولیؒ اور خواجہ اسحٰق قاریؒ سے کسب فیض کیا۔ ان کا انتقال ۱۰۲۶ھ میں اس وقت ہوا جب کشمیر کی بیشتر آبادی ہیضے کی وجہ سے لقمہ اجل بن گئی۔ انکی تصنیفات کا آجکل سراغ نہیں ملتا البتہ انکے تفسیر کلام مجید کا ایک مخطوطہ محکمہ تحقیق و اشاعت سرینگر کے مخطوطات میں محفوظ ہے۔ ٭

میر غلام رسول نازکی

حضرت میر نازک نیازی قادریؒ

سلطان زین العابدین کا عہدِ حکومت نہ صرف اس لحاظ سے کشمیر کا عہدِ زریں کہلاتا ہے کہ اُن کے زمانے میں کشمیر صنعت و حرفت کا گہوارہ بنا، بلکہ ملک میں طویل بدامنی کے بعد امن و آشتی کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس اعتبار سے بھی یہ عہد سنہرا عہد ہے کہ کشمیر میں علم و فضل، خداشناسی، بصیرت و معرفت کا آفتاب عالم تاب روشن ہوا۔ سلطان نے دیگر ممالک خاص کر چین اور روسی ترکستان سے رابطہ قائم کر کے وہاں کے علماء و فضلاء کو دعوت دے کر کشمیر میں آباد کیا۔ ان ہی بزرگواروں میں سے ایک صاحب تاریخ کے اوراق پر ستارۂ صبح کی طرح درخشاں ہیں اور اُن کا اسم گرامی میر محمد علی محمد بخاریؒ تھا۔ سلطان بڈشاہ نے اُن کو اُن کے علم و فضل اور معاملہ فہمی کی بناء پر مملکتِ کشمیر کے نظامِ عدل کا سربراہ بنا دیا تھا اور وہ قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ پر مامور تھے۔ میر محمد علی بخاریؒ کا خاندان کشمیر میں پھولا پھلا اور ملک کا شعبۂ عدل پشت در پشت اس خاندان کے ہاتھ میں رہا۔ اس خاندان کے بارے میں بجا طور کہا جاسکتا ہے ــ

ایں سلسلۂ طلا سر تا ب است

ایں خانہ تمام آفتاب است

اس خاندان کے مشہور و معروف بزرگ قاضی موسیٰ شہید گذرے ہیں جن کے حالات تاریخ میں تفصیل کے ساتھ منضبط ہیں اور اسی خاندان کے چشم و چراغ حضرت میر نازک نیازی قادری ؒ ہیں جو اپنے علم و فضل کے علاوہ زہد و تقویٰ، معرفت الٰہی اور عشق سرمدی کے متوالے تھے اور تمام تاریخ نویسوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کشمیر میں لاتعداد اولیاء اصفیاء صلحاء اور بزرگان دین ہیں مگر تقویٰ اور پرہیزگاری کے معاملے میں حضرت میر نازک نیازی قادری ؒ کا کوئی ثانی نہیں۔

میر علیہ الرحمۃ کا شجرۂ نسب یوں ہے:

میر نازک نیازی قادری ابن میر حاجی محمد قاضی بن میر کمال الدین بن میر سکندر بن میر اسحاق بن میر ملک نیازی بخارشاہی رحمۃ اللہ علیہ۔

میر علیہ الرحمۃ کی تاریخ ولادت کے بارے میں کوئی تقریر وایت نہیں البتہ اتنا معلوم ہے کہ ان کے والد میر حاجی محمد قاضی حضرت محبوب العالم سلطان العارفین شیخ حمزہ کشمیری کے ہم عصر تھے۔ ان کی کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر خوردسالی میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں تھیں۔ میر نازک جب تولد ہوئے تو ان کے والد انہیں حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ کشمیری کی خدمت میں لائے اور ان سے عرض کی کہ اس سے پہلے جو اولادیں ہوئیں وہ سن بلوغ پر پہنچنے سے قبل ہی اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔ اس لئے اس نومولود کو آپ کی خدمت بابرکت میں لایا ہوں اور اسے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ مولانا بہاؤالدین متو اپنی کتاب "سلطانی" میں یہ واقعہ اس طرح درج کرتے ہیں:-

چو زیں تولد جناب پیر سر مہر	درو دیوار از خورشید شد بہر
پدر برداشت و زد علم بمرزد	بلکہ خورشید معرفت سر زد
پدر از مہر برد بر دوش آورد	بسوئے شیخ حمزہ سلطان برد

کیں پسر کردہ ام نیاز شما　　　اے تو محمود ایں ایازِ شما

(ترجمہ :۔ "جب حضرت میر نازکؒ پیدا ہوئے تو اُن کے نورِ معرفت سے در و دیوار منور ہو گئے۔ ایسا لگا کہ جیسے چمکتا چاند ظاہر ہوا، بلکہ ایک خورشیدِ معرفت طلوع ہوا۔ باپ نے اسے گود میں اٹھایا اور کہا کہ اِس بچے کو آپ کی خدمت میں بطورِ نذر و نیاز لایا ہوں۔ آپ اگر سلطان محمود ہیں، تو یہ بچہ آپ کا ایاز بن کر رہے گا۔")

اِسی اعتبار سے میر علیہ الرحمۃ کو میر نازک نیازیؔ بھی کہتے ہیں۔ کچھ دیر یہ بچہ حضرت سلطانؒ کے سامنے رہا۔ اتنے میں باپ نے دیکھا کہ حضرت سلطان العارفین کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں اور وہ سمجھے کہ شاید یہ بچہ بھی زیادہ دیر تک زندہ رہنے والا نہیں۔ حضرت سلطان العارفینؒ باپ کے شکوک سے آگاہ ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ بچہ عالمِ روحانی میں اتنا بلند مقام ہے کہ مجھے خوشی ہوئی کہ یہ میرا مرید ہوگا۔ مگر جناب غوثِ صمدانی، محبوبِ سبحانی شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ نے مداخلت فرمائی اور کہا کہ ہم اسے اپنے سلسلے میں لے رہے ہیں۔ مولانا بہاء الدین فرماتے ہیں:-

ایں پسر کہ ہا سپردۂ تست	از پئے حق نثار کردہ تست
ما چو دیدیم نورِ قربت او	شاد گشتیم و داد فرحت او
بر دایک بشوکت و شانش	دست بگرفتہ شاہِ جیلانشؒ
لطفِ حق چوں بر دنظر کردم	از مہرِ مہرِ دیدہ تر کردم

(ترجمہ :۔ "حضرت سلطان العارفین نے فرمایا کہ اس بچے کو تم نے ہمارے حوالے کیا اور نذر کے طور پر ہمیں بخشا۔ ہم نے اس کے رُوحانی کمالات دیکھے اور ہمارا دل خوش ہو گیا کہ ایسا مرید بھی ہمارے زمرے میں ہے لیکن اس بچے کو پورے اعزاز کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے لئے پسند فرمایا اور اس کی دستگیری کی، یہی وجہ ہے کہ میری آنکھیں غمناک ہو گئیں۔ یہ بچہ تو ایک ناپیدِ کنار سمندر ہے۔ روحانی میدان میں شیر اور معرفت کی فضاء کا شہباز ہے۔ تمہاری

یہ نیاز خاندانِ رسالت میں مقبول ہوگئی۔")

حضرت سلطان العارفینؒ نے اس بچے کو سنِ شعور تک پہنچنے کے بعد اپنے خلیفۂ خاص حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ عبوری طور پر اس کی تربیت کریں کیوں کہ ان کا اصلی مرشد حضرت غوثِ پاک کی ہدایت پر باہر سے آئے گا اور یہ سب اپنے وقت پر ہوگا۔

حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ حضرت میر کی تربیت کرتے رہے اور کچھ عرصے کے بعد کشمیر میں جناب حضرت میر اسماعیل شامی رحمۃ اللہ علیہ کا ورودِ مسعود ہوا۔ وہ حضرت بابا داؤد خاکیؔ کے ہاں فروکش ہوئے اور دونوں بزرگ ایک دوسرے سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ حضرت میر اسماعیل شامی مامور تھے کہ وہ کشمیر میں سلسلۂ عالیہ قادریہ کو ترویج دیں اسلئے انہوں نے حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک جوانِ صالح کی طلب کی، جسے وہ تربیت دے سکیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے اپنے فرزند پیش کئے، مگر حضرت شامیؒ نے فرمایا کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں۔ آخرالامر حضرت خاکیؔ نے میر نازک نیازیؒ کو پیش کیا جو فوراً منظور ہوئے۔ مولانا بہاء الدین متو فرماتے ہیں سے

خواست سید ز شیخ فرزندے — کہ ہر و تربیت کند چندے
شیخ فرزندہائے کودک خویش — برد ہر یک جدا جدا در پیش
گفت اینہا چو کودک اند بسے — نیست آوان تربیت بسے
طالب گر مرید تو باشد — مستفید و رشید تو باشد
حکم فرما بہ پیش من آید — سر ز گنج نہفتہ بکشاید
شیخ فرمود میر نازک را
کہ توئی لائق ایں نیزک را

ان اشعار کا مفہوم وہی ہے جو اوپر کی سطور میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح حضرت

میر نازک قادری سلسلے میں حضرت میر اسماعیل شامی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور مجاز بنے۔ اور کشمیر میں قادری سلسلے کو عروج ہوا۔ یہ امتیاز حضرت میر نازک قادری کو ہے کہ وہ اس ملک میں قادری سلسلے کے بانی ہوئے۔ چنانچہ مولانا بہاؤ الدین متو فرماتے ہیں کہ میر اسمٰعیل شامیؒ نے حضرت میر سے کہا کہ یہ دولت جو تجھ کو حاصل ہوئی ہے حضرت غوث الاعظمؒ کے ارشاد سے ہوئی ہے اور پھر ــــ

مہر ازیں لطف و زیں کرامت ہا — از خدا خواست استقامت ہا

طالبان را بخود صلا در داد — بخدا راہ از صدق در داد

خرقہ در پر زمہر رافت کرد — بر سر مسند خلافت کرد

محاوری نقش زد بروئے نگین — میر نازک غلام محی الدین

(ترجمہ: ـــــ ان عنایتوں اور کرامتوں سے انہوں نے خدا سے راہِ حق پر چلنے کے لئے استقامت کی دعا کی جو قبول ہوئی اور طالبانِ حق جوق در جوق اُن کے چشمۂ معرفت سے سیراب ہونے لگے آپ کی انگوٹھی میں جو نگینہ تھا اُس پر "میر نازک غلام محی الدین" کندہ تھا۔

میں نے اس سے پہلے کہا ہے کہ کشمیر میں زاہدانِ مرتاض، عابدانِ شب زندہ دار اور مقربانِ بارگاہ کی کمی نہیں، مگر تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری میں جناب میرؒ بے نظیر ہیں۔ آپ کا مزارِ پُرانوار اور آپ کی خانقاہ محلہ کادی کدل میں آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ان دنوں نالہ مار پر ایک پُل تعمیر ہو رہا تھا جس کا نام کادی کدل ہے۔ حضرت میر علیہ الرحمۃ اس تعمیر کو اکثر دیکھتے۔ ایک روز دیکھا کہ ایک عورت زار و قطار رو رہی ہے۔ سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پل بنانے والے ٹھیکیدار نے اس کے کچھ پتھر اٹھائے ہیں اور انہیں پل کی تعمیر میں لگا رہا ہے۔ ٹھیکیدار بارسوخ آدمی تھا۔ اس نے عورت کی ایک نہ سنی اور حضرت میرؒ نے فیصلہ کیا کہ انہیں

پل کو مجبوراً مرمت کے لئے کبھی استعمال نہیں کریں گے کہ اس پل میں غصب شدہ مال لگایا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب نہ وہ نالہ مار ہے جس کا وجود ایک زمانے میں شہر کے حسن کو دوبالا کرتا تھا اور نہ وہ کاوری کدل جس کو زمین دوز کرکے ایشیا کے اس دنش گاہ کو برباد کرکے رکھ دیا گیا ہے اور وہ دن بھی دور نہیں، جب ڈل کا وجود ختم ہو جائے گا، جنگلات کا صفایا ہو گا اور یہ جنتِ ارضی ایک ریگستان میں بدل جائے گی خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

حضرت میر نازک قادری رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کی مؤرخوں نے کئی مثالیں دی ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت تک کوئی بھی تحفہ قبول نہیں فرماتے جب تک اس کی حلت و حرمت اور اس کے ماخذ کے بارے میں دریافت نہ کرتے۔ تحفہ لانے والے سے پوچھتے تمہارا کوئی شریک تو نہیں؟ اگر ہے تو کیا اس کی اجازت حاصل ہے۔ کیا اس پر سرکاری ٹیکس ادا کیا گیا ہے؟ اگر ذرا بھی شبہ ہوتا تو تحفہ لینے سے انکار فرماتے۔ غلام محی الدین سرائے بلی اپنی کتاب تحالیف الابرار میں فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حکام وقت میں سے ایک صاحب حضرت میرؒ سے ملنے آئے، آپ نے اُسے اس وقت تک اندر آنے کی اجازت نہ دی جب تک خانقاہ کے سامنے بوریہ نشین ہوا نہ لئے۔ اندر آ کر حاکم وقت نے کچھ روپیہ بطور نذر پیش کیا۔ آپؒ نے حاکم کی موجودگی ہی میں وہ ساری رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر ڈالی۔ حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ سلسلۂ قادریہ کے ایک بلند مرتبت بزرگ ہیں، وہ کچھ عرصے کے لئے کشمیر آئے اور حبہ کدل میں مقیم رہے یہاں بہت سے لوگوں نے اُن کو مدعو کیا اور آپ نے بلا تحقیق وہ دعوتیں قبول کیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو اپنے کمال میں زوال کے آثار نظر آنے لگے، بہت گھبرائے اور لوگوں سے استفسار کیا کہ کیا اس شہر میں قادری سلسلے کے کوئی بزرگ ہیں؟ لوگوں نے حضرت میر نازک نیازی کا نام بتا دیا اور آپ نے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر

کیا۔ حضرت میرؒ کو کشف کے ذریعے معلوم ہوا انہوں نے مٹھی بھر چاول اپنی اہلیہ کو دیا اور کہا کہ ایک مہمان آرہے ہیں ــــ حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ تین روز تک حضرت میر نازک قادری کے مہمان رہے اور حضرت شاہ نعمت اللہ قادری نے دیکھا کہ وہ نہ صرف اپنا کھویا ہوا کمال حاصل کر سکے بلکہ اُن کے روحانی مدارج میں ہر روز ترقی ہوتی گئی۔ دل میں خیال کیا کہ اب یہیں پڑا رہوں گا۔ حضرت میرؒ نے چوتھے روز صبح مٹھی بھر چاول اُن کے سپرد کئے اور فرمایا کہ مہمان کو تین دن تک ٹھہرانا سنت نبویؐ ہے۔ یہاں پڑے رہنے کے خیال سے باز آؤ کیوں کہ ؂

ڈگرا ے میر نازک جو خونِ جگر است

ہر کسے مفت میسر نتواند شد

یعنی میر نازک جو کا ڈگرا جگر کا خون ہے اور ہر کسی کو آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتا ساتھ ہی انہیں کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط برتنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ اب جایئے اور پھر دوبارہ نہ آیئے۔ کچھ عرصے کے بعد شاہ نعمت اللہ قادری پھر حاضر ہونے کے لئے بے قرار ہوئے اور انہوں نے کہلا بھیجا ؂

ما در فراق تو سوختیم

یعنی ہم آپ کے فراق میں جل رہے ہیں۔ حضرت امیرؒ نے اسی کاغذ کی پشت پر لکھا ؂

ما سوختیم، خاکستر شدیم د بر باد رفتیم

یعنی ہم تو پہلے ہی جل کر خاکستر ہو گئے ہیں اور یہ راکھ اڑ کر برباد ہو گئی ہے۔ اب کس سے ملنا چاہتے ہو!

مولانا بہاء الدین متو نے بابا داؤد مشکواتی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب "اسرار الابرار" سے نقل کیا ہے کہ جامع مسجد سرینگر میں ایک عجیب الخلقت پرندہ مینارِ مسجد پر نمودار ہوا جو شکل و صورت اور قدو قامت کے لحاظ سے باز کے برابر تھا۔ اس کا سر اور پاؤں سفید تھے اور وہ

مسجد کے چاروں میناروں پر طواف کرتا رہا۔ لوگ اسے پتھر مارتے مگر نہ وہ اس سے متاثر ہوتا اور نہ خوف زدہ۔ دو ہفتے تک یہی عالم رہا۔ لوگ یہ ماجرا لے کر حضرت میر نازک قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے تھوڑے سے غور و فکر کے بعد کہا۔ "جاؤ اُس سے کہو" "ہم نے تمہارا پیغام سُنا"۔ جوں ہی اس پرندے نے یہ پیغام سُنا وہ اُڑ گیا اور چند روز کے بعد حضرت میر نازک قادری رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا۔

آپ کے انتقال کے کئی سال بعد یہی پرندہ پھر نمودار ہوا اور اس سال کشمیر میں وبائے ہیضہ سے بے شمار لوگ ہلاک ہوگئے۔ پھر کئی سال بعد پھر نمودار ہوا تو کشمیر قحط کی لپیٹ میں آگیا اور ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ واقعہ تحفۃ الابرار، تاریخ اعظمی اور تاریخ کی دیگر کتابوں میں درج ہے۔

حضرت مولانا بہاءالدین متو نے اپنی کتاب "سلطانی" میں حضرت میر نازک قادریؒ کے کمالات کا تذکرہ یوں فرمایا ہے ؎

قدوۂ برگزیدانِ الٰہ — زبدۂ محرمانِ درگہِ شاہ
شاہباز تراوقِ ملکوت — خازنِ گنجِ خانۂ لاہوت
مسند آرائے ملکِ درویشی — رہ پیمائے فقر و دل ریشی
از ازل اُو نہادہ در تفرید — تا ابد مستِ بادۂ توحید
نکتادہ بغیر سنت دم — بر رسولِ خدا قدم بقدم
میر نازک بحرِ معنی بود — بلکہ زاں بحر دُرِ یکتا بود
بہ او سر چو از بخارا زد — سر چو خورشید آشکارا زد

(ترجمہ: — اللہ کے چنے لوگوں کا پیشوا، اللہ تعالےٰ کے رازوں کے محرم بزرگوں کا خلاصہ، ملکوت کے پردوں پر اڑنے والے شاہباز اور لاہوت کے خزانے کا خزانچی۔ درویشی کے ملک کا مسند نشین اور فقر و دل ریشی کی منزلیں طے کرنے والا۔ ازل سے ابد تک تفرید اُسکو

توحید کے لئے متوالا ــــــ ۵ ۰ بزرگوار جس کی ہر سانس سنت رسولؐ کے مطابق تھی اور جو قدم قدم حضور رسالتمآبؐ کا تابع تھا۔ اس کا نام نامی میر نازک ہے جو معنویت کا سمندر تھا۔ بلکہ معنویت کے سمندر کا لاثانی اور بیش بہا موتی تھا۔ اُن کے جد پاک (میر علی محمد بخاری) بخارا سے آئے اور یہاں آفتاب عالم تاب بن کر چمکے۔

کتاب "تحفۃ الابرار" میں لکھا ہے:-

"شائقی و مورخان دیگر مثل شیخ داوُد خاکی رحمۃ اللہ علیہ و صاحب خوارق السالکین و بہاء الدین متو در کتاب غوثیہ سیادت حضرت میر د سیادت نجا اعام الیشان سنے نگارند۔"

یعنی شائقی اور دوسرے مورخ مثلاً بابا داوُد خاکیؒ صاحب "خوارق السالکین" اور بہار الدین متو اپنی کتاب میں حضرت میر اور ان کے نجا اعام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سید تھے۔

اسی کتاب میں حضرت میر سید یعقوب کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:-

"از ارادتمندان عالی درجات صاحب حالات و مقامات بودہ۔ چنانچہ صاحب خوارق السالکین در ذکر ایشاں می نگارد کہ قدوۂ آفاق زبدۂ عشاق مرشد و محبوب حضرت سید یعقوب عموزادہ میر نازک بیانی قادری از ارادتمندان شیخ داوُد خاکی بود۔"

ان میر سید یعقوب کا مزار پرانوار ہوتہ وار میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت میر نازک قادری رحمۃ اللہ علیہ ۹، ذی الحجہ ۱۰۲۲ھ کو اس دار فانی سے دار البقاء کی طرف روانہ ہوئے۔ "تقیا التقیا" سے سال وصال حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ کا مزار پرانوار اور آپ کی خانقاہ کادی کدل میں مرجع عوام ہے۔ عمر شریف کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ کیوں کہ تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ مگر آپ چونکہ خود حضرت سلطان العارفینؒ کے زیر تربیت رہے ہیں اور ان کے

انتقال کے بعد حضرت بابا داؤد خاکیؒ اُن کی دیکھ بھال کرتے رہے ۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ کا وصال سنہ ۹۹۴ھ میں ہوا۔ اس وقت وہ حضرت میر اسماعیل شامیؒ کے حوالے ہو گئے تھے اور قیاس کہتا ہے کہ اُن کی عمر اُس وقت ۲۵، ۳۰ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ اِس طرح اندازاً پچاس اور پچپن کے درمیان ہو گی۔

اِن سطور کا لکھنے والا حضرت میر نازک قادریؒ کی گیارہویں پشت میں ہے اور "بدنام کنندہ نکونامے چند" بنا ہوا ابھی تک بقیدِ حیات ہے ۔ ٭

عبدالمجید ساؔئر

حضرت شیخ بابا محمد علی رینہ رحمۃ اللہ علیہ

زبدۃ العرفا عمدۃ الصلحا حاجی الحرمین شریفین مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ کشمیر میں بلند پایہ اولیاء اللہ میں سے ایک ہیں۔ آپ موضع تجر شریف پرگنۂ زینہ گیر میں پیدا ہوئے ہیں۔ آپ حضرت شیخ بابا عثمان رینہؒ کے فرزند ارجمند اور حضرت محبوب العالم سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ قدس اللہ سرہٗ کے برادر اکبر ہیں[1]۔ ذکر و فکر آپ کا مشغلہ تھا۔ آپ نے سال ہا سال اطراف و اکناف کی سیاحت کی — تین بار حج اکبر کی برکت سے فیضیاب ہوئے — اپنے وقت کے بلند مرتبہ عالم و فاضل تھے۔ علم حدیث، تفسیر اور فقہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے یہاں تک کہ بلند پایہ صاحبِ تصنیف تھے۔ شعر و شاعری میں بھی کافی دستگاہ حاصل کی تھی۔ لیکن آپ کی کوئی شاعرانہ تصنیف دستیاب نہیں ہے۔

صاحب "ہدایت المخلصین" حضرت میر بابا حیدر تینہ مولیؒ آپ سے متعلق رطب اللسان ہیں کہ آپ کو حضرت مخدومؒ نے ایک دن فرمایا کہ "اے برادر جب تک اپنے سر سے یہ خودی دور نہ کروگے کہ میں محبوب العالمؒ کا بھائی ہوں میرے اسرار سے واقف نہیں ہو جاؤ گے۔ چنانچہ آپ کو ایک سال اندر

---

[1] ملا بہاؤالدین متو نے اپنی کتاب "سلطانی" میں آپ کو برادر خورد سے موسوم کیا ہے۔ لیکن ایسا صحیح نہیں ہے۔

رفت بابا بدعوتش حالی　　از رہِ سنت دنیکو حالی

حضرت شیخ حمزہ باخود بُرد　　باز بابا علی برادرِ خورد

آٹھ ماہ کے لئے دربانی کرنے کا حکم ہُوا بے[1]

آپ طے مکاں سے جہاں کہیں بھی جانا چاہتے تھے جایا کرتے تھے۔ ع[2]

یہ امر مسلّمہ ہے کہ مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ علم و فضل میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ علوم ظاہری اور علوم باطنی کا سرچشمہ تھے۔ آپ نے متنوع تصنیفات کا سلسلہ کتابی صورت میں بطور یادگار چھوڑا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ فرماتے ہیں کہ "مخدوم الاولیا شیخ بابا محمد علی رینہؒ جو کہ حضرت محبوب العالمؒ کے عینی برادر ہیں، نے جب "ورد المریدین" کا مطالعہ کیا تو آپ نے خواہش ظاہر کی کہ میں بھی ایسی کوئی کتاب تصنیف کروں جسمیں حضرت محبوب العالمؒ کے خوارق و عادات ہوں۔ جو کچھ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے لکھوں اور باقی کچھ آپ کے دوسرے خلفاء کی تصانیف سے اخذ کروں۔ ع[3] آپ کی مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔ "تذکرۃ العارفین" "رسالہ محیط" "مرکز الابرار" "نسیم الاحرار" "شواہد المراقبات" "جواہر النکات" وغیرہ۔ ان میں سے صرف "تذکرۃ العارفین" کا نسخہ دستیاب ہے۔ اور باقی تصانیف کا کہیں نام و نشان نہیں۔

حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ نے حضرت مولوی شیخ احمد چاگلی کے برادر ملا عبدالعزیز کو تفسیر کا درس دیا اور نظم میں بھی رہنمائی کی کیونکہ آپ نظم سے خوب واقف تھے۔ علوم عربی میں بہت ممتاز اور نظم میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ ع[4]

میر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ "حضرت محبوب العالمؒ کی اس دنیا سے نقل فرمانے کے بعد میرے بھائی حضرت شیخ خاکیؒ نے آنحضرتؒ کی بعض کتابیں حضرت خواجہ حسن قاریؒ، حضرت خواجہ اسحٰق قاریؒ اور مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ جو کہ حضرت محبوب العالمؒ کے برادر عینی ہیں کو دیدیں۔ اگرچہ حضرت شیخ خاکیؒ نے حضرت محبوب العالم کا سارا کتب خانہ مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کے حوالے کیا کیونکہ آپ اس ساری ملکیت کے مالک تھے لیکن آپ نے اس میں تصرّف نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ حضرت شیخ خاکیؒ اور حضرت میر بابا حیدر جو کچھ مناسب سمجھیں، کریں۔ ع[5]

صاحب "چلچلۃ العارفین" حضرت خواجہ اسحٰق قاریؒ رقمطراز ہیں کہ "جب حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ ایک دفعہ حج بیت اللہ سے واپس آئے اور بارہ مولہ پہنچ گئے تو حضرت سلطان العارفینؒ

---

[1] مخطوط ہدایت المخلصین ص ۱۵۷
[2] مخطوط ہدایت المخلصین ص ۱۵۸
[3] مخطوط ہدایت المخلصین ص ۱۹۱
[4] مخطوط ہدایت المخلصین ص ۲۵۱
[5] مخطوط ہدایت المخلصین ص ۲۱۵

نے مجھے فرمایا کہ اے فرزند! عرب سے ایک فقیر آیا ہے اور بارہ مولہ پہنچا ہے۔ تم اور میاں یوسف اُسکی خدمت میں جاؤ اور برادرانہ خدمت بجا لاؤ۔" ہم سب ارشادِ حضرت مرشد بارہ مولہ گئے اور وہاں اس فقیر کی خدمت کر کے اس سے پوچھا کہ آپ کا کیا نام ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میرا نام محمد علی ہے۔ ہم نے پوچھا کہ آپ کے والدِ بزرگوار کا کیا نام ہے؟ آپ نے فرمایا "شیخ بابا محمد عثمان ریشیؒ" آپ نے بارہ سال عرب کے مختلف ممالک میں علوم ظاہری حاصل کرنے میں صرف کئے۔ جب آپ تیسری بار حج کے لیے حضرت مخدومؒ کی اجازت سے گئے تو اس سفرِ محمود میں چالیس چلے ادا کئے۔[1]

آپ نے متواتر دو سال کے لئے حضرت مخدومؒ کے گھوڑوں کو پانی پلانے اور دانہ کھلانے کی خدمت انجام دی۔[2]

مزید فرماتے ہیں کہ "مخدوم شیخ بابا محمد علی ریشیؒ، جو کہ حضرتِ محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے عینی برادر ہیں، تین بار حج کرنے کی غرض سے بیت اللہ شریف گئے۔ آپ کے خوارق عادات اور کشف و کرامات بسیار ہیں جو کہ شرحِ بیان میں نہیں آسکتے ہیں۔ آپ حج کھلے مکان سے جاتے تھے۔ بعض علوم میں آپ کو کافی دستگاہ حاصل تھی۔ علم نظم میں آپ کو ممتاز درجہ حاصل تھا۔ آپ دیوانِ حافظ کا مطالعہ کرتے تو دونوں آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے۔ آپ کا یہ حال دیکھکر دوسروں پر اس قسم کی رقّت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ بھی بے اختیار رو پڑتے تھے۔ ایک دفعہ شہر کے ایک بقال کا لڑکا نور محمد ڈار آپکی خدمت عالیہ میں "لیلیٰ مجنون" نامی کتاب پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اُسکو ہوش نہ رہا۔ اسی حال میں آپ کی کرامات سے دیوانہ ہو گیا۔ کچھ مدت کے لئے پہاڑوں، جنگلوں اور ویرانوں میں پھرتا رہا۔ پھر اپنے حال میں آکر آپ سے تلقین پائی اور ملچی مرحلہ کا قطب بن گیا۔[3]

صاحبِ "تذکرۃ المرشدین" حضرت خواجہ میرم بزاز سکندر پوریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ بات میں نے حضرت شیخ بابا عثمان ریشیؒ پدرِ بزرگوار حضرتِ محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ سے سُنی، یعنی:۔

جب حضرتِ سلطان العارفینؒ کی والدۂ ماجدہ کو حمل کے دنوں میں سخت تکلیف ہوتی رہی تو حضرت بابا عثمانؒ حد سے زیادہ متفکر ہوئے اور طبیب حاذق کی تلاش کرنا شروع کر دی۔ ایک عزیز کو یہ حال کہا۔ اُس عزیز نے سُنا اور سمجھ لیا۔ جواب میں اُس عزیز نے فرمایا کہ اے بھائی! خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کو دو ماہ گزر جانے کے بعد ایک دوسرا فرزند عطا کر دے گا۔ جس طرح حضرت یونسؑ

---

[1] مخطوطہ چلچلۃ العارفین ص ۹ [2] مخطوطہ چلچلۃ العارفین ص ۸۳

[3] مخطوطہ چلچلۃ العارفین ص ۱۲۲

مچھلی کے شکم میں بند ہو کر یادِ خدا کر رہے تھے اسی طرح وہ عملی طور ماں کے پیٹ میں اس وقت ذکر وفکر میں مشغول ہے۔[1] "دوسرا فرزند" کا فقرہ صاف بیان کرتا ہے کہ حضرت شیخ بابا عثمانؒ کے ہاں حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ سے پہلے ایک فرزندِ ارجمند پیدا ہوا تھا۔ یہ مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔

صاحب "تذکرۃ العارفین" حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ اپنی معرکتہ الآرا کتاب کے ابتدائی صفحات میں اپنا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔ "بندۂ ضعیف فقیر نحیف علی ابن عثمان کشمیری تجرؒ کے گاؤں کا بسیکن ہے جو کہ اس غریب کی جائے پیدائش اور وطن ہے۔ مخصوص طور پر حسبی اور نسبی ذات رینہ سے کشمیر میں مشہور و معروف ہے۔ اس فقیرِ حقیر کا مرشد کامل اپنا حقیقی بھائی ہے۔ وہ زمانے اور زمانے کے لوگوں کے مرشدِ کامل ہیں۔ وہ غوث الاعظم، قطب العالم، سلطان العارفین ہیں۔[2]

آپ اپنے سے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں کہ "جب تک میں حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کی خدمت عالیہ میں رہا میں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا کہ میں آنحضرتؒ کا بھائی ہوں۔"[3] اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ آپ نے زیادہ تر وقت کشمیر سے باہر سیر و سیاحت میں گزارا ہے۔ سرینگر میں بہت کم ٹھہرے ہیں۔

آپ آگے فرماتے ہیں کہ "جب میں کشمیر سے نکلا تو پہلے پہل میں نے بہت مدت کے لئے لاہور میں قیام کیا۔ وہاں ایک بڑے پایہ کے بزرگ حضرت شیخ احمد غوث تھے جو کہ زیادہ تر خلوت گزین ہی رہا کرتے تھے اور لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ میں ان کے پاس ٹھہرا۔ انہوں نے میری بہت خاطر تواضع کی۔ میرے دلِ ناصبور میں اُن سے بعیت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کس عزیز کے مُرید ہیں؟ انہوں نے جواب باصواب میں فرمایا کہ "میں آپ کے عزیز بھائی محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ، جو کہ کشمیر میں ہیں، کا مُرید ہوں۔"[4]

اسی طرح آپ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ "قطب العرفا مخدومنا سید ابو البقاؒ بلند مرتبہ اولیائے کرام میں سے ایک ہیں۔ میں اُن کے پاس بہت مدت کے لئے ٹھہرا۔ ایک دن میں اُن کے گھر میں اُن کے سامنے بیٹھا تھا کہ کوئی عزیز ایک خط لیکر اُن کے پاس آیا۔ انہوں نے یہ خط پکڑا اور کھولکر پڑھا۔ اس کے بعد مجھے مطالعہ کرنے کے لئے دیا۔ یہ خط سید موصوف کو محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کی طرف سے آیا تھا۔ اس

1۔ مخطوط تذکرۃ المرشدین ص ۱۷ 2۔ مخطوط تذکرۃ العارفین ص
3۔ مخطوط تذکرۃ العارفین ص ۲۴۴ 4۔ مخطوط تذکرۃ العارفین ص

خط کا قاصد ایک مردِ غیبی تھا۔ اس میں یہ عبارت لکھی تھی۔ :

ترجمہ :۔ ہُوَالقدوس۔ قدوۂ ارباب عمل۔ زبدۂ اصحاب کُمُل برادرِ دین۔ شیخ الاسلام والمسلمین۔ مخدوم الاولیاء۔ سید ابوالبقا مشتاق بقا ہوں۔ آپ پر روشن ہو کہ میرے بھائی محمد علی رینہ، جو کہ میرے برادرِ عینی ہیں آپ کی خدمت میں پہنچے ہیں ہر باب میں اُن کو تربیت و اُلفت میں ممتاز رکھیں اور اپنوں میں سے شمار کریں۔[1]

صاحب خوارق السالکین مُلا احمد کشمیری ابن عبدالصبور لکھتے ہیں کہ حضرت بابا محمد علی رینہ رح سلطان الاولیائ حضرت مخدوم شیخ حمزہ ق کے بھائی تھے۔ طریقت میں نسبتِ ارادت آنجناب ق ہی سے حاصل کرکے ریاضیات و عبادات میں جد و جہد کرتے رہے۔ خلعتِ ارشاد اور سندِ خرقہ مرشدِ اکبر حضرت سید حیدر تلیہ مولیؒ سے حاصل کرکے رہے۔ آپ کا مقبرۂ مقدس موضع تجر شریف، پرگنہ زینہ گیر میں ہے۔

نظیرش در ریاضت ناپدید است
مثالش در عبادت ناشنید است
کمالش در مقالم سے نہ گنجد
قرینش در کرامت ناپدید است[2]

فاضل مورّخ سعداللہ صاحب شاہ آبادی اپنی مستند تاریخ "باغِ سلیمان" میں رقمطراز ہیں ؎

دیگر از اولیائے شاہ سریر — ہست علی رینہؒ آن برادرِ پیر
بعدِ کسبِ فضایل از کشمیر — رُوبہ حج کرد و گشت طالب پیر
بہرِ آن استخارہ در حرمین — کرد بسیار یافت بے شر و شین
از خدا و نبیؐ اشارہ درست — کہ برو پرتوِ برادرِ تست
باوے از فضل ہمچو گل بشگفت — آنچہ در استخارہ یافت بگفت
شیخ گفتش بخطۂ کشمیر — چوں رسی مبشوی ولدیت گیر
از قدمبوسِ شیخ دین حالی — دست دادش ولدیت عالی
در کمالات یافت چوں فردش — شیخ دین جانشین خود کردش
مرقدش در تجر لبعد درجات — اہلِ دین راست قبلۂ حاجات[3]

---

[1] مخطوطہ تذکرۃ العارفین ص ۱۴۶ [2] مخطوطہ خوارق السالکین ص ۱۴۴

[3] مخطوطہ تاریخ نظم یعنی باغِ سلیمان در خانۂ مرحوم پیر بزرگ شاہ محلہ کلال دوری نائیدکدل سرینگر کتاب کے صفحے کا شمار نہیں دیا گیا ہے

فاضل مورخ ملا عبدالوہاب شایق اپنی معتبر تاریخ "تاریخ شائق" میں اس طرح رطب اللسان ہیں ؂

بحال مولوی علی حق قرین	رقم کردہ در "تذکرۃ العارفین"
کدام است آن مولوئ علی	کہ بودہ برادر بہ حمزہ[ق] ولی
سفر کردہ بسیار در روم وشام	زِ کشمیر بہ طرف بیتُ الحرام
زمینِ عجم پے سپر کردہ بود	بچین و خطا ہم گذر کردہ بوُد
چو از بحر مُرشد مراحل بُرید	براہِ طلب رنج بے حد کشید
باآخر زِ احمد دلالت شُدہ	بہ مخدوم حمزہ[ق] حوالت شُدہ
ملاقی شدہ بابسے اولیا	زِ اہلِ شہود است آن راہ نما[1]

صاحب "تاریخِ کشمیر" ملا محمد مراد نقشبندی عرف ٹٹنگ خواجہ اعظم صاحب دیدہ مری کے مرشدِ کامل آپ کو حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ[ق] کے خلفائے برگذیدہ میں اس طرح شمار کرتے ہیں :

خلفائے حضرتِ مخدوم[ق]... آپ کے خلفا جناب بابا داوُد خاکیؒ۔ جناب شیخ بابا علی رینہ تیجریؒ برادرِ گرامی حضرتِ مخدوم[ق]۔ ملا شیخ احمد چاگلی۔ شیخ میر حید رتلہ مولیؒ۔ خواجہ اسحٰق قاریؒ۔ خواجہ حسن قاریؒ۔ خواجہ میرم۔ روپی ریشی اور ہردی بابا تھے۔ یہ آپ کے ہمعصر اور مقربین تھے۔[2]

صاحب تصنیف "سلطانی" ملاّ بہاؤالدین متو آپ سے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں ؂

آنکہ سرمستِ جام قیومی الیست	شیخ بابا علی مخدومی الیست
مستِ اطلاق و مقبلِ دارین	قطب آفاق حاجی الحرمین
حج پے ذاتِ حق سہ بار نمود	ہمہ آفاق را نظارہ نمود
اوُ بہر سو زمین کہ جا میکرد	طلب پیرو راہ نمُا میکرد
بر درِ خاص شاہد لولاک...	دردِ دِل عرض کرد بادلِ چاک
ناگہاں سینۂ خجستہ نسیم	مصدرِ فیض و مفخرِ عالم
جلوہ گر شدُ باوُ بہ نورو سُرور	اے خوشا چشم و اے خوشا آن نور
گفت چیزے کہ مدعایت بوُد	در سر خانہ و سرایت بود
تو بگرد جہاں عبث رفتہ	زِ اختران جُستہ ماہ دوُ ہفتہ

---

[1] "تاریخ شایق" مخطوطہ۔ در تحویل کلچرل اکیڈمی۔

[2] تاریخ کشمیر، مائکرو فلم صفحہ ۵۲ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ جموں وکشمیر ۱۱۴۰ھ میں لکھی گئی ہے

پس سوئے شیخ حمزہ قہ ایما شُد   زانکہ اُو نیز حاضر آن جا شُد

گفت بابا علی برادرِ تُو   میشود کامیاب از برِ تُو

بہ نگاہے بہ دولتِ ابدی   برسان و رہاں ز قیدِ خودی[1]

اسی طرح صاحب تصنیف "کاشرِ سلطانی" میں فردوسیِ کشمیر عبدالوہاب پرے آپ سے متعلق اس طرح گویا ہیں ؎

شانیٔ عِلم مولوی رومی   شیخ بابا علی مخدومی

حضرتِ شیخ سُندُسے سِنح بوے   پھیشُور اندر جہاں در ہر سوے

حج بیتُ الحرام ستہ بار کوٗرُن   سیر دنیا بہر کنار کوٗرُن

اوس ژھاران بہر طرف رہبر   گرِ آسِتھ تمِس نہ رُوز خبر

لیُس اکھاہ تمُو وُچھُن ز اہلِ جہان   تم ہمہ آسی پیدو سلطانؒ

لیَہ اُکس نِش تمُو وُچھن خوبی   سُو وُچھُن تمُو مُریدِ محبوبیؒ

اُو لاران دَرَ مدینہ سُو گو   از سرِ درد و سوزِ سینہ سو گو

بامُید آس بندہٗ مسکین   شاد کرتم بو زیادہ چھس غمگین

تس دراں فکر سیّد عالم   جلوہٗ گر گو بواقعہ دردَم

آس فرمان زِ سیّد السادات   ضایع بے ہودہ ژنےٗ کرِتھ اوقات

گرِ بینہ نے ژنےٗ چھے پننُ مقصود   گرِ آسِتھ ژِ پر گری بے ہوُد

پس اشارہ بہ حضرتِ سلطانؒ   کوٗر تمو سُو تہِ اوس در ایوان

علی بابہِ چھوُہ توہے سنح بوے   خانہ خانہ سُو پھیشور در ہر سوے

پہ گرِ شیا نا امُید از درِ تُو   چھوُ پہ فرزندِ من برادرِ تُو

واتہ ناوُن بدولتِ ابدی   موکہ لاوُن زِ حرص و قیدِ خودی[2]

کشمیر کے مسلّمہ فاضل مورّخ پیرزادہ حسن شاہ کھوٗیہامی مورخانہ اندازِ بیان کو نظر انداز کرکے حضرتِ موصوف سے متعلق اس طرح گوہر فشانی فرمارہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ حضرت مخدوم قہ کے حقیقی بھائی تھے۔ لیکن شیخ داوٗد خاکیؒ نے اپنی کتاب میں کسی جگہ ان کا نام ہی نہیں لیا ہے البتہ بابا حیدر تلہ مولیؒ نے اپنی

[1] مطبوعہ سلطانی منظوم

[2] مطبوعہ کاشرِ سلطانی کلاں جلد دوم صفحہ ۲۲

کتاب "ہدایت المخلصین" میں ان کے حالات بہت ہی مبالغہ کے ساتھ درج کئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "بابا علی حضرت محبوب العالمؒ کے حقیقی بھائی ہیں۔ بارہ برس تک مرشد کی تلاش میں ملکوں کی سیاحت کی۔ تین دفعہ حج کو گئے۔ علم فقہ اور حدیث میں کمال رکھتے تھے۔ ایک رات حضرت سرورِ کائناتؐ اور حضرت مخدومؒ کو خواب میں روضۂ مطہرہ میں (گنبد خضریٰ تلے) اکٹھے دیکھا۔ آنحضرتؐ نے حضرت مخدومؒ کو حکم دیا کہ بابا علیؒ آپ کا بھائی ہے۔ اس کی تربیت کرنی چاہیئے۔ بابا علیؒ کشمیر آئے۔ حضرت مخدومؒ نے میر بابا حیدرؒ اور خواجہ اسحٰق قاریؒ کو اِن کی پیشوائی کے لئے ہیرہ پورہ روانہ کیا۔ جب دربار سلطان العارفینؒ میں پہنچے تو اُن کی کیمیا اثر نظر سے فیضیاب ہوئے۔ ایک سال ڈیوڑھی پر پہرہ داری کا کام کرتے رہے اور تعلیم و تربیتِ معنوی پاتے رہے۔ پھر حضرت داؤدِ خاکیؒ کے ساتھ ملتان، جاکر بڑے بڑے بزرگوں کی صحبت ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے۔ حضرتِ بابا علی رینہؒ طے مکان میں کمال دستگاہ رکھتے تھے۔ اپنے علاوہ دوسروں کو بھی طے مکان کراسکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اِن کا ایک مُرید پورب گیا تھا اور ایک دن اس کی بیوی کو اس کے مرنے کی خبر کسی نے سنائی۔ بیچاری روتی بلکتی، گریہ وزاری کرتے ان کی خدمت میں آئی اور اپنے خاوند کا قصہ سنایا۔ حضرت نے اس کو کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کرلو۔ اُس نے آنکھیں بند کیں اور پورب پہنچ گئی۔ سات دن اپنے خاوند کے پاس رہی۔ پھر بابا کے فرمانے پر آنکھیں کھولیں اور ہنستی خوشی گھر چلی گئی۔ مختصر یہ ہے کہ حضرت بابا علی رینہؒ اپنے زمانے کے بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ "تذکرۃ العارفینؒ" اُن کی تصنیف ہے۔ تجر کے گاؤں میں دفن ہیں۔[1]

پیرزادہ موصوف کے بعد خواجہ غلام محی الدین امرتسری "تحفۂ محبوبی" میں حضرت موصوفؒ سے متعلق پیرزادہ موصوف کا ہی تتبع کرتے ہوئے اپنی ترا لی دُر افشانی اس طرح کرتے ہیں۔ "مخدوم بابا علی رینہؒ قبل اس کے کہ ہم مخدوم بابا علی رینہؒ کا مختصر تذکرہ بیان کریں یہ ضروری ہے کہ بطورِ اظہارِ حقیقت یہ بیان کریں کہ شیخ بابا داؤد خاکیؒ، ابوالفقرا بابا نصیب الدین غازیؒ اور بابا داؤدِ مشکواتی نے اپنی تصنیف کردہ کتابوں میں بابا علی رینہؒ کا نام تک بھی حوالہ قلم نہیں کیا ہے۔ لیکن ایک مشہور تاریخ نویس نے اس باب میں لکھا ہے کہ "گویند کہ برادر عینی حضرت مخدوم بود و بقولِ بعض محققین برادر فرمی اوست" مگر ہم ملا شہاب الدین[2] متو کی کتاب سلطانی منظوم سے اجمالاً آپ کا تذکرہ اخذ کرکے درج ذیل کرتے ہیں کہ آپ نے علمائے کرام کی علمی مجالس سے استفادہ کرکے فقہ و حدیث کی کم و بیش شناخت

---

[1] مطبوعہ اسرار الاخیار ص ۱۸۴

[2] سلطانی منظوم ملا بہاؤالدین متو نے لکھی ہے۔

حاصل کی۔ بارہ برس تک سیر و سیاحت کرکے پیرومرشد کی تلاش کی اور ہادیانِ ملت اور ماہرین سیرو سلوک کی خدمت میں زانوئے ادب۔ تہہ کیا مگر طلب کی پیاس نہ بجھی۔ حرمین شریفین گئے، روضہ مقدس کی زیارت کی اور اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ مکاشفہ کی حالت میں جناب رسول مقبولؐ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر حضرت مخدومؒ کے سپرد کیا اور فرمایا کہ " اپنے سچے پیارے طالب کو تربیت کریں "۔ بابا علیؒ فوراً واپس آئے اور حضرت مخدومؒ نے میر بابا حیدرؒ، شیخ داؤد خاکیؒ اور خواجہ اسحاق قاریؒ کو بیرہ پورہ کے مقام تک استقبال کے لئے بھیجا۔ وطن پہنچ کر حضرت مخدومؒ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ پھر بمعیت شیخ بابا داؤد خاکیؒ ملتان چلے گئے اور وہاں چند سال تک اقامت پذیر رہے۔ واپس آکر پھر موضع تجر میں اقامت اختیار کی۔ کہتے ہیں کہ "تذکرۃ العارفین" آپ کی تصنیف ہے جس میں حضرت مخدومؒ کے حالات مذکور ہیں۔ [1]

بندۂ احقر کو اس جگہ حضرت موصوف مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کے کمالات و مقامات اور کشف و کرامات کا تذکرہ کرنے سے غرض نہیں البتہ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے ساتھ آپ کے برادرانہ رشتے سے متعلق بحث و مباحثہ چھیڑنا بہت ضروری ہے۔ بحث و مباحثہ چھیڑنے سے اصلی حقائق قارئین کرام کے سامنے آسکتے ہیں۔ کیونکہ مذکورہ دو فاضل مصنفین پیرزادہ حسن شاہ کھویہامی اور خواجہ غلام محی الدین امرتسری نے نمایاں طور پر ایک متنازعہ بات کو جنم دیا ہے کہ " حضرت موصوفؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے برادرِ عینی نہیں ہیں۔ وراثت کے دعویداروں نے، لگتا ہے کہ یہ پھلجڑی چھوڑی ہے اور وراثت جتنے کے لئے "ہدایت المخلصین" کے اس بیان کو خوب اچھالا ہے۔ ان ہی دو فاضل مصنفین کے مبہمانہ حوالوں سے اپنی وراثت جتلانے کے لئے نام نہاد وارثوں نے سوقیانہ ٹریکٹ وقتاً فوقتاً شائع کئے، جن میں واضح طور پر لکھا گیا کہ مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے حقیقی بھائی نہیں تھے۔ کیونکہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ، حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ اور حضرت بابا داؤد مشکواتی نے اپنی تصنیف کردہ کتابوں میں حضرت مخدوم بابا محمد علی رینہؒ کا نام تک سپردِ قلم نہیں کیا ہے۔

مذکورہ بالا بیان پر بات کرتے وقت ہمیں اس خاص ماحول اور پس منظر کو زیرِ نظر رکھنا ہوگا جو نا چیز کی دانست میں اس کا محرک رہا ہے۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ حضرت بابا علی رینہؒ کے برادر اصغر حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ اولیائے کرام میں ایک مقتدر اور برگزیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ آپ نے کشمیر اور اس کے گرد و نواح میں دینِ اسلام

[1] مطبوعہ تحفۂ محبوبی صفحہ ۵۳

کی آبیاری کرکے ہزارہا بندگانِ خدا کو رُشد و ہدایت کی نعمت سے مستفید فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی درگاہِ عالیہ روحانی فیض حاصل کرنے کی جگہ تصور کی جاتی ہے۔ یہ درگاہ عالیہ مرجع خاص و عام ہے۔ یہاں سال بھر عقیدت مند نزدیک اور دور و دراز جگہوں سے جوق در جوق رُوحانی فیض حاصل کرنے کے لئے آتے رہتے ہیں اور نقدی کے علاوہ مختلف قسم کے نیاز و نذرانے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس نقدی اور نذر و نیاز کی اِفراط نے یہاں مجاوروں کی ایک بڑی جماعت پیدا کردی ہے۔ ان میں سے کچھ باباصاحبان "بالا" کچھ باباصاحبان "پائین" اور کچھ "صوفیوں" کے نام سے موسوم ہیں اور اپنی اپنی مختلف ذاتیں رکھتے ہوئے اپنے آپ کو "مخدومی" کہتے ہیں۔ باباصاحبان بالا اپنے آپ کو حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد و اخفاد سے، جبکہ باباصاحبان پائین اپنے آپ کو حضرت میاں صوفی علی متبنائے حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کی اولاد و اخفاد سے ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں اور صوفی صاحبان اپنے آپ کو حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کی پاک زندگی میں آپ کے خدمتگاروں کی اولاد و اخفاد میں سے بتاتے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ سلطان العارفین محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ نے کوئی نکاح نہیں کیا تھا اس لئے آپ کی صُلبی اولاد نہیں تھی۔ اس دنیائے فانی سے نقل فرمانے کے بعد بہ مطابق شریعت غرّا آپ کی وارث آپ کی یکجدی جماعت ہو سکتی تھی۔ لیکن دوسری ایک جماعت نے صاف طور پر یہ جتلایا کہ آپ کا کوئی بھی یکجدی وارث نہیں ہے۔ بلکہ آپ نے اپنی پاک زندگی ہی میں ایک متبنّیٰ بنایا ہے اس لئے اسی متبنّیٰ کی اولاد و اخفاد آپ کی جائز وارث ہے۔ اِن دو جماعتوں کو چھوڑ کر تیسری ایک اور دعوٰی دار جماعت نے یہ نمایاں طور پر ظاہر کردیا کہ نہ تو آپ کا کوئی حقیقی یکجدی ہی ہے نہ متبنّیٰ بلکہ جن لوگوں نے زندگی میں آپ کی خدمت بجالائی ہے، اُن کی اولاد و اخفاد ہی حقیقی طور پر آپ کی وراثت کی حقدار ہے۔ وراثت کے اس جھگڑے کو ایک طرف رکھتے ہوئے اِس بات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ موصوف مخدوم حضرت بابا علی رینہؒ تاریخ میں ایک باوقار شخصیت کے ہی حامل نہیں بلکہ ایک برگزیدہ ولیٔ کامل بھی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار کرکے تاریخ کے اوراق کو مسخ نہیں کیا جاسکتا۔

بابا محمد علی رینہؒ تواریخ کے تناظر میں

یہ سچ ہے کہ چند مصنفین نے موجودہ صدی میں آنکھیں بند کرکے ایک دوسرے کا تتبع کرتے ہوئے اظہار کیا ہے کہ زبدۃ العرفا عمدۃ الصلحا حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ سلطان العارفین محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کے حقیقی برادر نہیں ہیں۔ حالانکہ ان کا دعوٰی ہے کہ اپنی تصانیف

کو تشکیل دیتے وقت ان کے زیر مطالعہ خود حضرت مخدوم، شیخ بابا محمد علی رینہؒ کی معرکتہ الآرا کتاب "تذکرۃ العارفین"، حضرت شیخ میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ کی بلند پایہ تصنیف "ہدایت المخلصین"، حضرت میرم بزاز سکندرپوریؒ کی مؤلف کتاب "تذکرۃ المرشدین"، حضرت خواجہ اسحٰق قاری معصدقہ کتاب "چلچلتہ العارفین" اور اسی طرح دیگر اصحاب کی معتبر تصانیف رہی ہیں۔ باوجود اس کے ان کا عام حوالہ یہ رہا ہے کہ "گویند کہ برادرِ عینی حضرت مخدوم بود ولیکن بقول محققین برادرِ فرعی اوست"۔

جہاں تک مختلف تواریخ اور تذکروں کے مطالعہ کرنے کا تعلق ہے صرف ایک مورخ پیرزادہ حسن شاہ کھویہامی اپنی تاریخ میں یوں لکھتے ہیں "کہ کہتے ہیں کہ شیخ بابا علی رینہؒ حضرت مخدومؒ کے حقیقی بھائی تھے لیکن شیخ داؤد خاکیؒ نے اپنی کتاب میں کسی جگہ بھی ان کا نام نہیں لیا ہے۔ البتہ بابا حیدر تیلہ مولیؒ نے اپنی کتاب "ہدایت المخلصین" میں ان کے حالات بہت ہی مبالغہ کے ساتھ درج کئے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے: "بابا علی حضرت محبوب العالمؒ کے حقیقی بھائی ہیں۔ بارہ سال تک مرشد کی تلاش میں ملکوں کی سیاحت کی۔ تین دفعہ حج کو گئے۔ علم فقہ اور حدیث میں کمال رکھتے تھے۔"[1]

یہی پیرزادہ صاحب موصوف گرانمایہ کتاب "ہدایت المخلصین" تصنیف حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ سے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ "بعض مورخ کہتے ہیں کہ مذکورہ کتاب اُن کی تصنیف نہیں ہے بلکہ پرگنہ زینہ گیر کے گاؤں تجر کے بابوں نے پیروں کا وہ فرقہ جنکا نسب سید نہیں اپنی وراثت کے دعوؤں میں بابا علی رینہؒ کا حضرت مخدومؒ کا بھائی قرار دینے کے لئے "ہدایت المخلصین" لکھوا کر حضرت میرؒ کی طرف منسوب کی ہے اور بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کو پیش کی ہے اور قاضی خانؒ[2] نے ان کی طرفداری کر کے بابوں

[1] مطبوعہ اسرار الاخیار صفحہ ۱۸۴ یعنی مطبوعہ تاریخ حسن جلد سوم

[2] قاضی خان کشمیر کے بچھ قبیلہ کے ایک نامور فرد گزرے ہیں۔ آپ نے ملا عبدالرشید زرگر سے علم کے مختلف شعبوں کا اکتساب کر کے اپنے ہمعصروں سے سبقت حاصل کی ہے۔ اپنی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر دربارِ عالمگیری میں رسائی پائی۔ دربارِ شاہی میں علمی مسائل کی تحقیق اور بحث و مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ کچھ مدت کے لئے شہزادہ اعظم کو بھی پڑھاتے رہے اور کچھ وقت کے لئے شاہجہان آباد کے قاضی بھی رہے۔ بنگال میں بھی منصب قضات پر فائز رہے۔ آخر پر اپنی قابلیت و صلاحیت کے طفیل اور اقبال کی یاوری سے سلطنت مغلیہ کے قاضی القضات مقرر ہوئے پھر کچھ مدت کے لئے مغل دربار کی طرف سے ۱۰۴۲ھ میں یہاں کے ڈپٹی گورنر بھی رہے ہیں۔ قارئین کرام کو چاہئے کہ وہ اس آدمی کی پروقار شخصیت اور تقویٰ شعار اورنگ زیب عالم گیر کو مدِ نظر رکھیں اور غور کریں کہ پیرزادہ حسن شاہ اس فیصلہ سے متعلق درج صدر عبارت لکھنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟

کی وراثت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے خدا ہی حقیقت اور اصلیت کو بہتر جانتا ہے۔[1]

فاضل مورخ خواجہ محمد اعظم صاحب دیدہ مری اپنی مطبوعہ تاریخ "واقعات کشمیر" میں حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ سے متعلق لکھتے ہیں کہ "نسخہ ہا در احوال پیران خود دارد کہ بعض مردم آن را محمول بر کمال اغراق و مبالغہ مے دارند والعلم عند اللہ"[2] یعنی ان لوگوں کے اپنے پیروں سے متعلق بہت سے لکھے ہوئے نسخے ہیں کہ بعض لوگ ان کو اغراق و مبالغہ آمیزی سے پُر تصور کرتے ہیں۔ اصلی علم خدا کو ہی ہے۔

فاضل مورخین پیرزادہ حسن شاہ کھویہامی اور خواجہ محمد اعظم صاحب دیدہ مری کے بعد خواجہ غلام محی الدین صاحب امرتسری اپنے تذکرے "تحفۂ محبوبی" میں بیان کرتے ہیں کہ "مخدوم بابا علی رینہؒ قبل اس کے کہ ہم مخدوم بابا علی رینہؒ کا تذکرہ بیان کریں یہ ضروری ہے کہ بطور اظہارِ حقیقت بیان کریں کہ شیخ بابا داؤد خاکیؒ، ابو الفقراء بابا نصیب الدین غازیؒ اور بابا داؤد مشکواتیؒ نے اپنی تصنیف کردہ کتابوں میں بابا علی رینہؒ کا نام تک حوالۂ قلم نہیں کیا ہے لیکن ایک مشہور تاریخ نویس نے اس باب میں لکھا ہے کہ "گویند کہ برادرِ عینی حضرت مخدوم بود و بقول بعض محققین برادرِ فرعی اوست"۔ یعنی کہتے ہیں کہ حضرت مخدومؒ کے حقیقی بھائی تھے لیکن بعض محققین کے کہنے کے مطابق اُن کے فرعی بھائی ہیں۔[3]

یہی خواجہ غلام محی الدین صاحب امرتسری لکھتے ہیں کہ "ہدایت المخلصین" ایک پرانی کتاب بھی دیکھی جسکی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں آپ نے یعنی میر بابا حیدر تلہ مولیؒ نے حضرت مخدومؒ کے حالات اس قدر محبت اور عقیدت سے لکھے ہیں کہ خواجہ محمد اعظم صاحب دیدہ مری کو اپنے تذکرے میں یہ فقرہ لکھنا پڑا کہ "نسخہ ہا در احوال پیرانِ خود دارد کہ بعض مردم آن را محمول بر کمال اعتقاد و اغراق و مبالغہ مے دانند"۔[4] (اس کا ترجمہ اوپر کیا گیا ہے۔)

موصوف امرتسری صاحب پھر لکھتے ہیں کہ "علاوہ اس کے "اسرار الاخیار" تاریخ حسن جلد سوم کے مشہور مصنف نے وجہ تصنیف و مقصد مصنف بیان کر کے لکھا ہے کہ "بعض محققان مے گویند کہ نسخۂ مذکور از کلام الشان نیست" یعنی کہ بعض محقق کہتے ہیں کہ نسخہ مذکور میر صاحبؒ کے کلام سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔[5]

وقتاً فوقتاً شایع کئے گئے ٹریکٹس میں یہاں تک لکھا گیا ہے کہ "مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ

---

[1] مطبوعہ اسرار الاخیار ص ۵۸ یعنی مطبوعہ تاریخ حسن جلد سوم
[2] مطبوعہ تاریخ واقعات کشمیر ص [3] مطبوعہ تحفۂ محبوبی صفحہ ۵۲،۵۳
[4] مطبوعہ تحفۂ محبوبی صفحہ ۴۴ [5] مطبوعہ تحفہ محبوبی صفحہ ۴۴

حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ ؒ کے حقیقی بھائی نہیں تھے کیونکہ حضرت شیخ بابا داود خاکی ؒ، حضرت بابا نصیب الدین غازی ؒ اور حضرت بابا داود مشکواتی ؒ نے اپنی تصنیف کردہ کتابوں میں بابا علی رینہ ؒ کا نام تک بھی حوالۂ قلم نہیں کیا ہے۔"

جہاں تک اس سلسلے میں تحقیقات کرنے کا تعلق ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا بکھیڑا چودھویں صدی ہجری کا ہے۔ کیونکہ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی تاریخ کے بغیر یہ ساری کتابیں اور ٹریکٹس اسی صدی کی تصنیفات ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ٹریکٹ بازوں کو چھوڑ کر فاضل مصنفین نے آنکھیں بند کر کے ایسا مبہم اندازِ بیان اختیار کیا ہے جس سے عوام الناس کیلئے صاف مترشح ہوتا ہے کہ شاید زبدۃ العرفا عمدۃ العلما مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہ ؒ سلطان العارفین محبوب العالم حضرتِ مخدوم شیخ حمزہ ؒ کے حقیقی بھائی نہیں ہیں جب ہم اس معاملے کو بہ نظر غائر دیکھتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ فاضل مصنفین نمایاں طور پر پارٹی بازی کے شکار ہو کر رہے ہیں۔ جسکی وجہ سے اس قسم کا شک و شبہ پیدا کرنے میں حقیقی طور پر یہی ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ واقعات کو لیپ پوت کر اصلیت کو چھپانے کی کوشش کرنا مورخین اور تذکرہ نویسوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اُن کا ایسا کرنا مکمل طور پر انصاف اور علمی تحقیق کے خلاف ہے۔

فاضل مورخ پیر زادہ حسن شاہ نے اپنی تاریخ جلد سوم "اسرار الاخیار" میں کسی بزرگ کے حالات لکھتے وقت لفظ "کہتے ہیں" سے عام طور پر عبارت شروع نہیں کی ہے۔ صرف مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہ ؒ کے حالات لکھتے وقت لفظ "کہتے ہیں" سے عبارت شروع کی ہے۔ اسی طرح تذکرہ نویس خواجہ غلام محی الدین امرتسری نے آپ کا ذکرِ خیر شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " مخدوم بابا علی رینہ ؒ قبل اس کے کہ ہم مخدوم بابا علی رینہ ؒ کا مختصر تذکرہ بیان کریں الخ" یہاں صاف طور پر عیاں ہے کہ یہ مورخانہ اندازِ بیان نہیں ہے۔ انہوں نے مورخانہ اندازِ بیان کو پسِ پشت ڈال کر اس سلسلے میں ایک نرالا اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ فاضل مصنفین کو چاہیئے تھا کہ پہلے بات کو صاف کرتے پھر تحریر میں لاتے۔ زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ فاضل مصنفین نے اپنی عبارات میں لکھا ہے کہ "بقول بعض محققین برادر فرعی اوست" یہاں تو بات محققین کی آئی ہے۔ خدارا بتائے کہ کشمیر میں (اس زمانے میں) اس سلسلے میں کون محقق گزرا ہے؛ کس نے اس سلسلے میں تحقیق کی ہے، اگر ان فاضل مصنفین کے پاس یہ مؤثق بات ہوتی تو یہ ضرور اپنی تحریر کردہ بات کو مدلل اور وزن دار بنانے کے لئے کسی با اعتبار صاحب تحقیق کا حوالہ ضرور دیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں عام طور پر سُنی سُنائی باتوں پر عمل کیا گیا ہے۔ کوئی تحقیقاتی کام کسی نے نہیں کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری سمجھ سے لفظ "فرعی" بالکل بالاتر ہے۔ یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر یہ

لفظ فرعی ٭ کون اصطلاحی نقطہ ہے۔

فاضل مصنف پیرزادہ حسن شاہ لکھتے ہیں کہ میرے زیر مطالعہ خوارق السالکین تاریخ شائق۔ تاریخ باغ سلیمان وغیرہ وغیرہ رہی ہیں ۔[1]

اسی طرح فاضلِ مصنف خواجہ غلام محی الدین امرتسری کا دعویٰ ہے کہ " میرے مطالعہ میں "تذکرۃ العارفین" "تذکرۃ المرشدین" خوارق السالکین۔ باغِ سلیمانی، تاریخ شائق۔ سلطانی منظوم اور وغیرہ وغیرہ رہی ہیں ۔[2]

اگر ان دو فاضل مصنفین نے ان درج صدر کتابوں کا واقعی طور پر مطالعہ کیا ہوتا تو ہرگز زبدۃ العرفا عمدۃ الصلحا حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہ رح سے متعلق یہ مبہمانہ اظہار خیال نہیں فرماتے کیونکہ ان ساری کتابوں میں واضح اور روشن تر صورت میں درج ہے۔ کہ آپ سلطان العارفین محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہ رح کے برادر اکبر ہیں۔ معلوم نہیں کہ ان دو فاضل محققین نے آخر یہ شک آور بات کہاں سے حاصل کی۔ اس مبہم بات کا مخزن ان کے پاس آخر کونسی کتاب ہے۔ میں نے ان ہی درج صدر کتابوں سے مواد حاصل کر کے آپ کے صحیح حالات منصۂ شہود پر لانے کی جسارت کی ہے اور ابتداء ہی میں ان معتبر کتابوں کے حوالہ جات قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

قارئین کرام پر یہ بات واضح رہے کہ زبدۃ العرفا عمدۃ الصلحا مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہ رح ایک عبقری شخصیت کے مالک گزرے ہیں۔ اس میں کوئی بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ معتبر اور مستند مورخین اور تذکرہ نویسوں نے آپ کا ذکر خیر اپنی تصانیف میں مفصل اور نمایاں طور پر کیا ہے آپ

٭ جان ٹی پلیٹس " اے ڈکشنری آف کلاسیکل ہندوستانی" میں "فرع" کے معنی یوں بیان کرتے ہیں:-

A فرع FAR', VULG. FARA (INF. OF فرع 'TO OVERTOP; TO SURPASS) S.F. THE UPPER OR UPPERMOST PART (OF ANY THING); - A BRANCH (OF A TREE OR PLANT) A BOUGH, THE HEAD OF A BRANCH; - A BRANCH, SUBDIVISION; A DERIVATIVE (SYN - SHAKH) ●— (ایڈیٹر)

●

۱۔ مطبوعہ اسرار الاخیار یعنی تاریخ حسن جلد سوم صفحہ ۳

۲۔ مطبوعہ تحفۂ محبوبی ص ۱۰

کا روضہ مبارک موضع تجر شریف پرگنہ زینہ گیر تحصیل سوپور میں مرجع خاص و عام ہے۔ اگر آپ حضرت شیخ بابا عثمانؒ کے فرزندارجمند اور حضرت سلطان العارفین محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے برادر گرامی نہیں ہیں تو آخر آپ کے والد بزرگوار اور بھائی بند کون ہیں!

بفحوائے قرآن حکیم اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝

● ۔ (جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تجھے اپنے فرمان کی خوش خبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا۔ اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائیگا) یہ شرف یہ غیر معمولی پیدائش صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہی حاصل ہوئی ہے یعنی کہ آپ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی وقت کے مفسدوں اور شرپسندوں نے انگلیاں اٹھائیں اور ببانگ بلند یہ الزام ٹھہرایا کہ نعوذ باللہ آپ کا باپ کوئی یوسف نجار تھا۔ یہاں ہمارے کشمیر میں معمولی سے معمولی آدمیوں کے آباؤ اجداد کی وسیع علمیت لوگوں کو ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ اس بڑی معروف و مشہور شخصیت مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ کے والد بزرگوار کا پتہ لوگوں کو نہ ہو۔ اگر آپ حضرت شیخ بابا عثمان رینہؒ کے فرزند ارجمند نہیں ہیں تو اس موضع تجر شریف میں آپ کا مزار پاک کس طرح ہے۔ اس مزار پاک پر عوام نے کس حیثیت میں وہاں ایک عالیشان آستانہ کی تعمیر کی ہے؟ سچ یہ ہے کہ وہاں کے عوام کو اس کی پوری پوری علمیت ہے کہ آپ حضرت شیخ بابا عثمان رینہؒ کے فرزند ارجمند اور سلطان العارفین، محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کے برادر عینی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ ایک بلند پایہ ولی کامل ہیں۔

حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کے برادر عینی ہونے کے ناطے ہی تحصیل سوپور، تحصیل بانڈی پورہ اور تحصیل ہندوارہ وغیرہ کے عوام آپ کی درگاہ عالیہ میں والہانہ طور اور پوری عقیدت مندی سے محبوب العالم شیخ حمزہؒ کے عرس مبارک کی تقریب مناتے ہیں۔ یہاں بھی درگاہ فیض پناہ سلطانی سرینگر کی طرح ماہ صفر المظفر کی گیارہویں تاریخ سے ہی ان ایام متبرکہ میں ختمخوانی، اورادخوانی، نعت خوانی و منقبت خوانی اور درود و اذکار کی مجالس کا اہتمام ہوتا ہے اور اطراف و اکناف سے عقیدت مند ہزاروں کی تعداد میں جوق در جوق ان میں شمولیت کرنے کے لئے آتے ہیں۔ عرس مبارک کے دنوں میں عوام حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کے تبرکات متبرکہ کی زیارت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

فاضل مصنفین پیرزادہ حسن شاہ کھویہامی اور خواجہ غلام محی الدین امرتسری نے یہ تو مان لیا ہے کہ حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ ایک بڑی شخصیت تھے۔ لیکن آپ کے والد بزرگوار کا نام معلوم کرنے میں بڑی

طرح ناکام رہے ہیں۔ جب تک یہ بات تحقیق کرکے صاف نہیں ہو جاتی تب تک تاریخی نکتۂ نظر سے آپ حضرتِ شیخ بابا عثمان رینہؒ سے منسوب ہو سکتے ہیں کیونکہ معتبر مورّخین اور تذکرہ نویسوں نے آپ کو سلطان العارفین محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کا برادرِ عینی قرار دیا ہے۔

فاضل مورّخ پیرزادہ حسن شاہ صاحب نے بیان کیا ہے کہ "لیکن حضرت شیخ بابا داؤد خاکیؒ نے اپنی کتاب میں کسی جگہ بھی ان کا نام لیا ہی نہیں ہے"۔

میں فاضل مصنّف پیرزادہ صاحب موصوف کا کافی احترام کرتا ہوں کہ آپ نے ایک مفصل تاریخ لکھکر ہمارے ملک اور قوم کی بہت خدمت کی ہے۔ اگرچہ کسی کسی جگہ آپ پھسل بھی گئے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت شیخ بابا داؤد خاکیؒ کی "وردالمریدین" مع اسکی شرح "دستورالسالکین" کو سمجھنے میں اُن سے اس حد تک بھول ہوئی ہے کہ یہ کس قسم کی کتاب ہے۔ کیا یہ کوئی تاریخی کتاب ہے؟ کیا اسمیں سلطان العارفین محبوب العالم حضرتِ مخدوم شیخ حمزہؒ کے خاندانی حالات، حالات زندگی یا آپ کے خلفاء کے حالات زندگی درج ہیں؟ موصوف حضرتِ شیخ خاکیؒ نے اس میں آپ کی تاریخ پیدائش یہاں تک کہ تاریخِ انتقال پُر ملال کا ذکر بھی کہیں نہیں کیا ہے۔ پیدائش کے حالات اگرچہ آپ کو دوسروں سے دریافت کرنے تھے لیکن آں حضرتؒ اس دنیائے فانی سے نقل کرنے کے وقت آپ خود بذات وہاں موجود تھے۔ آپ تو اس سے متعلق مفصّل واقعات اپنی اس مذکورہ تصنیف میں حوالۂ قلم کر سکتے تھے کہ مورّخین اور تذکرہ نویسوں کے لیے ایسی باتیں ورطۂ تحریر میں لانا ضروری ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ شاید اس لئے کہ آپ کی یہ تصنیف صرف ایک مدحیہ قصیدہ ہے۔ کوئی تاریخی کتاب نہیں۔ اس میں آپ نے اپنے مرشد بزرگ کے کمالات، کشف و کرامات، اوراد و اذکار اور اُن کی تشریحات کی ہیں البتہ یہ صحیح ہے کہ اس میں آپ نے آں حضرتؒ کے چند خلفاء اور مریدانِ خاص کا نام ضمناً لیا ہے۔ کیونکہ خاص جگہوں پر ان کے نام لینے کی آپ کو ضرورت پڑی ہے۔ مرشد کامل کے کشف و کرامات کا اظہار کرنے کے لئے چند نام لینے پڑے ہیں جیسے ؎

از کمالِ تربیت با خواجہ اسحٰق حلیم
گشتہ ملہم مخبر و مانع زما امر شد است
بارہا مشہودِ ریگو ڈار پُر اخلاص را...
از پے حفظ از عدو در لشکر سوی پر شد است

درروِ تبت بوقتِ برف اندر دیوہ سوی

دستگیر خواجہ زینِ حاجی اکبر شد است

یہ تو صرف کشف و کرامات کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کے حالات زندگی کا آپ نے کوئی تذکرہ نہیں فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ نے قصیدۂ فوایدِ جلالیہ' قصیدہ لامیہ' قصیدہ غسلیہ وغیرہ تحریر فرمائے ہیں۔ وہ بھی کوئی تاریخی تذکرے نہیں بلکہ مدحیہ قصیدے ہیں۔ وردالمریدین میں واضح طور آپ فرماتے ہیں؎

مدحِ شیخان است طاعت زان بہ مولانا بروم

مدحِ پیرِ خویشتن مقصودِ شش دفتر شد است

مدحِ شیخ ایں نظم من وردالمریدین تام یافت

زانکہ وِردش ساختن بر ہر مُرید اَجدر شد است

وردالمریدین حضرت شیخ خاکیؒ نے سنہ ۹۶۱ھ اور سنہ ۹۶۲ھ میں تصنیف فرمائی ہے' جیسا کہ اُس کے سال تاریخ سے ظاہر ہے۔ مرشدی رہبر فیضناک ۹۶۱ھ خواستم تاریخ دیگر از پئے ایں مدحِ شیخ... بعد سالے لفظِ مدحِ شیخ ۹۶۲ھ ہم موٴخر شد است[1]

وردالمریدین کے تصنیف ہونے کے وقت حضرت شیخ خاکیؒ اور حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کے مابین کوئی شناسائی نہیں تھی جیسا کہ حضرت بابا علی رینہؒ اپنی تصنیف کردہ معرکۃ الآرا کتاب "تذکرۃ العارفین" میں رقمطراز ہیں۔ کہ "سفر کے دنوں میں حضرت شیخ خاکیؒ اور مجھ فقیر کی ملاقات شہر ملتان میں ہوئی۔ حضرت شیخ خاکیؒ اور میرے درمیان کسی قسم کی واقفیت نہیں تھی۔ رات کو ہم اکھٹے تھے۔ جب رات کے درمیان میں نے اُن کو طریقہ سہروردیہ میں اوراد و ظائف پڑھتے ہوئے سُنا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ عزیز شاید حضرت مخدوم شیخ حمزہ قؔ کے مُریدوں میں سے ہونگے۔ میں ان کے نزدیک گیا اور اُن سے پوچھا کہ ولایت کشمیر میں اس وقت جناب حضرت مخدوم قؔ بقید حیات ہیں کہ نہیں؛ میں نے اُن کی تصنیف وردالمریدین کا مطالعہ شہر ملتان میں ہی کیا۔ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھ فقیر نے شہر خراسان کی راہ لی اور حضرت شیخ خاکیؒ قطب عالم حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے آستانۂ مبارک کی زیارت کرنے کے لیے چلے گئے۔"[2]

قارئین کرام! یہ بات غور طلب ہے کہ حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ نے "وردالمریدین" کا مطالعہ شہر ملتان میں کیا اور اس وقت تک یہ دونوں حضرات ایک دوسرے سے ناآشنا تھے۔ کسی کا یہ کہنا کہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں حضرت بابا محمد علی رینہؒ کا ذکر نہیں کیا ہے کیا معنی رکھتا ہے۔

[1] خواستم تاریخ دیگر از پئے ایں مدحِ شیخ بعد سالے لفظ مدحِ شیخ ہم موٴخر شد است
مطبوعہ دستور السالکین صفحہ ۳۷۷ (م-۱-۱) [2] مخطوطہ تذکرۃ العارفین صفحہ ۲۹۴' ۲۹۳

حق بات یہ ہے، جیساکہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ "وردالمریدین" اور اسکی شرح "دستورالسالکین حضرت شیخ خاکیؒ کی کوئی تاریخی کتاب یا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک مدحیہ قصیدہ ہے جو کہ آپ نے اپنے مرشد کامل کی تعریف و توصیف میں لکھا ہے۔ البتہ آپ نے اس قسم کا ایک تذکرہ تحریر فرمایا ہے۔ جو کہ آپ کی آخری تصنیف ہے۔ اس میں آپ نے جماعتِ پیر برادران کے حالات و مقامات درج فرمائے ہیں اور کچھ مشایخان کا حال بھی تحریر فرمایا ہے۔ یہ گرانمایہ تذکرہ حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کے قلمِ گوہرفشاں سے ہی کتابت میں آیا ہے۔ اس کا نام رسالہ کمال نامۂ اخوان ہے جیساکہ خود حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ فرماتے ہیں۔ "رسالۂ کمال نامۂ اخوان کہ تصنیف آخر شیخ داؤد خاکیؒ بود۔ دورانِ حالات و مقامات جماعہ مخصوص از پیر برادران است و قدرے از مشایخ دیگر و ارقامِ آن راقم فقیر واسطہ است"[1]

بدقسمتی سے حضرتِ شیخ خاکیؒ کی اس اہم دستاویز کا کہیں وجود نہیں ہے۔ یہ باور کرنے کی کافی گنجائش ہے کہ اس میں ضرور حضرتِ مخدوم بابا محمد علی رینہؒ کے مفصل حالات درج ہونگے۔ کیونکہ مذکورہ کتاب کی کتابت خود حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کے دستِ مبارک سے ہوئی ہے۔

اب پیرزادہ صاحب موصوف کا یہ بیان کہ " البتہ میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ نے اپنی کتاب "ہدایت المخلصین" میں اِن کے حالات بہت ہی مبالغہ کے ساتھ درج کئے ہیں کہ بابا علی رینہؒ حضرت محبوب العالمؒ کے حقیقی بھائی ہیں۔ بارہ سال تک مرشد کی تلاش میں ملکوں کی سیاحت کی۔ تین دفعہ حج کو گئے، علم فقہ اور حدیث میں کمال رکھتے تھے۔ ایک رات حضرتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مخدوم قدس اللہ سرہ کو خواب میں روضۂ مطہرہ میں اکٹھے دیکھا۔ الخ۔

پیرزادہ صاحب موصوف نے اپنی تصنیف "اسرار الاخیار" یعنی تاریخ حسن جلد سیوم مرتب کرنے میں مندرجہ ذیل تصانیف سے استفادہ کیا ہے جیساکہ آپ نے اس کتاب کے صفحہ ۲،۳ پر اظہار فرمایا ہے: " وقایع کشمیر۔ اسرار الابرار۔ واقعات کشمیر۔ فتحاتِ کبرویہ۔ فتحات قادریہ۔ دستورالسالکین۔ خوارق السالکین۔ تاریخ شایق۔ تاریخ باغ سلیمان۔ وقایع نظامیہ۔ تاریخ مولوی ہدایت اللہ متو۔ خمسہ بہاءالدین۔ تحقیقات امیری اور مجموعۂ شیوا۔ یہ بات حیران کن ہے کہ گوشوارۂ کتب میں کہیں بھی "ہدایت المخلصین" کا نام درج نہیں۔ جسکا مطالعہ کرکے موصوف نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "یہ کتاب مبالغہ آمیز ہے۔ یہ حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ کی تصنیف نہیں ہے۔ پیروں نے اپنی وراثت کے دعوؤں میں حضرت شیخ بابا علی رینہؒ کا حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کا بھائی قرار دینے کیلئے

[1] مخطوط تذکرۃ العارفین صفحہ ۳۰۹

اس کو لکھوا کر حضرت میرؒ کی طرف منسوب کیا ہے الخ"

واقعات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ پیرزادہ موصوف نے متذکرہ صدر کتاب "ہدایت المخلصین" دیکھی ہی نہیں ہے۔ حق تو یہ ہے کہ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے برگذیدہ خلفاء میں سے آپ کے سامنے صرف حضرت شیخ خاکیؒ کی "دستور السالکین" رہی ہے معلوم نہیں کہ آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے برگذیدہ خلفاء میں سے حضرتِ مولوی احمد چاگلیؒ، حضرت خواجہ حسن قاریؒ، حضرتِ خواجہ اسحٰق قاریؒ، حضرت خواجہ میرم بزاز سکندرپوریؒ اور خود حضرتِ مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ بھی صاحب تصنیف اصحاب گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں کیا کچھ لکھا ہے۔ آخر "دستور السالکین" میں آپ کو ہدایت المخلصین پر الیسا کیا مبارک پاس کرنے میں کونسی جھلک نظر آئی ہے۔ دستور السالکین ورد المریدین کی شرح ہے جو کہ ایک مدحیہ قصیدہ ہے، جیساکہ سابقہ اوراق میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں کسی کی زندگی کے حالات نہیں ہیں بلکہ کشف و کراماتِ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کا تذکرہ ہے۔ یہاں تک کہ آپ کی زندگی سے چند واقعات کا ذکر ہے۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ اِن برگزیدہ خلفاء کی تصانیف کا مطالعہ کرتے کیونکہ انہوں نے حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کا زمانۂ زندگی پایا تھا۔ انہوں نے سب کچھ اپنی مبارک آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُن کی ہر بات قابلِ اعتبار تھی اُن کی تصانیف کو حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ نے خود اپنی بابرکت ذات سے مشاہدہ فرمایا ہے۔ البتہ پیرزادہ موصوف نے اس سلسلے میں اُن کتابوں کو صحیح اور اہم قرار دیا ہے جو اِن بزرگ خلفاء محبوب العالم کے بہت مدت بعد لکھی گئی ہیں۔ یہ پیرزادہ موصوف ہی نہیں ہیں جن کے پیشِ نظر صرف دستور السالکین رہی ہے بلکہ جس کسی نے حضرتِ محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ سے متعلق کوئی کتاب لکھی ہے یا کوئی تبصرہ کیا ہے۔ وہ صرف اسی دستور السالکین کے احاطے میں محدود ہو کر رہا ہے۔ کسی ایک نے بھی باقی برگذیدہ خلفاء کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔

درج صدر گوشوارہ میں پیرزادہ صاحب موصوف نے معرکتہ الآرا کتاب "تذکرۃ العارفین" کا نام درج نہیں کیا ہے حالانکہ پیرزادہ صاحب موصوف نے اس معرکتہ الآرا کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ جب ہی آپ نے اپنی تصنیف "اسرار الاخیار" تاریخ حسن جلد سیوم کے صفحہ ۵ میں بے ساختہ طرز دلی کا مل حضرتِ بلبل شاہؒ کا ذکر خیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "صاحب "تذکرۃ العارفین" وجہ تسمیہ بلبل شاہ یوں لکھتے ہیں کہ" ایک دن حضرت سید شرف الدینؒ وضو کرنے کے ارادہ سے ایک نہر کے کنارے بیٹھے تھے۔

اور اسی حال میں ایک درخت کی ٹہنی پر ایک خوش آواز بلبل دیکھی جو نہایت میٹھی اور دل کو لبھانے والی آواز میں گا رہی تھی۔ آپ اس بلبل کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ اس نے آسمان کی طرف پرواز کی۔ آپ نے بھی اس کا پیچھا کرنے کے لیے ہوا میں اڑان فرمائی اور اس کو پکڑ کر اپنی کوٹھری میں اُترے۔ یہاں کوٹھری میں بلبل آپ کے مبارک ہاتھ سے غائب ہو گئی۔" حیرانی کا مقام ہے کہ کتاب پڑھکر پیرزادہ صاحب موصوف یہ سمجھ نہ سکے کہ صاحب "تذکرۃ العارفین" (حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ) حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے حقیقی بھائی ہیں کیونکہ مذکورہ کتاب اس بات پر مستند طور پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔

درجِ صدر عبارت پر گہری نظر ڈالکر معلوم ہوتا ہے کہ پیرزادہ صاحب موصوف نے "ہدایت المخلصین" سے متعلق یہ مبالغہ آمیز فقرہ شاید خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی تاریخ سے مستنبط کردیا ہے اور ای ایک مبالغہ آمیز فقرہ کو بڑھاوا دیکر اپنی ایک من چاہی کہانی گھڑلی ہے۔ ورنہ اس معتبر کتاب سے متعلق کسی ایک مورخ نے ایسی مبہم رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ اگر یہ حضرت میر بابا حیدر تلہ مولیؒ کی کتاب نہیں ہے تو پھر کس کی ہے۔ کوئی شخص اپنی کتاب لکھکر دوسرے سے کیوں منسوب کرے۔ آخر اس کتاب میں کونسی بغاوت ہے جسکی پاداش میں اس کو پکڑا جاتا۔ اس معرکتہ الآرا کتاب سے انکار کرنے کی دراصل یہی وجہ ہے کہ اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ حضرتِ مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے عینی برادرِ گرامی ہیں۔ باقی اس میں مبالغہ آمیزی کی کوئی بات نہیں ہے۔ مان لیا کہ یہ حضرت میر بابا حیدر تلہ مولیؒ کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے، کسی غیر نے لکھی ہے مگر یہ بتائے کہ جو ہدایت المخلصین میر صاحب موصوف نے تحریر فرمائی ہے، وہ کہاں ہے؛ کیونکہ میر صاحب موصوف کی اس کتاب سے متعلق حوالے بہت سارے مصنفین نے اپنی اپنی تصنیفات میں دئے ہیں۔ جب تک میر صاحب موصوفؒ کی ناپید "ہدایت المخلصین" بود نہیں ہوتی تب تک ہمارے پاس موجود "ہدایت المخلصین" آپ ہی کی بابرکت ذات سے منسوب ہو کر رہیگی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

حضرت میر صاحب موصوف کی اس گرانمایہ "ہدایت المخلصین" سے متعلق بہت سارے مصنفین نے ہی نہیں بلکہ خود دیگر خلفائے بزرگ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ نے اپنی اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے جیسے حضرتِ میرم بزاز سکندر پوری فرماتے ہیں کہ "جب میں نے ۹۹۷ھ میں تذکرۃ المرشدین لکھنے کی خواہش کی تو مرشدِ کامل حضرتِ محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ مجھے مشاہدہ میں آئے اور فرمایا، جیسا کہ لکھا ہے کہ:

"ناگاہ آنحضرتؒ در مشاہدہ ہویدا شدند، عرض نمودم کہ یا مخدوم۔ غوث الاعظم استدعائے من آنست کہ چیزے در احوالات و مقامات جناب حضرت بیان کنم و دوائے درد فراق و علاج مرضِ خود ہماں یافتم دریں رخصت از شانِ والامکان۔ حضرت دریں وِلا از شفقت و مہربانی آں حضرت جواب دادند کہ مخلص محبّ کیش! آنچہ دیدی ازاں بیش و آنچہ از زبانِ من فہمیدی ازاں بیش نہ نویسی۔ اگر ترا جزایں ہیچ وجہ صبر و شکیبائی دست بدید و آرام و قرار حاصل نہ شود پس آنچہ در تصنیف شیخ داؤدِ خاکیؒ کہ ورد المریدین و میر شیخ حیدر تیلہ مولیؒ کہ کتاب ہدایت المخلصین تالیف نمودہ و آنچہ در نسخہ جات خواجہ حسن قاریؒ و خواجہ اسحٰق قاریؒ و شیخ احمد چاگلیؒ و مخدوم شیخ بابا محمد علی ریناؒ دیدہ و مطالعہ کردہ باشی مکرّر در نسخہ خود خواہی آورد۔[1]"

● ــــ (اچانک حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ مشاہدہ میں ظاہر ہوئے۔ میں نے اُن سے عرض کی یا مخدوم یا غوث الاعظم! میری یہ استدعا ہے کہ میں آپ کے کچھ حالات و مقامات لکھوں تاکہ میرے درجہ فراق کی دوا اور میرے مرض کا علاج ہو جائے۔ اس سلسلے میں اجازت بخشدیں۔ آپ نے شفقت و مہربانی سے جواب میں فرمایا۔ اے محب کیش مخلص! جو کچھ دیکھا ہے اور جو کچھ میری زبان سے سمجھا ہے اس سے زیادہ کچھ نہ لکھوگے۔ اگر اس سے صبر و قرار اور آرام و اطمینان میسر نہ ہو تو جو کچھ حضرت شیخ داؤد خاکیؒ کی تصنیف "ورد المریدین" اور میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ کی کتاب "ہدایت المخلصین" میں لکھا گیا ہے اور جو کچھ خواجہ حسن قاریؒ، خواجہ اسحٰق قاریؒ، خواجہ شیخ احمد چاگلیؒ اور مخدوم شیخ بابا محمد علی ریناؒ کے نسخہ جات میں دیکھا اور مطالعہ کیا ہو اس کا دوبارہ اپنے نسخہ میں بیان کرو۔)

یاد رہے کہ صرف یہی ایک نسخہ ہے جو حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے اس دنیائے فانی سے نقل فرمانے کے بارہ سال بعد ۹۹۶ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کی مبارک زندگی میں موصوف میرم بزاز سکندر پوریؒ نے نظم و نثر کی کتابیں لکھی ہیں جن کا کہیں وجود نہیں البتہ آپ کی ایک سی غزلی محکمۂ تحقیقات گورنمنٹ جموں و کشمیر میں موجود ہے۔ باقی سب برگزیدہ خلفاء کے نسخہ جات حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ ہی کی حیات طیبہ میں تصنیف ہوئے ہیں۔ صرف حضرت شیخ بابا محمد علی ریناؒ کی معرکۃ الآرا کتاب "تذکرۃ العارفین" اُس وقت

[1] مخطوط تذکرۃ المرشدین ص ۵۲

منتشر صورت میں تھی۔ اس کو بعد میں آپ نے مرتب فرمایا ہے۔ جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں: "بعد نقل حضرت محبوب العالمؒ مخدوم شاہ محمد صفا در کشمیر تشریف فرما شدند احقر دراں زماں ایں نسخہ کہ منتشر بود فراہم خواہیدم کرد۔"

● ـــ (حضرت محبوب العالمؒ کے نقل فرمانے کے بعد مخدوم شاہ محمد صفا کشمیر میں تشریف فرما ہوئے۔ اُس وقت بندہ احقر اس نسخہ کو، جو کہ منتشر صورت میں تھا، ترتیب دیکر کتابی صورت دے رہا تھا) [1]

مرشد برحق حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ نے اپنے سب برگزیدہ خلفاء کی تصانیف کا خود اپنی بابرکت ذات سے مشاہدہ فرمایا ہے۔ یہ ساری تصانیف ہمارے پاس معتبر اور مصدق ہیں۔ کیونکہ آنحضرتؒ نے حضرت میرم بزاز کو مشاہدہ میں ان خلفاء کے نسخہ جات کو پیش نظر رکھکر اپنی کتاب "تذکرۃ المرشدین" تصنیف کرنے کی تاکید و تلقین فرمائی ہے۔ خاص کر حضرت بابا داوٗد خاکیؒ کی "ورد المریدین" اور حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ کی "ہدایت المخلصین" کا ذکر نام لیکر فرمایا ہے۔

اسی طرح اس گرانمایہ کتاب "ہدایت المخلصین" سے متعلق مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ کو یہ کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا تو حضرتِ سلطان العارفینؒ نے آپ کو فرمایا "یا مخدوم! از ماہایاں ذکرے و مراقبہ دراں جمع کنید۔"

● ـــ (یا مخدوم! اس میں ہمارا تھوڑا ذکر اور مراقبہ بھی درج کریں۔) [2]

دوسری جگہ پھر یہی مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ اس کتاب مذکور سے متعلق تحریر فرماتے ہیں: "بداں کہ اذکار و افکار دریں رسالہ نیاوردم و اختصار بایں چند ذکر نیا براں کردم کہ اکثر اذکار و افکار و مراقبات و اشغال در "ہدایت المخلصین" بودہ۔ چوں موقوف علیہ آں ہا در سلوک المراقبات تحریر یافتہ موقوف علیہ ایں اذکار نیز دراں مذکور است [3]۔"

● ـــ (معلوم رہے کہ میں نے اس رسالہ میں اذکار و افکار کو درج نہیں کیا صرف چند اذکار بیان کئے۔ ایسا اس وجہ سے کیا کیونکہ اکثر اذکار و افکار اور مراقبات و اشغال سے متعلق ذکر "ہدایت المخلصین" میں ہوا تھا۔ ان اذکار و افکار سے متعلق ذکر حضرت میر صاحب موصوفؒ نے "سلوک المراقبات" میں بھی بیان فرمایا ہے۔)

---

[1] مخطوطہ تذکرۃ العارفین ص ۱۱۲ [2] مخطوطہ تذکرۃ العارفین ص ۲۷

[3] مخطوطہ تذکرۃ العارفین صفحہ ۴۷،۲

"سلوک المراقبات" حضرت میر بابا حیدر صاحب تیلہ مولیؒ کی ایک دوسری گرانمایہ کتاب ہے اس میں اذکار داؤراد اور مراقبات کا مفصل ذکر ہے۔ بدقسمتی سے اس کا بھی کہیں نام ونشان نہیں۔ اب اگر حضرت موصوف کی یہ "ہدایت المخلصین" اس وقت ہمارے پاس محفوظ ہے تو یہ ہمارے پاس ایک بیش قابل احترام تبرک ہے۔

اس گرانمایہ کتاب "ہدایت المخلصین" پر آج تک کسی ایک نے تحقیق نہیں کی ہے تاکہ ہمیں یہ پتہ چلتا کہ آخر فاضل مورخ پیرزادہ حسن شاہ کے قول میں کہاں تک صداقت ہے کہ کیا یہ اصل ہے یا فرع لہذا اس وقت جو "ہدایت المخلصین" ہمارے پاس دستیاب ہے ہم ببانگ بلند دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہی وہ "ہدایت المخلصین" ہے جو حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ نے تخفیف فرمائی ہے۔ عقل سلیم رکھنے والا کوئی بھی شخص یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ یہ کسی نے میر صاحب موصوف سے منسوب کرکے وراثتی دعویٰ میں حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کا حضرت مخدوم شیخ حمزہ قاؒ کا بھائی قرار دینے کے لیے لکھی ہے۔ یہ من گھڑت کہانی ایک اختراع ہے۔ کسی بھی ایک مورخ یا تذکرہ نویس نے ایسا نہیں لکھا ہے کہ مذکورہ کتاب "ہدایت المخلصین" حضرت میر صاحب موصوف کی نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا ہے کہ جس نے یہ اظہار کیا ہے کہ حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ قاؒ کے برادر گرامی نہیں ہیں۔

اب دوسرے فاضل مورخ خواجہ محمد اعظم صاحب دیدہ مری کے بیان کو لیکر چند ایک باتیں کرنے کی جسارت کروں گا۔ ان کی تاریخ کو لوگ مستند نظروں سے دیکھتے ہیں اور مجھے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہو اکسی جگہ بہک بھی گئے ہوں! "ہدایت المخلصین" مصنفہ حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ پر شاید آپ ہی نے پہلے پہل یہ خامہ فرسائی کی ہے کہ "نسخہ ہا در احوال پیران خود دارد کہ بعض مردم آں را محمول برکمال اعتقاد و اغراق و مبالغہ سے دارند"۔ ویسے تو فاضل مورخ نے میر صاحب موصوفؒ کے ہی نسخے پر یہ تنقید فرمائی ہے۔ یا شاید حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ قاؒ کے سارے خلفاء کے نسخہ جات پر ایسا ریمارک پاس کیا ہے۔ فاضل موصوف نے "ہدایت المخلصین" کا نام نہیں لیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خامہ فرسائی "ہدایت المخلصین" پر ہی نہ ہو بلکہ سب نسخہ جات پر ہو۔ فاضل موصوف نے اپنے اس جملے میں بعض "مردم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ موصوف کو چاہیے تھا کہ اس بعض مردم لفظ کو استعمال کرکے مثال کے طور پر چند نام پیش کرتے تاکہ ہمیں معلوم ہو جاتا کہ یہ بعض "مردم" کون ہیں۔ اس لفظ بعض میں سارے علماء، فضلاء، مورخین اور تذکرہ نویسوں کی سندات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ کسی ایک کا نام بھی

ہمارے تعارف کرانے کے لیے بطورِ حوالہ نہیں دیا گیا ہے ۔ اس لفظِ بعض میں تمام سما نہیں سکتا بلکہ تمام میں بعض سما سکتا ہے ۔ اگر اس لفظ بعض میں کوئی ایک صاحب بھی معتبر ہوتا تو موصوف ضرور اُس کا حوالہ دیتے کیونکہ ایسا کرنے سے آپ کی بات کی تصدیق ہو جاتی ۔ لفظ بعض استعمال کرنے سے ہی موصوف کی رائے اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے کیونکہ ایک مورّخ اور مصنّف کے لئے ضروری بن جاتا ہے کہ ایسی بات کو ثابت کرنے کیلئے سندات پیش کرے ۔ کبھی بھی مشتبہ صورت میں بات کو پیش کرنے کی جسارت نہ کرے ۔ اب اگر اسکی ذاتی رائے ہو تو اس کو چاہیئے کہ لفظ "بعض" استعمال کر کے دوسرے لوگوں کو اس سلسلے میں اُچھالنے کی بیجا کوشش نہ کرے ۔ بہر حال یہ صاف عیاں ہے کہ خود خواجہ صاحب دیدہ مری کی نظر میں لفظ "بعض" کا کوئی وزن نہیں ہے ۔ یہ بھی شکر کی بات ہے کہ خواجہ صاحب موصوف نے اپنی تاریخ میں ایسا اظہار نہیں فرمایا ہے کہ مذکورہ کتاب "ہدایت المخلصین" حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولیؒ کی نہیں ہے ۔

جب ہم دور تک نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انہی خواجہ محمد اعظم صاحب دیدہ مری کے ظاہری طور "بے ضرر" اور معصوم سے فقرے کا ناجایز فایدہ اٹھا کر فاضل مورخ پیرزادہ حسن شاہ نے اپنی مبہمانہ رائے ظاہر کی ہے ۔ اگر خواجہ صاحب موصوف نے حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ قدس کے دیگر مصنّفین خلفائے بزرگ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہوتا تو آپ اس کتاب "ہدایت المخلصین" پر اس قسم کا ریمارک پاس نہیں کرتے کیونکہ ان ساری تصانیف کا نفسِ مضمون اور طرز بیان ایک جیسا ہے ۔ ان ساری تصانیف میں حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ قدس کے کشف و کرامات اور کمالات کا تذکرہ ہے ۔ اگر "ہدایت المخلصین" پر اس قسم کی تنقید کی گئی ہے تو باقی خلفاء کی تصانیف پر بھی ایسا ہی کیا جانا چاہیئے تھا ۔ خواجہ صاحب موصوف اس واقعہ سے بے خبر ہیں کہ یہ کتابیں تصنیف کرنے کے لئے حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ ہی نے اپنے ان بزرگ خلفاء کو تلقین فرمائی ہے ۔ یہ ساری کی ساری تصانیف آنحضرت قدس کی کیمیا اثر نظروں سے گزری ہیں اور آپ کی مقدس ذات سے تصدیق شدہ ہیں ۔ ان تصانیف کو حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے بھی معتبر مانا ہے ۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں "در بعضی نسخۂ معتبر کہ رتبہ ابدالی و سیاحیش نوشتہ شدہ آن ہم راست است" ؎

اصل بات یہ ہے کہ کچھ لوگ اولیاء اللہ کے کشف و کرامات اور کمالات کے قائل نہیں ہوتے جیسا کہ حضرت شیخ خاکیؒ فرماتے ہیں ؎

؎ دستور السالکین صفحہ ۲۳۳

منکر ار باور ندارد ایں کرامت دور نیست

کے بوجہل سیہ دل معجزہ باور شد است

علم با نااہل گفتن تخم ضایع کردن است

در زمین شورہ کزوی فی امید برشد است

● — (منکرین اگر مرشد کامل مخدوم شیخ حمزہ ق کی کراموں اور امورِ خرقِ عادات کے صدور سے انکار کرتے ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ سیاہ دل ابوجہل نے بھی پیغمبر برحق ؐ کے معجزاتِ عظیمہ قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ نااہلوں کو علم و ادب سے روشناس کرنا حقیقت علم کے بیج کو ہی ضایع کرنا ہے کیونکہ بنجر زمین سے کوئی میوہ حاصل ہونے کی امید نہیں ہے)

حضرت شیخ خاکیؒ فرماتے ہیں کہ " اگر میں اپنے مرشدِ کامل حضرتِ محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ ق کے ان سارے کشف و کرامات اور کمالات کا ذکر کروں جن کا میں نے خود بذات مشاہدہ کیا ہے تو عوام کو یقین نہیں آئیگا۔ اس لئے بالکل اختصار سے کام لینے پر مجبور ہوں۔ جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

من کجا شرحِ کرامات و مقامات از کجا

باز در نظم قصیدہ کا ضیق و اخصر شد است

● — (میں کہاں اور مرشد کامل کی کرامات و مقامات کہاں؛ اور پھر ان کی پوری تشریح قصیدہ کی نظم میں۔ جس کا دامن وسعت میں نثر کی صنف سے بالکل تنگ اور مختصر ہے۔

" جزئیات ایں نوع کرامات کہ فقیر خود از ذات بابرکاتِ آنحضرت مدظلہ مشاہدہ نمودم ایں کتاب گنجایشِ آن ندارد میخواستم کہ جزئے چند بقدر مثال بنویسم۔"[1]

● — (اس قسم کی کرامات کے جزئیات جو کہ مجھ فقیر نے آنحضرت مدظلہ کی بابرکت ذات سے صادر ہوتے دیکھے ہیں اس کتاب میں ان کے درج ہونے کی گنجایش نہیں۔ میں نے اس پر اکتفا کیا کہ چند جزء بطورِ مثال پیش کئے۔)

حضرت شیخ خاکیؒ پھر اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ :۔

" ایں بیت مقبول قول ناظم دلالت کنندہ است بر اقرار بعجز در شرح کرامات و

---

[1] مطبوعہ دستور السالکین ص ۲۰۹

مقامات آنحضرت زید حالتہ و مشیر است بداں کہ آنچہ ایں جا باجمال ذکر کردہ شدہ ہمچو نمونہ ایست از بعضے کرامات و مقامات چنانچہ نوبتی در مقامِ شکرگزاری فرمودہ اند کہ مرا از عنایتِ حق تعالیٰ حالتی و مرتبہ ایست کہ ذکر ایں چنیں اوصاف عار است نسبت باآں رتبہ امّا از آنرو کہ ایں مخلص بحوصلۂ خود اظہار اخلاص کردہ است و ایں قصیدۂ او مشتمل بر مسائلِ لابدیہ اہلِ سلوک افتادہ من آں را پسند کردہ ام و الّا احدے کہ باشد کہ احاطہ باوصاف و اسرارِ من تواند کرد"[1]

● — (آنحضرتؒ کی کرامات و مقامات کی تشریح کرنے کی عاجزی و انکساری میں یہ بیت مجھ ناظم کی مقبولیت پر دلالت کرتی ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ اس جگہ مختصر طور پر بیان کیا گیا وہ آنحضرتؒ کی کرامات و مقامات کا تھوڑا سا نمونہ ہے۔ ایک دفعہ آنحضرتؒ نے اِن کرامات و مقامات کی نعمت حاصل ہونے کے سلسلے میں خداوند کریم کا شکر گزار ہوتے ہوئے فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ کی عنایات اور مہربانیوں سے ایسا مرتبہ حاصل ہے کہ یہ اوصاف اُس رتبہ کی نسبت میں ننگ ہیں۔ لیکن اس وجہ سے کہ اس مخلص نے اپنے حوصلے کے مطابق اپنے اخلاص کا مظاہرہ کیا ہے اور اس کا یہ قصیدہ اہلِ سلوک کے اہم مسایل پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کو پسند کیا ہے۔ ورنہ یہ کس کی مجال ہے کہ میرے اوصاف و اسرار کا احاطہ کر سکے۔"

اس سلسلے میں حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے ایک برگزیدہ خلیفہ حضرت خواجہ اسحٰق قاریؒ فرماتے ہیں:۔

"چوں شیخ خاکیؒ وردالمریدین تصنیف ساختہ بفقیر نمود۔ در ہر نقطے آں دلیل بسیار از مشایخ و اصحاب اتباع آوردہ مدلل گردانیدہ۔ گفتم کہ یا شیخ! ایں ہمہ چہ احتیاج بود کہ کتاب خود را از دلایل پُر کردید۔ جواب باصواب فرمودند کہ اے برادر! چوں نبیؑ را انکار آوردند تا بشیخ ما چہ رسد۔ لہٰذا دلیل آوردم کہ بچند زبان جواب یک منکر بگویم و آنکہ از احوالِ پیرِ خود آوردم و مفصل نہ کردم۔ در ہر متی بر کمالیت آنحضرت۔ اشرد ہائے بے شمار کردم و اکتفا بر ہماں اجمال

[1] مطبوعہ دستور السالکین ص ۲۱۰

نمودیم کہ مردم ناموافق در عالم ہستند و حاسدان بسیار کہ آں ہا از شنیدن ایں قدر گرم میشوند و از دیدن ہمیں یک سخن کور میگردند لہٰذا بیانِ اصل حالِ آنحضرت قدس نکردیم۔ پس فقیر حقیر کہ از خدمت الیشان اجازت یافتم و بگفتن و ترتیب دادن ایں نسخہ متابعت بر قول الیشان کردہ بیانِ جزوے از کلہم آوردم۔ شہ "

• ۔۔ (جب شیخ خاکیؒ نے "وردالمریدین" لکھکر مجھے دکھائی تو انہوں نے ہر نقل کی ہر بات کو شاگردوں اور اصحاب تابعین کی بسیار دلیلوں سے مدلل بنا دیا تھا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ اے شیخ! اسکی کیا ضرورت تھی کہ آپ نے اپنی کتاب کو اس قدر دلایل سے بھر دیا ہے؟ آپ نے اس کے جواب باصواب میں فرمایا کہ اے برادر! جب نبی برحقؐ سے انکار کیا گیا تو ہمارے مرشدِ برحق قدس سے کیا کیا جائیگا۔ لہٰذا میں نے دلایل پیش کیں۔ تاکہ ایک منکر کو چند لوگوں کی زبان سے جواب دوں۔ میں نے اپنے مرشدِ برحق سے متعلق تھوڑا لکھا تفصیل سے بیان نہیں کیا۔ ہر بیت میں آنحضر قدس کی کمالیت پر کافی احتیاط سے کام لیا اور اتنے پر ہی اکتفا کیا کیونکہ دنیا میں ناموافق لوگ ہیں اور حسد کرنے والے بے شمار ہیں۔ وہ اتنا ہی سُنکر گرم ہو جائینگے اور اس ایک ہی بات کو دیکھکر اندھے ہو جائینگے۔ لہٰذا آنحضرت قدس کا اصلی حال بیان نہیں کیا۔ پس فقیر حقیر نے شیخ خاکیؒ سے رخصت حاصل کی اور اس اپنے نسخے کو بیان کرنے اور ترتیب دینے میں اُن کے قولِ برحق کی متابعت کی، یہاں تک کہ کلہم میں سے جزوی طور بیان کیا۔)

بہر حال دونوں فاضل مورخین خواجہ محمد اعظم صاحب دیدہ مری اور پیرزادہ حسن شاہ صاحب کھویہامی اپنی یہ ذاتی رائے شد و مد سے ظاہر کر کے اس گرانمایہ کتاب "ہدایت المخلصین" پر آخر میں بے ساختہ طور یہ لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ خدا ہی اصلیت اور حقیقت کو بہتر جانتا ہے۔" والعلم عنداللہ" جو اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں حضرات کو خود یقین نہیں۔ اگر اس کی علمیت ہو کر یہ بات ان کو تصدیق ہو جاتی تو ہر گز خداوند کریم کے حوالے نہ کر دیتے۔ صاف عیاں ہے کہ آخر میں دونوں نے اپنی رائے سے فرار کیا ہے۔

اب رہے فاضل مصنف خواجہ غلام نبی الدین امرتسری اور دوسرے ٹریکٹ باز۔ ان سبوں

شہ مخطوط حلیۃ العارفین صفحہ ۵۶

نے ان ہی دو فاضل مورخین — خواجہ محمد اعظم صاحب دیدہ مری اور پیرزادہ حسن شاہ صاحب کھویہامی کے مبہم اور مشتبہ حوالے پر تکیہ کیا ہے اور جو جی میں آیا لکھتے رہے۔ اگر یہ حضرات اس سلسلے میں باضابطہ تحقیق کرتے اور اصلی معاملہ کو سمجھتے تو انہیں پتہ چلتا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں!

فاضل مصنف خواجہ غلام محی الدین صاحب امرتسری نے اپنے تصنیف کردہ تذکرے میں اظہار کیا ہے کہ "میں نے تذکرۃ العارفین" "تذکرۃ المرشدین" "خوارق السالکین"۔ باغ [illegible] تاریخ شائق۔ سلطانی منظوم کا استفادہ کرکے اپنے تذکرے کو ترتیب دیا ہے[1]۔"

درج صدر کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ "قبل اس کے کہ ہم مخدوم بابا علی رینہؒ کا مختصر تذکرہ بیان کریں یہ ضروری ہے کہ بطور اظہار حقیقت یہ بیان کریں کہ شیخ داؤد خاکیؒ ابو الفقرا بابا نصیب الدین غازیؒ اور بابا داؤد مشکواتی نے اپنی تصنیف کردہ کتابوں میں بابا علی رینہؒ کا نام تک بھی حوالہ قلم نہیں کیا ہے لیکن ایک مشہور تاریخ نویس نے اس باب میں لکھا ہے کہ "گویند برادر عینی مخدوم بود و بقول بعض محققین برادر فرعی اوست۔"

فاضل مصنف کا ایسا اظہار کرنا کہاں تک صحیح ہے کہ اس نے درج صدر کتابوں کا مطالعہ [illegible] جبکہ ان ساری تصانیف میں روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مخدوم حضرت شیخ بابا علی رینہ [illegible] محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے برادر عینی ہیں۔ خود حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کی اپنی تصنیف کردہ [illegible] کتاب "تذکرۃ العارفین" بزبان حال بتا رہی ہے کہ موصوف حضرت شیخ حمزہؒ کے برادر عینی ہیں۔ [illegible]

"العبد الضعیف الفقیر الحنیف علی ابن عثمان کشمیری ساکن الاصل قریۂ تجر کو مولد و وطن این غریب [illegible] قدیم موصوف بہ رینہ کہ در کشمیر آنرا بحسب و نسب مخصوص دارند و برادر حقیقی این حقیر کہ مرشد کامل [illegible] زمانہ و زمانیاں است و غوث الاعظم و قطب العالم سلطان العارفین است[2]۔"

● — (بندۂ ضعیف فقیر نحیف علی ابن عثمان کشمیری تجرؒ کے گاؤں کا رہنے والا ہے جو کہ اس غریب کی جائے پیدائش اور وطن ہے۔ مخصوص طور حسبی اور نسبی ذات رینہ سے کشمیر میں مشہور و معروف ہے۔ اس فقیر حقیر کا مرشد کامل اپنا حقیقی بھائی ہے۔ وہ زمانہ اور زمانہ کے لوگوں کے بھی مرشد کامل ہیں۔ وہ غوث الاعظم قطب العالم۔ سلطان العارفین ہیں۔)

دوسری ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "موصوف حضرت مخدوم کے برادر عینی ہیں، خلیفہ ہیں اور وارث

---

[1] مطبوعہ تحفۂ محبوبی صفحہ ۱۰۸ [2] مخطوطہ تذکرۃ العارفین ع

جائز ہیں۔ عبارت اس طرح ہے کہ "چوں فقیر از سفر آمدہ در خدمت حضرت مخدوم قدس رسیدم باعزاز و اکرامم درآوردند و چند کس را کہ ما را با آن ہا از قدیم محبتے بود فرمائش استقبال نمودند۔ در خدمت مخدوم مشرف شدم۔ وقتِ مشرف شدن در کنار آوردند و بہ تشریف معرفت در ہماں زماں معززم ساختند تا در خدمتِ مخدوم قدس بودم بہ ہیچ کس نے گفتم کہ من برادر آن حضرتم چہ شائستگی آں نداشتم کہ برادر میخوانندم حتیٰ کہ در لبہا ہنگام مریدانِ نورس از سایہ خادمان ماوائے دانستند تا بحدے کہ خلافت بمن عطیہ داشتند و فرمودند کہ ترا خلیفہ ے ساختم یعنی تا زندہ باشی خلیفہ منی و مریدان را بگیر تار حضرتِ مجاز و الفاظ من نباشد خلافتِ تو بر دیگرے نفوذ نباشد[1]۔"

● — (جب یہ فقیر سفر سے آیا اور حضرت مخدوم قدس کی خدمت بابرکت میں پہنچا۔ مجھے عزت و احترام سے لایا گیا اور حضرتِ موصوف نے چند ایک کو جن کے ساتھ میری قدیمی محبت تھی میرا استقبال کرنے کی فرمائش کی۔ جب میں نے حضرت مخدوم رح کی خدمت کا شرف حاصل کیا تو اُس وقت آپ نے مجھے گود میں لیا اور اسی وقت مجھے علم معرفت سے مشرف فرمایا۔ جب تک میں حضرت مخدوم رح کی خدمت بابرکت میں تھا، میں نے کسی ایک پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں آنحضرت قدس کا بھائی ہوں، کیونکہ مجھ میں ایسا کہنے کی شائستگی ہی نہیں تھی کہ بھائی کیوں یہاں تک کہ نئے نئے مریدوں نے بہت دفعہ مجھے خادموں میں سے ہی شمار کیا۔ وقت آ پہنچا کہ حضرت موصوف قدس نے مجھے خلافت عطا فرمائی اور فرمایا کہ تجھے میں نے خلیفہ بنا دیا۔ بیشک زندہ رہو گے میرے خلیفے ہو اور مریدوں کو لے لو۔ جب تک میرا حکم اور اجازت نہ ہو تمہاری خلافت کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو کر رہیگی۔)

اس معرکتہ الآرا کتاب (تذکرۃ العارفین) کا ایک ایک لفظ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت شیخ بابا محمد علی رینہ رح حضرت محبوب العالم قدس کے برادر عینی ہیں۔ پوچھا سکتا ہے کہ کیا یہ کتاب بھی حضرت مخدوم بابا محمد علی رینہ رح کی اولاد و احفاد کو حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ قدس کا وارث جائز بنانے کے لیے کسی نے جعلی طور پر تصنیف کی ہے۔ بقولِ شر پسندوں اور معتقدوں کے اگر حضرت میر بابا حیدر تیلہ مولی رح کی گرانمایہ کتاب "ہدایت المخلصین" کسی اور کی لکھی ہوئی ہے تو اس معرکتہ الآرا کتاب

---

[1] مخطوطہ تذکرۃ العارفین ص ۲۴۴

"تذکرۃ العارفین" سے متعلق اُن کا کیا فتویٰ ہے ؟ اس میں ایک تو صاف صاف آئینے کی طرح حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ قؒ کے برادر عینی نظر آرہے ہیں۔ ہمارے خیال میں معترضین کی اس گوہر گرانمایہ پر نظر نہیں پڑی ہے ورنہ وہ اس کو صدف میں بند کر کے کسی سمندر کی تہہ میں دبا کر رکھ دیتے۔ واضح رہے کہ یہ معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کرنے کے لیے حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کو حضرت سرورِ کائنات فخر موجودات نبی برحقؐ نے مشاہدہ میں ارشاد فرمایا ہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں :-

"حضور سرورِ عالمؐ بر سر احقر نوازش فرمودند طلب داشتہ در پیش گاہِ اشرف مشرف ساختہ فرمودند کہ اے شیخ علی رینہؒ از آنچہ در عالم سفر مشاہدہ کردی قدرے ازاں و چندے از مرشدِ ثقلین خود یعنی مخدوم شیخ حمزہ قؒ بنویسی[1]"

● — (حضور سرورِ عالمؐ نے مجھ بندۂ احقر پر نوازش فرمائی۔ بلا کر اپنی ذاتِ بابرکت کے دیدار سے مشرف کر کے فرمایا کہ "اے شیخ علی رینہ! عالم کا سفر کر کے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اُس میں سے تھوڑا اور کچھ اپنے مُرشدِ ثقلین یعنی مخدوم شیخ حمزہ قؒ سے متعلق لکھو)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک طرف موصوف خواجہ صاحب امرتسری بیان فرماتے ہیں کہ میں نے "تذکرۃ العارفین" سے "تحفۂ محبوبی" لکھتے وقت استفادہ کیا ہے اور دوسری طرف اس معرکۃ الآرا کتاب کے مصنف باوقار کے حالات لکھتے وقت یوں رقمطراز ہیں کہ "کہتے ہیں کہ "تذکرۃ العارفین" آپ کی تصنیف ہے جس میں حضرت مخدوم کے حالات مذکور ہیں۔" اندازہ کیجیے کہ دعویٰ کیا ہے ؛ کتاب مذکور سے استفادہ کیا ہے لیکن افسوس یہ نہیں سمجھ سکے کہ اس کے مصنف نامی گرامی کون ہیں!

حضرت خواجہ اسحٰق قاریؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ قؒ کے بزرگ خلفا میں سے ایک اور صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی بلند پایہ تصنیف "چلچلۃ العارفین" ہے۔ ذرا اس کا مطالعہ فرمائیے۔ اس میں بھی بوضاحت درج ہے کہ حضرتِ مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ قؒ کے عینی برادر ہیں۔ مذکورہ کتاب کے چند ایک اقتباسات قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لیے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت خواجہ موصوف فرماتے ہیں کہ "مخدوم شیخ علی رینہؒ کہ برادر عینی حضرت مخدوم قؒ است

---

[1] مخطوطہ تذکرۃ العارفین صفحہ ۲۹۹

سہ بار حج اکبر نمودہ و در ہر بارے کسے را اطلاع نگزاشتہ الّا بچند کس آن صاحب باطن بودند۔ خوارق و عادات و کشف و کرامات و عالی درجاتِ ایشان بسیار است[۱]۔"

● ۔۔ (مخدوم شیخ علی ریـنہؒ جو کہ حضرت مخدومؒ کے برادر عینی ہیں تین بار حج اکبر سے سرفراز ہوئے اور آپ نے ہر بار بغیر چند صاحب باطن لوگوں کے کسی ایک کو اس کی اطلاع نہ دی۔ آپ کے خرقِ عادات، کشف و کرامات اور درجاتِ عالی بسیار ہیں)۔

دوسری جگہ حضرت موصوف فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے رات کو ایک غیر معمولی واقعہ دیکھا تو "در خاطر آوردم کہ حقیقت شب بعرضِ پیر دستگیر رسانم۔ پیر بعد از اوراد بجانب برادر عینی خویش مخدوم شیخ محمد علی ریـنہؒ اشارت فرمود کہ حضرت مشکوٰۃ بیار۔ وے مشکوٰۃ آوردہ در پیش حضرتِ سلطان العارفینؒ حاضر نمود"[۲]۔

● ۔۔ (ایک دفعہ میں نے رات کو ایک غیر معمولی واقعہ دیکھا تو میں نے دل میں خیال کیا کہ رات کی یہ حقیقت اپنے پیر دستگیر کے مبارک کانوں تک پہنچا دوں۔ پیر بزرگ نے اوراد کے پڑھنے کے بعد اپنے برادر عینی مخدوم شیخ محمد علی ریـنہؒ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ مشکوٰۃ شریف لے آو۔ انہوں نے مشکوٰۃ شریف لاکر حضرتِ سلطان العارفینؒ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر کی)۔

تیسری ایک جگہ حضرت موصوف فرماتے ہیں، کہ "فقیر حقیر پارۂ از علوم احادیث بخدمت مخدوم الانامی و مرشدِ آفاقی شیخنا شیخ الاسلام مخدوم شیخ محمد علی ریـنہؒ کہ برادر عینی حضرت مخدوم الییت تحصیل نمودہ"[۳]۔

● ۔۔ (فقیر حقیر نے علوم احادیث کا کچھ حصہ مخدوم الانامی مرشدِ آفاقی شیخنا شیخ الاسلام مخدوم شیخ محمد علی ریـنہؒ، جو کہ حضرتِ مخدومؒ کے برادر عینی ہیں، حاصل کیا۔)

چوتھی جگہ فرماتے ہیں: "روزے بخدمت مخدومؒ بودم با جمیع از اصحاب کبار یعنی خاکیؒ، بابا ہردی ریشیؒ، خواجہ حسن قاریؒ، شیخ احمد چاگلیؒ، رُوپی ریشیؒ و زبدۃ العرفا خدمت شیخ بابا محمد علی ریـنہؒ کہ وے برادر عینی حضرت مخدوم میبت[۴]"

---

۱ مخطوط چلچلۃ العارفین صفحہ ۱۲۲ ۲ مخطوط چلچلۃ العارفین صفحہ ۴
۳ مخطوط چلچلۃ العارفین صفحہ ۶ ۴ مخطوط چلچلۃ العارفین صفحہ ۳۰

● — (ایک روز میں حضرت مخدومؒ کی بابرکت خدمت میں تمام اصحاب کبار یعنی خاکیؒ
باباہردی ریشیؒ۔ خواجہ حسن قاریؒ۔ شیخ احمد چاگلیؒ۔ روپی ریشیؒ اور زبدۃ العرفا
جناب شیخ محمد علی رینہؒ، جو کہ حضرت مخدومؒ برادر علینی ہیں، موجود تھے۔)

درج صدر بلند پایہ تصنیف "چلچلتہ العارفین" کا مطالعہ خود حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ
نے بھی فرمایا ہے۔ فاضل مصنف حضرت خواجہ اسحٰق قاریؒ اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں:- "چلچلتہ العارفین"
در سنہ ۹۸۲ھ در حالۂ حیات آنحضرت سلطان العارفینؒ مرتب گشتہ و چوں بعد از اتمام در نظر آن حضرت
گزرانیدم بعضے از کلام احوال صوفیہ و در بعضے اقوال تصوف و مسائل سلوک را مطالعہ کردہ فرمود کہ ایں
نسخہ را از محو کردن باز دارید۔"[1]

● — ("چلچلتہ العارفین" سنہ ۹۸۲ھ میں حضرت سلطان العارفینؒ کی مبارک زندگی میں
ہی مرتب ہوا۔ جب اس کو اتمام تک پہنچانے کے بعد میں نے آنحضرتؒ کی مبارک
نظروں میں لایا تو آپ نے کلام احوال صوفیہ کے بعض حصے بعض تصوف کے اقوال
اور سلوک کے مسائل کا مطالعہ کیا اور فرمایا کہ اس نسخہ کو ضایع ہو جانے سے
بچائے۔)

خواجہ صاحب کی اس تصنیف کے حوالہ جات سے عیاں و بیاں ہے کہ زبدۃ العرفا عمارۃ الصلحا
مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے برادر علینی ہیں۔ کیا اس گرانمایہ
تصنیف کو بھی یہ چلینج کیا جاسکتا ہے کہ یہ بھی حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کے وارثوں کو حضرت
محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کی وراثت کا حقدار بنانے کے لیے کسی نے جعلی طور لکھی ہے؟

فاضل مصنف خواجہ غلام محی الدین صاحب امرتسری اپنے تذکرے "تحفہ محبوبی" میں مزید اس طرح
رقمطراز ہیں کہ "قبل اس کے کہ ہم مخدوم بابا محمد علی رینہؒ کا مختصر تذکرہ بیان کریں یہ ضروری ہے کہ بطور اظہار
حقیقت بیان کریں کہ شیخ بابا داؤد خاکیؒ، ابوالفقرا بابا نصیب الدین غازی اور بابا داؤد مشکواتی نے
اپنی تصنیف کردہ کتابوں میں شیخ بابا علی رینہؒ کا نام تک بھی حوالہ قلم نہیں کیا ہے۔"[2]

چونکہ فاضل مورخ پیرزادہ حسن شاہ صاحب نے اپنی کتاب "اسرار الاخیار" یعنی "تاریخ حسن
جلد سوم" میں اس بارے میں صرف حضرت شیخ خاکیؒ کا حوالہ دیا ہے جس پر سابقہ اوراق میں بحث کی گئی ہے۔
لیکن موصوف خواجہ صاحب امرتسری نے مزید دو بزرگان دین کا بھی نام لیا ہے۔ یہ دونوں بزرگ ابوالفقرا

---

[1] مخطوطہ چلچلتہ العارفین صفحہ ۱۲۴ [2] مطبوعہ تحفہ محبوبی صفحہ ۵۲

حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ اور حضرت بابا داؤد مشکواتی بلند مرتبہ اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ حضرت شیخ خاکیؒ کے خلیفۂ خاص ہیں اور حضرت مشکواتی حضرت نصیب الدین غازیؒ کے خلیفۂ خاص ہے۔ ان دونوں بزرگان دین نے دو تذکرے "نورنامہ" اور "اسرار الابرار" بالترتیب تصنیف کئے ہیں۔ حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے زمانہ یا سعادت میں عہد طفولیت میں تھے اور حضرت مشکواتی صاحب پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں تاریخی لحاظ سے ان دونوں بلند مرتبت بزرگوں سے زیادہ ہمیں حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے خاص ذوالقدر خلفاء کی بات کو فوقیت دینا ضروری ہے۔ کیونکہ انہوں نے خود اپنی بابرکت ذات سے حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کا زمانۂ سعادت پورے طور پایا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے خلفائے خاص کی تصنیفات کا حضرت شیخ حمزہؒ نے خود مشاہدہ اور مطالعہ فرمایا ہے۔ اس لئے جو کچھ انہوں نے ورطۂ تحریر میں لایا ہے اس کو زیادہ فوقیت ہے۔ اس سے قارئین کرام یہ نتیجہ اخذ نہ کریں کہ ابوالفقراء حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ اور حضرت بابا داؤد مشکواتیؒ کا لکھا قابل اعتبار نہیں۔ وہ بھی موثق اور مصدق ہے۔ کیا ہوا اگر ان دو بزرگان دین نے مخدوم حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ کا نام تک اپنے مندرجہ صدر تذکروں میں قلمبند نہیں کیا ہے۔ لیکن انہوں نے کہیں یہ بھی تو نہیں لکھا ہے کہ آپ حضرت شیخ حمزہؒ کے برادر عینی نہیں ہیں۔ اگر یہ دونوں حضرات دین آپ کے حالات لکھتے اور آپ کے اور حضرت شیخ حمزہؒ کے تعلقات پر تبصرہ نہ فرماتے تو بھی یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ آپ آنحضرت کے بھائی نہ تھے۔ آپ جیسی بہت سی شخصیتوں کا ذکر ان دو بزرگان دین نے اپنے تذکروں میں نہیں فرمایا ہے۔ اس سے کیا ہوا؟ یہ تذکرے ہی تو ہیں تواریخ نہیں۔ تاریخ سب باتوں پر حاوی ہوتی ہے۔ تذکروں میں سب کچھ لکھنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تاریخوں میں بھی سب کچھ نہیں آتا۔ ذرا ان بزرگان دین کے ان تذکروں کا مطالعہ کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ انہوں نے اس وقت کی تمام شخصیات کا ذکر خیر نہیں فرمایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس سبھی کے حالات کی جانکاری نہ ہو یا سبھوں کے حالات معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہوئے ہوں۔ اسلئے جو کچھ بہم ہوا ہے۔ اس پر خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ رسالۂ سلطانیہ جو ۹۸۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ میں حضرت مولوی شیخ احمد چاگلیؒ نے حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے بزرگ خلفاء میں سے صرف حضرت شیخ بابا داؤد خاکیؒ اور حضرت میر بابا حیدر رتیلہ مولیؒ کا ذکر ضمناً کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی خلفاء حضرت شیخ حمزہؒ کے تھے ہی نہیں۔ اسی طرح "راحة الطالبین" میں حضرت خواجہ حسن قاریؒ نے حضرت شیخ بابا داؤد خاکیؒ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ موصوف

حضرت شیخ حمزہؒ کے خلیفہ ہی نہ تھے۔ حق تو یہ ہے کہ تذکروں میں ہر ایک کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے۔

قارئین کرام! اب میں اصلی حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں کہ فاضل مصنّف خواجہ غلام محی الدین صاحب امرتسری نے یہ جملہ معترضہ کہ "شیخ بابا داؤد خاکیؒ، ابوالفقرا، بابا نصیب الدین غازیؒ اور بابا داؤد مشکواتیؒ نے اپنی تصنیف کردہ کتابوں میں بابا علی رینہؒ کا نام بھی حوالۂ قلم نہیں کیا ہے۔" کہاں سے حاصل کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ موصوف امرتسری صاحب نے اپنا تذکرہ مرتّب کرنے کے سلسلے میں بہت سے اصحابِ وقت سے اعانت حاصل کی ہے۔ بہت سے ہمعصر اصحاب نے آپ کو اپنے اس تذکرے کے مواد کی فراہمی میں گراں قدر تعاون دیا ہے۔ ان میں سے ایک صاحب جناب سید محمد شاہ صاحب جانشین میر بزرگ شاہ صاحب مرحوم ساکنِ محلہ کلال دوری متصل نایدکدل سرینگر گزرے ہیں۔ آپ نے موصوف کو کئی کتابیں دکھادی ہیں جن سے موصوف کو اپنا تذکرہ مرتّب کرنے میں بہت مدد ملی۔ اس کا اعتراف موصوف خود اپنے تذکرے[ؔ] میں کرتے ہیں۔

سید محمد شاہ صاحب مرحوم کے گھر کے کتُب خانہ میں سعداللہ صاحب شاہ بادی مرحوم کی منظوم تاریخ "باغ سلیمان" موجود ہے۔ یہ اوّل تا آخر نظم میں لکھی گئی ہے۔ کسی جگہ اس میں نثر کا شائبہ تک نہیں ہے۔ ہر صفحے پر اس کا حاشیہ صاف ہے البتہ جس صفحے پر حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کا ذکر خیر ہے اس کے حاشیئے پر کسی دوسرے کے قلم سے ہمرنگ سیاہی سے مندرجہ ذیل عبارت درج کی گئی ہے۔

"اکثر محققان مے گویند و مے نگارستند کہ بابا علی از حضرت سلطان برادرِ نسبتی
نبودہ است برادر فرئی اوست۔ بابا داؤد خاکیؒ، بابا نصیب الدین غازیؒ
بابا داؤد مشکواتیؒ وغیرہ نامے و پیامے از وے نہ نگاشتہ اند۔"

قارئین کرام! درج صدر عبارت سے متعلق مکمل بحث کی جاچکی ہے اور اس کے علاوہ "باغ سلیمان" کے مصنف کا حوالہ ابتدا ہی میں حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ کا ذکر خیر کرتے ہوئے ہی دیا گیا ہے۔ آپ ذرا "باغ سلیمان" کے فاضل مصنّف کے حوالے کو پھر غور سے پڑھ لیں اور اندازہ کریں کہ جو فاضل مصنف حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کا تذکرہ اس شان سے نظم میں بیان کرے کیا وہ نثر میں درج صدر عبارت حاشیئے پر لکھنے کی جسارت کر سکتا ہے اگر ایسا کرنا مقصود ہوتا تو نظم ہی میں اس کا تھوڑا بہت اشارہ دیتا۔ فاضل مصنف کو یہ عبارت نثر میں لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ موصوف نے تو ایک بڑی کتاب نظم

ؔ مطبوعہ تحفۂ محبوبی صفحہ ۸

میں لکھی ہے ؛ میری نظر میں اس "تاریخ" کے ایک دو قلمی نسخے ایک دو جگہوں کے علاوہ ریسرچ لائبریری گورنمنٹ جموں و کشمیر میں بھی گزرے ہیں۔ ان کے حاشیوں پر اس قسم کی کوئی نثری عبارت درج نہیں ہے۔ اس قسم کی جعلی باتیں بنا کر جس مقصد کے لیے لوگ سامنے لاتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی طرح حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ کی عبقری شخصیت کو مشکوک و مشتبہ بنا کر اُن کو حضرت شیخ حمزہؒ کے برادرِ عینی نہ ہونے کو ثابت کر کے ساقط الاعتبار ٹھہرا دیا جائے۔

اس سارے معاملے کو بہ نظرِ غایر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتنہ درجِ صدر جملہ کا پیدا کردہ ہے ورنہ بتائے کہ وہ کون سا محقق ہے، کون سا مورخ اور تذکرہ نگار رہے کہ جس نے یہ لکھا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ حضرتِ شیخ حمزہؒ کے عینی برادر نہیں ہیں۔ ایسی باتیں مفاد پرست لوگ ہی کرتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ فاضل مصنف خواجہ غلام محی الدین امرتسری نے بھی کسی پارٹی کے ایما پر یہ جملۂ معترضہ اپنے تذکرے میں درج کیا ہے۔ مختصر طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ "تحفۂ محبوبی" کو مرتب کرنے کی غرض و غایت حقیقت میں یہی رہی ہے کہ حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ کو مشتبہ اور مبہم صورت میں پیش کیا جائے کیونکہ اس زمانے میں بھی اُدھر درگاہ فیض پناہِ سلطان العارفین میں یہی وراثتی جنگ چل رہی تھی۔

زبدۃ العرفا عمدۃ الصلحا حضرت شیخ بابا محمد علی رینہؒ کا حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کا برادرِ عینی ہونے کے سلسلے میں یہ ایک اہم حوالہ دینا ضروری ہے۔ اس کے حاصل کرنے کی کہانی دلچسپی سے خالی نہیں۔

حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کے زمانہ با سعادت میں آپ کے برگزیدہ خلفاء میں سے حضرت خواجہ حسن قاریؒ نے ایک تاریخ لکھی ہے۔ جو تاریخ کشمیر سے موسوم ہے۔ حضرت خواجہ موصوف اپنے وقت کے ایک بلند پایہ وقایع نویس گزرے ہیں۔ حضرت موصوف کی اس وقایع نویسی سے متعلق حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ " خواجہ حسن قاریؒ بہ مرتبۂ واقعہ نویسی کشمیر امتیاز یافتہ و کلیہ در کشمیر تعلق دارد۔ بذات شریف الشان تا یوم القیامت در واقعات ایں دیار متعلق است "[1]

● — (حضرتِ خواجہ حسن قاریؒ کشمیر کی واقعہ نویسی میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ کی ذاتِ شریف کے طفیل اس شہر سے متعلق یہ واقعات قیامت تک قائم رہیں گے)

اسی طرح حضرت موصوف کی اس واقعہ نویسی سے آپ کے برادرِ عزیز حضرت خواجہ اسحٰق قاریؒ

[1] مخطوطہ تذکرۃ العارفین صفحہ ۳۲۸

حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "یکے از ما دو برادران واقع نویس و دیگرے واقعہ خوان باشد۔"[1]

● ــ (ہم دو بھائیوں میں سے ایک واقعہ نویس ہے اور دوسرا واقعہ خوان ہے)

حضرت خواجہ میرم بزاز سکندرپوری فرماتے ہیں کہ "خواجہ حسن قاریؒ را خدمت واقعہ نویسی ایں شہر عنایت شدہ و بر خواجہ اسحٰق قاریؒ عرض رسانی مرحمت گشتہ۔ احوال ایں جائے کلہم بر ہمیں دو کس است۔"[2]

● ــ (خواجہ حسن قاریؒ کو اس شہر کی واقعہ نویسی کی خدمت سپرد ہوئی اور خواجہ اسحٰق قاریؒ کو دن کے حالات گوش گزار کرنے کی خدمت مرحمت ہوئی۔ اس جگہ کے کلہم حالات کا انحصار ان ہی دو پر ہے۔)

موصوف حضرت خواجہ حسن قاریؒ کی اس تاریخ سے متعلق میں نے کافی تلاش کی مگر اس کا نام ونشان تک پانے میں ناکام رہا۔ اگر یہ بہم ہوجاتی تو اس تاریخ سے بہت سارے واقعات وحالات اور حقائق پر روشنی پڑتی۔ کیا معلوم کس کنج خانہ میں پڑی ہوگی۔ البتہ اس کا حوالہ صاحبزادہ حسن شاہ صاحب، سابقہ ڈائریکٹر محکمہ تحقیقات نے "تاریخ حسن" حصہ اول میں دوسری تاریخوں کے ساتھ اس طرح دیا ہے کہ "خواجہ حسن قاریؒ کی تاریخ موسوم بہ "تاریخ کشمیر" کا کوئی نسخہ یہاں موجود نہیں ہے بلکہ اس کا ایک قلمی نسخہ آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ میں محفوظ ہے۔ جموں وکشمیر گورنمنٹ نے اس تاریخ کی مائیکرو فلم منگوا کر محکمہ تحقیقات میں قارئین کے استفادہ کرنے کے لیے محفوظ رکھی ہے۔"

درج صدر حوالے کو پا کر میں محکمہ تحقیقات جموں وکشمیر گورنمنٹ میں مذکورہ مائیکرو فلم کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے لیے چلا گیا اور وہاں جاکر پہلے پہل درج شدہ رجسٹر میں اسکی کھوج لگائی تو رجسٹر میں لکھا ہوا پایا "تاریخ کشمیر مائیکرو فلمی از خواجہ حسن علی قاری"۔ خواجہ حسن کے ساتھ علی اور پھر قاری ہونے نے میرے دل میں شک پیدا کر دیا کہ شاید یہ خواجہ موصوف کی تاریخ نہ ہو۔ بہر حال میرے لیے مائیکرو فلم مذکور کا مطالعہ کرنا ضروری تھا۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے، اس کے پہلے صفحے میں یہ عبارت درج تھی۔ "از ابتدائے آبادی کشمیر جنت نظیر لغایت زمان محرر مجملی در بیان مے آرند ونقل از رازہ ترنگ بیک واسطہ مے آمدہ کہ آں ہم بایجاز واختصار و مؤلف آن حسین بن علی کشمیری است و در آخر ہائے آن تاریخ احوال بعضی نقل از تاریخ حیدر ملک است و محرر سطور ہم تا زمان خواجہ نوشت۔ انشاء اللہ تعالیٰ و سمیتہ "بالتاریخ کشمیری" اولی الالباب و وجدہ تاریخ تالیفہ فاعتبروا یا اولی الابصار و تام محرر محمد مراد نقشبند الیت بن ملا محمد طاہر مفتی مرحوم غفر اللہ۔"

---

[1] مخطوط چلچلۃ العارفین صفحہ ۵   [2] مخطوط تذکرۃ المرشدین صفحہ ،

● ۔۔ (کشمیر بے نظیر کی ابتدائی آبادکاری سے اس تاریخ کے لکھنے والے صاحب کے زمانے تک مکمل طور پر حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ایک واسطہ سے اسکی نقل راج ترنگنی سے کی گئی ہے اور وہ بھی قلیل اور مختصر ہے۔ اس کا تالیف کرنے والا حسین بن علی کشمیری ہے۔ اس تاریخ کے آخری حصے کے بعض حالات حیدر ملک کی تاریخ سے نقل کئے گئے ہیں اور یہ سطریں لکھنے والے نے بھی خواجہ کے زمانے تک لکھے۔ انشاءاللہ یہ تاریخ کشمیر سے موسوم رہیگی۔ دانشوروں نے اسکی تاریخ تالیف فاعتبروا یا اولی الابصار ۱۱۴۲ھ سے اخذ کی یعنی ۱۱۴۲ھ۔ یاد رہے اس کے لکھنے والے کا نام محمد مراد نقشبندی بن ملا محمد طاہر مفتی مرحوم ہے۔ خدا اس کو مغفرت کرے"

حق یہ ہے کہ درج صدر تاریخ محمد مراد نقشبندی ابن ملا محمد طاہر مفتی مرحوم کی لکھی ہوئی ہے۔ جس کا مؤلف غلطی سے حسین بن علی دکھایا گیا ہے۔ یہ نام اس کے ٹائیٹل پیج پر لکھا گیا ہے۔ کتاب کا نام "تاریخ کشمیر" درج کیا گیا ہے۔ صاحبزادہ حسن شاہ نے اس کو خواجہ حسن قاریؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس تاریخ کا حوالہ فتوحات قادریہ میں اس طرح ہے۔" حضرت شیخ محمد مراد جس نے ایک تاریخ لکھی ہے ملا محمد طاہر مفتی کے بیٹے ہیں۔ عرف ٹنگ سے معروف ہیں۔ اس میں اورنگ زیب عالمگیر کے وقت تک کے حالات درج ہیں۔ فقرۂ فاعتبروا یا اولی الابصار ۱۱۴۲ کی رو سے ۱۱۴۲ھ میں لکھی گئی ہے یہ ایک بہت ہی اہم تاریخی نسخہ ہے۔ بدقسمتی سے انڈیا آفس کے اہل کاروں نے اس کی مائیکرو فلم کا مطالعہ نہیں کیا ہے لگتا ہے کہ صاحبزادہ حسن شاہ نے بھی اس کا مطالعہ کرنے کے بغیر ہی اس کو حضرت خواجہ حسن قاریؒ کی طرف منسوب کردیا ہے۔

بہرحال اس اہم تاریخ کی مائیکرو فلم کا مطالعہ کرتے کرتے میں اپنے ہیرو کے نام کو اس میں پانے میں کامیاب ہوا۔ اس کے صفحہ ۵۲ پر یہ عبارت لکھی ہوئی دیکھی "خلفائے حضرت مخدوم قدہ۔ خلفائے ایشان خدمت بابا داؤد خاکیؒ و خدمت شیخ بابا علی رینہ تیجریؒ برادر گرامی حضرت مخدوم قدہ و ملا احمد چاگلی و شیخ میر حیدر تیلہ مولیؒ و خواجہ اسحٰق قاریؒ و خواجہ حسن قاریؒ و خواجہ میرم۔ روپی ریشی و ہردی باباؒ ہم عصر و ہم قرین بودند:

● ۔۔ (خلفائے حضرت مخدومؒ۔ آپ کے خلفاء جناب بابا داؤد خاکیؒ، جناب شیخ بابا علی رینہ تیجریؒ برادر گرامی حضرت مخدوم قدہ ملا احمد شیخ چاگلی، شیخ میر حیدر تیلہ مولیؒ، خواجہ اسحٰق قاریؒ، خواجہ حسن قاریؒ، خواجہ میرم۔ روپی ریشی،

اور ہردی بابا تھے۔ یہ آپ کے ہم عصرو ہم قرین تھے۔"

قارئین کرام! میں نے آپ کے سامنے اپنی طرف سے زبدۃ العرفا عمدۃ الصلحا حضرت مخدوم شیخ بابا محمد علی رینہؒ سے متعلق سارے واقعات و حالات کے حقایق فاضل محدثین اور معتبر تذکرہ نویسوں کے مکمل حوالہ جات دیکر پیش کئے۔ ان حوالہ جات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرت محبوب العالم شیخ حمزہؒ کے برادر علاتی ہیں لیکن ان لوگوں کا جو یہ ماننے کے لئے تیار نہیں اور جو حضرت موصوف کو حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہؒ کا حقیقی برادر نہ بنانے کے لئے تاریخ اور تذکروں کے زریں اوراق کو مسخ کرنے کی کوششوں میں ہمیشہ منہمک رہتے ہیں، کیا کیا جائے لگتا ہے کہ یہ سعی لاحاصل وراثتی جھگڑے کے ضمن میں ہی ہوتی رہی ہے کیوں کہ جب تک اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال نہ کئے جاتے تب تک مقصد براری ممکن نہ تھی۔ میری دعا یہی ہے کہ خداوند کریم ہم مسلمانوں کو ایسی حرکتیں کرنے سے بچائے اور ہدایت و رشادت کے راستے پر گامزن کرے۔ (آمین)



حضرت خواجہ محمد طاہر الرفیق رحمۃ اللہ علیہ

سالک راه باطن و ظاهر ہست خواجہ محمد طاهر
در فنج ہل بغزلی از تحقیق شہرت یشیخ ہست خواجہ رفیق
بود در پردۂ تجارت گم زو کسی پی بزده از مردم
نسب آن شہنشۂ دوران ہست از خواجہ گان عالی شان
پدرش بود خواجہ ابراہیم سفر ہند پیشہ داشت قدیم
زان سفر در مدینۂ لاہور داشت صحبت بشیخ عبدالشکور
بود ز اولاد قطب ربانی زکریا بزرگ نورانی
بکرامات بود علی التحقیق گفت بادی ز حال خواجہ رفیق
نیز بنوشت خط ارشادش بود شاگرد ساخت استادش
پدر آن خط گرفتہ سوی پسر شد ز بس خوشدلی روان از سر
خواجہ دریافت تا بنور صفا شد سہ منزل پذیره آن خط را
شد بارشاد بعد ازین مرجع خلق را ساخت دلنشین مرجع
اکثر از وی چو یافتند کمال مقتدا بوده اند صاحب حال

خاصۂ اولاد او کہ باظفر اند
پشت در پشت و راہبر اند (باغ سلیمان مصنفہ سعداللہ شاہ آبادی)

جناب حضرت سید شرف الدین عبدالرحمان الملقب بلبل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قریباً ساٹھ سال بعد حضرت امیر کبیر میر سید علی الہمدانی قدس اللہ سرہ، در عہد سلطان قطب الدین شاہ میر ۲۶۰ سادات و علماء کے ہمراہ بغرض اشاعت دین مبین وارد وادی کشمیر ہوئے۔ حضرت امیرؒ کے بعد ان کے فرزند ارجمند جناب حضرت میر محمد ہمدانیؒ در عہد سلطان سکندر بت شکن سادات و علماء کی ایک اور کثیر جماعت کے ساتھ اپنے والد ماجد کے مشن کو پورا کرنے کی غرض سے وارد کشمیر ہوئے۔ ان کے ساتھیوں میں ان کے خاص رفیق حضرت سید جلال الدینؒ بھی تھے۔ حضرت سید جلال الدینؒ کا سلسلۂ نسب ۱۷ ویں پشت پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت امیر کبیرؒ اور ان کے فرزند حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے ہمراہ جو بھی سادات و علماء وغیرہ یہاں آئے ان میں اکثر یہیں وادی کے مختلف علاقوں میں بغرض اشاعت اسلام و تبلیغ رشد و ہدایت سکونت پذیر ہوئے۔

حضرت سید جلال الدینؒ نے سرینگر کے محلہ علاء الدین پورہ میں اپنا مسکن بنایا اور سید موصوف نے وہاں تراشیدہ پتھروں کی ایک مسجد اور کئی دوکان تعمیر کرائے، جس کی وجہ سے حضرت موصوف خواجہ سنگین اور ان کا جائے مسکن دوکانِ سنگین کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے دو بیٹے خواجہ طاہرؒ اور خواجہ عبدالقویؒ تھے۔ خواجہ عبدالقوی عنفوان جوانی میں ہی اس جہان فانی کو داغ مفارقت دیکر بعالم جاودانی چل بسے۔ ان کا اکلوتا بیٹا خواجہ عبدالعلیم اس وقت چار سال کا تھا۔ ان کے خالو خواجہ شمس الدین کول نے ان کی تربیت و پرورش کی۔ ننہال میں عرصہ دراز تک رہنے سے لوگوں نے ان کو بھی "کول" ذات کے ساتھ منسلک کر دیا۔ اور ان کے ناموں کے ساتھ "کول" چلتا رہا چنانچہ اذکار العرفاء میں یہ واقعہ ان الفاظ میں درج ہے:۔

"جدش خواجہ عبدالقوی ابن خواجہ سنگین است مہر سپہر اقتدار رتبہ بر داز اجلال پایہ فراز اقبال کریم الخطاب علی الالقاب در علوم ظاہر و باطن عدیمش نبود و در ورع و تقوی بنہایت رسیدہ و ادب و تواضع بغایت داشت بروز وفات والد چہار سالہ بود بموجب آن خواجہ شمس الدین کول کہ خال او بود بطور مصاہرت بخانہ خود بردہ پرورش او نمود و در علوم آداب کمالات حاصل کرد صاحب ریاست و حشمت و وقار گردید و بر مکان او استقرار پذیر رفت۔"

خواجہ طاہر بن خواجہ سنگینؒ کے انتقال کے وقت ان کے بیٹے حضرت خواجہ ابراہیم کی عمر ۱۸ سال

کی تھی۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد ماموں نے خواجہ ابراہیم کی پرورش کی۔ ان کو اپنے بیٹوں کے ساتھ بغرض تجارت بیرون کشمیر بھیجتا تھا۔ بانجھے کی صلاحیت اور دیانتداری سے خواجہ عیسیٰ عشائیؒ نے اپنی بیٹی بی بی ہاجرہ کا نکاح حضرت ابراہیم سے کیا جس کے بطن سے حضرت قطب الاولیا حضرت خواجہ محمد طاہر الرفیق قدس اللہ سرہ تھے۔ چونکہ عشائی گھرانے کے ساتھ منسلک رہنے سے لوگوں نے خواجہ ابراہیم اور ان کے بیٹوں کو عشائی نام سے پکارا۔ حضرت بی بی ہاجرہ کے دادا خواجہ سلیمان عشائیؒ اپنے مرشد جناب امیر کبیر میر سید علی الہمدانی قدس اللہ سرہ کے ساتھ وارد کشمیر ہوئے تھے۔ خواجہ موصوف اپنے مرشد حضرت امیرؒ کے ساتھ لداخ اور تبت گئے۔ وہاں سے انہوں نے پشمینہ کی تجارت شروع کی۔ قلیل مدت میں اپنے مرشد کی نظر کیمیا اثر سے خواجہ سلیمان وادی بھر کے روسا میں شمار ہونے لگے۔ باوجود جاہ و حشم کے تقویٰ شعاری و پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ خواجہ موصوف سال بھر روزہ دار ہوتے تھے۔ صرف عشاء کے وقت غذا کھاتے تھے۔ اسی نسبت سے حضرت امیر کبیرؒ ان کو عشائیؒ کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

خواجہ عیسیٰ عشائیؒ بن خواجہ سلیمان کے نکاح میں بی بی امۃ اللہ دختر نیک اختر خواجہ سنگینؒ تھی۔ حضرت خواجہ ابراہیم بھی دوکان سنگین میں بزازی کا کاروبار کرتے تھے۔ دوکانداری کے ساتھ ساتھ خوف خدا بھی دردل تھا۔ ان کے دو بیٹے حضرت خواجہ محمد طاہر اور حضرت خواجہ عطار تھے۔ خواجہ عطارؒ اپنے برادر اکبر حضرت خواجہ محمد طاہر الرفیقؒ کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ ان کی خاص توجہ نے ان کو عالم باعمل بنایا۔ عنفوان جوانی میں ہی ۱۹ ماہ ذیقعدہ ۹۶۷ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۵۶۰ء کو اس دنیائے فانی سے چل بسے۔ آپ اپنے آبائی مقبرہ مزار قدیم رعناواری احاطہ زیارت زینہ ولیؒ میں مدفون ہیں ؎

خواجہ عطار بود بیشک و شین — حضرت خواجہ را برادر عین
مدفن خاص حضرت عطارؒ — شد مزار قدیم رعنا وار

تاریخ سال وفات ان اشعار میں ہے۔ ؎

خواجہ عطارؒ دانای رشید — زاہد مشہور مثل بایزید
فاضل و علامہ و مقبول دهر — شیخ طاہر را برادر ہم مرید
رفت از دنیا و تاریخش بدان
فاضل دانا دگر شیخ مجید

حضرت خواجہ محمد طاہر الرفیقؒ کو والد کی نیک تربیت نے دنیاداری کے ساتھ ساتھ پرہیزگاری و

دینداری اور تقویٰ شعاری عطا کی۔ حضرت خواجہ دو دکان پر بیٹھ کر ظاہری طور دنیاوی کاروبار میں مشغول ہوتے تھے۔ لیکن ان کا باطن ہر وقت خدا کی یاد میں محو رہتا تھا۔ پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ حضرت موصوف سال بھر روزہ دار ہوتے تھے۔ گھر سے آیا ہوا کھانا ہر روز رضائے الٰہی کی خاطر کسی مسافر کو کھلاتے تھے۔ قطب الاولیاء حضرت خواجہ محمد طاہر الرفیقؒ کے والد حضرت خواجہ ابراہیمؒ موسم سرما میں بیرون کشمیر لاہور بغرض تجارت جاتے تھے۔ وہاں وہ حضرت شیخ عبدالشکور قریشی لاہوری قدس اللہ سرہ کے فیض صحبت میں اکثر جاتے تھے۔ ان کے حکم کے مطابق شیخ ابراہیمؒ نے ایک سو قمیض و پاجامے سلوا کر جناب مرشد حضرت شیخ عبدالشکور لاہوری قدس سرہ کے محبوں اور خدمتگزاروں کے لئے بطور نذرانہ پیش کئے۔ بہ نظر شفقت حضرت ممدوحؒ نے فرمایا جو کچھ چاہتے ہو وہ مانگو۔ جناب شیخ ابراہیمؒ نے عرض کیا کہ خداوند تعالیٰ جل شانہٗ کا شکر کس زبان سے ادا کروں جس نے مجھے تمام نعمتوں سے نوازا ہے صرف آخری عمر کے انجام نیک کا متمنی ہوں۔ حضرت ممدوح نے موجب حکم الٰہی جل شانہٗ

"ان الذین آمنوا و عملوا الصّٰلحٰت کانت لہم جنّٰت الفردوس نزلا"

(بے شک جن لوگوں نے ایمان لایا اور نیک اعمال کئے وہ جنت الفردوس کے مہمان ہوں گے)

سے تسلی دیکر فرمایا۔ کچھ اور مانگو۔ حضرت ابراہیمؒ نے کہا میری بیٹی بعلت وجع مفاصل کشمیر میں بیقرار ہے اس کے حق میں دعائے خیر فرمایئے تاکہ شفایاب ہو۔ حضرت ممدوح نے تھوڑی دیر سر بمراقبہ کرنے کے بعد فرمایا اس وقت وہ اپنی والدہ کے ساتھ موسم سرما کے لئے سبزی سکھانے کے لئے اپنی دایہ کے ہاتھ دے رہی ہے۔ شافی حقیقی جل شانہٗ نے اس کو شفا بخشدی ہے۔ حضرت ممدوح نے دوبارہ کچھ مانگنے کو کہا تو انہوں نے کہا کہ یہی عاقبت بخیر ہو جائے۔

اس کے بعد حضرت ممدوحؒ نے خواجہ ابراہیمؒ سے فرمایا کہ اپنے فرزندوں میں سے طاہر نامی فرزند کو مجھے بخشدیجئے۔ خواجہ موصوفؒ نے عرض کیا وہ کشمیر میں ہے۔ واپسی پر خدمت اقدس میں روانہ کر دونگا۔ حضرت ممدوح نے تبسم فرمایا اور بجذبۂ ولایت حضرت خواجہ طاہرؒ کو اپنے پاس ظاہر کیا اور حضرت خواجہ طاہر کو رفیق کے لقب سے نوازا۔ اس کے بعد حضرت خواجہ ابراہیمؒ کو رخصت کر کے خرقہ و تسبیح حضرت مخدوم بہاءالدین ذکریا ملتانی قدس اللہ سرہ مع خط ارشاد در سلسلۂ سہروردیہ حضرت خواجہ محمد طاہر رفیقؒ کے لئے ظاہری طور حوالہ کئے۔ تسبیح مبارک اس وقت بھی خاندان رفیقیہ میں موجود ہے۔

حضرت خواجہ طاہر الرفیقؒ حسب عادت دو کان بزازی پر بیٹھتے تھے کہ ایک روز حضرت خضرؑ

نے آکر فرمایا "شر البقاع الاسواق وخیر المساجد" "تمام جگہوں سے بدترین جگہ بازار ہے اور بہترین مقامات میں مسجد ہے"۔ یہ سنتے ہی حضرت خواجہ نے دوکانداری کو خیر باد کہا اور ارشاد و تلقین سلسلۂ علیہ عالیہ سہروردیہ، قادریہ، کبرویہ اور نقشبندیہ کے اذکار و اوراد و تربیت خلق اللہ میں مشغول ہوگئے۔ سلسلۂ قادریہ کی بیعت حضرت سید اسماعیل شامیؒ سے لی اور انکو سلسلۂ سہروردیہ کی بیعت دی۔ سلسلۂ کبرویہ کی بیعت حضرت سید علی والی متقیؒ سے لی اور انکو سلسلۂ سہروردیہ کی بیعت دی۔ سلسلۂ نقشبندیہ تو موروثی اپنے جدامجد حضرت سید جلال الدین بنگینؒ برادر حضرت سید بہاؤ الدین نقشبندیؒ سے پشت در پشت چلا آیا تھا۔ اجازت در سلسلۂ سہروردیہ اپنے والد ماجدؒ کے ذریعہ خط ازشادی میں حضرت شیخ عبدالشکور لاہوریؒ سے عطا ہوا تھا۔ ان کے ہمعصر حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم قدس اللہ سرہ، جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ۔ حضرت شیخ بابا والیؒ۔ حضرت شیخ بابا داؤد خاکیؒ۔ حضرت سید میر میرک اندرابیؒ۔ بابا ہردی ریشیؒ وغیرہ تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ حمزہؒ کی نماز جنازہ کی امامت اس وقت کے صلحاؑ و علماء نے متفقہ طور حضرت خواجہؒ کو سونپ دی۔

حضرت بابا داؤد خاکیؒ حضرت سلطان العارفین کے انتقال پُرملال کے بعد حضرت خواجہؒ کی خدمتمیں اکثر آتے تھے۔ حضرت خواجہ محمد طاہر الرفیقؒ کے عم زادہ حضرت ابو شریف شیخ احمد زاہدؒ کے والد حضرت خواجہ عبدالعلیمؒ کے انتقال کے وقت ۴ سال کے تھے۔ حضرت خواجہ نے ان کی پرورش و تربیت میں خاص توجہ فرمائی اور ان کو عالم باعمل بناکر اپنا جانشین بنایا۔ حضرت خواجہؒ نے اپنی اکلوتی بیٹی رابعہ عصر حضرت مریم بانو کا نکاح ان کے ساتھ کیا۔ اور حضرت خواجہؒ نے شیخ احمد زاہد کو "رفیقی" کے معزز لقب سے نوازا۔ پیر حسن شاہ کھویہامی نے بغیر تحقیق و تجسس خاندانِ رفیقیہ کو "کول" خاندان کے ساتھ منسلک کیا ہے جو کہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔ اس سے پہلے اور بعد کے جو بھی مورخ و تذکرہ نگار گذرے ہیں انمیں خواجہ محمد اعظم دیدہ مریؒ مصنف واقعات کشمیر، بابا داؤد مشکواتی، مصنف اسرار الابرار، ابا رفیع الدین احمد غافلؒ مصنف نوادر الاخبار، ملا عبدالصبورؒ مصنف خوارق السالکین۔ سعد اللہ شاہ آبادیؒ مصنف باغ سلیمان، شیخ عبدالوہاب نوریؒ مصنف فتحات کبرویہ۔ ملا بہار الدین متوؒ مصنف رسالہ غوثیہ و سلطانیہ۔ ملا عبدالنبی خانیاری مصنف وجیز التواریخ۔ الحاج محی الدین مسکین مصنف تحائف الابرار وغیرہ نے خاندان رفیقیہ کو "کول" ذات سے منسلک نہیں کیا ہے۔ حسن نے ایسا کیوں لکھاہے اس کی کوئی معتبر روایت یا دستاویز

خود حسن کے پاس ہیں۔

چک حکمرانوں میں یعقوب شاہ کے عقائد میں کٹر پن تھا اور وہ اس سلسلے میں زور زبردستی کی پالیسی پر کاربند تھا جس کے نتیجہ میں حضرت قاضی موسیٰ نے شہادت پائی۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنے چند ملازموں کے ہمراہ حضرت خواجہؒ کے دربار میں انہیں گزند پہنچانے کی نیت سے حاضر ہوا۔ حضرت خواجہؒ نے اسکی سخت خاطر مدارت کی اور اس کو انڈوں کا ایک پلیٹ کھانے کے لئے پیش کیا۔ یعقوب شاہ نے حواس باختہ ہو کر انڈوں کو بغیر چھیلنے کے کھایا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر حضرت خواجہؒ سے رخصت لے کر چلا گیا۔ باہر جا کر ساتھیوں نے یعقوب شاہ سے پوچھا کہ آپ نے کوئی اشارہ نہ کیا' ہم تو منتظر تھے۔ بلکہ آپ کی حالت ہی عجیب ہوئی۔ یعقوب شاہ نے کہا شیخ کو عجیب سا جادو ہے اس کے سر پر ایک سیاہ سانپ آویزاں تھا جو کہ مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا اگر میں کوئی ناشائستہ حرکت کر گزرتا تو وہ مجھے ایک لمحہ میں مار ڈالتا۔ اسلئے میری یہ حالت ہوئی ہے۔

محی الدین اسلام آبادی نے اس واقعہ کو اپنی تصنیف "کتاب الانہار الطیبین" میں ان اشعار میں درج کیا ہے ؎

قصد آزار شیخ دین کردند	رو بآن خسرو لعین کردند
رفت یک سگ بسوی آن شہ دین	برد خنجر در آستین از کین
در زمان لرزہ اش بجان افتاد	برزمین سرِ بپای خواجہ نہاد
حضرت خواجہ چند بیضۂ خام	کرد از لطف خود باو انعام
ہمہ را خورد آنچناں آن خر	ہیچ از حال خود نداشت خبر
بعد ازان ز آنجناب بیروں شد	زہرہ آب از غم و دلش خوں شد
ہمرہاں طعنہ ہا باو دادند	نامش از طعنۂ خبر بتہادند
گفت چوں آمدم بدان درگاہ	دیدم از سقف اژدہای سیاہ
گر بدل شد خیال زشتم باز	او دہن کرد جانب من باز
ایں ہمہ ترس و بیئم را زو بود	قصد او کردنم نکو ننمود

اسکی زیادتیوں سے تنگ آ کر یہاں کے بہت سے بزرگان دین شہر چھوڑ کر اور کچھ بیرون وادیٔ کشمیر چلے گئے' جنہیں حضرت جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفیؒ بعد ادائے مناسک حج بیت اللہ واپس آ کر دہلی میں ہی ٹھہرے۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ ملتان چلے گئے اور حضرت خواجہؒ شہر کو خیرباد کر کے موضع خورد

میر علاقہ تراال، موضع قمر علاقہ شاہ آباد اور موضع نوگام واوکیل بلن علاقہ کوٹھار میں تبلیغ دین مبین میں مشغول ومصروف رہے۔ یہاں انہوں نے بہت سے غیر مسلموں کو دین مبین کی روشنی سے مالا مال کیا اور شرک وکفر کی ظلمت سے نجات دلاکر راہ ہدیٰ سے ان کی عاقبت کو سنوارا۔ موضع خورد میر ترال میں ایک خانقاہ لوگوں کی تعلیم وتلقین کے لئے تعمیر کرائی اور موضع نوگام شانگس میں حضرت خواجہؒ نے بت خانوں کو اللہ اکبر کی گونج سے ایک نئی ضیا بخش کر ایک مسجد تعمیر کی جو کہ اس وقت بھی وہاں موجود ہے۔

"خواجہ ابو محمد طاہر رفیق قدس سرہ، در عہد فتنہ وفساد یعقوب شاہ مشہور در موضع اوکیل بلن نام پرگنہ کوٹھار مخفی ماندہ ہر گاہ فتنۂ مذکورہ منکشف شد در موضع نوگام پرگنہ مذکور کہ درآنجا نہ دہ بودند بزبان کشمیری نون گام می گفتند آمدہ آنجا کفر بسیار غالب بود سردار آنجا را متوجہ شدہ باسلام آوردند و بجائے بت خانہ مسجدے بنا نمودند تا الیوم موجود است پس بابا محمدؒ مذکور خواجہ موسیٰ را فرمودند کہ ہرگاہ در پیش ما استقامت نکردی در مکانی حضرت پیر دستگیر کہ در نوگام است استقامت نمای خواجہ موسیٰ آنجا آمدہ متقیم گشت و بریاضت وعبادت مشغول شد از ایشان دو فرزند ماندیکی ہاشم بابا کہ در صغر سن فوت شد، دوم شیخ بابا ابنہ، مومن بابا لفقط خواجہ موسیٰ از قبیلہ مانجہا است کہ ہم نسب خواجہ عبدالرحیم مانجو ساکن محلہ عالی کدل بودند عالم العلوم شریعت وطریقت و در موضع نوگام مذکور آسودہ فیض بخش خاص وعام است" •۔ (اذکار العرفا فولیو ۶۶)

کچھ عرصہ بعد شہر کے خلفاء و محبان حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو واپس شہر آنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ محلہ تاشی بت وان، جو کہ اس وقت تاشوان کے نام سے مشہور ہے، کے ایک مخلص معتقد دھوبی نے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں ایک قطعہ زمین بالتعمیر خانقاہ وسرائے بطور ہدیہ اپنی ملکیت سے پیش کیا جو کہ خواجہ ممدوحؒ نے قبول فرمایا اور واپس شہر تشریف لاکر اس قطعہ اراضی پر خانقاہ اور سرائے تعمیر کرکے عوام الناس کو روحانی تربیت سے مستفیض کرتے رہے۔ حضرت خواجہؒ کے بعد حضرت شیخ طیب رفیقیؒ نے یہ خانقاہ دوبارہ تعمیر کرائی۔ اس وقت روضہ شریف حضرت خواجہؒ اسی خانقاہ کے مغربی جانب ہے۔

حضرت خواجہ کے بہت سے خلفاء تھے۔ انمیں حضرت شیخ موسیٰ زنگیرؒ، خواجہ میر علیؒ،

خواجہ لطف اللہ اسلام آبادیؒ۔ مولانا شمس الدین گنائیؒ۔ مولانا حسن لنکر۔ مولانا شیخ نور الدین عشائیؒ بن خواجہ سعد اللہ عشائیؒ، شیخ محمد یوسف جنؒ۔ خواجہ موسیٰ مانٹجوؒ۔ بابا ابراہیم ساگامیؒ۔ مولانا خواجہ ابراہیم گنائی عرف کاکہ صاحب اور زینہ ولیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے مرشد کی خدمت میں پروانوں کی طرح گھومتے رہتے تھے۔ خلیفہ اوّل حضرت شیخ موسیٰ زہگیر المتوفی ۱۰۲۷ھ نے اپنے مرشد کی شان میں آداب المریدین بہ اتباع ورد المریدین حضرت بابا داؤد خاکیؒ تصنیف کی تھی۔ روایت ہے کہ جب آپ نے یہ اپنے مرشد حضرت خواجہؒ کے گوشگذار کی تو حضرت خواجہ معہ خلیفہ و نسخہ متذکرہ ساتھ لیکر بغرض ادائی نماز عصر خانقاہ معلےٰ تشریف لے گئے۔ دراثنا راہ فتح کدل پل سے گذرتے وقت نسخہ متذکرہ صدر کو دریا برد کر دیا۔ بعد فراغت نماز عصر خانقاہ معلےٰ سے واپس آتے وقت حضرت خواجہؒ نے خلیفہ کو دل ملول دیکھکر فرمایا "موسیٰ آپ ناراض ہیں۔؟ خدا کی بارگاہ میں طاہر کو مقبولیت ہونی چاہیئے۔ دنیاوی شہرت سے مجھے نفرت ہے۔"

حضرت خواجہ محمد طاہر الرفیق قدس سرہ اتوار اوّل ماہ ذالحجہ ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۹ ماہ اگست ۱۵۹۳ء اس جہانِ فانی کو داغ مفارقت دیکر بعالم جاودانی چل بسے۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" تاریخ وصال "شیخ اکمل" ہے۔

حضرت جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفی قدس سرہ نے حضرت خواجہؒ کا سال وفات ان اشعار میں فرمایا ہے

خواجہ اعلیٰ مراتب سالکان پیشوا ۔۔ شیخ طاہر مرشد حقانی و پیر ہدیٰ

یعنی آن خواجہ رفیق نقشبندی در نسب ۔۔ سہروردی در طریقت رہنما واھتدا

غرۂ ذی حجہ از دنیا بہ عقبیٰ کرد او

سال وصلش گفت ملہم بود شیخ الاولیا ۱۰۰۱ھ

حضرت شیخ موسیٰ زہگیرؒ نے اپنے مرشد کا سال وصال ان اشعار میں کہا ہے ؎

چون ز دنیا رفت شیخ دین رفیق ۔۔ آنکہ اندر بحر وحدت بد غریق

ہاتفی فرمود سال وصل او ۔۔ پادشاہ عالم مستان بگو

"ایضاً منہ"

آن خریدۂ زمانہ خواجہ رفیق ۔۔ رخت چون بر ز زین جہان مغیق

عقل تاریخ وصل شان می جست ۔۔ گشت زین رہ بحر فکر غریق

آہ کردہ سر ہاتفی گفتا ۶

قطب اقطاب و ثانیٔ صدیق ۹۹۰ = ۱۰۰۱ھ

آپ کا روضہ مرجع خلائق ہے جو محلہ اردو بازار رفیقی کوچہ فتح کدل میں واقع ہے۔ ——— ●●

حضرت مُلّا حسین خباز رحمۃ اللہ علیہ

کشمیر جنتِ نظیر اپنی تروتازگی، شادابی اور دیگر محاسن کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور و معروف رہی ہے اور شعراء ان خصوصیات کی بنا پر اس کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں۔ ہر زمانہ میں دُور دُور سے سیاح یہاں آکر اپنی تفریح کا سامان بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔ دنیا والے اس کی ظاہری دلفریبی و رعنائی پر عش عش کرتے ہی ہیں۔ لیکن اہلِ باطن کے لئے بھی یہاں اطمینان و سکون قلب کا سامان موجود ہے۔ بہت سے اللہ والے اس سرزمین میں محوِ خواب ہیں جنہوں نے کشمیر میں ہدایت کی قندیلیں روشن کیں اور لوگوں کو تصوّف و سلوک کے راستے بتائے اور کشمیر میں اسلام پھیلانے کے لئے اس طرح کام کیا کہ کشمیری مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان کہلانے کے مستحق ہوئے۔ آج بھی ان بزرگوں کی تعمیر کردہ خانقاہوں میں سکون و طمانیت قلب حاصل ہوتا ہے۔ ڈل جھیل اگر اپنی دلفریبی اور خوشنمائی میں اپنی نظیر آپ ہے تو درگاہ حضرت بل دل والوں کے لئے مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ کشمیر عہدِ قدیم سے ایک مردم خیز خطہ رہا ہے۔ ہر زمانہ میں یہاں مختلف مکاتیب فکر کی عظیم اور مقتدر شخصیتیں تولّد ہوئی ہیں۔ علماء، مشائخ، صوفیائے کرام کے علاوہ مفکرین و مدبرین، سیاست دان، واعظ، مبلغ، شعراء، ادباء، اتالیق، خطاط، وغیرہ پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح بزرگانِ دین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے جس میں حضرت آخوند ملا حسین خباز مجددی قدس سرہ کا اسم گرامی بھی شامل ہے جنہوں نے کشمیر میں دینِ حق کی تبلیغ

کی اور لوگوں کو گمراہی کی راہوں سے بچا کر صحیح راستے پر گامزن کیا۔

مولانا کا نام حسینؒ اور ان کا اصلی وطن سرینگر تھا۔ وہ سرینگر میں ہی تولد ہوئے تھے جیسا کہ انہوں نے اپنی تصنیف "ہدایت الاعمٰی" کے مقدمے میں لکھا ہے[1]۔ ان کے معاصر تذکرہ نگار بابا داؤد مشکواتی" کے علاوہ بعد کے تقریباً تمام مقامی تذکروں میں ان کا نام مولانا حسین خباز درج ہے۔ انہیں خباز (نانوائی) اس لئے کہتے تھے کہ مولانا کی ایک نانوائی کے ساتھ بے حد دوستی تھی اور مولانا اکثر اس کی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ اس طرح لوگوں میں خباز کے نام سے ہی مشہور ہو گئے[2]۔

مولانا حسین نے ابتدائی تعلیم اپنے زمانے کے ایک بڑے عالم، فاضل اور معلم خواجہ اسحاق قاریؒ[3] سے حاصل کی اور انہی سے علوم معقول و منقول دونوں میں تربیت بھی حاصل کی۔ خواجہ اسحٰق قاریؒ کے ارادت مندوں میں بھی شامل ہوئے۔ جب خواجہ اسحاق قاریؒ کا مکہ معظمہ میں انتقال ہوا تو مولانا حسین کو بھی حرمین شریف کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ مراسم حج انجام دینے کے بعد انہوں نے اکبر آباد میں خواجہ عبدالشہید (جو کہ حضرت عبداللہ احرار کی اولادوں میں سے تھے) کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے شاگردوں میں شامل ہو گئے[4]۔ مولانا حسین دہلی میں عبدالباقی دہلوی کی خدمت میں بھی باطنی فیوض سے فیض یاب ہوئے[5]۔ تحصیلِ علوم ظاہری و باطنی کے بعد جب مولانا کشمیر آئے تو وہ شریعتِ محمدیؐ کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہو گئے اور بدعتوں اور گمراہیوں کو دور کرنے کی کوشش میں ہمہ تن لگ گئے[6]۔ اگرچہ معاصر تذکرہ نگار اس بارے میں خاموش ہیں کہ کشمیر آکر انہوں نے کونسا پیشہ اختیار کیا تھا لیکن ان کے نام کے ساتھ تذکروں میں لفظ آخون[7] لکھا ہے جو اس امر کی وضاحت

---

[1] ہدایت الاعمٰی ص ۲۔ مخطوطہ کشمیر یونیورسٹی زیر نمبر ۲۹۲

[2] تحائف الابرار ص ۱۹۳

[3] تحائف الابرار ص ۱۹۳

[4] واقعات کشمیر ص ۱۳۲

[5] ریاض الاخیار۔ ص ۳۸۴

[6] ایضاً ریاض الاخیار ص ۳۸۴، واقعات کشمیر ص ۱۳۲۔ تاریخ حسن ج ۲ ص ۲۶۰

[7] تحائف الابرار ص ۱۹۳۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ماضی قریب میں بھی اگر کسی (بچے) کو قرآن شریف وغیرہ یاد نہ رہتا یا پڑھنے میں دقت ہوتی تو اسے حضرت مولانا مذکور کے روضہ لیجا کر ان کی تربت کے قریب کا پتھر چٹایا جاتا۔ (م۔ا۔ا)

کرتا ہے کہ کشمیر لوٹنے کے بعد اُنہوں نے معلمی کا پیشہ اپنایا ہوگا اور درس و تدریس اور اشاعتِ دین میں مصروفِ عمل رہے ہونگے۔ آج بھی کشمیر میں لوگ اسی نام سے اُن کو یاد کرتے ہیں ان کا روضہ بھی آخون صاحب کے نام سے ہی مشہور ہے۔

مولانا حسینؒ حقیقی معنوں میں کشمیر میں بعض لوگوں میں رائج بدعتوں کو مٹانے اور ان کا قلع و قمع کرنے میں سرگرمِ عمل رہے ہیں۔ وہ حق و باطل، بُرے اور بھلے میں زندگی بھر تمیز کرتے رہے۔ وہ دینِ مبین کے زبردست حامی تھے۔ مبلّغ تو تھے ہی وہ ایک نیک کردار عالمِ باعمل بھی تھے۔[1]

مولانا حسین خبازؒ کے اپنے معاصر صوفی شاعر و بزرگ صوفی خواجہ حبیب اللہ حبّی نوشہریؒ، جو کہ حال کے غلبہ کے بموجب اکثر اوقات محفلِ سماع میں مشغول رہتے تھے، کے ساتھ اُن کے اکثر مُباحثے اور مناظرے ہوتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار اُن کے درمیان زبردست جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک بڑے تنازعہ کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ تنازعہ حاکمِ وقت کی عدالت میں پیش ہوا تھا۔ حضرتِ خواجہؒ نے سماع کی جوازیت میں یہ دلیل پیش کی کہ آئینِ شریعت کے مطابق علاجِ امراض کے لئے ایسی دوائیوں کا استعمال جائز ہے جن کو صحت کی حالت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ حضرت حبّی کا استدلال یہ تھا چونکہ ہم بیمار ہیں اور سماع کے بغیر ہم کسی دوسری دوائی سے ٹھیک نہیں ہو سکتے اس لئے ہمارے لئے یہ حرام نہیں۔ چونکہ مولانا خبازؒ شرعی دلائل اور براہین پیش کرتے تھے اور وہ اکثر اوقات حبّیؒ پر غالب رہتے تھے۔[2]

جہاں تک مولانا خبازؒ کے مسلک کا تعلق ہے وہ اہلِ سنت والجماعت میں سے تھے اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے پیرو کار تھے اور ان کا تعلق صوفیوں کے نقشبندی طریقہ کے ساتھ تھا۔[3] وہ کشمیر میں اسی مسلک اور طریقہ کی اشاعت میں محو رہے۔ وہ علمِ تفسیر، فقہ اور حدیث میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور بابا نصیب الدین غازیؒ، مولانا حیدر علامہ اور محمد افضل جیسے معاصر علماء و فضلا بھی حدیث میں ان سے مستفید ہوتے تھے۔[4]

---

[1] ریاض الاخیار۔ واقعات کشمیر۔ تاریخ حسن ج ۲ ۔ ص ۲۶۰

[2] دیوان حبّی ص ۷ ۔ مرتبہ حبیب اللہ کاملی ۱۳۸۱ھ

تحالیف الابرار ص ۱۹۲ ۔ واقعات کشمیر ص ۱۲۳ ۔ تاریخ حسن ج ۲

[3] تحالیف الابرار ص ۱۹۳

[4] ایضاً ص ۱۹۲

تذکرہ نویسوں نے مولانا کا سال وصال ۱۲ ذی الحجہ ۱۰۵۲ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۶۴۲ لکھا ہے اور "منبع فیض" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔[1] لیکن وثوق سے کوئی بھی یہ نہیں بتایا پایا ہے کہ راہئ عدم ہونے کے وقت اُن کی عمر کتنی تھی۔ مولانا موصوف کا روضہ محلہ گوجوارہ (سری نگر) میں اسلامیہ کالج کے متصل واقع ہے اور مرجع خلایق ہے۔[2] ۱۲ ذی الحجہ کو ہر سال مولانا موصوف کے یوم وصال کے سلسلے آستانہ عالیہ میں ذکرواذکار کی مجلس ہوتی ہے جس میں اہل دل شرکت کرنا اپنے لئے سعادت سمجھتے ہیں۔

مولانا حسینؒ خبازؒ کے معاصر تذکرہ نویس بابا داؤد مشکواتیؒ کے مطابق مولانا خبازؒ نے بدعتیوں اور گمراہ لوگوں کے خلاف نظم ونثر دونوں میں بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان تصانیف میں کافی باریک بینی سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مولانا مذکور چند کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ فرماتے ہیں: "ایں مولانا صاحب تصانیف ست مثل ہدایت الاعمیٰ وغیرہ ذلک دراں رسالہ درحق حضرات گذشتہ مثل حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ و مولانا جلال الدین رومیؒ وامثال ایشان نیز جواب وسوال دارد"۔[3]

صاحب تذکرہ اولیائے کشمیر کے مطابق مولانا حسینؒ چند کتابوں کے مصنف ہیں۔ لیکن انہوں نے ہدایت الاعمیٰ کے علاوہ کسی اور تصنیف کا نام نہیں لیا ہے۔[4] ہدایت الاعمیٰ کے دو مخطوطے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ تحقیقات میں زیر نمبر ۵۴، ۹۲ موجود ہیں۔ ان میں سے پہلے نسخے کے ابتدائی اوراق ضایع ہو چکے ہیں اور دوسرا نسخہ ہر لحاظ سے مکمل ہے جو مولانا حسین خبازؒ کی وفات سے صرف دس سال بعد نقل کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کاتب نے اس کی تاریخ یوں درج کی ہے۔ "تمام شد کتاب ہدایت الاعمیٰ کہ از تصنیف ملا حسین کشمیری است۔ تاریخ رمضان المعظم ۱۱۶۲ھ ہزار یکصد شصت دو۔

مولانا حسین خباز کو فارسی نظم ونثر دونوں پر عبور حاصل رہا ہے۔ "ہدایت الاعمیٰ" فارسی نثر میں اپنے زمانے کی ایک اہم کتاب ہے جس کو انہوں نے جا بجا اپنے اشعار سے آراستہ کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب فارسی نظم ونثر کا ایک مرقع ہے۔[5]

مولانا حسین خباز نے کتاب کی تصنیف کرنے کے بارے میں کہا ہے کہ اندھوں کے لئے یہ کتاب رہنما

---

[1] حاشیہ واقعات کشمیر ص ۱۲۳

[2] تحایف الابرار ص ۱۹۳ [3] واقعات کشمیر ص ۱۳۲

[4] تاریخ اولیائے کشمیر ج ۲ ص ۲۶۰

[5] پاکستان میں فارسی ادب ص ۴۰۵ جلد ۲

اور باعث ہدایت ثابت ہو سکتی ہے۔ لگتا ہے کہ اُن کے پیش نظر وہ علماء و صوفی تھے جو اُن کی نظر میں سماع جیسی غیر شرعی محفلوں کا اہتمام کرتے تھے۔ معاصر صوفی بزرگ اور شاعر خواجہ حبیب اللہ حبی نوشہریؒ سے تو بڑی لے دے ہوتی رہی جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ مولانا خبازؒ سماع، رقص اور قوالوں کی صحبت اور موسیقی سننے کے شدید طور پر مخالف تھے۔ لہٰذا اس قبیل کے صوفیوں، عارفوں اور درویشوں کے ساتھ اکثر ان کے مناظرے ہوتے رہتے تھے۔ مولانا حسین خباز شرعی دلائل اور براہین پیش کر کے ان کو قائل کرتے تھے۔ ان کی دلائل میں وزن نظر آتا ہے۔ ہدایت الاعمیٰ میں ایسے صوفیوں اور درویشوں کی شرعی دلائل اور احادیث کی سند کے ساتھ نہایت ہی پُرزور الفاظ میں مذمت اور مخالفت کی گئی ہے۔ اور انہیں "اعمیٰ" کہا گیا ہے۔ "ہدایت الاعمیٰ" کے مقدمے میں وہ واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"دریں رسالہ کہ نام این ہدایت الاعمیٰ کردہ شدہ تا ہدایت کند اعمیٰ را و راہ نماید گمراہ را کہ دریں ضلالت والحاد و بدعت گرفتار است و بر ہر عارفی و عاشقی و صادقی کہ از خوانند و شنونده ایں رسالہ مطالعہ نماید و از چشم و گوش دل بعض اوقات دریں رسالہ مشغول شود اصل و فرع توحید و معرفت حق بداند و راہ راست یابد"[1]

کشمیر میں مولانا حسین خبازؒ غالباً پہلے عالم دین ہیں جو کسی صوفی سلسلے یا طریقہ میں رقص و سماع کے خلاف کھل کر سامنے آئے اور جنہوں نے اس کو شریعت اور طریقت دونوں کی رُو سے ناجائز اور گناہ ثابت کیا ہے۔ لیکن کشمیر کے تذکرہ نویسوں اور مؤرخوں نے اس مسئلے کی حقیقت اور اس کے جائز یا ناجائز ہونے کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے دور میں کشمیر کے سنی مسلک میں متعدد صوفی طریقے رائج تھے۔ ان میں سے دو طریقے اس دور میں سب سے زیادہ عروج اور کمالِ ترقی کو پہنچے تھے۔ یہ دو طریقے نقشبندی اور کبروی سلسلے یا طریقے تھے۔ کشمیر میں اس زمانے میں کبروی سلسلے کے ساتھ تعلق رکھنے والے صوفیوں میں سب سے مشہور صوفی صرفیؒ، حُبیؒ، میر خلیفہؒ، حمزہ کریریؒ وغیرہ تھے۔ صرفیؒ اس زمانے میں کشمیری کبروی سلسلے کے سب سے بڑے شاعر، پیرِ طریقت اور پیشوا سمجھے جاتے تھے اور حُبیؒ، میر خلیفہ اور حمزہ کریریؒ تینوں صرفی سے بیعت کر چکے تھے۔ صرفی کبروی سلسلے کے ساتھ تعلق رکھنے کے باوجود قوالوں اور صوفیانہ گلوکاروں کی صحبت میں رہ کر موسیقی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ برعکس اس کے نقشبندی سلسلہ کے ساتھ تعلق رکھنے والے صوفی شریعت اور طریقت دونوں کے زبردست پابند تھے۔ موسیقی، سماع، رقص۔ حتیٰ کہ وجد کو بھی

---

[1] کتاب ہدایت الاعمیٰ۔ ورق ۵۔ شعبہ تحقیقات کشمیر یونیورسٹی

ناجائز سمجھتے تھے۔

مولانا حسین خبازؒ اپنے دور کے ایک بڑے عالم اور مشہور صوفی بزرگ خواجہ اسحاقؒ کے شاگردِ رشید تھے جو خود حضرت شیخ مخدوم حمزہ کشمیریؒ کے ہاتھوں بیعت کر چکے تھے۔ حضرت مخدومؒ اپنے زمانے کے جیدّ عالم اور پیرِ طریقت ہونے کے علاوہ صوفیوں کے پیشوا تھے۔ عالمِ متبحّر حضرت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے تمام احادیث ان کو زبانی یاد تھے۔ مسائل پوچھنے کے لئے طلبا اور علما دونوں ہی انؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

شریعت محمدیؐ کے پابند اور سماع اور موسیقی کے بالکل مخالف تھے۔ چنانچہ ہدایت المخلصین میں بیان کیا گیا ہے :-

"(محبوب العالم) اصلاً و قطعاً از ابتدای تولد تا انتہائی زندگی عجیب ظاہر سازو سماع مسموع نکرد۔ واز شریعت قدم نگذاشت۔ خود سجادہ شریعت محمدیؐ عین محمودیؐ بود"

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اکبر اور جہانگیری دور میں کشمیر میں ان صوفی سلسلوں اور طریقوں کے عقائد میں ایک زبردست ٹکراو اور تناؤ تھا اور دونوں سلسلے اپنے عقائد کے متوالے اور اثبات میں دلائل پیش کرتے تھے۔

"ہدایت الاعمیٰ" میں مولانا خبازؒ نے طریقت کے بعض امور اور مسائل کو شریعت محمدیؐ، احادیث نبویؐ اور قرآنی آیات اور طریقت کے بعض صوفیوں کے ملفوظات سے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور "ہدایت الاعمیٰ" میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے ان کو مصنف نے مندرجہ ذیل (اٹھارہ) ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ باب اول :- دربیان آنکہ از جمال تفصیل ظاہر می شود۔ واز وحدت بکثرت واز احد بعدد۔

۲۔ باب دوم :- در بیان جامعیت انسان کہ جامع است از ہمہ اشیاء

۳۔ باب سوئیم :- در بیان ایمان و طریقت۔

۴۔ باب چہارم :- دربیان معرفت حق تعالیٰ۔

۵۔ باب پنجم :- دربیان شریعت۔ حقیقت

۶۔ باب ششم :- دربیان شریعت و طریقت و حقیقت آن از وجہ اثبات و نفی باشد۔

۷۔ باب ہفتم :- دربیان شریعت و طریقت و حقیقت کہ از فنا و بقا باشد۔

۸۔ باب ہشتم :۔ دربیان نبوت و ولایت

۹۔ باب نہم :۔ دربیان کرامت وکہانت واستدراج

۱۰۔ باب دہم :۔ دربیان علم وحقیقت کہ علم ظاہری و باطنی

۱۱۔ باب یازدہم :۔ دربیان توکل وحقیقت آن۔

۱۲۔ باب دوازدہم :۔ دربیان وجد و سماع وحقیقت آن۔

۱۳۔ باب سیزدہم :۔ دربیان نفی ومزامیر و آواز خوش شنیدن و صداقت آن۔

۱۴۔ باب چہاردہم :۔ دربیان حسن دیدن وحقیقت آن۔

۱۵۔ باب پانزدہم :۔ دربیاں باغ و گلزار در دیدن احوال آن

۱۶۔ باب شانزدہم :۔ دربیاں عبادت حق تعالیٰ

۱۷۔ باب ہفدہم :۔ دربیاں مذمت بدعت وحقیقت آن

۱۸۔ باب ہشدہم :۔ دربیاں شریعت ومتابعت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا خبازؒ نے "ہدایت الاعمیٰ" میں بعض معروف صوفیائے کرام مثلاً مولانا رومؒ اور شیخ عطارؒ وغیرہ سے سوالات کئے ہیں اور پھر ان کے اشعار اور ملفوظات سے ان سوالات کے جوابات دیتے ہیں اور اس طرح سے بعض صوفیوں میں رائج 'بدعتوں' کی طرف صریح طور پر اشارے بھی کئے ہیں۔ مولانا کی نظر میں ہر وہ نئی بات ناپسندیدہ ہے جس کی سند حضور سرورِ کونینؐ سے نہ ملتی ہو اور نہ ہی صحابہ کرامؓ یا تابعین سے اس کی تائید میں کوئی شرعی دلیل موجود ہو۔ؔ جس صوفی کے افعال شریعت محمدیؐ کے منافی ہوں اُس کا عمل مولانا خبازؒ کی نظر میں رحمانی نہیں۔ وہ "ہدایت الاعمیٰ" میں بیان کرتے ہیں: "پس باید دانست کہ کسی کہ مخالف شرع باشد اگر از وعجائب وغرائب وخوارق عادات درحالہ حیات ودر حالہ ممات ظاہر شود۔ آن استدراج است ونشان تجلیات او شیطانی است۔"

رقص وسماع کے متعلق مولانا حسین خبازؒ فرماتے ہیں کہ سرور کونینؐ، خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور تابعین وجد و سماع نہیں کرتے تھے اور ہر وہ کام جو انہوں نے خود انجام نہیں دیا کیسے جائز ہو سکتا ہے؛ چنانچہ "ہدایت الاعمیٰ" میں اس ضمن میں تحریر شدہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

پس باید دانست کہ زندگانی خود موافق متابعت اقوال واحوال وافعال محمد رسول اللہؐ وخلفائے راشدین وصحابہ وتابعین بگذرانی بر قول وفعل وحال

ؔ ہدایت الاعمیٰ برگ ۱۳

کہ مخالف ایشان باشد آن شیطانست نہ رحمانی و وجد و سماع مخالف صریح ایشان

است کہ محمد رسول اللہ و خلفائے راشدین و صحابہ و تابعین وجد و سماع نکردند

و نیت کردن ایں با ایشان گناہ است"

اُن کے نزدیک وجد کرنا اور سماع کے ساتھ دلچسپی رکھنا اسلامی اصول اور آئین شریعت کے سراسر خلاف ہے جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے ؎

رقص اگر وصل خدا باشد تمام ‌‌ ‌‌ ‌‌ واصلند ایں جملہ رقاصان بدام

مولانا حسین خبازؒ نے کسی بھی درویش کا نام اس سلسلے میں نہیں لیا ہے۔ لیکن "ہدایت الاعمیٰ" کی عبارت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ڈنکے کی چوٹ ان مقامی صوفیوں سے مخاطب ہیں جو رقص و سرود کی محفلوں کو آراستہ کیا کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی ہر دلیل اور برہان کے ساتھ ایک ایک حدیث بطور سند پیش کی ہے۔ مولانا عطارؒ کے کلام سے یوں دلیل پیش کرتے ہیں ؎

چوں دلش فانی شدی در بحر راز ‌‌ ‌‌ ‌‌ زود میل او فتادی در نماز

غرض بقولِ خبازؒ جو شخص توحید الٰہی میں مستغرق ہو جائے اس کو وجد و سماع میں مست ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

معاصر تذکروں سے اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے کہ حضرت خواجہ حبیؒ نوشہری نے آخر کار مولانا حسین خبازؒ کو سماع اور قوالوں کی صحبت میں موسیقی سننے کے لئے دعوت دی تھی۔ البتہ بعض تذکروں میں بیان کیا گیا ہے کہ مولانا کی سخت مخالفت کے باوجود خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ نے ترک سماع نہیں کیا تھا۔

مولانا حسین خبازؒ نے "ہدایت الاعمیٰ" میں سماع اور وجد کے بارے میں سوالات اور جوابات کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور مختلف سوالات کے جوابات دے کر ثابت کیا ہے کہ وجد و سماع اور رقص سنت نبویؐ کے خلاف ہے۔

"ہدایت الاعمیٰ" کشمیر میں اکبر اور جہانگیری دور میں لکھی گئی ہے اور یہ کتاب اپنی نوعیت کی اوّلین کتاب ہے جس کا بیشتر حصہ تصوف و عرفان کے بعض اہم مسائل اور صوفیانہ اصطلاحات کی تشریح کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بعض اہم سوالات کے جوابات بھی مصنف نے بیان کئے ہیں۔ ان کا اسلوب نگارش سہل، سادہ، دلنشین اور آسان ہے۔ لیکن مصنف نے بعض صوفیانہ اصطلاحات کی تشریح عالمانہ انداز میں کی ہے جس کی وجہ سے عام لوگ اس کے مطالب کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ کتاب میں بکثرت قرآنی آیات، احادیث نبویؐ اور بعض صوفی شعراء کے کلام سے اشعار بطور سند پیش

کیے گئے ہیں جو اگرچہ مناسب اور برمحل ہیں لیکن کبھی کبھی اکسا دینے والے ہیں اور اس سے کتاب کی روانی، سادگی، سلاست متاثر ہوتی ہے۔ "ہدایت الاعمیٰ" کا ایک نسخہ پشاور یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے جو مکمل ہے۔ اس پر کاتب کا نام درج نہیں ہے۔[1]

مولانا شاعر بھی تھے۔ "ہدایت الاعمیٰ" میں ان کے اشعار بکثرت ملتے ہیں۔ عام طور پر ان کے اشعار، شریعت اور طریقت کے اہم مسائل کی وضاحت اور تشریح کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمیشہ پند و نصیحت میں مشغول نظر آتے ہیں۔

مولانا حسین کی دوسری دستیاب تصنیف "کفایت الاعتقاد" ہے۔ فارسی نثر میں ان کی یہ کتاب "ہدایت الاعمیٰ" کے مقابلے میں نہایت ہی مختصر ہے۔ اس کتاب میں مولانا حسین خبازؒ نے اہل سنت والجماعت کے اعتقادات پر روشنی ڈالی ہے اور اس مسلک کے مخالفین، بالخصوص خوارجیوں کے بعض عقائد کو قرآن و سنت اور فقہ اور منطق کے آئینے میں پرکھا ہے۔

مولانا کا ایک اور کتابچہ، جو کہ دستیاب ہے۔ "راس الاعتقاد" ہے۔ یہ کتابچہ مختصر ہے اور صرف بیس اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کتابچے میں خلفائے راشدین کے ساتھ محبت رکھنے والے اہل سنت والجماعت کے عقائد کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ کتابچے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول :۔ دربیان فضیلت خلفائے راشدین۔

باب دوم :۔ دربیان واقعہ کہ درمیان حضرت علیؓ کرم و حضرت معاویہ۔

باب سویم :۔ دربیان سوالات کے بیاں پر خلفائے راشدین۔

باب چہارم :۔ دربیان مومنان۔

مولانا نے اس کتابچے کے ماخذ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جیسا ۱۔ احیائے العلوم از امام غزالیؒ۔
۲۔ غرابت الفوائد، طبقات ناصری۔

اس کتابچے میں بھی مولانا نے جا بجا اشعار برتے ہیں۔ یہ اشعار کہیں کہیں مغلق بھی ہیں اور عام لوگ انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔

مولانا خبازؒ عالم تو تھے ہی عابد و زاہد بھی تھے۔ ان سے کئی کرامات منسوب ہیں۔ خواجہ محمد صوفی سے نقل ہے کہ ایک دن نماز جمعہ کے بعد حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ ملا حیدر علامہ اور ان کا بیٹا

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب

محمد افضل حضرت آخوند ملا حسین خبازؒ کی ملاقات کو خانقاہِ ملک جلال ٹھاکور میں آئے۔ میں چھوٹا تھا اور حضرت ابو الفقرا (بابا غازی) کی جوتیاں اٹھاتا تھا۔ دروازہ کے پاس جوتیاں ہاتھ میں اٹھا کر کھڑا رہا آخوند ملا حسین سے ایک حدیث پڑھ کر ملا حیدر علامہ سے پوچھا اس حدیث شریف کا راوی کون ہے۔ محمد افضل نے کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ آخوند نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ملا حیدر کی طرف متوجہ رہے۔ انہوں نے بھی کہا۔ تیسرا خلیفہ اس حدیث کا راوی ہے۔ آخوندؒ نے کہا اگر آپ پہلے کہتے تو میں قبول کرتا۔ چونکہ آپ نے اپنے فرزند کے کہنے کی تصدیق کی۔ اس لئے میں شک میں پڑ گیا۔ اب تیسرے خلیفہ میں سے اس بات کی تصدیق کرائیں گے۔ اسی ضمن میں ایک نقاب پوش دروازے سے اندر آکر صدر کے مقام پر تشریف فرما ہوئے اور حاضرین مجلس تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوگئے اور ان کے پاؤں پکڑنے پھر آہستہ آہستہ آپس میں بات چیت کرنے لگے۔ نقاب پوش حضرت اٹھ کر نکلے۔ میں نے بھی دروازے پر ان کے قدموں کو ہاتھ لگایا۔ اور معلوم کیا کہ یہ کون صاحب تھے۔ مجھے بتایا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔[1]

کتابیات

۱۔ واقعات کشمیر

۲۔ تحالیف الابرار

۳۔ تاریخ حسن ج ۲

۴۔ ہدایت الاعمیٰ

۵۔ فارسی ادب کی تاریخ

۶۔ پاکستان میں فارسی ادب

۷۔ کشمیر از جی، ایم، ڈی صوفی

۸۔ کشمیر انڈر سلطانز۔ محب الحسن

۹۔ نگارستان کشمیر

۱۰۔ تاریخ کشمیر از فوق

۱۱۔ دیوان حبی

۱۲۔ اکبر اور جہانگیر کے دور میں کشمیر میں فارسی ادب

۱۳۔ ادبیات فارسی۔ پاکستان

۱۴۔ کفایت الاعتقاد

۱۵۔ راس الاعتقاد

۱۶۔ طبقات ناصری

۱۷۔ منتخب التواریخ

۱۸۔ تاریخ فرشتہ

۱۹۔ ریاض الاخیار

۲۰۔ اسرار الابرار

۲۱۔ ہدایت المخلصین

۲۱۔ علمائے ہند از رحمان علی

---

[1] واقعات کشمیر ص ۱۳۴ و تاریخ اولیائے کشمیر ص ۲۶۰

راجہ نذر بونیاری

حضرت بابا شیخ عبدالغفور رحمۃ اللہ علیہ

سری نگر سے اوڑی جاتے ہوئے جہلم ویلی روڈ کے ۷۰ ویں کلومیٹر پر دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر حضرت بابا عبدالغفور صاحبؒ کا آستانہ مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ اس پُر فضا مقام کا نام پیرنیاں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ کبھی ایک گھنا جنگل ہوا کرتا تھا جس کا قدیم نام "پری وَن" تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک نہ صرف اس جگہ بلکہ آس پاس کے کچھ دیہات بھی وہاں نہ تھے بلکہ اس سارے علاقے کو بڑے بڑے چھتنار درخت اور نوکیلی کانٹے والی جھاڑیاں سایہ کئے ہوئے تھیں جن میں خونخوار درندے اور سینکڑوں قسم کے پرندوں کے علاوہ سانپ اور دوسرے زہریلے کیڑے مکوڑے بکثرت موجود تھے۔ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے دیہات کے لوگ انتہائی غریب اور نادار تھے۔ ان کے پاس جو برائے نام زرعی اراضی تھی وہ پانی کی زبردست کمی کے سبب بے کار پڑی رہتی اور پھر قدرت نے اُن لوگوں کے حال زار پر رحم کھاتے ہوئے ایک مسیحا کو اس بے رونق بیابان میں جا کر اپنا ابدی مسکن قائم کرنے کیلئے بھیج دیا جس نے نہ صرف اُس زمانے میں جب تک وہ بقیدِ حیات رہے پرگنہ دچھنہ خصوصاً اور علاقہ پہاڑ کے عوام کی عموماً دینی، روحانی، تہذیبی اور معاشی سطحوں پر رہنمائی کی اور اُن کے مسائل اپنی روحانی قوت سے سلجھائے بلکہ عقیدت مند تو آج تک اُس بزرگ ہستی کے فیوض و برکات سے برابر مستفیض ہو رہے ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے لوگ بارہمولہ سے مظفر آباد تک پھیلے ہوئے ڈیڑھ سو کلومیٹر علاقے کو پہاڑ کہتے تھے اور آج تک اندرونی علاقے میں اس خطے کے لئے "پہاڑ" کا لفظ رائج ہے اور اسی پہاڑ میں زہم پورہ گاؤں سے کملکوٹ تک دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر آباد تقریباً تیس ہزار کی آبادی والے علاقے کو "دچھنہ" کہا

جاتا ہے اور پیرنیاں اس سارے علاقے کا ایک روحانی مرکز بنا ہوا ہے اور پورے دچھنہ کے کئی دیہات میں حضرت بابا عبدالغفور صاحبؒ کی جاگیریں آج بھی موجود ہیں۔ مقام پیراں۔ بجہامہ۔ نور نواہ گینگل۔ بمیار۔ لمبر پہلی پورہ۔ ناگناڑی۔ منزگام اور اجارہ دیہات میں کئی آثار اور یادگاریں حضرت بابا غفور صاحبؒ سے وابستہ ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر کے زرعی اصلاحات کے قانون کے نفاذ تک حضرت بابا غفورؒ کا نام محکمہ مال کے ریکارڈ میں ایک بڑے جاگیردار کی حیثیت سے مالک اراضی کے خانے میں موجود تھا اور سینکڑوں کنال زرعی اراضی اُن کے نام پر درج تھی۔ اس میں سے کافی زمین اب مزارعان کے نام منتقل ہو چکی ہے اور جو نہیں ہوئی ہے اس کے مزارعان ہر سال بابا غفورؒ کا حصّہ زیارت شریف کے منتظمین اور مقامی اوقاف کو برابر ادا کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو بابا غفور صاحبؒ کا کاشتکار سمجھنے میں سعادت اور فخر محسوس کرتے ہیں۔

حضرت بابا شیخ عبدالغفور صاحبؒ کی سیرت اور سوانح نگاری کا جہاں تک سوال ہے ماسوائے ایک بردوشر کے جو کئی سال پہلے اُن کے ایک خادم مرحوم عبدالمجید مسعودی نے اُن کے عرسِ پاک کے موقعے پر اجرا کیا تھا، اور کوئی دستاویز نہیں ملتی جس سے اُن کا شجرۂ نسب اور اُن کے اسلاف، اعزاء اور اقرباء کے بارے میں معلومات مل سکیں۔ حضرت شیخؒ کی سیرت و کردار، روحانی کرامات، اُن کی ازدواجی زندگی کے حالات اور دیگر خاندانی تفصیلات کے بارے میں جو روایتیں عام ہیں دراصل یہ سب سینہ بہ سینہ راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔

راقم الحروف کو موضع پیرنیاں کے ہی ایک بزرگ جناب غلام محمد مسعودی عرف ماہہ صاحبؒ جن کے والد بزرگوار درگاہ حضرت بابا غفور صاحبؒ کے اہم ترین خدّام میں سے ایک تھے، کے ہاں سے ایک مخطوطہ ملا۔ ؎ جس کے مطابق حضرت بابا عبدالغفور صاحبؒ قصبہ سوپور کے ایک روحانی بزرگ حضرت شیخ عبدالرحیم کے فرزند تھے۔ پانچ سال کی عمر میں دینی اور روحانی تلمذ کی خاطر سری نگر کے محلہ نرورہ جا پہنچے جہاں انہوں نے ایک استاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ آپ کا سلسلۂ معرفت سہروردیہ ہے۔ کئی سال نرورہ میں

؎ یہ قلمی نسخہ بیس اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ فارسی زبان میں تحریر ہوا ہے اور اس کا خط خوبصورت ہے۔ جن الفاظ میں پ، ٹ، چ، ڈ، ڑ، گ حروف آتے ہیں اُن میں ان غیر عربی حروف کے بجائے علامات کا استعمال کیا گیا ہے اور ایسا فارسی میں نہیں کیا جاتا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ کسی ایسی علمی شخصیّت کی کاوشِ بابرکت ہے جو عربی صرف ونحو سے واقف ہے۔ نسخہ ادھورا اور ناکافی ہے اور اچانک ایک جگہ آدھا جملہ لکھ کر چھوڑ دیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قلمی نسخے کا مؤلف کوئی عمر رسیدہ بزرگ ہے جو اس دستاویز کو مکمل کرنے سے پہلے ہی اس عالم فانی سے نقل کر گیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا کہ یہ قلمی نسخہ تقریباً سو سال پرانا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ
للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی
رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین
اما بعد الحمد و صلوات شروع میکنم
کرامات جناب شیخ عبد الغفور صاحب
فرزند عبد الرحیم صاحب ساکنہ
قصبہ سوپور از حکم قبلہ گاہی بابا شیخ اللہ
علم دین بعمر پنج سالگی در شہر محلہ

(جناب غلام محمد مسعودی صاحب کے ہاں سے ملے مخطوطے کا پہلا صفحہ)

روحانی تربیت پاتے رہے اور وہیں سے عرفان اور تصوّف کی پیاس بجھانے پنجاب کے شہر ملتان جا پہنچے اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے حلقہ مریدی میں شامل ہو گئے اور اپنی جھولی برصغیر کے اس مشہور ولی اللہ کی ودیعت کی ہوئی دولتِ معرفت سے بھر لی۔ دل عشق یا جنون سے پہلے ہی سے معمور تھا تصوّف اور روحانیت کے دوآتشہ نے مخمور کر دیا۔ حضرت بابا غفورؒ نے نرورہ میں قیام کے دوران دینی علوم بھی حاصل کر لئے تھے۔ وہ محض ایک صوفی بزرگ ہی نہیں تھے بلکہ عمر بھر شریعت کے بھی پابند رہے۔ اس کا ثبوت وہ آثار ہیں جہاں انہوں نے رات دن اللہ تعالےٰ کی عبادت کی۔ مراقبوں میں اپنے رب کی قربت حاصل کی۔ صوم وصلوٰۃ کو کبھی اپنے شب وروز سے الگ نہ کیا اور ساتھ ساتھ دنیا داری اور سماجی ربط و میل ملاپ کو بھی نہ چھوڑا کہ اگر ایک شخص شب وروز اللہ کی بارگاہ ہی میں رہے، تسلیم ورضا اور خود سپردگی کے عالم میں وہ دنیا کو بھول ہی جائے یا اپنے آس پاس کے ماحول سے اپنا رشتہ منقطع کرے تو وہ راہب کہلائے گا اور راہبانہ زندگی اسلام میں منع ہے۔

قانون قدرت یہی ہے کہ انسان بالعموم پختہ عمر اور کمال تجربہ کاری کے بعد ہی خرد یا عقلیّت کی منزلِ منتہا تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن عشق، عمر اور تجربے کا پابند نہیں۔ عالمی تاریخ میں کئی مثالیں ایسی ہیں کہ شاگرد اپنے اُستاد سے باطنی دنیا میں آگے جا نکلا ہے۔

حضرت بابا غفورؒ کا استاد کون تھا؟ اس کے بارے میں کہیں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ حضرت بابا مسعود نروریؒ اگر اسی زمانے میں گذرے ہیں تو پھر یقیناً وہی ان کے اُستاد رہے ہونگے۔ کیونکہ سینہ بہ سینہ جو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں ان میں بابا مسعود نروریؒ کا ذکر ہر روایت میں آیا ہے۔

نامعلوم سیرت نگار نے اپنے قلمی نسخے میں ایک واقعے کا ذکر کیا ہے کہ استاد نے عبدالغفور کو سبق کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"پڑھو الف"۔ شیخ نے کہا۔ "الف اللہ است"۔

ﷺ تاریخ حسن کی تیسری جلد جو کہ تذکرۂ اولیائے کشمیر سے متعلق ہے میں مورّخ حسن بابا عبدالغفور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ بابا عبداللہ نروری کے پوتوں میں سے تھے۔ یاد رہے کہ بابا عبداللہ، بابا مسعود نروریؒ کے بیٹے اور خلیفہ تھے۔ جیّد عالم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نہایت ہی پرہیزگار تھے۔ کشف قلوب، کشف قبور اور روشن دلی میں بے مثل تھے۔ وسعتِ دل اور خوش اخلاقی میں اپنی مثال آپ تھے۔ بابا عبداللہ کے اور بھی دو بھائی تھے، شیخ بابا حاجی اور شیخ حاجی ابراہیم۔ شیخ بابا حاجی بھی صاحبِ کشف وکرامات تھے۔ ارشاد کے درجے کو پہنچ کر انتقال کیا اور اپنے برادر بابا عبداللہ کی ہی طرح اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہیں۔ شیخ ابراہیم نیک اعمال اور حال کی بلندی اور قال کی شیرینی کے لئے بہت مشہور تھے۔ آپ نے دیوہ سرہ کے پرگنہ کے ایک گاؤں آکھرن میں وفات پائی اور انہیں وہیں سپرد خاک کیا گیا۔ ٥ —— (م۔ ا۔ ل)

"بارِ دیگر استاد صاحب گفت "بخوان ب" یعنی حرف با۔ حضرت ممدوح خواند۔
گفت۔ "بیشک گواہی میدہم کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرستادہ خدا است جل جلالہ"
بعدہ استاد صاحب فرمود۔ "بخوان حرف سیوم ت" یعنی حرف تا۔ درجواب حضرت مذکور گفت
کہ سیوم کسے نیست"۔

استاد نے حضرت کے مُنہ پر ایک طمانچہ مارا اور شیخ ان کے سامنے سے اٹھے اور نہ جانے کہاں چلے گئے۔
استاد نے بہت تلاش کیا۔ لیکن کامیابی نہ ملی۔ آخر کار انہوں نے عبدالغفور صاحب کے والد شیخ عبدالرحیم
کو اُن کے بیٹے کے لاپتہ ہونے کی اطلاع ایک خط کے ذریعے دی۔ شیخ عبدالرحیم صاحب سرینگر پہنچے اور
کئی دن تک شیخ عبدالغفور کو تلاش کیا اور جب وہ نا ملے تو مایوس ہو کر واپس سوپور لوٹ گئے۔ اسی درمیان
عبدالغفور صاحب جس وقت اپنے استاد کی مجلس سے اُٹھ آئے تو جاکر عیدگاہ والی مسجد میں چُھپ گئے اور تین دن
اور تین رات وہاں رہے یہاں تک کہ جمعۃ المبارک کی رات آگئی۔ اُس رات جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم
بمعہ چہار یار باصفا و اصحاب کبار رضؓ و سلسلہ داران چہاردہ خانوادہ مسجد شریف میں تشریف لائے اور مسجد شریف
میں قیام فرمایا۔ ان کے سامنے مئے معرفت کے چھ پیالوں کے بجائے سات پیالے لاکر رکھے گئے۔ اسی وقت میر
سید احمد کرمانیؒ مجلس میں حاضر ہوئے اور حضرت پیر دستگیر صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ کے خلفاء میں سے ایک خلیفہ
اسی مسجد شریف کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔ انہیں سامنے لایا گیا۔ ایک پیالہ معرفت انہیں بھی پلایا گیا اور
پھر انہیں حکم ہوا "تم شہر ملتان جاؤ جہاں بوعلی قلندر متمکن ہیں۔ جاؤ ان سے آگے کی تعلیم حاصل کرو۔"
عبدالغفور صاحب نے کہا۔ "میں پانچ سال کا بچّہ ہوں، میں کیسے ملتان پہنچ سکتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے حضرت میر سید احمد کرمانیؒ سے کہا کہ اپنے خلیفہ کو ملتان پہنچاؤ۔ میر سید احمد کرمانیؒ نے بابا غفور کا ہاتھ اپنے
ہاتھ میں لیا اور اُن کا پاؤں اپنے پاؤں کے اوپر رکھا اور شہر ملتان جا پہنچے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بوعلی
قلندرؒ کے سامنے جلوہ گر ہوئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ شیخ عبدالغفور کو اپنے حلقۂ درس میں شامل کر لیں اور
اُن کو صحیح تعلیم و تربیت دیں۔ ؎

؎ تاریخ حسن میں بابا عبدالغفور کے ملتان پہنچنے اور بوعلی قلندرؒ سے تعلیم و تربیت پانے کے سلسلے میں یوں لکھا ہے:
"ازل کی یاوری سے ترک دنیا کر کے مرشد کی تلاش میں ملتان گئے اور بڑے بڑے صاحبدلوں اور خدا دوستوں کی
صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ خصوصاً داتا بوعلی قلندرؒ کی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہو کر سلوک کی منزلوں اور مرحلوں
سے آشنا ہو کر سخت ریاضت اور عبادت میں مصروف ہو کر دل کے چراغ کو روشن کیا اور ارشاد کے سرمایہ کو بہم
پہنچایا۔ ان کے کشف و کرامات کا شہرہ سُن کر حاکم ملتان اُن کا مرید ہو گیا۔" ٥ــــ (م۔ و۔ ا)

حضرت بابا غفور ایک دفعہ اپنے گھر میں خلوت میں تھے کہ پیر صاحب (بوعلیؒ) کے حکم سے باہر آئے اور "پہاڑ" کہ جس کا نام "دچھنہ" رکھا، کی طرف جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ پیر صاحب نے وہاں کے بادشاہ سے اُن کی اس خواہش کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے منع فرمایا اور کہا کہ جب تک اُن کا یہاں کا قیام پورا نہ ہو جائے انہیں یہاں سے نہ جانے دیا جائے اور ملکِ غیر میں ان کی حفاظت کے لئے اس وقت کسی کو ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ یاد رہے یہ واقعہ بقول راوی ملتان میں ان کے قیام کے بارہ سال گذر جانے کے بعد ہوا ہے۔ حضرت بابا ممدوح نے خدا سے دعا مانگی کہ اے اللہ! میری روح قبض کر لے (اسی مسجد میں) لیکن مجھے دفن نہ کیا جائے اور مجھے اسی طرح اسی قالب میں اپنے وطن پہنچا دے۔ چنانچہ ان کی دعا مستجاب ہوئی اور وہ فوت ہوئے لیکن اُن کو دفنا دیا گیا۔ چند دنوں کے بعد اللہ پاک نے ان کے جسم میں پھر روح پھونک دی۔ وہ اٹھے اور اسی مسجد شریف میں آئے جہاں انہوں نے چلہ گذرا تھا۔ انہوں نے مسجد شریف کو حکم دیا کہ میرے ساتھ کشمیر چلو۔ مسجد شریف اُن کو لے کر چل پڑی۔ اسی درمیان ایک اور طالب علم نے حضرت بوعلی شاہؒ کو جا کر یہ خبر سنائی کہ عبدالغفور مسجد شریف کے سمیت ملتان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ حضرت بوعلیؒ نے کہا۔ "عبدالغفور تم نے بیوفائی کر کے اچھا نہ کیا۔ واپس آؤ۔"•

بابا عبدالغفور صاحبؒ نے مسجد شریف سے کہا "میرا مرشد مجھ سے روٹھ گیا۔ تم واپس جاؤ۔" لیکن خود ایک شیر پر سوار ہو کر اپنا بوریا بستر اور کچھ دوسری اشیاء لے کر روانہ ہوئے اور دچھنہ کے ایک گاؤں (اسنزگام میں) آ کر ایک جگہ رک گئے۔ وہاں ایک کسان انہیں پردیسی فقیر سمجھ کر کھانا کھلاتا رہا۔ اس کے عوض میں باباؒ اس کسان کے ریوڑ اور مال مویشی کو جنگل میں چرا لیتے۔ ایک دن گاؤں والوں نے دیکھا کہ بابا صاحب تو خود

• تاریخ حسن میں درج واقعات اس ضمن میں حقیقت پسندانہ لگتے ہیں اور قرین قیاس بھی ہیں کیونکہ کوئی طالب، مرید یا خلیفہ اپنے مرشد کے حکم کو ٹال نہیں سکتا اور نہ اس کی کوئی گنجائش ہی ہے۔ مرشد کے حکم کی نافرمانی کی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ حکم عدولی کا تصور تک اس سلسلے میں حکم عدولی کے مترادف ہے۔

حسن اس ضمن میں رقمطراز ہیں کہ ..... "ایک دن مرشد بزرگوار نے انہیں وطن جا کر لوگوں کی رہبری اور رہنمائی کرنے کی رخصت بخشی اور آپ کشمیر آنے کو تیار ہو گئے۔ لیکن حاکم ملتان نے اجازت نہ دی اور کہا کہ جب تک جناب زندہ ہیں، وطن جانے کی اجازت نہ دوں گا۔ باباؒ لحاظ کے موجب مجبور ہو گئے اور ایک ہفتہ گزرنے پر انہیں مرشد کی حکم عدولی کا خیال آیا اور بہت ڈر گئے اور اسی ضمن میں دنیا سے نقل کی۔ حاکم ملتان نے تجہیز و تکفین کر کے وہیں دفن کیا۔ اسی رات حضرت باباؒ زندہ ہو کر قبر سے نکلے اور مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر کشمیر آنے کی رخصت حاصل کی اور کشمیر چلے آئے اور علاقہ دچھنہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ کچھ مدت بعد نکاح کیا اور مرتے دم تک لوگوں کی فیض رسانی میں مشغول رہے۔ • ..... (م۔ ۱۔ ۱)

عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں اور مال مویشی کی حفاظت شیر کرتا ہے۔ اس سے راز افشا ہوا اور آس پاس کے دیہات کے سینکڑوں لوگ بابا کی خدمت میں اپنے مسائل کے روحانی حل کے لئے آنے لگے۔ اس طرح بابا غفور پورے علاقہ دچھنہ میں مشہور ہو گئے۔ اسی دوران ان کی شادی ایک نواحی گاؤں کے درویش کینو جو وہاں کا ذیلدار اور رئیس تھا کی دختر سے ہوئی۔ اُن سے دو نرینہ اولاد ہوئیں۔ راوی کہتے ہیں کہ باباصاحب کی بیوی جسے لوگ دیدہ صائب کہتے تھے، بھی بہت اللہ والی خاتون تھیں۔ وہ منز گام میں جس مکان میں رہتی تھیں، اس میں ایک سانپ کا جوڑا رہتا تھا۔ دیدہ صائب روزانہ اُن کے دو بچوں کو دودھ وغیرہ پلاتیں۔ ایک دن دونوں سنپولے گرم دودھ میں گر پڑے اور جل کر مر گئے۔ اُن کی ماں نے باباغفور سے فریاد کی تو باباغفور نے کہا۔ "جا تو ہمارے بچے لے جا"۔ کہا جاتا ہے اُن کے دونوں صاحبزادے اسی دم انتقال کر گئے۔ انہیں منز گام میں دفنا دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد دیدہ صائب نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ کہتے ہیں ان کے بعد بابا نے گانز مولا میں میر خاندان میں شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُن کی دوسری بیوی بھی عالم شباب میں رحلت کر گئیں۔

بابا عبدالغفورؒ کی عمر کا تین چوتھائی حصہ پہاڑ خصوصاً پرگنہ دچھنہ میں گذرا۔ اس دوران انہوں نے اپنی روحانی قوت سے اس علاقہ کے لوگوں کے بے شمار مسائل حل کئے۔ ناگنار ڑی، اجارہ، منز گام، پہلی پورہ دیہات میں آبپاشی کے لئے پانی نہیں ملتا تھا جس سے کسانوں کی ساری محنت بے کار ہو جاتی تھی اور عام لوگوں کو فاقہ کشی اور قحط سالی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور سینکڑوں لوگ اپنا وطن چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ حضرت بابا عبدالغفورؒ نے ربّ العالمین سے دوران مراقبہ خصوصی دعائیں مانگیں۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور عوام میں ان کو سرخرو کیا اور اس علاقے میں پانی کے کئی چشمے اُبلنے لگے۔ کئی سال تک بارشیں بھی خوب ہوتی رہیں اس کے ساتھ ساتھ باباصاحب لوگوں کی علمی اور روحانی تربیت بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کئی مساجد اور خانقاہیں بھی اپنی نگرانی میں تعمیر کرائیں۔

بابا عبدالغفورؒ کے بارے میں راوی کئی کرامتوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے صرف چند ایک کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

- کہتے ہیں کہ موضع گنگل میں کسی نے انہیں رات کو رہنے کے لئے جگہ نہیں دی تو انہوں نے جنوں کو حکم کیا کہ ان کے لئے ایک اچھا سا مکان بنا ڈالیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مکان اس صدی کے آغاز تک موجود تھا۔
- موضع لمبر میں انہوں نے ایک خبیث جن کو اس کے خاندان سمیت ہلاک کیا اور وہاں کے لوگوں کو اس

شیطان کے ظلم سے آزاد کیا۔

• موضع پہلی پورہ کے رئیس وریش کنیو، جو اُن کے پدرِ نسبتی بھی تھے کو حضرت نے پہلی پورہ اور پیرنیاں کی کچھ زرعی اراضی اپنے حلقۂ مریداں کے لئے طلب کی۔ وریش کنیو نے کہا کہ چونکہ وہ سلسلہ قادریہ کے مرید ہیں اس لئے سلسلہ سہروردیہ کے کسی پیر کو نیاز نہیں دے سکتے۔ اس پر بابا عبد الغفورؒ نے اس خاندان کو بددعا دی۔ کہتے ہیں آج تک اس خاندان کی ایسی منصوبہ بندی ہوئی کہ پوری وادی میں اس خاندان کے صرف دو تین گھر رہ گئے ہیں اور معاشی طور پر بھی وہ نہایت کمزور اور پسماندہ ہیں۔

• حضرت بابا عبد الغفورؒ موضع بجہامہ جاتے ہوئے جب نور خواہ گاؤں میں پہنچے تو انہیں سخت بھوک لگی تھی اور جس گھر میں کھانا مانگنے جاتے وہاں سے کوئی باہر نہ آتا۔ چلتے چلتے دور براری پورہ گاؤں جو بجہامہ سے چند کلومیٹر دور ہے، پہنچے۔ وہاں ایک بوڑھی بیوہ اپنے گھر میں بیٹھی تھی۔ حضرت عالی نے دروازے پر جاکر رات بسر کرنے کے لئے بیوہ سے اجازت مانگی۔ اُس خاتون نے نہ صرف رات کو اپنے گھر میں قیام فرمانے کی پیش کش کی بلکہ اُن کی خاطر مدارت اور کھانے پینے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جو کچھ بھی اس سے ہو سکا پیش کر دیا۔ رات اچھی طرح سے بسر کی اور علی الصبح نماز فجر کے لئے باہر گئے۔ نماز کے بعد دعا میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد کشمیری زبان میں کہا:

"حولہ حسا مَندِھ کرِھ اَنْدکہر"

ان کا یہی کہنا تھا کہ ایک اونچے پہاڑ پر بادل پھٹنے سے اس سارے علاقے میں سیلاب آگیا اور بجہامہ سے لیکر نور خواہ تک تباہی مچا گیا۔ بوڑھی عورت دوڑتے ہوئے حضرت کے پاس پہنچی اور سارا معاملہ بیان کیا اور عرض کیا کہ اس کا مکان بھی زد میں آنے والا ہے۔ حضرت نے اسے کشمیری زبان میں کہا:

"گرِھ شُپ تھاوِ ڈُکھس"

بوڑھی عورت نے چھاج مکان کے اس طرف رکھا جس طرف سے پانی آرہا تھا۔ سیلاب کے پانی نے اپنا رُخ بدل ڈالا اور صرف یہی ایک ٹکڑا بچ گیا۔

• علاقہ بجہامہ کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قاضی ناگ نام کا ایک "تصرف دار" اُن کے کھیت کھلیانوں کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ قاضی ناگ ایک اونچی چوٹی کا نام ہے جو ہندوارہ اور اوڑی کے درمیان واقع ہے۔ اس چوٹی سے آنے والی سرد اور تند و تیز ہواؤں، بجلیوں اور اولوں کی زد میں بجہامہ لازمی طور پر آتا ہے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت بابا عبد الغفور کی ناراضگی کا نتیجہ ہے تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دست بستہ معافی مانگی اور عرض کی کہ گذشتہ کچھ برسوں سے اس علاقے پر روزانہ آسمانی بجلیاں گر رہی ہیں

اور جان و مال کا نقصان ہو رہا ہے۔ حضرت نے باری تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا فرمائی جو قبول ہوئی اور آسمانی بجلیاں گرنا بند ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے اسی واقعہ کے بعد اس گاؤں کا نام بجہامہ پڑا، جس کا مطلب ہے "بجلیوں کا گھر"۔ بابا غفورؒ نے بابا گیل میں ایک چڑیل جسے کشمیری زبان میں "رانٹس" کہتے ہیں کو قابو کیا اور اسے کئی دنوں تک ایک مکان میں قید رکھا۔ اس کے بعد اس کو لوگوں کے سامنے ہلاک کر دیا۔

قلمی نسخے میں نامعلوم راوی نے لکھا ہے کہ وہ قُم بِاذنِ اللہ کا وظیفہ بھی کرتے تھے۔ چنانچہ بقول راوی سوپور اور بجہامہ میں انہوں نے دو مرتبہ قُم بِاذنِ اللہ کہہ کر "جمعہ" اور "یارمو" نام کے دو افراد کو زندہ کر دیا۔ واللہ اعلم۔

- بابا عبدالغفور صاحبؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کسی قسم کا گوشت یا مچھلی وغیرہ پسند نہیں کرتے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جب وہ سوپور سے منزگام آرہے تھے، بوسیاں کے پہاڑ کو عبور کرتے وقت انہوں نے قصبہ بارہ مولہ میں دیکھا کہ کوئی وہاں گوشت بھون رہا ہے۔ حضرت نے اس مکان کی طرف انگلی اٹھا کر اس کے جل جانے کی بددعا کی تو آدھا قصبہ جل گیا۔

گوشت خوری کے بارے میں ان کی رائے کیا تھی، یہ بتانا مشکل ہے لیکن جب ہم عالم تصوف و عرفان میں جھانکتے ہیں تو ہمیں اور بھی بہت سے ایسے بزرگ لوگ ملتے ہیں جو گوشت اور ماہی کا استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے پیروکاروں کو بھی گوشت خوری سے منع کرتے تھے۔ وادیٔ کشمیر میں بتہ مالو صاحبؒ کے ساتھ بھی یہی روایت وابستہ ہے۔

موجودہ زمانے کے بہت سے علماء اور آزاد خیال حضرات کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے حضرت باباؒ سے یہ بات مصلحتاً فرضی طور پر وابستہ کی گئی ہو۔ ان کے خیال میں ہر مسلمان کے لئے گوشت کھانے کی پوری اجازت ہے اور شریعت میں اس کی کوئی ممانعت نہیں۔

لیکن دوسری بات جو میری سمجھ میں آئی ہے یہ ہے کہ چونکہ کشمیری صوفی مت عراقی اور ایرانی صوفی ازم سے مختلف ہے۔ اس لئے اس میں بعض نئی باتیں ملتی ہیں۔ ایران اور برصغیر کے دوسرے حصوں میں اہل تصوّف کچھ چیزیں شریعت کے حصار سے باہر کی بھی کرتے رہے ہیں، جن میں محفلِ سماع، جنگلوں اور ویرانوں میں مراقبہ اختیار کرنا، اپنے آس پاس ہر قسم اور خصلت کے لوگوں کو جمع رکھنا وغیرہ۔ چونکہ کشمیری تصوّف پر قدیم ویدانت کے فلسفے کا بھی اثر رہا ہے، اس لئے انہیں اس سے الگ الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کشمیر سے باہر ریشی ایک پہنچے ہوئے سادھو سنت کو کہتے ہیں۔ لیکن وادی میں سب ریشی مسلمان گذرے ہیں۔

ایک بات اور ـــــ وہ یہ کہ اِن صوفیوں کے دروازے ہر مذہب کے لوگوں کے لئے کھلے رہتے تھے اُن کے خدام اور خلفاء میں کشمیر کے غیر مسلم بھی رہے ہیں جو من کی مرادیں پانے کے لئے اُن کی مجلسوں میں آتے رہتے تھے ۔ اِس لئے بھی ان صوفیائے کرام کے لنگر خانے اکثر ویجی ٹیرین ہوتے تھے ۔ یوں بھی شیخ عبدالغفور دوسرے کشمیری مسلمانوں کی طرح دیکھا جائے تو 'نومسلم' ہی تھے ۔

بہرحال وجوہات کچھ بھی کیوں نہ ہوں ۔ ایک بات جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا وہ یہ ہے کہ تقویٰ، پرہیزگاری اور تزکیہ نفس کے لئے بعض اوقات حلال چیزوں کو بھی باشریعت لوگ استعمال نہیں کرتے ۔ بقول راوی اگر حضرت شیخ گوشت و ماہی تناول نہیں کرتے تھے لیکن انہوں نے کہیں بھی دوسرے لوگوں کو گوشت کھانے سے منع نہیں کیا ۔ یہ تو صرف احترام کے طور پر ایک روایت جاری ہے کہ گوشت کھا کر ان کے آستانے کے اندر اگر نہ جائیں تو یہ اُن کے تئیں عقیدت کا ثبوت ہوگا ع

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اور اگر یقین نہیں تو پھر اُن کے ہاں جانے کا فائدہ کیا؟ نہ اس سے نقصان ہوگا نہ کوئی نفع ۔

اگر انہوں نے جلال میں آکر کسی گوشت خور کو اپنی ناراضگی کا نشانہ بنایا، تو یہ صرف ایک علامتی احتجاج تھا یا پھر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ـــــ اور اللہ تعالیٰ اپنے پیارے دوستوں کی جائز پسند اور ناپسند کا خیال ہمیشہ فرماتے رہتے ہیں ۔ کیونکہ آخر اُس کے اِن پیاروں نے اپنے لئے نہیں صرف اللہ کے لئے ہی یہ لذت اور آرام ترک کیا ہوا ہوتا ہے اور اللہ کے نزدیک وہ پسندیدہ لوگ ہوتے ہیں بلکہ اللہ کے محبوب ہوتے ہیں جو نفس کُشی کو اپنا شعار بناتے ہیں کیونکہ وہی انسان اللہ کو پہچان سکتا ہے جو پہلے اپنے نفس کو پہچانتا ہو ۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گوشت سے اُن کے پرہیز کی وجہ کچھ اور ہو، جو ہماری سمجھ میں نہ آئی ہو اور جسے وہ ہی جانتے ہوں ۔ واللہ اعلم ۔

بابا صاحبؒ کے خدام اور خلفاء نے حضرت کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے :

"میانہ قد ـــ مضبوط جسم ـــ گورا رنگ، گھنی سفید داڑھی، کشادہ پیشانی ۔ شانوں پہ پڑے ہوئے گیسو ۔ سیاہ گھنی پلکوں کے اندر پُر جلال آنکھیں ۔ پُر وقار شخصیت ۔ ٹخنوں تک لمبا اونی پھرن (لمبا کرتا) ۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں ۔ پیشانی پر عبادت اور ریاضت کی نشانی کے طور پر پڑے ہوئے گھٹے میں سے نکلتی ہوئی نور کی شعاعیں ۔"

نامعلوم سال کی ۲۶ رماہ صفر[1] کو حضرت بابا عبدالغفورؒ اس دنیائے فانی سے نقل کر گئے۔

کہا جاتا ہے کہ انتقال سے پہلے انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ انہیں تابوت میں رکھا جائے اور دفنایا نہ جائے (کیونکہ وہ ایک بار پہلے ہی دفن ہو چکے تھے[2])۔ تابوت خود ہی اس مقام پر اُڑ کر جائے گا جو ان کی ابدی آرام گاہ بنے گا۔ ایسا ہی ہوا ــــ تابوت اُن کے جسدِ خاکی کو لے کر اُڑا اور دریائے جہلم کے کنارے جھاڑیوں میں رک گیا۔ بعد میں کئی دنوں کے بعد لوگوں نے اسے اس وقت دیکھا جب کچھ چڑیاں اُن کے تابوت کی جگہ شور مچا رہی تھیں۔ اُسی جگہ ان کا آستانہ تعمیر کیا گیا[3]۔

یاد رہے تابوت کا سرہانہ مغرب کی طرف ہے اور پائنتی مشرق کی طرف، جو آج تک اُسی طرح ہے۔

عام تاثر یہ تھا کہ ان کا تابوت معلق ہے۔ لیکن راقم نے جناب حافظ کشمیری کے ہمراہ اس کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا اور تصویریں کھینچیں۔ تابوت چار خوبصورت پایوں پر ہے جو فرش پر ہیں۔ یہ تابوت تقریباً

---

[1] تاریخ حسن میں اُن کی تاریخ وفات ۲۶ رماہ صفر المظفر ۱۱۰۵ھ درج ہے۔ ○ ــــ (م۔ و۔ ی)

[2] اس سلسلے میں اگلے صفحات میں ایک حاشیہ میں پیر غلام حسن شاہ کے حوالے سے عرض کیا جا چکا ہے کہ حاکم ملتان کے اصرار پر حضرت بابا عبدالغفورؒ چند دن ملتان میں قیام کرنے کے بعد رحمت حق ہو گئے۔ حاکم ملتان نے تجہیز و تکفین کر کے وہیں دفن کیا۔ لیکن اسی رات زندہ ہو کر اپنے مرشد سے اجازت لیکر کشمیر آئے۔ اور علاقہ دچھنہ میں گوشہ نشیں ہو گئے۔ کچھ مدّت کے بعد آپ نے نکاح کیا اور تادمِ واپسیں لوگوں کی فیض رسانی میں مشغول رہے اور اچھی عمر پا کر ۲۶ رماہ صفر ۱۱۰۵ھ کو رحلت فرمائی۔ وفات سے پہلے آپ نے وصیت فرمائی کہ مجھ میں عذابِ قبر برداشت کرنے کی طاقت نہیں اور پہلی قبر کے عذاب کی تلخی ابھی مجھے بھولتی نہیں۔ اس لئے میرے جسد کو بعد غسل اسی خرقے میں (بغیر کفن پہنائے) تابوت میں رکھیں۔ نماز جنازہ کے بعد تابوت جس جگہ جا کر بیٹھے گا، تابوت کے اردگرد ایک دیوار اٹھا دی جائے۔ دفن کسی بھی صورت میں نہ کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق ایسا ہی کیا گیا۔

[3] تاریخ حسن کے مطابق جب حضرت باباؒ کا تابوت اُڑ کر دریا کنارے آگیا تو لوگوں نے تابوت پر لکڑی کی چھت بنا دی اور اس کے اردگرد روضہ تعمیر کیا۔

کہا جاتا ہے کہ حاجی کریم خان داؤد حاکم نے خوش اعتقادی کے سبب حضرت باباؒ کے جسد خاکی سے خرقہ اتروا کر اور اسے کفن پہنا کر اور نماز جنازہ پڑھ کر اسے اپنی جگہ رکھ دیا۔ اسی رات حضرت باباؒ نے اپنے ایک خلیفہ (معتقد) کو خواب میں بتایا کہ میں عریاں ہوں، مجھے خرقہ پہنا دو۔ دوسری صبح دیکھا گیا کہ حضرت باباؒ کا جسد خاکی واقعی بے کفن ہے۔ کفن ایک طرف رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت باباؒ کے جسد خاکی کو اپنا خرقہ پہنا دیا گیا۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ سو سال گذر جانے کے باوجود حضرت باباؒ کے جسدِ پاک کو کوئی گزند نہیں پہونچی تھی بلکہ یوں لگتا تھا کہ آپ جیسے محوِ خواب ہیں۔ (ادارہ)

ساڑھے سات فٹ لمبا، تین فٹ چوڑا اور تین فٹ اونچا ہے اور دیودار کی لکڑی کا بنا ہوا ہے اور لوہے کی کیلوں سے بند ہے۔ سامنے کی درز سے کچھ پرانی چھینٹ کا تھوڑا سا کپڑا باہر نکلا ہوا ہے۔ اس کے اوپر دو غلافیں ہیں۔ یہ تابوت ایک خوبصورت گول گنبدوں کے چبوترے میں رکھا گیا ہے۔ یہ چبوترہ دیودار کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ سرپوش سفید جپسم یا چونے کا ہے۔ اندرونی چبوترے کو انتہائی محنت سے بنایا گیا ہے اسمیں قدیم طرز کے چوبی پردے بنے ہوئے ہیں جو پنجرکاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ باہر سے عمارت کافی اونچی دکھائی دیتی ہے جو تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ سب سے اوپر لکڑی کا کلس سا بنا ہے۔ چھتیں ٹین پوش ہیں جو پچاس کی دہائی میں بنائی گئی ہیں۔ عمارت تقریباً ڈھائی سو سال پرانی ہے۔ اس کے آس پاس گھنے درخت اور جھاڑیاں ہیں، پھلدار درخت بھی ہیں۔ سیب کے چند پودوں کو پیوند لگایا گیا تھا لیکن اس کے باوجود ان درختوں پر جو پھل لگتے ہیں وہ انوکھے قسم کے ہیں۔ پوری وادی میں اس قسم کے سیب نہیں ملتے۔

احاطۂ آستانہ میں بابا غفور صاحبؒ کے اعزہ واقارب کے مقبرے ہیں۔ آستانہ کے سجادہ نشین پیرزادہ محمد مقبول مسعودی ہیں۔ جو ایک سرکاری افسر بھی ہیں۔

ہر سال ۲۶ صفر کو یہاں عرس منایا جاتا ہے، جو ایک ہفتے تک جاری رہتا ہے۔ وادی کشمیر کے کونے کونے سے عقیدت مند خواتین وحضرات اور بچے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ عرس کے دنوں میں تبرکات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ درود واذکار کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور حضرت بابا غفورؒ کی سیرت اور کارناموں پر واعظ اور مقررین روشنی ڈالتے ہیں۔ اس دن منزگام میں اُن کے قدیم رہائشی مکان بمقام پیران، بجہامہ، لمبر اور پہلی پورہ میں بھی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔ ؏

خدا رحمت کُند ایں عاشقانِ پاک طینت را



نشاط انصاری

حضرت بابا شکور الدین ریشیؒ

ہماری یہ زیبا نگار وادی عارفوں اور صوفیوں، سادھوؤں اور سنتوں اور رشیوں و منیوں کی سرزمین ہے۔ یہاں کی شاید ہی کوئی بستی ایسی ہوگی، جہاں کسی نہ کسی روحانی شخصیت کی کوئی زیارت، خانقاہ یا روضہ مرکزِ کشش نہ رہا ہو۔ وادی کے جس کسی علاقہ، پرگنہ یا گاؤں سے آپ گزر جائیے، ضرور کسی خدارسیدہ بزرگ کی کوئی نہ کوئی زیارت یادگار آپکو دکھائی دیگی۔ اسی حقیقت کے نتیجے میں وادی کے اطراف و اکناف میں، روحانیت سے سرشار درویشوں، زاہدوں اور دیدہ وروں کی وہ بہت سی زیارتیں ملیں گیں، مقدس خانقاہیں و درگاہیں نظر آئی گئیں اور پوتر استھاپن ملینگے جو زمانہ قدیم سے مرجعِ خلائق بھی رہے ہیں اور یہاں کی روایتی یگانگت، ایک جہتی اور خداشناسی کی زندہ جاوید علامتیں بھی۔ چنانچہ اس مادی اور ٹیکنالوجی دور میں بھی ان باعثِ کشش اور مقدس مقامات کی اہمیت کسی بھی طرح کم نہ ہوئی ہے۔

ان ہی عارفوں اور صوفی سنتوں نے وادی کے ہر حصے میں عرفان کی وہ شمعیں روشن

کرلی ہیں، جن کے نور کی تابانی سے نفس امارہ کی آغوش میں پڑے ہوئے بے شمار لوگوں نے فیضان پاکر قرب الٰہی پالیا ہے۔ الوہیت کے درجہ پر فائز ان ہی درویشوں اور روحانی بزرگوں کے زہد و تقویٰ کی برکتوں سے وادی کشمیر کو اگلے وقتوں سے ہی "پیر وار" یعنی پیر پرستوں کی بھومی قرار دیا گیا ہے۔ فیض و برکت اور روحانیت سے مملو ان ہی درخشندہ ستاروں میں جن باعمل اہل اللہ اور روحانیت کی علامتوں نے خداشناسی کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیبی و ثقافتی روحانی زندگی اور علم و ادب کی دھاراؤں کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان کا سر فہرست ہیں سید شرف الدین بلبلؒ، سید حسین سمنانی، سید تاج الدینؒ، سید جلال الدین بخاری، حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ، میر سید محمد ہمدانی، سید حسین خوارزمی، سید محمد مدنی، میر سید حسین قمی، سید محمد امین اویسی، میر شمس الدین اراکی[1]، حاجی سید مراد، سید حسین منطقی، سید بہاء الدین نقشبند مشکل کشا وغیرہ۔

تواریخی کتب میں اگرچہ سادات ایران کی تعداد سات سو کے قریب دکھائی گئی ہے لیکن مورخ حسن نے تاریخ حسن کی تیسری جلد "اسرار الاخبار یا تذکرہ اولیائے کشمیر" میں ایران سے آئے ہوئے ان سادات کی تعداد دو سو پندرہ کے قریب لکھی ہے جنہوں نے وادی بھر میں تبلیغ اور اشاعت دین اسلام کے سلسلے میں خداشناسی، زہد و تقویٰ، عرفان اور روحانیت کے وہ سوتے بہا دیئے، جن سے کہ صاحبان سلوک و طریقت نے اپنی پیاس

---

[1] عام مورخوں نے میر شمس الدین کو عراق کا باشندہ جتلایا ہے۔ جب کہ یہ حقیقت سے کوسوں دور ہے وہ دراصل ایران کے شہر اراک (ARAK) کے رہنے والے تھے اور یہ شہر صوبہ اصفہان کے شمال و مغرب اور تہران کے جنوب و مغرب میں واقع ہے اور وہاں کے سیاحتی مرکزوں میں اہم مرکز مانا جاتا ہے۔

(بحوالہ جنرل میپ آف دی اسلامک ری پبلک آف ایران نقشہ نمبر ۱۷ ۰۰۵ - ۳۳ م)

[2] کشمیر اسلام کے سائے میں از میر سید مقبول ہمدانی

بھی ملتی۔ ریشی ہدایت کے ان نقیبوں سے قطع نظر مورخ حسن نے اپنی مذکورہ تاریخ میں دیگر
مشہور اور غیر مشہور ریشیوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ بیان کی ہے۔ مگر ان ریشیوں کی کل تعداد
سو سوا سو کے قریب بتائی گئی ہے جو کشمیری الاصل ہونے کے ناطے یہاں کے اس تحریک
(ریشیت) سے وابستہ رہے ہیں۔ جن کی بنیاد علمدار کشمیر شیخ نورالدین نورانی نے یہاں چودھویں
صدی عیسوی کے دوران ڈالی دی۔ ڈاکٹر رشید نازکی نے ان ہی ریشیاں کشمیر کو تین ادوار
میں تقسیم کرکے پہلے دور کے ریشیوں کی تعداد آٹھ دوسرے دور کی پچھتر اور تیسرے دور کی
تینتالیس درج کی ہے۔[1] دور اول کے ریشیوں میں ڈاکٹر موصوف نے ذوالقار ریشی، میر الدین ریشی،
رامودہ ریشی، اور نند ریشی، بتالمس من ریشی، یاسمن ریشی، لطیف من ریشی اور سورن ریشی کے نام درج
کئے ہیں۔

یہاں ایک خاص بات کی وضاحت کرنا ناگزیر بن جاتا ہے کہ علمدار کشمیر کے
اول ریشی احمد ریشی کے کہنے کے تناظر میں دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عرفان و تصوف
جسے ریشیت بھی کہا جا سکتا ہے کی ابتدا خود صدر اسلام کے ہاتھوں ہی ہوئی ہے جس کی
نفی کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید نازکی کہہ چکے ہیں کہ یہ اسلوک تصوف اور طریقت کا شجرہ نسب
پیش کرنے کا ایک ذریعہ اظہار ہے اور اسے تاریخی حیثیت دینا نہ صرف غلط ہے بلکہ
گمراہ کن بھی ہے۔ میں بار با خود اس تردید پر پہنچا کہ راہ تصوف میں صدر اسلام کا خود بانی
مبانی ہونا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ تصوف کا نام دوسری صدی ہجری میں متعارف ہوا ہے
تو اس نکتہ کی گرہ کشائی کے لئے میں نے جناب محمد امین کامل، جنہوں نے تصوف کے موضوع
پر بہت کام کیا ہے، کی طرف بذریعہ خط رجوع کیا۔ میرے خط کے ردعمل میں انہوں
نے تحریری طور پر جو کچھ لکھا اس کا متن یوں ہے:-

---

[1] ریشی نامہ (ریشیت اور ہمارے ریشی) شعبہ کشمیری کشمیر یونیورسٹی ڈاکٹر رشید نازکی ص ...

[2] ریشی نامہ (ریشیت اور ہمارے ریشی) شعبہ کشمیری کشمیر یونیورسٹی ڈاکٹر رشید نازکی ص ۹۲

"تصوف نام ہے انسان اور خدا کے درمیان جذبۂ اتحاد و محبت کا۔ یہی روحانیت بھی ہے۔ اس لحاظ سے ہر مذہب کی اساس تصوف پر ہے۔ اس کے بغیر مذہب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مذہب روحانیت سے مبرا ہو تو وہ ایک ایسا مردہ نظام ہے جو انسان کی روحانی ترقی کا ضامن نہیں بن سکتا۔ یعنی مذہب متصوفانہ احساس کے بغیر قربِ الٰہی پا نہیں سکتا۔"

اس حقیقت کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ اسلام اس سے مستثنیٰ نہیں اور نہ ہو سکتا تھا۔ حضرت محمدؐ روحانی یا متصوفانہ کمالات کا بدرجۂ اتم نمونہ تھے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام میں متصوفانہ تصورات پہلی صدی ہجری کے بعد ظہور پذیر ہوئے تو ہم نہ صرف مذہب کے اساسِ تصوف سے انکار کرتے ہیں بلکہ آنحضرت صلعم کے کمالات و معرفتِ روحانی کی بھی نفی کرتے ہیں۔ آپ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ یا حضرت موسیٰؑ کے متعلق آیات کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا ان کا عرفانِ حق متصوفانہ کشف و مشاہدہ کی انتہا ہے۔ خود آنحضرت صلعم کے نزولِ وحی، شقِ الصدر، معراج سماوی (سورۂ نجم) وغیرہ پر سوچیں تو واضح ہوگا کہ مشاہدہ و کشف کی کس بلندی پر پہنچے تھے۔ یہی تصوف ہے۔ یعنی انسان اور خدا کے درمیان جذبۂ اتحاد و محبت اس حد تک پہنچ جائے کہ اس مادی دنیا کے تمام پردے یک قلم جل کر راکھ ہو جائیں۔

ممکن ہے یہاں آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ان حضرات کو صوفی کیوں نہیں کہا گیا۔ وجہ صاف ہے کہ وہ بانیانِ مذاہب تھے اور مذہب انسان کے تمام داعیات کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔ وہ عقل و دانش یعنی حرکت و عمل کی بھی آبیاری کرتا ہے اور جذباتی داعیات کو بھی بلا تسکین نہیں چھوڑتا ہے۔ گویا مذہب میں متصوفانہ تعلق کے ساتھ ساتھ حرکت و عمل کی کارفرمائی بھی دہتی ہے۔ اس طرح یہ انسان کی پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ اس کے برعکس تصوف انسان کی پوری زندگی کے بجائے صرف اس کے جذباتی و داخلی پہلو ہی

پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور حرکت و عمل کے پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ صوفی نام جو متصوفین کے لیے وضع کیا گیا اس کی ضرورت اسلئے آپڑی کہ تصوف (جذباتی پہلو) کی راہ پر چلنے والوں کو متمیز کیا جا سکے۔ ورنہ قرآن ان لوگوں کو جو مذہب کے دونوں پہلوؤں پر کاربند ہوں اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

پہلے صوفیائے کرام اور تمام روحانی سلسلوں نے اپنا شجرہ حضرت محمدؐ کے بعد حضرت علیؓ ہی سے ملایا ہے جو اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ حضرت علیؓ اس روحانیت کی پہلی ہنر تھے جس کے سرچشمہ آنحضرت صلعم تھے۔ یہاں پر یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھونگا کہ ہر پیغمبر اپنے دور کا نقطہ (روحانی کسب نور کا مرکز) ہوتا ہے۔ ہر پیغمبر کا جانشین، وارث یا امام اس نقطے سے کھینچا ہوا اس کے گرد کا پہلا دائرہ ہوتا ہے جو اپنی قرابت کے لحاظ سے دوسرے تمام دائروں سے بلند مقام کا مالک ہوتا ہے، جیسا موسیٰؑ کے بانیوں میں ہارون عیسیٰؑ کے حواریوں میں پطرس علیٰ ہذا القیاس۔ نقطے اور بعد کے تمام دائروں کے درمیان یہ پہلا دائرہ ایک حد فاصل، ایک پردہ یا ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ اس وسیلے کے بغیر نقطہ کے مصدر قاعہ اسرار و رموز تک رسائی پانا مشکل ہے کیونکہ وارث ہونے کے ناطے یہی ان اسرار و رموز کی اصل کا راز دان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام متصوفانہ سلسلے آنحضرت صلعم کے بعد حضرت علیؓ کو اپنا پیشوا مانتے آئے ہیں۔ جس طرح پیغمبر (نقطہ) کو صوفی نہیں کہہ سکتے (جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا) اسی طرح دائرۂ اول کو بھی صوفی نام نہیں دے سکتے کیونکہ وہ نقطے کے جذباتی و حرکی دونوں پہلوؤں کا اپنے مراتب کے لحاظ سے نمائندہ ہوتا ہے۔ "ؔ

کامل صاحب کے اس طویل خط کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس بات سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ صوفیت کی دنیا میں سب سے پہلے اور ابتدائی صوفی (احمدؐ) آنحضرت صلعم ہی ہو سکتے ہیں۔ خود شیخ العالمؒ کا "اول رشی احمد رشی" کہنا اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتا ہے جس کی تفصیل کامل کے خط میں درج ہے۔ اس سے یہاں دوسرا

ؔ اقتباس از مکتوب بنام راقم از محمد امین کامل محررہ ۱۲ اپریل ۱۹۸۵ء

"تصوّف نام ہے انسان اور خدا کے درمیان جذبۂ اتحاد و محبت کا۔ یہی روحانیت بھی
ہے۔ اس لحاظ سے ہر مذہب کی اساس تصوّف پر ہے۔ اس کے بغیر مذہب کا تصور ہی نہیں
کیا جا سکتا۔ اگر مذہب روحانیت سے مبرّا ہو تو وہ ایک ایسا مردہ نظام ہے جو انسان کی
روحانی ترقی کا ضامن نہیں بن سکتا۔ یعنی مذہب متصوفانہ احساس کے بغیر قربِ الٰہی پا نہیں
سکتا۔"

اس حقیقت کے پیش نظر ظاہر ہے کہ اسلام اس سے مستثنیٰ نہیں اور نہ ہو سکتا تھا۔
حضرت محمدؐ روحانی یا متصوفانہ کمالات کا بدرجۂ اتم نمونہ تھے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام میں متصوفانہ
تصورات پہلی صدی ہجری کے بعد ظہور پذیر ہوئے تو ہم نہ صرف مذہب کے اساسِ تصوف
سے انکار کرتے ہیں بلکہ آنحضرت صلعم کے کمالات و مدارجِ روحانی کی بھی نفی کرتے ہیں۔
آپ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ یا حضرت موسیٰؑ کے متعلق آیات کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم
ہوگا ان کا عرفانِ حق متصوفانہ کشف و مشاہدہ کی انتہا ہے۔ خود آنحضرت صلعم کے نزولِ
وحی، شق الصدر، معراج سماوی (سورۂ نجم) وغیرہ پر سوچیں تو واضح ہوگا کہ مشاہدہ و کشف
کی کس بلندی پر پہنچے تھے۔ یہی تصوف ہے۔ یعنی انسان اور خدا کے درمیان جذبۂ اتحاد و
محبت اس حد تک پہنچ جائے کہ اس مادی دنیا کے تمام پردے یک قلم جل کر راکھ
ہو جائیں۔

ممکن ہے یہاں آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ان حضرات کو صوفی کیوں نہیں کہا گیا۔
وجہ صاف ہے کہ وہ بانیانِ مذاہب تھے اور مذہب انسان کے تمام داعیات کی تسکین
کا سامان مہیا کرتا ہے۔ وہ عقل و دانش یعنی حرکت و عمل کی بھی آبیاری کرتا ہے اور جذباتی
داعیات کو بھی بلا تسکین نہیں چھوڑتا ہے۔ گویا مذہب میں متصوفانہ تعلق کے ساتھ ساتھ حرکت و
عمل کی کارفرمائی بھی رہتی ہے۔ اس طرح یہ انسان کی پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔
اس کے برعکس تصوف انسان کی پوری زندگی کے بجائے صرف اس کے جذباتی و داخلی پہلو ہی

پر ہی اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور حرکت و عمل کے پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ صوفی نام جو متصوفین کے لیے وضع کیا گیا اس کی ضرورت اسلئے آ پڑی کہ تصوف (جذباتی پہلو) کی راہ پر چلنے والوں کو متمیز کیا جا سکے۔ ورنہ قرآن ان لوگوں کو جو مذہب کے دونوں پہلوؤں پر کاربند ہوں اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

پہلے صوفیائے کرام اور تمام روحانی سلسلوں نے اپنا شجرہ حضرت محمدؐ کے بعد حضرت علی کرم اللہ ہی سے ملایا ہے جو اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ حضرت علیؓ اس روحانیت کی پہلی نہر تھے جس کے سرچشمہ آنحضرت صلعم تھے۔ یہاں میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھونگا کہ ہر پیغمبر اپنے دور کا نقطہ (روحانی کسب نور کا مرکز) ہوتا ہے۔ ہر پیغمبر کا جانشین، وارث یا امام اس نقطے سے کھینچا ہوا اس کے گرد کا پہلا دائرہ ہوتا ہے جو اپنی قرابت کے لحاظ سے دوسرے تمام دائروں سے بلند مقام کا مالک ہوتا ہے، جیسا موسیٰؑ کے بانیوں میں ہارون عیسیٰؑ کے حواریوں میں پطرس علیٰ ہذا القیاس۔ نقطے اور بعد کے تمام دائروں کے درمیان یہ پہلا دائرہ ایک حد فاصل، ایک پردہ یا ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ اس وسیلے کے بغیر نقطے کے مصدر اسرار و رموز تک رسائی پانا مشکل ہے کیونکہ وارث ہونے کے ناطے یہی ان اسرار و رموز کی اصل کا راز دان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام متصوفانہ سلسلے آنحضرت صلعم کے بعد حضرت علیؑ کو اپنا پیشوا مانتے آئے ہیں۔ جس طرح پیغمبر (نقطہ) کو صوفی نہیں کہہ سکتے (جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا) اسی طرح دائرہ اول کو بھی صوفی نام نہیں دے سکتے کیونکہ وہ نقطے کے جذباتی و حرکی دونوں پہلوؤں کا اپنے مراتب کے لحاظ سے نمائندہ ہوتا ہے۔ ؎ "

کامل صاحب کے اس طویل خط کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس بات سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ صوفیت کی دنیا میں سب سے پہلے اور ابتدائی صوفی (احمدؐ) آنحضرت صلعم ہی ہو سکتے ہیں۔ خود شیخ العالم کا "اول رشی احمد ریشی" کہنا اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتا ہے، جس کی تفصیل کامل کے خط میں درج ہے۔ اس سے یہاں دوسرا

؎ اقتباس مکتوب بنام راقم از محی الدین کامل مرقومہ ۱۸ اپریل ۱۹۸۵ء

"تصوّف نام ہے انسان اور خدا کے درمیان جذبۂ اتحاد و محبت کا۔ یہی روحانیت بھی ہے۔ اس لحاظ سے ہر مذہب کی اساس تصوّف پر ہے۔ اس کے بغیر مذہب کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مذہب روحانیت سے مبرّا ہو تو وہ ایک ایسا مردہ نظام ہے جو انسان کی روحانی ترقی کا ضامن نہیں بن سکتا۔ یعنی مذہب متصوفانہ احساس کے بغیر قربِ الٰہی پا نہیں سکتا۔"

اس حقیقت کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ اسلام اس سے مُستثنیٰ نہیں اور نہ ہو سکتا تھا۔ حضرت محمدؐ روحانی یا متصوفانہ کمالات کا بدرجۂ اتم نمونہ تھے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام میں متصوفانہ تصورات پہلی صدی ہجری کے بعد ظہور پذیر ہوئے تو ہم نہ صرف مذہب کے اساسِ تصوف سے انکار کرتے ہیں بلکہ آنحضرت صلعم کے کمالات و مدارجِ روحانی کی بھی نفی کرتے ہیں۔ آپ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ یا حضرت موسیٰؑ کے متعلق آیات کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا ان کا عرفانِ حق متصوفانہ کشف و مُشاہدہ کی انتہا ہے۔ خود آنحضرت صلعم کے نزولِ وحی، شق الصدر، معراج سماوی (سورۂ نجم) وغیرہ پر سوچیں تو واضح ہوگا کہ مشاہدہ و کشف کی کس بلندی پر پہنچے تھے۔ یہی تصوف ہے۔ یعنی انسان اور خدا کے درمیان جذبۂ اتحاد و محبت اس حد تک پہنچ جائے کہ اس مادی دنیا کے تمام پردے یک قلم جل کر راکھ ہو جائیں۔

ممکن ہے یہاں آپکے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ان حضرات کو صوفی کیوں نہیں کہا گیا۔ وجہ صاف ہے کہ وہ بانیانِ مذاہب تھے اور مذہب انسان کے تمام داعیات کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔ وہ عقل و دانش یعنی حرکت و عمل کی بھی آبیاری کرتا ہے اور جذباتی داعیات کو بھی بلا تسکین نہیں چھوڑتا ہے۔ گویا مذہب میں متصوفانہ تعلیم کے ساتھ ساتھ حرکت و عمل کی کارفرمائی بھی رہتی ہے۔ اس طرح یہ انسان کی پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ اس کے برعکس تصوف انسان کی پوری زندگی کے بجائے صرف اس کے جذباتی و داخلی پہلو ہی

پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور حرکت و عمل کے پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ صوفی نام جو متصوفین کے لئے وضع کیا گیا اس کی ضرورت اسلئے آپڑی کہ تصوف (جذباتی پہلو) کی راہ پر چلنے والوں کو متمیز کیا جا سکے۔ ورنہ قرآن ان لوگوں کو جو مذہب کے دونوں پہلوؤں پر کاربند ہوں اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

پہلے صوفیائے کرام اور تمام روحانی سلسلوں نے اپنا شجرہ حضرت محمدؐ کے بعد حضرت علیؓ ہی سے ملایا ہے جو اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ حضرت علیؓ اس روحانیت کی پہلی نہر تھے جس کے سرچشمہ آنحضرت صلعم تھے۔ یہاں میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھونگا کہ ہر پیغمبر اپنے دور کا نقطہ (روحانی کسب نور کا مرکز) ہوتا ہے۔ ہر پیغمبر کا جانشین، وارث یا امام اس نقطے سے کھینچا ہوا اس کے گرد کا پہلا دائرہ ہوتا ہے جو اپنی قرابت کے لحاظ سے دوسرے تمام دائروں سے بلند مقام کا مالک ہوتا ہے، جیسا موسیٰؑ کے بانیوں میں ہارون عیسیٰؑ کے حواریوں میں پطرس علی ہذا القیاس۔ نقطے اور بعد کے تمام دائروں کے درمیان یہ پہلا دائرہ ایک حد فاصل، ایک پردہ یا ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ اس وسیلے کے بغیر نقطہ کے مصدر قوت، اسرار و رموز تک رسائی پانا مشکل ہے کیونکہ وارث ہونے کے ناطے یہی ان اسرار و رموز کی اصل کا راز دان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام متصوفانہ سلسلے آنحضرت صلعم کے بعد حضرت علیؑ کو اپنا پیشوا مانتے آئے ہیں۔ جس طرح پیغمبر (نقطہ) کو صوفی نہیں کہہ سکتے (جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا) اسی طرح دائرہ اول کو بھی صوفی نام نہیں دے سکتے کیونکہ وہ نقطے کے جذباتی و حرکی دونوں پہلوؤں کا اپنے مراتب کے لحاظ سے نمائندہ ہوتا ہے۔ سے "

کامل صاحب کے اس طویل خط کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس بات سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ صوفیت کی دنیا میں سب سے پہلے اور ابتدائی صوفی (احمدؐ) آنحضرت صلعم ہی ہو سکتے ہیں۔ خود شیخ العالم کا "اول رشی احمد رشی" کہنا اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتا ہے جس کی تفصیل کامل کے خط میں درج ہے۔ اگر اس سے یہاں دوسرا

ے ۱۔ اقبال مکتوب بنام ... [illegible] ... اپریل ۱۹۸۶ء

اہم نقطہ بھی ابھرتا ہے کہ علمدارِ کشمیر جناب آنحضور صلعم کو ہی صوفیت کا ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے یہاں یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ علمدارِ کشمیرؒ کی نظر کسقدر رسا تھی۔

شیخ العالمؒ سے قبل اگرچہ یہاں ریشیت کی تحریک باضابطہ طور موجود بھی تھی لیکن یہ علمدارِ کشمیر ہی ہیں جنہوں نے ریشیت کو اگلے دوسرے دور میں تحریک کو ایک نیا موڑ دے کر اسے اسلامی نظریات کے بالکل قریب ہی نہیں بلکہ اسلامی رنگ میں پیش کر لیا چنانچہ حضرت شیخ کی عارفانہ کوششوں سے ہی وادیٔ کشمیر میں تصوف، عرفان اور روحانیت کی انسانیت نواز قدریں پوری طرح اجاگر ہوگئیں اور اُن کے بعد اُن کے قریبی جانشین اور خلیفوں اور پھر اُنکے خلیفوں کے خلفاء نے اس تحریک کو اسلامی دائرے میں آگے لے لیا۔ دورِ دوئم کے جن ریشیوں نے شہرت کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں اُن میں بابا بام الدینؒ، بابا زین الدینؒ، بابا لطیف الدینؒ، بابا نصر الدینؒ، بابا پیام دینؒ، بابا لولی رشیؒ وغیرہ اہم اور قابلِ ذکر نام ملتے ہیں۔

اُن ہی معروف ترین ریشیوں میں ایک رشی ہیں بابا شکور الدینؒ، جنکی زیارت شمالی کشمیر کے پرگنہ اُترسہامہ اور پرگنہ زینہ گیر کے درمیان سوپور سے بانڈی پورہ جاتے ہوئے خبر نیلی روڈ پر ستر ہ کلومیٹر میں وڈہ لب (زینہ گیر) کے متصل دائیں طرف ایک پہاڑی موسوم بہ کرال سنگری کی چوٹی پر واقع ہے اور جسکے قدموں کو جھیل ولر کا پانی گزشتہ پانچ صدیوں سے بجانب شمال چوم چوم کر دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ کرال سنگری کے شمال مغربی دامن میں خبر نیلی سڑک کے بالکل قریب ایک خوبصورت سیاحتی تفریح گاہ وڈہ لب ریسٹ ہاؤس قائم ہے۔ جہاں روز و شب بابا شکور کو نقش بجالاتا ہوا نظر آتا ہے۔ بابا شکور الدینؒ علمدارِ کشمیر کے دوسرے خلیفہ بابا زین الدین المعروف زینہ رشیؒ، جن کا سالِ وصال ۸۴۹ھ[1]

---

[1] کشمیر انسائیکلوپیڈیا آف کلچرل اکادمی، جلد ۱، ص ۲۰۳

بتایا جاتا ہے کہ سرپر خاص اور خلیفہ تھے۔ تاریخی کتب میں مذکور ہے کہ باباشکور الدین دراصل علاقہ دردو کے پرگنہ ماچھ ہوم میں واقع موضع آرٹ کے رہنے والے تھے۔ یہ گاؤں آجکل بڈگام کی تحصیل میں پڑتا ہے۔ ماچھ ہوم چغتائیوں کے عہد حکومت میں وہ پرگنہ ہوا کرتا تھا جسکا حدود اربعہ بیان کرتے ہوئے مورخ حسن نے لکھا ہے:۔

"پرگنہ ماچھ ہوم مشتمل است بر دیہات پرگنہ ورین ہوم۔ درمیان سطح ناہموار و تالاب ہا کورہ در ذیل اوست۔ چنداں لطافت وزیبائی ندارد۔ یک صدو بست و نہ قریہ" کہا جاتا ہے کہ باباشکور الدین ایک باثروت اور اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور انکے گھر میں مال و جائیداد کے علاوہ عیش و عشرت کا ہر سامان موجود اور ہر سہولیت میسر تھی۔ مگر کلام اللہ کی تلاوت کرنے کی نیک عادت لڑکپن ہی سے انکی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ باباشکور الدینؒ نے جب بلوغیت میں قدم رکھا تو تلاوت کلام پاک کرنے کی متواتر عادت سے ان کے دل میں عشق الٰہی نے پنپنا شروع کیا اور عشق حقیقی کی دہی آگ ان کے دل میں روز بروز بھڑکنے لگی اور بہت جلد وہ بھی دن آئے جب وجدانی کیفیت نے باباشکور کو دنیاوی جاہ و حشمت مال و منال کے ساتھ بیزارگی اور مادی طاقت کو شدت کے ساتھ دبانے کی پوری ترغیب دی۔ اسطرح سے باباشکور چشمۂ عرفان سے پوری طرح فیض یاب ہونے کے لئے مرشد کامل کی تلاش میں اپنے بھرے پرے گھر کو چھوڑ کر چل نکلے اور شیخ العالمؒ کے دوسرے خلیفہ بابازین الدینؒ کے پاس عیش مقام جاکر ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ریاضت میں محو ہوگئے۔

---

[1] کاشر انسائیکلوپیڈیا آف کلچرل اکادمی، جلد ۲، ص ۱۰۹

[2] یہ وہ علاقہ ہے جسے آجکل بھی علاقہ دونترہ کہا جاتا ہے اور اسکے ساتھ شامل دیہات میں علاقہ بڈگام کا مرہ گنڈ، کاکن مرجندہ پورہ، وہاب پورہ، نسہ، نگرنید، ماہم وغیرہ اہم جگہیں ہیں (ن۔ا)۔ [3] تاریخ حسن جلد اول، ص ۲۹۲

بابا زین الدینؒ نے کچھ مدت کے بعد ان کو تزکیۂ نفس اور زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کرنے کے لیے پرگنہ کھوییہامہ[1] میں جاکر گوشہ نشین ہونے کی فہمائش کی۔ مورخ حسن اس پرگنہ کا حدود اربعہ دکھلاتے ہوئے کہتا ہے: "پرگنہ کھوییہامہ بر ساحل مشرقی و شمالی تالاب اولر درمیان سہ ورہ واقع است۔ نہر مدمتی و رود اربن میان آن می گذرد۔"

بابا شکور الدینؒ نے ریشی مقام سے آکر عبادت گزاری کی تبیا اور چشمہ عرفان سے اپنی پیاس بجھانے کے لیے علاقہ زینہ گیر کی شنگرپال پہاڑی پر واقع ایک غار کا انتخاب کیا اور پھر اسی غار میں خلوت گزین ہو کر دن رات اپنی نفس کشی کر کے تپسیا کرنے لگے۔ شنگرپال کی یہ پہاڑی کہاں اور کس جگہ واقع ہے؟ اس سلسلے میں مورخ حسن لکھتا ہے۔ "بر کمر کوہ متصل براروچھ: در پرگنہ کھوییہامہ واقع است۔ شیخ بابا داؤد خاکیؒ در آن جا مسجدے عمارت کردہ مدت چہل چلہ در اں جا بہ عبادت مشغول بود[2]۔" حسن کی اس عبارت سے لگتا تو یہی ہے کہ شنگرپال کی پہاڑی مخدوم العارفین شیخ حمزہ کشمیریؒ کے آبائی مسکن تجر شریف (زینہ گیر) کے گاؤں میں بجانب شمال و مغرب واقع ہے جہاں بابا شکور الدینؒ اپنے پیر و مرشد بابا زین الدینؒ کی ہدایت کے مطابق اسی شنگرپال پہاڑی کے غار میں بارہ سال تک دن رات ریاضت کرتے رہے۔

شنگرپال کی پہاڑی کے غار میں جب بابا شکور الدینؒ اپنی چلہ کشیوں کی مہم پوری کر چکے تو وہاں سے اٹھ کر وہ شیرکوٹ نام کی ایک دوسری اونچی چوٹی پر براجمان ہوئے جو شنگرپال کے جنوب و مشرق میں کوئی سات آٹھ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ انہوں نے یہاں اپنی زندگی کے کئی آخری سال گزارے اور اپنی وفات سے قبل انہوں نے شیرکوٹ یا کوہ السنگری کے غار کے باہر ہی اپنی حیات میں اپنے لیے قبر بھی کھدوا کر رکھی تھی اور

---

[1] تاریخ حسن، جلد اول، ص ۲۶۱

[2] تاریخ حسن، جلد اول، ص ۲۶۳

اس قبر کے بارے میں ڈاکٹر رشید نازکی اپنے مضمون "بابا شکور الدینؒ" میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص، جسکے ہاتھوں کوئی جرم سرزد ہو چکا تھا، شیر کوٹ کی پہاڑی پر چھپنے کے لیے آ گیا اور بابا شکور الدین کے لیے کھدوائی گئی قبر کو ہی اپنی پناہ گاہ بنا لیا۔ دوسرے دن جب بابا شکور الدین کو اس واقعہ کی علمیت ہوئی تو انہوں نے اپنے خلیفوں سے کہدیا کہ ان کے لیئے کھودی گئی قبر میں کوئی دنیادار پہلے ہی زندہ درگور ہو چکا ہے اس لئے ان کے مرنے کے بعد نئی قبر کھودنی چاہیئے[1] بابا شکور الدینؒ نے جب وفات پائی تو کھودی گئی اس قبر سے ذرا دور دوسری جگہ انکے لئے قبر تیار کی گئی جہیں ان کو آسودۂ خاک کیا گیا۔ ان کا انتقال کب ہوا؟ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں البتہ بابا زین الدین کا خلیفہ ہونے کے ناطے بابا شکور نے پندرھویں صدی میں ہی انتقال کیا ہوگا۔

بابا شکور الدینؒ کی قبر پر جب پہلی بار روضہ تعمیر کیا گیا تو اسکی چاروں دیواروں میں اینٹ پتھر کی جگہ چوبی پنجرہ کاری کے بڑے بڑے کٹّے (PANEL) استعمال کئے گئے تھے اور چھت بوج پتر کی بنائی گئی تھی۔ عملِ فرسودگی کے نتیجے میں مختلف وقتوں پر اس زیارت کی مرمت اگرچہ ہوتی رہی، مگر آج سے قبل پینتالیس سال ۱۹۴۶ء کے دوران اسے اچھے ڈھنگ سے سنوارا اور سنبھالا گیا، جسکا بیّن ثبوت اس کتبے سے مل جاتا ہے جو ۱۹۷۴ء میں نو تعمیر شدہ زیارت کے دروازے پر بائیں جانب لگا ہوا ہے[2] اس موقعہ پر زیارت کو وسعت دے کر اس غار والی جگہ کو بھی عمارت کے نیچے لایا گیا، جہاں بابا شکور ریاضت کیا کرتے تھے۔ اس جدید تعمیر سے قبل صادق وزارت (۷۱-۱۹۶۴ء) کے دوران زیارت کی شمالی مغربی جانب ہلکے قسم کی گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیئے ایک پختہ سڑک تعمیر کی گئی جسے سوپور بانڈی پورہ روڈ کے ساتھ لنک کیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ نلکوں کے ذریعے

---

۱ مشاہیر کمراز سادئیر ادبی مرکز کمراز، جلد ۲، ص ۸۵-۸۴، از ڈاکٹر رشید نازکی۔

۲ کاشر انسائیکلوپیڈیا آف کلچرل اکادمی نوشتہ از محمد احسن احسن، ص ۱۰۸

صاف پانی کی بہم رسانی اور بجلی کا خاطر خواہ انتظام بھی کیا جا چکا ہے۔

زیارت کے ساتھ جس مسجد کو تعمیر کیا گیا تھا اسے ۱۹۹۰ء کے دوران شہید کر کے نئے سرے سے بنایا گیا اور اس کی مغربی جانب اس کمرہ کی چوبی اور منقش چوبی ڈیوڑھی کو نصب کیا گیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بابا پیام الدین (ریشی صاحب) نے اپنے ہم مشرب و ہم عصر ریشی بابا شکور الدین کو تحفے کے طور پر بھیجی تھی اور اس ڈیوڑھی کو مسجد کے بیرونی احاطے میں ایسے نصب کیا گیا ہے کہ کوہ ہر مکھ پر واقع زیارت بابا پیام الدین ریشی صاحب اس پر سے براہ راست نظر پڑتی ہے۔ زیارت کے مغرب میں ایک لنگر بنایا گیا ہے اور حال ہی کے برسوں میں اس لنگر سے نیچے زائرین کی سہولیت کے لیے ایک مسافر خانہ بھی تعمیر کیا جا چکا ہے۔ بابا شکور کے خلیفوں میں سے رحمان رشی، دریا رشی اور رحیم رشی شیر کوٹ پہاڑی پر ہی آسودۂ خاک کیے گئے ہیں۔

پانچ فٹ اونچی کرسی (پلنتھ) پر ریشی طرز کی اس زیارت کی خشتی عمارت ۱/۲ ۴۵ فٹ چوکور ہے۔ ۱/۲ ۴ فٹ کشادہ غلام گردش کے اندر جو کمرہ ہے وہ ۱/۲ ۲۸ فٹ چوکور ہے۔ اسی کمرہ کے درمیان گنبد طرز پر بابا شکور کی ۱/۲ ۸ فٹ تعویذ ہے جسے شیشے کے فریم سے ڈھک لیا گیا ہے۔ زیارت کی چھت (CEILING) ختم بند طرز کی بنائی گئی ہے اور چھت پر ٹین کی چادریں لگائی گئی ہیں۔ بابا شکور الدینؒ کے عقیدت مند سال بھر یہاں آتے رہتے ہیں اور اپنی مرادیں پا کر واپس چلے جاتے ہیں۔

مورخ حسن کے بیان کے مطابق بابا شکور کی اس زیارت سے کبھی کبھی توپ داغنے کی گھن گرج دار آواز نکلتی ہے اور جب ایسی کوئی بات ہوتی ہے تو کشمیر میں ضرور کوئی نہ کوئی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ توپ کی آواز نکلنے کے ساتھ ہی ساتھ زیارت کی باہر کی دیواروں پر لگے ہوئے چوبی پنجرہ کاری کے پٹے خود بخود نکل کر بجلیاں ولر میں گر جاتے ہیں۔ تاریخ حسن

؎ مختصر انسائیکلوپیڈیا آف کلچرل اکادمی نوشتہ از محمد احسن احسن، ص ۵۸

کے اسرار الاخیار حصہ کے مترجم پروفیسر مولوی محمد ابراہیم[1] اس بات کی تصدیق کرچکے ہیں
کہ انہوں نے ایک موقعہ پر سوپور میں زیارت بابا شکور سے توپ داغنے کی آواز خود سنی
ہے۔ پروفیسر رشید نازکی بھی کہہ چکے ہیں کہ انہیں کئی زینہ گیری دوستوں نے کہا ہے کہ
بابا شکور الدینؒ کی زیارت سے واقعی توپ چلنے کی آواز کبھی کبھار سنائی دیتی ہے اور آواز
نکلتے ہی زیارت کے چوبی پنجرہ کاری پھٹے اڑ کر ولر میں پہنچ جاتے ہیں۔ نازکی صاحب
کے زینہ گیری دوستوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ سنہ ۱۹۵۲ء میں جب اس زیارت سے توپ چلنے
کی آواز سنائی دی تھی تو اس کے کئی مہینوں بعد کشمیر میں وزارتی تبدیلی عمل میں آئی۔

کشمیریوں کی مذہبی ثقافتی اور روحانی زندگی پر جو دور رس اثرات ایران سے آئے
ہوئے سادات بالخصوص حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کئے ہیں
اُن سے کسی ایک کو انکار نہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کشمیریوں کا روحانی کردار
تعمیر کرنے میں جو رول مقامی صوفیائے کرام خاص کر ریشی تحریک سے وابستہ ریشیوں کا رہا
ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان ریشیوں نے سلوک و طریقت کی راہیں کس طور استوار
کیں اور جو مشترکہ میراث ہمارے لئے چھوڑی ہے وہ مذہب انسانیت اور متاع عشق
ہے۔ ان ریشیوں نے تزکیہ نفس کرکے مایا جال سے خوب نفرت ہٹا کر زندگی کی خیر
خواہی کی ہے اور حقیقت نظر کے موتی چن لئے ہیں[2]۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اللہ
دوستوں نے یہاں ایسی شمعیں روشن کرکے رکھ دیں جو آج بھی ہماری وجدانی کیفیتوں کی خاطر
کا سرچشمہ ہیں ؎

ریشیاں سرو شعرا اہل تحقیق — ریشیاں مر اولیاء را پیشوا
ریشیاں جانباز در کوئے عشق — ریشیاں شہباز قاف ارتقاء[3]

۱؎ ریشیت ہماری ثقافت (ریشیت اور ہمارے رشی) از ڈاکٹر رشید نازکی ص ۱۳۰

۲؎ ۳؎ ۔ حرف اول در ریشیت آف شیخ العالم ششماہی سدا لعقیدہ ریاست ... از محمد یوسف ٹینگ ص ۵



خواجہ حبیب اللہ نوشہری حبیؒ

نویں صدی ہجری میں کشمیر کی خاک پاک سے بہت سی برگزیدہ ہستیاں پیدا ہوئیں جن میں قطب الاقطاب شیخ بہاؤ الدین گنج بخشؒ، شمس العارفین شیخ نورالدین ریشیؒ، لل عارفہ اور شیخ سلطان کشمیریؒ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انکے اسمائے گرامی سے کون واقف نہیں یا وصف اس کے کہ ان بزرگوں کے مقدس وجود کو دنیا کی آنکھوں سے مستور ہوئے تقریباً چھ سو سال کا عرصہ گذرا یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اُن کا روحانی تقدس بدستور موجود رہا ہے۔ اور ان کی زیارت گاہوں پر صبح و شام معتقدین کے جم غفیر حاضر رہتے ہیں۔ ان مجتہدین کی ان تھک کوششیں جو انہوں نے خلق خدا کو صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے لئے کیں جلد ہی بارآور ہوئیں اور دسویں صدی ہجری میں بڑے بڑے علمائے ربانی جو خالص کشمیری تھے پیدا ہوئے۔ ان بزرگوں نے علوم ظاہری اور باطنی میں اپنے تمام ہمعصروں سے سبقت حاصل کی۔ اس ضمن میں جامع الکمالات حضرت ایشان صاحبؒ۔ قطب الاقطاب حضرت بابا داؤد خاکیؒ اور عارف باللہ

حضرتِ خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ نے جو میدان مارے اور امتیازی مراتب حاصل کئے اُن کی نظیر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔

خواجہ حبیب اللہ نوشہری حُبی کشمیری ۹۶۳ھ ہجری مطابق ۱۵۵۵ء (علی شاہ چک کے عہدِ حکومت میں) سرینگر کے محلہ نوشہرہ میں تولد ہوئے۔ کشمیری زبان اور شاعری میں آپکی تاریخ ولادت ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۴ء لکھی ہے۔ لیکن دیگر تمام تذکرہ نویسوں نے آپکی تاریخ پیدائش ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء لکھی ہے اور یہی درست ہے۔ خواجہ حبیب اللہ حُبی نوشہری کا تعلق گنائی خاندان سے تھا۔ آپکے والد خواجہ شمس الدین گنائی تھے۔ خواجہ صاحب ایک متمول آدمی تھے۔ حُبیؔ نے اپنے آبائی گھر میں پرورش پائی۔ چونکہ اُس زمانے میں دینی علوم کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی اس لئے حُبیؔ کو دینی علوم کے علاوہ مروجہ علوم کی طرف بھی دلچسپی رہی۔ قرآنِ حکیم حفظ کر لیا۔ دیگر علوم و فنون میں بھی بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ فقہ، حدیث، علم اصول اور فارسی زبان و ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ چنانچہ آپ کشمیر کے ممتاز علما میں شمار کئے جانے لگے۔

خواجہ حبیؒ نے کھیل کود سے ہمیشہ بے رخی برتی اور ساری جوانی تصوف کے دائرے میں رہ کر بسر کی۔ بزرگانِ دین کی ترتیب خصوصاً جناب سید علی ہمدانیؒ مخدوم شیخ کمال الدینؒ جناب صرفیؒ کے علاوہ علما و فضلا، مشایخ اولیا کے فیوض برکات سے مستفید ہوتے رہے۔ دولتمندوں کی صحبت سے اجتناب کرتے رہے۔ لذیذ خوش ذائقہ خورد و نوش سے اور دنیا طلبی کی مصروفیتوں سے دست کش رہے۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ عموماً روزہ رکھا کرتے تھے۔ پوری زندگی میں کوئی چیز کسی سے مانگ کر نہ کھائی۔ جس دن گھر میں کھانے کا سامان نہ ہوتا تھا بہت خوش ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بُو آتی ہے۔ خدام، خلفا، احباب بطورِ تحفہ جات ہدایا وغیرہ جو کچھ پیش کرتے تھے تھوڑا سا حصہ اپنے ذاتی اخراجات

حاشیہ ۱، ۲، ۳ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

کے لئے صرف کرتے تھے باقی کو حاضرین، فقرا، رفقا اور غربا میں تقسیم فرماتے تھے۔
یہاں تک کہ حاضرین اور مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے آپ نے باضابطہ لنگر خانہ جاری کیا تھا۔ رنگدار قیمتی لباس سے آپ کو نفرت تھی، جوغہ، جبہ اور قمیض کرتا زیب تن فرماتے تھے۔ فیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو جوغہ عبا کرتا جو کچھ بدن پر ہوتا اُتار کر دیتے تھے۔ باوجود عظمت و شان کے نہایت درجہ بے تکلف، متواضع متحمل اور خاکسار تھے۔[1]

والد بزرگوار کے حکم سے نمک فروشی کی دُکان کی لیکن اُن کے ایک مشہور قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی دُکان پر ہر قسم کی چیز بکتی تھیں۔[1]

بعد و پارہ اوس نوشہر کُ وانی
نمہ نمت چھم سودا تہ ژ اپنہ زانی

(میں ایک دن نوشہرہ کا دکاندار تھا اور میرے پاس ننانوے چیزیں بکنے کے لئے تھیں۔ لیکن دکانداری کے فن کی کسی بات سے تعلق نہ تھا)[2] آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ کبھی ترازو ہاتھ میں نہیں لیتے۔ دکان پر بیٹھ کر تلاوتِ قرآن میں مشغول ہوتے۔ گاہک نقدی یا جنس کے بدلے خود ہی سودا تول کر لے جاتے۔ شاید اویہ کے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دُکان پر بھی زیادہ تر یادِ الٰہی میں ہی مصروف رہتے تھے۔

حاشیہ گزشتہ [1]۔ تذکرۃ الاولیا کشمیر حسن جلد سوم صفحہ ۲۱۸۔
[2] عہدِ بڈشاہی میں کشمیر کی راجدھانی تھی۔
[3] کشمیر میں اگنائی کا لفظ منشی کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔
[1] اخلاق و عادات حبی۔ مرحوم محمد قادری غیر مطبوعہ کشمیر یونیورسٹی۔
[2] کشمیری زبان اور شاعری جلد دوم صفحہ ۲۱۰۔ از عبدالاحد آزاد مطبوعہ کلچر اکیڈیمی۔

چنانچہ آپکے والد کو اس بات کا احساس ہوا کہ حبیؔ کو دکان پر بٹھائے رکھنے سے کاروبار میں کوئی فایدہ حاصل نہیں ہوتا ہے اور انہیں دنیاوی مشاغل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے بعد حبیؔ رح ملا حسین آفاقی کی خدمت میں رہنے لگے۔[1] ملا حسین اپنے زمانے کے بڑے عالم، فاضل اور صوفی تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں انکو بڑا کمال حاصل تھا۔ یہاں عربی اور فارسی کی اعلیٰ کتابوں کا درس حاصل کرتے رہے۔ پھر حدیث، تفسیر[3] قرآن، فقہ، منطق اور فلسفہ کے علاوہ شعروشاعری کی تربیت جناب حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ سے حاصل کرتے رہے۔ اُن کی صحبت اور روحانی تربیت نے حبیؔ کی زندگی کا رخ ہی بدل کر رکھدیا۔ اور وہ ایک دکاندار صوفی کے بجائے ربانی اور عالم دین بن گئے۔ چنانچہ حبیؔ اپنے اشعار میں جامع المکالات حضرت ایشان شیخ یعقوب صرفیؒ کی خدمت میں اپنی عقیدت کا یوں اظہار کرتے ہیں ؎

بیا حبیؔ مگو دیگر فسانہ[3]	بگو اوصاف آن پیر یگانہ
شہنشاہے بملکِ مرشدی ایست	ازو نام دنشانے ہم بگو چیست
نہے پیرے کہ ایزد راست محبوب	بود نام شریفش شاہ یعقوب
ہمایوں سایہ در قافِ کمال است	کسے محروم ذرظلمش محال است

(اے حبیؔ تو کوئی کہانی بیان نہ کر۔ تو فقط اپنے رہبر (شیخ یعقوب صرفی رح) کے اوصاف بیان کر۔ وہ ملک تصوف کے شاہنشاہ ہیں۔ اُن کے سامنے کسی اور کا نام لینا ادب کے خلاف ہے۔ وہ ایک ایسے مرشد ہیں کہ جن کو خدا پیارا سمجھتا ہے اور جن کا نام شاہ یعقوبؒ ہے۔ اُن کا سایہ نیک اور مبارک ہے۔ کوئی سائل اُن کے سائے سے محروم اور نا اُمید نہیں ہوتا ہے)۔

---

[1] فتحات کبرویہ۔ از شیخ عبدالوہاب نوری۔

دوسری جگہ اپنی عقیدت کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

ای دل سند از ثانی یعقوب طلب | وایں نسبت از آں سالک مجذوب طلب
در بیت حزن مقام کن از غم عشق | آنگاہ ز دل یوسف مطلوب طلب

(جب اپنے مرشد کی صحبت سے روحانی اور باطنی فیض حاصل کرتے رہے اور تصوف وسلوک کے مختلف مقامات طے کئے تو بے ساختہ ان کی زبان پر یہ شعر جاری ہوئے) ؎

گر صیغہ صفت می طلبی مصدر دست | از ہمت صرفی طلب کہ او پیر نکو است
ماضی و مضارع تو مدان جز حالش | بہ نہی و امر کن عمل در راہ ہو است

اور ان کا تعلق اپنے مرشد کے ساتھ اتنا گہرا ہو گیا کہ "من تن شدم تو من شدی" کے مصداق بن گیا اور جناب صرفی رح کے بعد اس مسند خالی کے مستحق قرار دیئے گئے جس کی ان کو تمنا تھی۔

حبی رح کو حضرت میر سید علی ہمدانی رح سے بے پناہ ارادت تھی اور فرماتے ہیں ؎

من بندۂ شاہ ہمدانی ہستم | پروردۂ آں علی ثانی ہستم[1]
ہر کس کہ محب او شدہ از دل و جاں | از صدق دلش محب جانی ہستم

حبی ملا حسن آفاقی کے علاوہ میر محمد خلیفہ رح کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ اور میر محمد خلیفہ رح بھی حضرت شیخ یعقوب صرفی رح کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے۔ اور یہاں بھی انہوں نے روحانی اور باطنی کسب و کمالات حاصل کئے۔ آہستہ آہستہ ان کی صحبت میں روحانی اور عرفانی مدارج طے کرتے رہے یہاں تک کہ اکسیر بن گئے۔ حضرت

---

[1] فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ - از ڈاکٹر محمد ریاض و ڈاکٹر محمد صدیق شبلی لاہور۔ سنگ میل پبلی کیشنز اردو بازار۔

ایشاں صرفی جب کہ آباد میں تشریف رکھتے تھے اُن کی واپسی کے وقت تک خواجہ حبیؒ جناب میر محمد سے رتبہ ارشاد حاصل کر چکے تھے حضرت ایشان کی تشریف آوری پر پھر اُن کی صحبت سے مشرف ہوئے۔ اور انہوں نے آپ کو اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھی ہوئی کتاب "اسرار النقط" عطا کی حضرت ایشانؒ فرمایا کرتے تھے کہ مشعل وہ خوارزم سے ساتھ لائے اسے انہوں نے نوشہرہ کے سپرد کیا۔

"اسرار الابرار" "فتحات کبیریہ" "واقعات کشمیر" "تذکرہ اولیائے کشمیر (حسن)" اور "تاریخ کبیر کشمیر" کے بیانات کے مطابق میر محمد خلیفہ رحمۃ سماع کے بہت دلدادہ تھے اور مولانا حسین آفاقی اُن کو اہل بدعت میں شمار کرتے تھے۔ ایک رات مولانا کو خواب میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ گر ہوئے اور فرمایا کہ تم کہاں تک کتابوں کا مطالعہ کرتے رہو گے اور اُن کے معانی سے بے خبر ہو گے۔ مولانا نے دوسرے روز یہ خواب خواجہ کو سنایا اور دونوں ایک دوسرے کی صلاح سے میاں مالک شاہ مجذوب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مالک شاہ نے اُنکی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ انکو تین پیسے دیکر ہدایت کی کہ وہ دونوں محلہ ملارٹہ واقعہ سرینگر سے میاں صاحب کے لئے شراب خرید کر لائیں۔ اس حکم کی تعمیل کرنے کے لئے دونوں بزرگ روانہ ہوئے اور راستے میں آپس میں تبادلہ خیالات کرتے ہوئے حضرت خواجہ نے مولانا سے فرمایا کہ آپ نے میر محمد خلیفہؒ کو بدعتی تصور کر کے اُن سے کسب فیوض کرنے سے انکار کیا اور اب ہم ایک ایسا کام جو صریحاً حرام ہے انجام دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔ بہر حال انہوں نے شراب فروش سے شراب خریدی اور حضرت خواجہ نے مجبور ہو کر شراب کی صراحی اپنے کندھے پر اُٹھائی۔ جب مجذوب کی خدمت میں پہنچے تو اُس نے دونوں کو شراب نوشی پر مجبور کیا۔ اُن کے انکار کرنے پر میاں شاہ نے دونوں کو زدکوب کیا اور کہا کہ ہمارا علاج صرف بدعتیوں کے پاس موجود ہے۔ یہ سن کر دونوں حضرات میر محمد خلیفہ کی خدمت میں تشریف لائے۔ خلیفہ اُس وقت مجلس سماع میں

تھے۔ انہوں نے مولانا سے کہا کہ آپ [illegible] چھ مہینے ضایع کر دیئے۔ اور میرے پاس آنے کے لئے اُس وقت مجبور ہوئے جب میاں مالک شاہ نے آپکو میرے پاس آنے کی ہدایت کی۔ مجلس سماع پھر شروع ہوئی اور مولانا اور حضرت خواجہ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ دونوں نے اپنا لباس اور عمامہ پارہ پارہ کر دیئے۔ خلیفہ نے مجلس کے ختم ہونے پر اپنا عمامہ مولانا کو اور اپنا جامہ حضرت خواجہ کو عطا فرمایا۔

علمای ظاہری بالخصوص مولانا آخون حسین خباز نے آپکے ساتھ سماع کی جوازیت پر بڑے بڑے مباحثے اور مناظرے کئے کہ وہ اُسے کسی طور جائز نہیں مانتے تھے۔ یہ واقعہ کشمیر کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو تھی نہیں کہ جس شخص کے خلاف محاذ کھولا گیا تھا وہ کوئی بھولا بھالا درویش نہیں تھا بلکہ علم و عمل اور زہد و تقویٰ میں کامل دیکتا تھا۔ اس لئے یہ معاملہ ایک بڑے تنازعہ کی صورت اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ یہ تنازعہ حکام وقت کے پاس تصفیہ کے لئے پیش کیا گیا۔ حضرت خواجہ نے سماع کی جوازیت میں یہ دلیل پیش کی کہ آئین شریعت کے مطابق علاج امراض کے لئے ایسی دوائیوں کا استعمال جائز ہے جن کو صحت کی حالت میں حرام قرار دیا گیا ہے چونکہ ہم بیمار ہیں اور سماع کے بغیر ہم کسی دوسری دوائی سے ٹھیک نہیں ہو سکتے اس لئے ہمارے لئے یہ حرام نہیں اور جو چیز حلال قرار دی گئی ہو وہ حرام نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں کہ ایک اور وقت ہی شکایت پھر حکام وقت کے پاس کی گئی۔ اور ایک محتسب ایک مفتی اور کچھ عمائد شہر کو حضرت خواجہ کے دولتخانہ پر تحقیقات کرنے کی غرض سے بھیجا گیا۔ اُس وقت حضرت خواجہ کے ہاں مجلس سماع گرم تھی۔ انہوں نے یہ پیغام سن کر سماع بند کیا۔ اور آلات موسیقی مکان کے دوسرے کمرے میں منتقل کئے۔ جب عدالت کا بھیجا ہوا وفد اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت خواجہ نے اُن کو ماحضر پیش کیا اور تناول طعام کے دوران میں پاس والے کمرے سے نغمہ کی آواز کانوں میں آئی۔ حضرت خواجہ نے اپنے

خادموں سے پوچھ گچھ کی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر کمرے کا دروازہ کھولا گیا اور حکام عدالت نے خود جاکر آلات موسیقی بغیر کسی نوازندہ و سازندہ اور موسیقار کے خود بخود بجتے ہوئے دیکھے اس کے بعد حضرت خواجہ سے کسی نے سماع سے متعلق بازپرس نہیں کی[1]۔ تاریخ کبیر میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز جہانگیر بادشاہ جھیل آنچار اور جھیل خوشحال سر میں شکار کی غرض سے سیر کر رہا تھا اور خواجہ حبی کے چکور ایک چنار کے درخت کے ارد گرد پرواز کر رہے تھے اور بادشاہ کے شاہباز چکوروں کو پکڑنے کے لئے اُن پر لپکے۔ چکوروں نے اچھل کر شاہبازوں کی آنکھیں نکال دیں۔ اور جب بادشاہ اس واقع سے مطلع ہوا اور پوچھا کہ یہ چکور کس کے ہیں؟ تو عرض کیا گیا کہ یہ چکور حضرت خواجہ حبی نوشہری کے ہیں۔ پھر بادشاہ جہانگیر ان کی ملاقات سے ممتاز اور مشرف ہوا[2]۔

کشمیر کے تذکروں میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کے عہد میں ترکستان کے قزاقوں نے کشمیر پر لوٹ مار کی غرض سے یورش کی۔ اور جب زوجہ پال کو عبور کر گئے تو کشمیر کے لوگ یہ سنتے ہی سخت گھبرا گئے اور پریشان ہونے لگے اور لوگوں پر خوف اور دہشت طاری ہونے لگی۔ اور اکثر سراسیمہ ہو کر بھاگنے لگے۔ اکثر لوگوں نے حضرت خواجہ حبی کی خدمت میں جاکر عرض کیا تو حضرت خواجہ حبی نے اپنے دوستوں سے کہا کہ تلوار ہاتھ میں لے کر فلاں صحرا کی طرف جاؤ اور تلوار کو وہاں گھماؤ۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن اطلاع ملی کہ قزاق ایک طوفانی حادثے کے شکار ہو گئے۔ اور جو بچے وہ اپنی جان بچانے کی خاطر بھاگ گئے اور دوبارہ کشمیر آنے کا نام نہ لیا[3]۔

---

[1] تاریخ کبیر محی الدین مسکین ص ۱۸۲ اور دیوان حبی ص ۷ و ۸ ۔

[2] ایضاً ص ۱۸۲ ۔

[3] تاریخ کبیر از محی الدین مسکین مطبوعہ امرتسر ۱۳۲۱ھ ص ۱۸۲ ۔

غرض حضرت خواجہؒ کی مقدس ہستی کو کشمیر کے اولیائے کبار کی صف میں ایک نمایاں درجہ حاصل ہے۔ اور حضرت خواجہ حبیؒ کے خوارق اور کرامات کتب تواریخ اور تذکروں میں اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ اُن کو لکھنے کے لئے ایک دفتر بےپایاں کی ضرورت ہوگی۔ وہ بڑے حقیقت شناس اور باریک بین تھے۔ بنی نوع انسان کی خدمت کو انہوں نے اپنا اصول بنالیا تھا۔ خود فاقہ کرتے لیکن بھوکوں کو کھلاتے تھے۔ اُن کے حرکات وسکنات میں اپنے روحانی پیشوا کی جھلک پائی جاتی تھی۔ حقیقت کی تفسیر اور مجاز کی تعبیر کرنا انہی کا خاصہ تھا۔ وہ برگزیدہ خداشناس تھے۔ ظاہری اور باطنی علوم میں انکی شان نرالی تھی حقیقت اور معرفت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ راتوں کو بیدار رہتے تھے۔ اوراد و وظائف پڑھا کرتے تھے۔ وہ صحرائے عشق حقیقی کے متوالے حقیقت کے رہبر اور وحدت توحید کی سرمستی میں سرشار تھے۔ وہ بازار معرفت کے جوہر شناس تھے[1]

تاریخ کبیر کی روایت کے مطابق جب آپ کا سن مبارک ۶۳ سال سے اوپر تھا۔ ۱۰۲۶/۱۰۲۷ ہجری ماہ ذی الحجہ مطابق ۱۶۱۷ء میں کشمیر میں وبائے عام کی وجہ سے بےشمار لوگ لقمۂ اجل ہوگئے۔ آخر تنگ آکر لوگوں نے آپ کی خدمت میں بروز ۱۹ ماہ ذی الحجہ (منگلوار) کو حاضر ہوکر اس مہلک بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لئے استدعائے دعا کی۔ آپ نے اُن کو صبر کرنے کی تاکید اور تلقین کی اور فرمایا کہ میں لوگوں کے عوض اپنے آپ کو پیش کردونگا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے حاضرین سے استفسار کیا کہ کیا اُن میں کوئی حضرت خواجہ کے ہمراہ عالم آخرت کی دعوت قبول کرنے کو تیار ہے؟ تمام اہل مجلس نے آمادگی ظاہر کی۔ مگر حضرت خواجہ نے تین اشخاص یعنی حضرت میر یوسف قادری۔ خواجہ داؤد مجذوب اور حضرت شیخ صرف الدین المعروف بہ شوگہ بابا بابوری کو منتخب کیا

---

[1] اسرار الابرار۔ ص ۳۷۹

اور اسی روز حضرت خواجہ نے بعد ادائے نماز عصر بمرض شربت شہادت نوش فرمائی اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔[1] ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

تاریخ وصال ہے "از سر اخلاص خواجہ حبیب اللہ والا شان" ہے۔[2] قدرت نے آپ کو دو فرزند عطا کئے تھے اور وہ دونوں کم سنی میں ہی داغ مفارقت دے چکے تھے اس کے بعد وہ اکثر آہ و زاری کرتے رہتے تھے۔

حضرت خواجہ نے بیشمار خلفا بہم کئے جس میں خواجہ زین الدین، علی دار دلی، مولانا مہدی علی، خواجہ حبیب اللہ نوری اور میر شمس الدین قدس اللہ روحہم کے اسمائے گرامی ہر خاص و عام کو معلوم ہیں۔[3] آپ کا عرس مبارک ۱۹ اور ۲۰ ماہ ذی الحجہ کو ہر سال آپ کی خانقاہ اور روضہ مبارک پر منایا جاتا ہے۔[4]

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

آپ کی تصانیف میں سے "دیوان حبی" "تنبیہ القلوب" "مراۃ القلوب" "راحۃ القلوب" "مقامات حضرت ایشان" "رسالۃ الانصاف" "رسالہ تصوف" اور "رسالۃ السلوک" زیادہ مشہور ہیں۔ یہ سب تصانیف علمِ تصوف کے موضوع پر ہیں۔

● مقامات۔ حبی کی یہ منظوم کتاب اُن کے اپنے حقیقی رہبر اور مرشد جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کے احوال و کمالات کے بارے میں ہے۔ اس کتاب کا دوسرا

---

[1] تاریخ کبیر ص ۱۸۲۔ واقعات کشمیر ص ۲۸ کشیر از جی ایم ڈی صوفی ج ۱ ص ۲۸۔

[2] دیوان حبی ص ۸۔

[3] ایضاً دیوی حبی ص ۸۔

[4] حبی از محمد امین قادری مرحوم غیر مطبوعہ کشمیر یونیورسٹی۔

نام سیاحت نامہ بھی ہے۔

● مراۃ القلوب نثر میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب تصوّف کے مختلف موضوعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ تصوف کے مختلف منازل پر بھی اس میں الگ الگ بحث کی گئی ہے۔

● رسالہ تصوف۔ یہ رسالہ بھی نثر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی تصوف کے بعض مضامین درج کئے گئے ہیں۔

● راحت القلوب۔ یہ رسالہ بھی تصوف کے مختلف موضوعات پر روشنی ڈالتا ہے۔ بعض احکام شریعت پر بھی بڑی وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

● تنبیہ القلوب۔ یہ رسالہ فارسی نظم میں ہے۔ اس میں مختلف عقاید تصوّف کی بڑی نشاندہی کی گئی ہے۔

● رسالہ الانصاف [illegible] تصوّف کے عقاید پر بحث کی گئی ہے اور یہ رسالہ عربی نثر میں ہے اور ان کے عربی زبان پر عبور کا احساس ہوتا ہے۔

● دیوان حسّیٰ۔ حضرت خواجہ کو عربی، اور فارسی اور کشمیری زبانوں میں جو قادرالکلامی حاصل تھی بہت کم شعرا کو نصیب ہوتی ہے۔ آپ کے فارسی اشعار میں فصاحت و بلاغت، شستگی اور روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ایران کے ایک جدید مفکر نے آپ کو فصیح اللسان بزرگ کہا ہے اور گزشتہ تین صدیوں میں پیدا نہیں ہوا۔ جیسا کہ حضرت خواجہ کی غزلیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے اُن کا کلام ایران کے برگزیدہ شعرا مغربی، عراقی، ابن یمین وغیرہ سے کسی طرح بھی شیرینی، برجستگی، سلاست اور متانت میں کم نہیں۔ رموز تصوّف کو جس انداز سے آپ نے پیش کیا ہے اُس سے آپ کے کلام کو ایک

---

* اس میں کوئی شک نہیں کہ حسّیٰ فارسی کے برگزیدہ شعرا میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے کشمیری کے علاوہ عربی میں بھی طبع آزمائی کی ہے چنانچہ عربی میں اُنکی ایک مثنوی "الانصاف فی بیان طریقۃ النجاۃ" کو کافی شہرت ملی۔ (ایڈیٹر)

امتیازی حیثیت حاصل ہے[1]

سادہ زبان اور چھوٹی چھوٹی بحروں میں عمیق خیالات کو خوبی سے باندھنے میں انہیں مہارت تھی۔ ان کی شاعری کا عروج یوسف شاہ چک کے عہد میں ہوا اور یوسف شاہ چک خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کی بہت قدر کرتا تھا حبّی کی ایک مرصع غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

ای کہ بہشت بریں یابی تو عذاب الم عذاب	آتش دوزخ ہمہ با تو گلا بم گلاب
گرمی شوقت چہ کرد۔ نرمی ذوقت چہ کرد	سینہ کبابم کباب، دیدہ پر آبم آب
حبّی بیچارہ بین اشک فشان بر زمین	کردہ زراہت جبین زدست شراب و کباب

حبّی کی اکثر و بیشتر غزلیں درد و سوز کے جذبات اور عشق حقیقی کا جلن سے بھری ہوئی ہیں۔ اور عشق حقیقی کی کشمکش سے وہ سخت مضطرب رہتے تھے۔ محویت اور سکر کا عالم آپ پر ہمیشہ طاری رہتا تھا۔ اس طرح ان کی طبیعت شگفتہ بن گئی تھی اور ان کی غزلیں میں منفرد رنگ پایا جاتا ہے۔ حبّی نے فریب کار اور ریا و مکاری سے کام لینے والے زاہدوں پر جو اظہار خیال کیا ہے وہ بڑی شدت لیکن گہرے طعن و تشنیع سے بھرپور زبان میں ادا کیا ہے۔

؎ واعظا ترک میّ از بندہ مسکین مطلب	عہد تسیم نازل آنکہ مشوم بادہ پرست
میّ بر زبان زاہد تلخ است و تلخ تر	کین بکام ما شیرین بود زعسل
مفتی نویس فتوای الراح راحتہ	فتوای ناصواب خود صواب را

خواجہ صاحب کا بیشتر کلام مدح محبوب حقیقی کے لئے وقف رہا ہے۔ اور آپ نے اپنے کلام میں اپنے محبوب کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور حسن کی جا بجا تعریفیں کی ہیں کبھی کبھی اس کے زلف و خال کی، کبھی اس کے حسن جہاں آرا کی تعریفیں کی ہیں۔

---

[1] دیوان حبّی مرتبہ حبیب اللہ کاملی صفحہ نمبر ۵۔

کبھی تو اس کے قد و رخسار کی سراپا نگاہ تو جمال پرست شاعروں کا شعار رہا ہے۔ خواجہ حبیّ نے محبوب کی طرح طرح توصیف کی ہے ؎

اگر روزی بہ بینم آں آشنا خراسانرا | بخط و دی خطا بخشم بہ لعل وے بدخشانرا
بہ زلف وی چہ می بخشم کہ او خود صاحب چین است | بخال وی چہ می بخشم کہ روم آمد مقام آں را
ز عرض حال من رنجد چرا آں آشنا خوبا نم | گہے مور ضعیفے می کند عرضے سلیمانرا

آپ کے کلام میں جگہ جگہ تشبیہات، تلمیحات، حسن تضاد، تجنیس، مراعاۃ النظیر وغیرہ صنائع بدائع ملتے ہیں۔ حبّی کے دور میں شاعری میں ان شاعرانہ خوبیوں کو بہت ہی پسند کیا جاتا تھا۔

خواجہ حبیب اللہ حبّی نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ اس کے علاوہ آپکے دیوان میں ترجیع بند بھی ملتے ہیں چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں پر بھی ترجیع بند موجود ہے۔

دریای عشق موج زند ہر زماں نگر | گاہے بہ رنگ این نگر و گہ باں نگر
یک موج از وسعت نور محمد کہ صد ہزار | دریای رحمت آمدہ از وی رواں نگر
عاجز، ز وصف او خرد خورده دانہا | قاصر ز نعت او وصف این، ساں نگر

خواجہ حبّی نے رباعیات بھی لکھی ہیں۔ اگرچہ رباعیات کی تعداد بہت ہی کم ہے لیکن ذوق کی ترجمانی کے لحاظ سے معنی میں وسعت کے ساتھ ساتھ ایک منفرد طرز بیان کی حامل ہیں ان رباعیوں میں اکثر تصوف اور عرفان کا رنگ موجود ہے ؎

دانی کہ چہ نسبت است میاں من و دوست | من نیز ہم صفت آمدم از پایہ و دو رفعت
نے نے غلطم نہ نسبتے ہست میاں | کیں ہم ہمہ سو بادہ ہوا و رتبہ ہمہ اوست

غرض حبّی کا کلام عشق حقیقی اور معرفت حق سے لبریز ہے۔ کہیں کہیں آپکے کلام

میں نعتیہ مجازی کا رنگ بھی جھلکتا ہے لیکن دراصل رمز و کنایات کے پردے میں آپ کے اکثر و اظہارات عشق رسولؐ سے مربوط ہیں ؎

در دست ما فتادہ چوں عشق تو در ازل　　خالی ز عشق نیست ازاں روی یک غزل

حبی کے دیوان کے قلمی نسخے ہند و پاک کے تمام کتب خانوں میں موجود ہیں[1] اور کشمیر کے بعض علم دوست حضرات کے گھروں میں بھی اِن کے دیوان کے قلمی مخطوطات موجود ہیں۔ سنہ ۱۳۸۱ھ میں خواجہ حبیب اللہ کاملی نے دیوانِ حبی ایک فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شایع کیا ہے ؎

خواجہ حبی کا کشمیری کلام بہت کم ملتا ہے۔ جس قدر دستیاب ہوا ہے اسی سے آپ کے شاعرانہ مرتبے کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ مشہور ہے کہ ایک دن بمقام احمد اکدل انار باغ میں خواجہ حبی کے سامنے محفلِ سرود گرم تھی۔ باغ میں انار کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ قوال مقامِ حسینی گا رہے تھے۔ خواجہ حبی وجد میں آکر گویوں کے ساتھ گانے لگے اور مقامِ حسینی کی لے پر ذیل کے شعر اسی وقت موزون فرمائیے ؎

ژٕ بۄ مۄ سنٕوی دِین کیھو بٕرٕ یارٕ مدٕ نو　　میانہ مدٕ نولہ یہ دأنِ پوش تہ ہیِ

ژھارٕنِ لو مس کوٕ نود دٕ یو　　دیتو ژٕ کمو پرٕ زٕ چھے

ہا دِتم دیدار چھیم چانی لادٕ نو　　میانہ مدٕ نولہ یہ دأنِ پوش تہ ہیِ

دتیرے بغیر دن کیسے گذاروں میرے محبوب۔ تیرے لئے انار اور یاسمن کے گلدستے بھیجدوں۔ تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں ڈھلتے سورج کی طرح غروب ہو گئی تو کہاں چلا ہے۔ اے میرے محبوب مجھے اپنا جلوہ دِکھا میں تو

---

[1] حضرت حبی کی تقریباً ساری تصانیف ریاست کی ریسرچ لائبریری میں موجود ہیں اور شاید A 21 ، 3 ، E ، 21 وہاں درج ہیں۔ (ایڈیٹر)

تیرا ہی شیدائی ہوئی اور تیرے لئے انار اور یاسمن کے گلدستے بچھ دیں۔[۱]

ژِ شینہِ پوشِس رنگ ہاہِ چھسو تَن   ژِ نوٚن نووُنی زِ ہس بوزِ عالم

حبی کی یہ کشمیری غزل آج بھی اتنی ہی مقبول ہے جتنی کہ اُن کے زمانے میں تھی۔

○

کتابیات:

۱۔ کشمیری زبان اور شاعری جلد دوم۔ عبدالاحد آزاد مرحوم۔ کلچرل اکاڈیمی۔

۲۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ ڈاکٹر محمد ریاض وہ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی۔ چوک اردو بازار لاہور۔

۳۔ تاریخ کبیر از محی الدین مسکین۔ ۱۳۲۱ھ۔ مطبع امرتسر۔ سنگ میل پبلیکیشنز۔

۴۔ واقعات کشمیر۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری ۱۹۳۶ء غلام محمد نور محمد۔

۵۔ دانش شعبۂ فارسی شمارہ ہفتم ۱۹۸۴ء۔ ۱۹۸۵ء کشمیر یونیورسٹی۔

۶۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ۔ از پروفیسر عبدالقادر مرحوم مجلس تحقیقات سرینگر ۱۹۶۸ء

۷۔ تذکرہ شعرائے کشمیر جلد اول ادارہ اقبال اکاڈیمی کراچی از راشدی۔

۸۔ حبی از محمد امین قادری مرحوم۔ کشمیر یونیورسٹی غیر مطبوعہ۔

۹۔ دیوان حبی از حبیب اللہ کاملی۔

۱۰۔ کشمیر۔ از جی۔ ایم۔ ڈی۔ صوفی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ج اول و ج دوم۔

۱۱۔ اسرار الابرار از حضرت بابا شیخ مشکواتی رح مخطوطات کشمیر یونیورسٹی۔

۱۲۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں۔ جناب محب الحسن۔ ۱۹۶۷ء

۱۳۔ تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ۱۱۴۔ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ از ظہور احمد۔

●

---

[۱] کشمیری زبان اور شاعری جلد دوم۔ عبدالاحد آزاد مرحوم۔ ص۔ ن ۲۱۳، ۲۱۴۔

●

پروفیسر غلام محمد شاد

حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ

آپ کا اسم گرامی نصر الدین تھا، خود انہوں نے ایک مناجات میں اسی نام کو بطور تخلص برتا ہے ؎

شکستہ دل ہمی نالد بدرگاہِ تو نصر الدین   برآور رحمت فراواں کُن کرم بسیار یا اللہ[1]

انکے شاگرد اور خلیفہ خاص بابا داؤد مشکواتی نے انکی مدح میں تصنیف کی ہوئی ایک منقبت میں انہیں اسی نام سے یاد کیا ہے ؎

حمدِ للہ حالِ من از فیض روشن تر شد است
ریشِ ریشیاں شیخ نصر الدین مرا رہبر شد است[2]

بیجبہارا کے ایک عالم اور شاعر مولوی محمد خضر مقبلؔ نے بھی اسی نام کے ساتھ اُن کا ذکر کیا ہے ؎

فخرِ علمائے صاحبِ تمکین   ریشِ ریشیاں جناب نصر الدین[3]

سلطانی[4] کے مصنف ملا بہاء الدین متو نے بھی حقیقت میں ہر جگہ نصر الدین اور نصیب الدین

ہی کے نام سے اُن کا ذکر کیا ہے جو کاتبوں کی غلطی سے نصیر الدین ہو گیا ہے۔[4]

کنیت:۔ غریبوں، مسکینوں، محتاجوں اور ناداروں کی مدد ہر وقت کرتے تھے، اور فقرا اور مساکین کی حاجات پوری کرنے میں، فاقہ مستوں، درویشوں اور بھوکوں کو کھلانے پلانے کے انتظامات پر بے انتہا سخاوت اور دریا دلی سے خرچ کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں　　مردم و مرغ و مور گرد آیند

کے مصداق، ان کے ہاں لوگوں کا اژدہام رہتا تھا، اسی وجہ سے ابوالفقراء کی کنیت سے مشہورِ خلائق ہو گئے ہیں۔[5]

لقب:۔ اشاعت و تبلیغ دینِ حق کے لئے کشمیر، لداخ، تبت اور دیگر دور و نزدیک کے علاقوں میں، بار بار پہنچتے رہے، اور بارہ سو سے زائد مساجد کو تعمیر کیا، بہت سے مدرسے بنائے، خانقاہیں، پل اور مسافر خانے تعمیر کئے، جگہ جگہ سایہ دار درخت لگوائے، حضرت نصیب کو، ان ہی ان تھک تبلیغی، اشاعتی اور تعمیری کارناموں کی انجام دہی پر غازی کا لقب دیا گیا۔

تخلص:۔ حضرت بابا اعلیٰ پایہ کے ادیب، نثر نگار اور شاعر تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے لئے مختصر نام کے طور پر نصیب تخلص اختیار کیا، کبھی کبھی وہ نصیب مسکین، نصیب کشمیری، نصر الدین، یا نصیب الدین بھی بطور تخلص استعمال کرتے تھے۔[6]

والدِ ماجد:۔ حضرت نصیب کے والد ماجد کا اسم گرامی تھا میر حسین رازی[1]، جن کے

[1] بابا داود مشکواتی اپنے قصیدہ در مدح بابا نصیب الدین غازی الموسوم "زاد المبین" میں حضرت نصیب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سید تھے وہ فرماتے ہیں ؎

او ست از آلِ رسول از قوم آن خیر الانام
هم عیالِ مصطفےٰ را بہتر و بہتر شدہ است

(زاد المبین، نسخۂ خطی، ورق ۱۲، ناقص الاول، کتابت سنہ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) مملوکہ مقالہ نگار

بارے میں محی الدین مسکین صاحب تاریخ کا یہ واضح بیان کافی ہے :

"از راجہ ہائی راولپنڈی و پدر بزرگوار حضرت بابا نصیب الدین غازی است۔"

اور انکی والدہ ماجدہ کا نام جمیلہ بی بی تھا۔ جو پہلے کسی اور صاحب کے نکاح میں تھیں۔ اس بات کا ذکر اگرچہ کسی تذکرہ یا تاریخ میں نہیں ملتا ہے، لیکن تذکروں میں حضرت نصیب کے دو بھائیوں کا ذکر آیا ہے، ایک شیخ شمس الدین جو انکے "برادر مادری" تھے، دوسرے برادر بابا شیخ شمس الدین تھے، جو حضرت نصیب کے "برادر عینی" یعنی حقیقی بھائی تھے۔ دونوں خطیرہ بابا نصیب میں دفن ہیں۔[10] حضرت نصیب کے والد ماجد مزار بڈشاہ[11] میں اور والدہ ماجدہ موضع "کل ترہ"[12] میں دفن ہیں۔

آبائی وطن :- حضرت نصیب کا آبائی وطن راولپنڈی تھا، انکے والد ماجد "میر حسین راوی از راجہ ہائے راولپنڈی"[13] تھے۔ اور وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر کشمیر آئے "وچوں وارد در شہر کشمیر (مطلب سرینگر) شد، بشمول نابیعت و یافتن تربیت در خدمت شریف محبوب العالم (حضرت حمزہ) قدس سرہ ایام حیات در زہد و تقوی بسر بردہ در مزار بڈشاہ آسودہ"[14]

اندازہ ہے کہ مال و دولت اور دنیاوی جاہ و حشمت کو چھوڑ کر وہ کسی مرشد معنوی کی تلاش میں ہی کشمیر آئے ہونگے اور یہاں آکر حضرت شیخ حمزہ کے دربار فیض بار سے وابستہ ہو گئے، لیکن بابا نصیب کشمیر میں ہی پیدا ہو گئے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو "نصیب کشمیری"[15] ہی کے نام سے متعارف کراتے ہیں اور محمد اعظم نے انکا ذکر کرتے ہوئے انہیں "از مشاہیر این دیار"[16] لکھا ہے۔ محمود گامی نے انکے آبائی وطن راولپنڈی کا ذکر حضرت نصیب کی ایک منقبت میں اسطرح کیا ہے

یا حضرت بابا نصیب	دِیہ ہا تہندی کرامات عجیب
بوئیہ واتتس نہ خطاد ختن	چھم راولپنڈ چون وطن

رُوم نہ تیتھُو نہ شہرِ یمن　　　یا حضرتِ بابا نصیب[17]

(اے حضرتِ بابا نصیب! میں آپ کی کراماتِ عجیب بیان کرتا چاہتا ہوں، راولپنڈی آپ کا (آبائی) وطن ہے، جس کی خوشبو کے آگے خطا اور ختن ہیچ ہیں۔ روم اور یمن کے شہر ایسے (خوبصورت) نہیں ہیں)۔

لیکن اسی منقبت میں محمود گامی حضرتِ نصیبؒ کے کشمیر میں تولد ہونے کی شہادت دیتا ہے ؎

پانہٕ ژےٚ زاکھ ور "شہرِ" کشمیر[18]

یعنی "خود آپ شہر کشمیر (سرینگر) میں تولد ہوئے"۔ میرا اندازہ ہے کہ حضرت نصیبؒ کی والدۂ ماجدہ کشمیری نژاد تھیں کیونکہ حضرت بابا نصیب کشمیری زبان نہ صرف بولتے تھے۔ بلکہ اچھی طرح سے لکھتے بھی تھے۔ اس لحاظ سے انکی مادری زبان کشمیری تھی جس کی شہادت اور تصدیق خود نورنامہ سے ہوتی ہے۔[19]

سالِ ولادت

بابا نصیبؒ سری نگر میں تولد ہوئے، تواتر کے ساتھ روایت ہے کہ انہوں نے اچھی خاصی عمر پائی جس کی تصدیق آثار و قرائن اور واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ بابا داود خشکواتی کا کہنا ہے کہ حضرت نصیب سات سال کی عمر میں ہی حضرت شیخ مخدوم حمزہؒ کی خدمت میں لائے گئے۔ ؎

کُو ولیٔ خاص مادر زاد از ہفت سالگی　　　نزد آن مخدوم حمزہ روشن از نور شداست

یہی بات اسرار الابرار میں مشکواتی نے اسطرح بیان کی ہے ؎

آنکہ در خوردی و پیری عشق ورزید و حق　　　دائم اندر جستجو از عاشقان بردہ سبق

شمع از سوز و گداز شستہ غرق اندر عرق　　　شیخ نصر الدین ابو الفقر النصیب اہل حق[20]

دراصل واقعہ بھی یہی ہے کہ میر حسین رازی خود اپنے فرزند نصر الدین کو اس مقصد کے تحت حضرت حمزہؒ کی خدمت میں لے گئے کہ فرزند اُن کی باطنی توجہ سے حصول علوم سلوک اور

معرفت کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مقصد کو پورا کیا۔ اپنی تصنیف کردہ منقبت بابا نصیب میں محمود گامی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ستہ وہری ژٕ یتہٕ ژھور تھو پیر [21]

(سات سال کی عمر میں ہی آپ نے مرشد کی تلاش کی) اور عبدالاحد ناظم بھی اسی روایت کی تصدیق کر کے لکھتے ہیں ؎

ستہ وہری الاہ ناد ہتہ پانہٕ عشقنہٕ نار ژھل نفس توسن رام کورتھن پانہٕ اوتھون راگہ تل [22]

(سات سال کی عمر ہی میں آپ نے عشق الٰہی کی آگ کی تپش کو سہہ لیا اور نفس کے سرکش گھوڑے کو رام کر کے قابو میں لایا) مؤرخ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے انہی بیانات کی بنیاد پر لکھا ہے کہ بابا نصیب "از خوردی بہ اصناف ریاضات و صحبت حضرات اشتغال نمودہ وگوئی سبقت از اقران خود ربودہ" [23] اس طرح بابا نصیب کا حضرت حمزہ کی خدمت میں اولاً سات سال کی عمر میں اور پھر کچھ مدت کے لئے برابر حاضر ہو کر فیضیاب ہونا حقیقتاً ایک امر واقعہ ہے۔ اسی سے اس متواتر روایت کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت حمزہ کی خدمت میں بابا نصیب بارہ تیرہ سال کی عمر تک حاضری دیتے رہے، حضرت شیخ حمزہ ۹۷۸ھ مطابق ۱۵۷۱ء میں وفات پا گئے [24] روایت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اندازہ ہے کہ بابا نصیب پہلی بار ۹۷۲ھ (۱۵۶۵ء) میں شیخ حمزہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں گے اور اس حساب سے ۹۷۲ھ میں سے سات سال کم کر کے ۹۶۵ھ مطابق ۱۵۵۸ء بابا نصیب کا سال ولادت بنتا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق یہی سن اقرب الی الواقعہ والصحت ہے۔ میرے پاس اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

حضرت حمزہ اور بابا داود خاکی کے سال ہائے وفات مدنظر رکھیں۔

۱۔ حضرت حمزہ (ولادت ۹۰۰ھ = ۱۴۹۵ء) وفات ۹۷۸ھ = ۱۵۷۱ء)

۲۔ بابا داود خاکی (ولادت ۹۲۸ھ = ۱۵۲۲ء) وفات ۹۹۴ھ = ۱۵۸۵ء

---

[24] عام طور پر محققین ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء پر متفق ہیں۔ (دادا اور)

حضرت نصیب کی ولادت میں تحقیق کے مطابق ۹۶۵ھ (۱۵۵۸ء) میں ہوئی اور

حضرت حمزہؒ کی خدمت میں پہلی بار والد کے ساتھ ۹۶۵ھ + ۷

حاضر ہوئے ۹۷۲ھ = میں + ۶

پھر چھ سال تک حاضری دیتے رہے۔ ۹۷۸ھ سال وفات حضرت حمزہؒ

اگر ڈاکٹر صوفی کے دیئے ہوئے سال ۹۷۷ھ کو مان لیا جائے۔ تو بابا داود مشکواتی کی ہم عصر

شہادت کہ بابا نصیب حضرت حمزہ کی خدمت میں سات سال کی عمر میں حاضر ہوئے کی تردید

ہوتی ہے۔ جو از روئے قاعدہ غلط ہے۔

۴۔ خواجہ محمد جمیل (تخلص۔ قاضی۔ بابا نصیب کے مرید تھے) خلف ابو القاسم جمیل ۱۰۵۳ھ

مطابق ۱۶۴۳ء میں بغداد میں فوت ہوئے۔ تحصیل علوم کے بعد وہ کچھ عرصہ کیلئے استاد ہو گئے۔

اسی اثنا میں وہ سلوک و معرفت کی طرف مائل ہو گئے اور مرشد کی تلاش کرتے کرتے حج کو گئے۔

مکہ سے مدینہ منورہ پہنچے، وہاں بشارت ملی کہ "تمہارا مرشد تمہارے ہی وطن میں ہے"۔ واپسی

کے کچھ وقت بعد حضرت بابا نصیب کی خدمت میں پہنچے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت وہ کم سے

کم تیس سال کی عمر کے ہوں گے۔ مکتب میں چند سال کے بعد پہلے انہوں نے ملا جوہر ناتت

سے کچھ سال تک علم حاصل کیا پھر علامہ حیدر چرخی (جو کہ ابتدائی استاد بابا نصیب تھے)

کے پاس پہنچے جو مولانا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے اعلیٰ علوم کی تربیت پا کے واپس

وطن آئے تھے۔ ان سے پانچ چھ سال تک وہ علوم حاصل کرتے رہے۔ پھر مدرس ہوئے

اور پھر حج کو گئے۔ وہاں سے واپسی پر بابا نصیب کے حلقۂ تربیت باطنی میں شامل ہو گئے۔

یہ کل ملا کے تیس سال کی مدت بنتی ہے۔ اس دوران میں حضرت بابا داود خاکیؒ بھی وفات

پا چکے تھے اور حضرت نصیبؒ عمر عزیز کے چھیالیس سال گزار کے پچاس کے نزدیک پہنچے تھے۔

یعنی حضرت نصیبؒ سنتالیس سال کی عمر کے تھے جب خواجہ مومن تیس سال کی عمر میں انکی

خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس لحاظ سے خود مومن کا سال ولادت ۹۸۲ھ / ۱۵۷۵ء بنتا ہے۔

۴۔ حضرت شیخ حمزہؒ نے نصرالدین کو دیکھتے ہی اس کی تربیت باطنی حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے سپرد کی۔ اگرچہ وہ چھ سال تک حضرت حمزہؒ کی نگاہِ فیض اثر میں برابر رہے۔ لیکن حضرت خاکی ہی اُن کے حقیقی روحانی مرشد تھے۔ حصولِ علم کے ساتھ ساتھ وہ حضرت خاکیؒ کی معیت میں اُن کے سفر و حضر میں رہے۔ "نورنامہ" سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ سب تاریخی حقائق اپنے سیاق و سباق میں صحیح، درست اور واقع شدہ اسی صورت میں قرار پائیں گے جب حضرت نصیبؒ کا سالِ ولادت ۹۶۵ھ / ۱۵۵۸ء تسلیم کیا جائے۔ بصورتِ دیگر، ہم عصر شہادتیں اور متواتر روایات کی تغلیط و تردید لابدی بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر صوفی نے "کشیر" جلد دوم صفحہ ۵۷۶-۵۷۵ میں حضرت نصیبؒ کا سالِ ولادت کسی ماخذ، سند یا حساب کے بغیر ہی ۹۷۷ھ دیا ہے اور اسے وہ عیسوی حساب سے ۱۵۶۹ء بتاتے ہیں۔ ۹۷۷ھ بہ حیثیت سالِ ولادت حضرت بابا بحوالۂ بالا دلائل سے غلط ثابت ہوا ہے (جبکہ ان کا دیا ہوا عیسوی سال بھی غلط ہے۔ ۹۷۷ھ مطابق ۱۵۷۶ء ہوتا ہے نہ کہ ۱۵۶۹ء) اگر جناب ڈاکٹر صوفی صاحب کے دئے ہوئے ۹۷۷ھ کو بابا نصیب کا سالِ ولادت مان لیا جاتا ہے، تو خواجہ محمد مومن جمیل غازی ایک سال کی عمر ہی میں (۹۸۲ھ میں) بلکہ پیدا ہوتے ہی پانچ سال کی عمر کے لڑکے بابا نصیبؒ (جو اس وقت نصرالدین تھے) سے روحانی تربیت حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ جو عقل کے لئے باعثِ سرسام ہے۔ دراصل ڈاکٹر صوفی صاحب کے پاس کوئی مستند ماخذ یا (CONVINCING - ARGUMENT) نہیں ہے۔ عبدالحمید عرفانی نے اپنے مختصر "تذکرۂ پارسی سرایانِ کشمیر" صفحہ ۱۵۷ میں نہ صرف ڈاکٹر صوفی کی بھونڈی نقل کی ہے۔ بلکہ ۹۷۷ھ کو ۱۶۳۷ء کے مطابق بتایا ہے اور جناب حسام الدین راشدی نے "تذکرۂ شعرائے کشمیر" بخش دوم صفحہ ۹۶۶ میں انہی سنین کو بغیر کسی جانچ پڑتال اور مقابلہ کے من و عن نقص در نقص نقل کیا ہے۔ اس طرح سے غلط در غلط نقولات کا یہ دراز سلسلہ رواج پاتا رہا ہے۔ پروفیسر محمد طیب صدیقی نے بھی بلا تحقیق حضرت نصیب

کا سال ولادت ۹۷۸ھ لکھا ہے اور باقی باتیں بھی ان کی طبعزاد ہی ہیں۔ جنکی کوئی سند نہیں ہے (دیکھیے "حیاتِ شیخ بابا داؤد خاکی" از محمد طیب صدیقی ص ۴۹)

حضرت نصیب کی تعلیم و تربیت

حضرت نصیب کے والد ماجد میر حسین رازی راولپنڈی سے آکر شہر سری نگر میں مقیم ہوگئے۔ یہیں پر حضرت نصیب پیدا ہوئے' اندازہ ہے کہ روایت کے مطابق ابتدائی تعلیم و تربیت انہوں نے اپنے والد ماجد یا کسی نزدیک کے مکتب میں حاصل کی ہوگی۔ اُس زمانے میں سری نگر اور وادی کے دوسرے علاقوں میں جگہ جگہ مکتب اور مدرسے قائم تھے۔ جہاں والدین اپنے بچوں کو حصول تعلیم کے لئے لے جاتے تھے[۲۵] اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مدارس اور خانقاہیں تعلیم و تعلّم کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ بابا نصیب نے مختلف مکتبوں' مدارس اور خانقاہوں اور ان میں کام کرنے والے اساتذہ اور علماء کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً:

"مولانا لطف اللہ کہ مدرسِ خانقاہ داراشکوہ بود' دانشمند و پرہیز گار بود"[۲۶]

حضرت شیخ مخدوم حمزہ کا بیان کردہ واقعہ روایت کرتے ہوئے حضرت نصیب لکھتے ہیں "حضرت شیخ حمزہ می فرمود کہ وقتی در خانقاہِ ملک شمسی چک رسیدم و خورد سال بودم و پس از آنجا پیشِ مولانا درویش کہ امام خانقاہ مذکور بود' رفتم و تمام قرآن ختم" و بعد ازاں پیشِ حافظ عربی و قاری' مدرسِ وقت بود تصحیح کردنِ قرآن ملازمت نمودم[۲۷] اسی طرح مولانا فتح اللہ خلیفہ مولانا شیخ اسماعیل شہر میں خانقاہ بابا اسماعیل میں زینت آرائے مسندِ درس تھے۔ مولانا فتح اللہ شیخ حمزہ کے عہد میں "سلیمانِ وقت" اور "بے بدل"[۲۸] تھے اور در "خانقاہ کلان واقع برکوہِ ماران" سبق پڑھاتے تھے[۲۹] مولانا میر افضل اُستاد حضرت داؤدِ خاکی "اوتادِ شرع و قطبِ علوم و عارفِ اکمل"[۳۰] اور دیندار تھے۔ اور "دریں عہد از علماء' سلطان زمان است"[۳۱] جید اور مستند علما اور فضلاء مسایندِ درس پر متمکن تھے۔

وسط ایشیا، ایران، کاشغر[۳۲] بدخشان اور خصوصاً عرب[۳۳] سے بھی علماء، حافظ، قاری، بلائے جاتے تھے۔ اسی عہد میں شمس الدین پال اور داؤد لوشی جیسے جلیل القدر عالم تھے۔ پورے ملک میں مدرسوں اور خانقاہوں کا ایک مربوط انتظام قائم تھا، اس کے علاوہ بہت سے علماء نجی طور پر بھی اپنے گھروں میں طلباء کو تعلیم اور درس دیتے تھے۔ حتیٰ کہ دور دراز گاؤں اور دیہاتی علاقوں میں بھی مکتب، مدرسے اور خانقاہیں تھیں۔ کھویہامہ میں ایسی ہی ایک خانقاہ تھی جو مہرجان کی خانقاہ کہلاتی تھی[۳۴] مختلف جگہوں پر صاحب ثروت لوگ اپنی لاگت سے مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرتے تھے[۳۵] ان مدارس اور تعلیمی مرکزوں میں عربی اور فارسی زبان میں مختلف علوم اور ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کشمیری علوم میں بھی ماہر لوگ پائے جاتے تھے۔ حضرت نصیبؒ نے حضرت حمزہؒ کے عہد کے ایک ایسے ہی شخص "ستی بٹ" (ہندو) کا ذکر کیا ہے جو "در علوم کشمیری دانا" تھے[۳۶]

اسی علم و ادب کے ماحول میں حضرت بابا نصیبؒ نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ مکتب کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انہوں نے اپنے وقت کے ایک سرکردہ عالم و فاضل مولانا یوسف اعمیٰ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اسلامیات کے علاوہ ظاہری علوم کا معتد بہ حصہ انہی کے مدرسے میں حاصل کیا[۳۷] اس کے بعد وہ چندے مولانا حسین خباز جو "علم و عمل میں کامل و اکمل[۳۸] تھے (اور ہدایت الاعمیٰ، کے مصنف بھی) کی خدمت میں بھی رہے اور ان سے بھی اکتساب علوم کرتے رہے۔ وہ اور بھی بہت سے علماء اور فضلا سے فیض یاب ہوتے رہے۔ لیکن خصوصی طور پر وہ اپنے مرشد حضرت بابا داؤد خاکیؒ سے علوم باطنی کے علاوہ علوم ظاہری کی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے۔

حضرت نصیبؒ کی تعلیمی اور تصنیفی فتوحات اور انکے ظاہری اور معنوی شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد، اور نور نامہ اور دیگر تصانیف میں لا تعداد کتابوں کے حوالے دیکھ کر ان

کی ذہانت، تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ، قوتِ حافظہ اور استحضار و قدرت اور علوم پر عبور کا اندازہ آسانی کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے حصولِ علوم کے لئے کتنی سخت محنت کی ہوگی۔ وہ اسلامی علوم خصوصاً تفسیر، علمِ حدیثؒ، فقہ، تصوف کے علاوہ عربی اور فارسی زبان و ادب اور شاعری کی جملہ اصناف پر خاصا عبور، اور کمالِ قدرت رکھتے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے اگرچہ خاکسارانہ انداز ہی میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ "فقیر نیز کتب فارسی و عربی در مطالعۂ خود آوردہ"[۳۹]

حضرت بابا نصیبؒ کی تصنیف نورنامہ کے سرسری مطالعہ کے دوران جن مختلف کتابوں کے حوالہ جات اسمیں نظر آئے اُن کی بناء پر یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نصیبؒ نے قرآن کریم اور متداول تفسیروں کے علاوہ تفسیر حسینی، تفسیر عظیمی، تفسیر بیضاوی، تفسیر مواہب الرحمان وغیرہ اور کتب احادیث میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ اور صحاحِ ستہ کی دیگر کتب حدیثؒ، کا براہِ راست بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، اپنی تصانیف میں جس عالمانہ ذہانت و فطانت کے ساتھ قرآن و احادیث مبارکہ سے استنباط اور اخذِ مطالب کرکے فیض اٹھایا ہے، اس سے انکی عالمانہ، مفسرانہ اور محدثانہ شان ظاہر ہوتی ہے، شاید اسی بناء پر انہیں "ثانی نعمان" (ابو حنیفہؒ) کہا گیا ہے[۴۰]۔ اس کے علاوہ انہوں نے جن کتابوں کے اقتباسات اپنی تصانیف میں نقل کئے ہیں۔ ان میں چند یہ ہیں :-

معارج النبوۃ، معالم التنزیل، دقائق الاخبار، شرحِ شمسی، گلستان و بوستان و کلیات حضرت سعدی شیرازی، مثنوی مولانا رومؒ، خمسۂ نظامی گنجوی، نفحات الانس، لوایح، و دیگر تصانیف جامی، منطق الطیر، و دیگر کتب حضرت فریدالدین عطار، دیوان حافظ شیرازی، شاہ نامۂ فردوسی، رباعیات ابو سعید ابی الخیر، رباعیات عمر خیام، تصانیف عین القضاۃ ہمدانی، ذخیرۃ الملوک و دیگر تصانیف میر سید علی ہمدانی، عوارف المعارف از شیخ شہاب الدین سہروردی، فصوص الحکم از ابن عربی، تصانیف حضرت امیر خسروؒ، ملفوظات

حضرت نظام الدین اولیاءؒ، تصانیف حضرت بابا داوٗد خاکیؒ، اشعار بر جستہ حضرت علیؓ، وغیرہ حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کا کلام بلاغت نظام انہوں نے اکثر جگہوں پر نقل کیا ہے اور کبھی کبھی اس کا ترجمہ نثری اور منظوم بھی کیا ہے۔ اس کے بارے میں خصوصی طور پر فرمایا ہے کہ جسے حضرت شیخؒ کے کلام پر عبور حاصل ہو، اسے دیگر کتب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔[41]

ان کتابوں کے علاوہ بھی انہوں نے دیگر لاتعداد مصنفوں کی تصنیفات اور شعراء کے دواوین مطالعہ کئے ہوں گے۔ اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ نوجوانی تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے علم و ادب کے لاتعداد ذخائر اپنے دل و دماغ کے خزانے میں جمع کئے تھے، اسی علم و فضل اور کمال تقویٰ کی وجہ سے حضرت نصیب کو جوانی ہی میں معروف و مستند عالم دین اور فاضل و اکمل اُستاد کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ میر سعداللہ شاہ آبادی نے انہیں سے "منبع علم و کاملِ صوفی" اور "ثانیؒ بو حنیفہؒ کوفی"[42] کہا ہے۔ ملا بہاءالدین متو نے انہیں "وارث انبیا بہ علم و ادب" اور "در شریعت بہ علم و دانش طاق" کہا ہے۔[43]

بابا کمال نے انکے بارے میں یہ ذکر کیا ہے ؎

مُفضّل بہ طاعات و افضل بہ علم ۔۔۔ بہ علم و عمل صاحب ِزہد و حلم

اور کہا ہے کہ "میدانِ اوصاف" میں انہوں نے "بہ چوگانِ خود در انداز گوئی سخن"۔[44]

سلوک و معرفت کی تعلیم

جیسا کہ ذکر ہوا ہے، حضرت نصیبؒ بچپن میں ہی اپنے والد ماجد کے ذریعہ حضرت شیخ حمزہؒ کی خدمت پہنچے، جس کا ذکر مشکواتیؒ نے اپنی تصنیف زادالفقراء (تذکرۃ ابوالفقراء) میں اس طرح کیا ہے ؎

کو ولیٔ خاص! در زاد از ہفت سالگی ۔۔۔ نزدِ آں مخدوم حمزہ روشن از نور برشد است[45]

اسکی تصدیق بہاءالدین نے ذرا تفصیل کے ساتھ کی ہے ؎

بہ حرم شیخ حمزہ سلطانش ۔۔۔ دید در کودکی چو برہانش

گفت چیزی کہ مرا دادند	ایں پسر را بہ جنب بنہادند
وآن چہ ما را ندادہ اند آن ہم	بر دل او کشادہ اند آن ہم
ہر کہ را لطف حق قرین گردد	پیر رہ مرشد گزیں گردد
ہر کہ در دین بہ کار سازی شد	او چو بابا نصیب غازی شد[۲۶]

جب میر حسین رازی نے حضرت حمزہؒ کی خدمت میں اپنے فرزند کو پیش کیا، تو مرشد نے اُسے "اللہ کی برہان" کی مانند پایا۔ اور نگاہِ فیض و کرم سے اُس کے قلب و صدر کو وصولِ علوم معرفت و سلوک کے لئے قابل بنا دیا، اور اُسے اسرارِ ربانی کے لئے کھول دیا۔ اس مجلس میں حضرت حمزہؒ کے خلیفۂ خاص حضرت بابا داود خاکیؒ بھی موجود تھے، حضرت حمزہؒ نے خورد سال بچہ کو (جو اُن کی بائیں جانب (بہ جنب۔ بطرف۔ بیٹھا تھا) حضرت بابا داؤد خاکی طرف اٹھا کر اس کا ہاتھ حضرت خاکی کے ہاتھ میں دے کر اس کی روحانی اور معنوی تربیت انکے سپرد کی، اس واقعہ کو بابا داود مشکواتی نے یوں قلمبند کیا ہے ؎

دست او در دست خاکی خود بنہاد آن تاج دین

گفت این منصب نصیب طفلک الیسر شد است[۴۷]

(طفلک الیسر کا مطلب ہے بائیں جانب بیٹھا ہوا۔)

حضرت بابا کے گھر میں زہد و ورع، اور فقر و تقویٰ اور حصولِ علم شریعت و طریقت کا ہی ماحول چھایا ہوا تھا، اُن کے والد حضرت حمزہ سے بعیت تھے، والدہ بھی راہِ معرفت کی سالکہ تھیں، اس لئے بچپن ہی سے انکی باطنی تربیت کا انتظام بھی قدرت کی طرف سے ہوا۔ محمد اعظم کا کہنا ہے کہ "از خوردی بہ اصنافِ ریاضات و صحبتِ حضرات اشتغال نمود و گوئی سبقت از اکثر اقران خود ربودہ خلیفۂ برجستۂ حضرت بابا داود خاکی است" و "بہ ائے الشان "فقرا بسیار را دیدہ، تمام عمر بترکِ لذات گذرانید"[۴۸]

آغاز شباب ہی سے وہ حضرت خاکیؒ کی تربیت میں رہے۔ جیسا کہ مسکینؔ نے تحریر کیا

ہے۔ "یہ توفیقِ ربانی در عینِ جوانی از تربیتِ شیخ خاکی بہرہ مند گردید و یکبار ترکِ لذات و حیوانات کردہ در ریاضات شاقہ اشتغال فرمود و در اندک عمر تصفیۂ باطنی و تزکیۂ روحانی حاصل کردہ از واصلانِ حق گردید۔"[49] محمود گامی نے بھی شاعرانہ انداز میں اس کا ذکر کیا ہے کہ حضرت نصیب کو سات سال کی عمر میں ہی حضرت بابا داود خاکی جیسے "روشن ضمیر مرشد" کا فیض حاصل ہوگیا۔[50] بہاء الدین متو نے بھی اس کا ذکر یوں کیا ہے ؎

خاکِ راہِ جناب خاکی شد   شاہ اقلیم درد ناکی شد[51]

غازی از وے نصیب غازی شد[52]

حضرت بابا داؤد خاکی اپنے زمانے کے اعلیٰ پایہ کے مستند اور جید علماء میں سے تھے، چوبیس سال کی عمر میں حضرت شیخ مخدوم حمزہؒ کی خدمت میں پہنچے پھر سب کچھ چھوڑ کر انہیں کے ہوگئے۔ اس وقت وہ بادشاہ کے اتالیق تھے۔ نورنامہ میں حضرت نصیب نے خصوصیت کے ساتھ شیخ نور الدین ریشیؒ اور شیخ مخدوم حمزہؒ کا تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے۔ ضمناً ان کے مریدین اور خلفاء کا ذکر بھی، اگرچہ اسمیں ضمنی طور پر حضرت بابا داود خاکیؒ کے اشعار، اقوال، اور انکے روایت کردہ واقعات بیان ہوئے ہیں لیکن ان کے متعلق تفصیلات تو درکنار، جزئیات بھی نظر سے نہیں گزرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت خاکیؒ اُن کے مرشد نہیں تھے۔ ممکن ہے اور تصانیف میں اُن کا تفصیلی ذکر بیان ہوا ہو، لیکن فی الحال وہ میری دسترس سے باہر ہیں۔

مگر ہمارے پاس ایک اہم ترین دستاویز ہے، جس کو حال ہی میں دریافت کیا گیا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے حضرت بابا نصیب کی شہرت و عظمت کا چرچا سنکر انہیں شاہی دربار میں تشریف آوری کے لئے ایک دعوت نامہ بھیجا تھا، لیکن حضرت بابا نصیب الدین نے اپنی فقیرانہ شان اور مومنانہ استغنا کو قائم رکھتے ہوئے، احسن طریقے سے دعوت کو ٹال دیا اور جواب میں ایک منظوم مکتوب شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا جسمیں وہ حضرت سعدی شیرازی

کے ایک شعر کی تضمین خوبصورت انداز میں کر کے واضح کرتے ہیں کہ وہ حضرت داؤد خاکی سے فیض یافتہ ہیں اور انہیں سب کچھ اُن کی نظر پُر تاثیر سے ہی ملا ہے۔ یہ منظوم خط "الدوایر دُ بحر الانساب" میں مندرجہ ذیل نثری عنوان کے تحت نقل ہوا ہے:۔

"من مقالاتِ شیخ المشائخ، سلطان العارفین حضرت شیخ بابا نصیب الدین غازی در جوابِ رقعۂ بادشاہ جہانگیر در حسنِ طلب (بادشاہ) کہ حضرت شیخ علیہ الرحمۃ قبول نفرمود ـــــ این ابیات در جوابِ او نوشتہ[53]

حضرت نصیب اپنے مرشد حضرت بابا داؤد خاکی کا ذکر یوں فرماتے ہیں:۔

مرا ہم رہنمونی کرد آں پیر — وگرنہ من چگویم شرح و تدبیر
کہ پیری داشتم بدرِ منیری — کہ پیری در حقیقت دستگیری
بہ علمش گر نپرسی کانِ فرہنگ — ہمیشہ داشت با نفس خودش جنگ
فلک در زیرِ پایش چون زمین بود — ملایک بہرِ طاعت جبہ می سود
ز فیضش اگر گردی بہ جستی — بفرقِ آسمان چون او نشستی
غرضش بہ زانوی پای خوش سرافراز — بعلم و حلم و زہد خویش ممتاز[54]

اس کے بعد اپنی خاکساری، عجز اور بے بضاعتی کا ذکر کرتے ہوئے ایک مثال سے اپنے مرشد کی فضیلت بیان کرتے ہیں:۔

کس از امیدِ من چون شاد گردد — نہ از بختم کسی آباد گردد!
شنیدستم کہ روزی بود مجنون — ز عشقِ یار خود بسیار محزون!
بہ سوئے خانۂ لیلیٰ رواں شد — سراسیمہ چو گوی از سر دواں شد
چو بس ذوقِ محبت داشت بسیار — گرفت آرام اندر کوئی دلدار
کہ ناگاہ چون سگِ لیلیٰ بر آمد — عجب در دیدۂ مجنوں در آمد
بہ جستی او جا گرفت اور ادر آغوش — ہمہ غمہائی دل کردہ فراموش

اگر مجنون بدیدی روی لیلی | نکردی سوی سگ اوہیچ میلی
زعشق پیر یا من عزو حرمت | ہمی دارند مردم جملہ عزت!
چہ صاحب دولتی در جملہ عالم | نظر دارند ازاں مردم بہ عالم
مرا از خادمانش می شمارند | مرا از دوستیش دوست دارند
بہر چشمی کہ او خواص گشتی | ہماں چشمہ مرید خاص گشتی
ز اسیم "اعلمش" داود خاکی | بود رحمت بر آں ارواح پاکی
مگر در خدمتش یکچند بستم | "وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم"[۵۵]

اپنے مرشد کی راہ نمائی میں انہوں نے سلسلۂ عالیۂ سہروردیہ کے تمام لوازمات پورے کرکے سلوک و معرفت کے اعلیٰ مقامات طے کئے جس کا تفصیلی ذکر تمام تذکروں اور تواریخ میں ملتا ہے۔ احکام شریعت اور لوازم طریقت میں وہ حد درجہ منہمک رہتے تھے، عبادات اور ریاضات میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ فقر و استغنا عنفوانِ شباب ہی سے اختیار فرمایا۔ متاہل زندگی سے فراغت پاتے ہی تجرید و تفرید میں باقی ساری عمر اشاعتِ دینِ حق اور ترویج شریعت کے لئے وقف کر دی۔[۵۶] دل کے غنی تھے۔ جو بھی نذور اور فتوحات خدمت میں پیش کی جاتی تھیں اسی وقت وہ سب غربا اور مساکین میں تقسیم کرا دیتے تھے۔[۵۷] اپنے ہاتھ سے کبھی روپیہ سکہ نہیں پکڑتے تھے۔ چار پانچ سو ایسے مریدین ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ جنہیں بہت سے مزدور، معمار اور نجار اور مبلغ ہوا کرتے تھے۔ جہاں جاتے وہاں ضرور مسجد، غسل خانہ، بیت الخلاء اور پل (حسب ضرورت) وغیرہ تعمیر کرا دیتے تھے۔[۵۸] کہیں کہیں مسافر خانے بھی بنوائے، جیسے زوجیلا پہاڑ کے راستے میں۔[۵۹] غیبت اور برائی سے انہیں بے انتہا نفرت تھی۔ خود ترکِ لذات کئے ہوئے تھے اور اکثر روزہ دار رہتے تھے۔ لیکن غربا، مساکین اور اپنے مریدوں کی کثیر جماعت کو اچھا کھانا کھلاتے تھے۔ جسمیں بھیڑ، بکرے اور گائے کا گوشت بھی شامل ہوتا تھا۔[۶۰] اپنے مرشد

کی طرح بڑے سیّار اور سیّاح تھے۔ قرآن کے حکم 'سیروفی الارض' کے مطابق لاتعداد جگہوں پر پہنچے، اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا فریضہ انجام دیا۔[61] ان کا مسلک صلح کل کا تھا۔ زاہد مرتاض، 'قائم اللیل' صائم الدہر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عالم باعمل اور صوفی باصفا تھے۔ وہ اعتدال کو نہایت پسند کرتے تھے۔ نہ کبھی جنگلی جڑی بوٹیوں اور گھاس پھوس سے پیٹ بھرا (کیوں کہ اس سے انسان سخت لاغر ہوگا۔) نہ مرغن، لذیذ اور پرلطف چیزوں سے شکم کو سیر کیا (کیوں کہ ان سے حرص و لالچ اور درندگی بڑھتی ہے) معمولی عام اور سادہ غذا استعمال کرتے تھے جو روح کی شادابی کے لئے مفید ہے۔ لباس کے کپڑے بھی اکتفا کی حد تک استعمال فرماتے تھے۔ وہ نہایت ہی متوکل تھے۔[62]

جہانگیر کے دعوت نامے کے جواب میں اپنے منظوم خط میں اپنے مشرب اور مسلک سلوک و تصوّف کی وضاحت میں وہ فرماتے ہیں ؎

کسی کو عاقل و فرزانہ باشد | چرا او طالبِ دیوانہ باشد
کسی کو بخت و دولت یار دارد | ہمیشہ از گدایاں عار دارد
گدائی اُنس کردہ با دَد و دام | کہ آرامی نکردہ صبح تا شام
ہمیشہ گردد اندر کوہ و ہامان | سراسر چاک دارد جیب داماں
فقیری مستمندی بی کس و کوی | نہ رفتہ پیش کس نہ نمودہ اش روی
بہ تنہائی گرفتہ خوی دائم | نہ یک جا مسکن خود کردہ قائم
دو شب یکجا نبود از صبح تا شام | ندارد یک شبی با خود سرانجام
چو بادِ صبح سرگرداں و دل ریش | جدائی کردہ از بیگانہ و خویش
بہ بزمِ عیش الفت کم گرفتہ | ز شادی این جہاں ماتم گرفتہ
ازین دنیا سرانجامی ندارد | چو بادِ صبح آرامی ندارد
نکردہ خانۂ در عمر یک جا | نہ کردہ مطبخی نے دیگ برپا

نہ از وے گرم گشتہ دیگدانی | نہ از وے سیر گشتہ میہمانے
نمود از برگِ دنیا ترکِ دنیا | گزشتہ یکسر از ما سوی اللہ
چرا با شی چنین کس را طلب گار | گہی در وشت باشد گہہ بہ کہسار
چرا با این چنین کس در گدازی | بہمراہِ خودش ہمراہ سازی
اگر تو طالبِ راہِ یقینی | چرا با این چنین کس در نشینی
ہر آنکس را کہ عزّ و جاہ باشد | بہ احوالِ فقیر آگاہ باشد
کسی را نہ ز شوق آگاہ باشد | کہ دل ہا را بہ دل ہا راہ باشد
دگر باشد قبولِ رائی عالی | ندارم از سفر کردن ملالی
شنیدم تا صفاتِ نیک نامت | کہ داری با فقیراں احترامت
زِ ما دیدہ بہ اخلاصت گزیدم | یقین گویا کہ پیشت خود رسیدم
زِ اخبارِ رسول حق تعالیٰ | ظُنّوا المؤمنین خیرِ خیرا[۶۳]

اس خط میں چند ایسی باتیں بھی حضرت نصیب نے بیان کی ہیں، جو ان کے اپنے مسلک یعنی سہروردی سلسلہ سے مختلف ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ حضرت نصیب اور اُن کے مرشدین، اپنے سلسلہ کے علاوہ کبروی سلسلۂ تصوف سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت میر سید علی ہمدانی کی تعلیمات کا اثر حضرت خاکی اور حضرت نصیب کی تصنیفات کی وساطت سے ظاہر ہے۔ سہروردی سلسلہ سے متعلق اصحاب بھی "اورادِ فتحیہ" (وظیفہ میر سید علی ہمدانی) باقاعدگی کے ساتھ حلقہ کی صورت میں روزانہ پڑھتے اور ورد کرتے تھے[۶۴] لیکن اس کے ساتھ ساتھ کشمیر میں رواج پانے والے تمام سلاسلِ تصوف و سلوک پر ہر دور اور ایام کے ساتھ مقامی ریشی سلسلۂ تصوف کا بھی اثر پڑا جس میں شیخ نورالدین کی وفات کے کچھ عرصہ بعد عجیب و غریب تبدیلیاں آگئی تھیں۔

"کشمیر میں صوفیائے کرام اور ریشی حضرات کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے، معاشرتی،

مذہبی اور ثقافتی زندگی پر اُن کا اثر بہت رہا ہے۔ انکے علم و تقویٰ کی وجہ سے عوام میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ وہ تارکِ دنیا تھے نہ اپنے آپ کو عوام اور اُن کے مسائل سے الگ کرتے۔ بلکہ ان میں سے زیادہ تر عام لوگوں کی طرح رہتے سہتے، شادی کرتے، بال بچے پیدا کرتے اور لوگوں کے معاملات میں سرگرمی سے حصہ لیتے۔" اور "ابتداء ریشی مسلک میں ترکِ دنیا کی طرف کوئی رجحان تھا ہی نہیں۔[95]

لیکن بعد میں اس میں تبدیلیاں ہو گئیں، اور سخت ریاضت کش زندگی، جسمیں ترکِ لذات، ترکِ علائق و خلائق، گوشہ گیری میں عبادت کی مشغولی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ سہروردی اور کبروی اور دیگر سلسلوں سے وابستہ لوگ کسب و کار کرتے، عام لوگوں کی طرح، لیکن ممتاز متقیانہ پاکیزہ اور متاہل زندگی گزارتے تھے جس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن آخری دور میں یہ لوگ بھی کسی حد تک راہبانہ زندگی کو پسند کرنے لگے۔ اس تبدیلی کی کون سی وجوہات تھیں؟ اور یہ کس دور میں شروع ہو گئی؟ اس کے بارے میں تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں کوئی توجیہہ نظر نہیں آتی ہے۔ میری رائے میں کشمیر کی حکومت پر چک خاندان کے قبضہ کے بعد ہی ان صوفیانہ مسالک میں منفی رجحانات شروع ہو گئے، جو ڈوگرہ دور کے آغاز تک ان کے زوال اور مکمل جمود پر منتج ہو گئے۔ بہر حال یہ مضمون الگ مقالے کا متقضی ہے۔ ریشیوں اور ریشی مسلک کا ذکر ہوتے ہوئے حضرت بابا نصیب بھی اسی تبدیلی کے مؤید نظر آتے ہیں۔ نورنامہ کو وہ "تذکرہ درویشان و بیانِ دلِ ریشیان" کہتے ہیں جو "در زاویۂ توکل بہ گوشۂ عزلت نشستند تا بودند ببادۂ معرفت مست بودند"...... اسے درویشِ پرہیزگاران و متقیان کشمیر را ریشی می نامند نسبت یعنی لباس تقویٰ کہ زاہداں، درشت و سخت می پوشیدند[96]"

روشنائی شمعِ دیں از ریشیانست	رہ نمائی رہِ یقیں از ریشیان است
دل نوازئ مردمِ اہلِ نیاز	از صفائی باطنِ دلِ ریشیان است

ریشی مردی بے زن و فرزند بود | قطع پیوند شرط حال ریشیان است
ریشی زخمی نشتر درد خدای | زخم نشتر در دل این ریشیان است
ریشی یعنی خرقۂ تقویٰ لباس | خرقۂ تقویٰ لباس ریشیان است
ریشی یعنی صوفی صفوت نشان | صوفی صافی نشان از ریشیان است
ریشی یعنی مُرشدِ اہلِ طریق | در طریقت تربیت از ریشیان است
ریشی یعنی قایمُ اللیل تمام | روزۂ دہر است رسم ریشیان است
ریشی یعنی مشتے از خاکِ نیاز | خوش مقام نیستی از ریشیان است
ریشی یعنی تارکِ حرص و ہوا | ترک بدنفسی سلوکِ ریشیان است
وصف حالِ ریشیان گفتی نصیب | تا شوی محشور با این ریشیاں (است)[1] ۹۷

حضرت بابا نصیب تجرید و تفرید، اور ترک لذائذ کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ان کی حمایت میں اگرچہ پُرجوش نظر آتے ہیں[۹۸] لیکن اُن کی ساری زندگی جہاد، تبلیغ و اشاعت دین، رفاہ عام کے کام، غربا اور مساکین کی خبر گیری اور کفالت اور بنی نوع انسان سے بے پناہ محبت و ہمدردی اور خیر خواہی سے عبارت ہے۔

کرامات

اولیائے کرام نے تصرفات، خوارق اور اعجاز و کرامات کو نہ کبھی پسند فرمایا ہے اور نہ ظاہر کیا ہے۔ اُن کی دعا سے اگر کسی کو کوئی فائدہ پہنچا تو یہ بھی قادرِ مطلق کی مہربانی سے ہوا۔ انہوں نے نہایت ہی عجز و درماندگی، انکسار و بے چارگی کے ساتھ ربِ کائنات کے حضور میں اپنی عبودیت کا اقرار و اعتراف کیا ہے۔ اُن کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ ہزاروں بندگان خدا اُن کی تربیت سے تزکیۂ و تصفیہ باطن کی دولت سے مالا مال ہو کر شریعت محمدی ؐ کی صراط مستقیم پر گامزن ہوئے اور دنیا و آخرت میں فائز المرام ہو گئے۔ یہ ہوا میں

[1] میری رائے میں "است" کا لاحقہ اس پوری نظم میں کاتبوں کی غلطی سے شامل ہوا ہے۔ شاد

اڑنا، پانی پر چلنا، پہاڑ کو ہاتھ پر اٹھانا، "طلسم ہوشربا" کی داستان میں زیب تو دے سکتا ہے۔ دینِ حق کی حقانیت ان اوہام و خرافات اور طلسمات کی محتاج نہیں ہے۔

حضرت بابا نصیب کی پوری زندگی ایک حقیقی مجاہدِ اسلام، مبلغ، واعظ، مفتی، فقیہہ صوفی باصفا، اور معنوی مرشد راہ شریعت و معرفت، کی زندگی تھی۔ جہادِ بالقلم، جہاد بالتبلیغ، جہاد بالنفس، جہاد باللسان، ان کی زندگی کے اہم ترین عنوانات ہیں۔ قریہ قریہ گاؤں گاؤں اور دشوار گذار راستے پیدل طے کرکے دور دراز علاقوں میں انہوں نے پیغام محمدی کو پھیلایا اسے عملاً قائم کیا، تبت، کرناہ، لداخ، اسکردو، دردستان، بلتستان کشتواڑ، ڈوڈہ، بھدرواہ، پونچھ، راجوری، نوشہرہ، غرض وادی اور اس سے ملحق علاقوں میں انہوں نے بارہ سو سے زاید مساجد تعمیر کیں، اس کے علاوہ ہزاروں غسل خانے، بیت الخلاء بھی بنوائے، مسافروں کے لئے دشوار گذار راستوں میں مسافر خانے تعمیر کئے، پل بنائے، سایہ دار اور میوہ دار درخت لگوائے۔ ہزاروں غربا، مساکین اور محتاجوں کی مدد اور خبر گیری کرتے رہے۔ سینکڑوں گمراہوں کو اسلام کی روشنی سے منور کیا۔ لاتعداد عالم و فاضل شاگردوں کی قابل فخر جماعتیں تیار کیں، جنہیں حضرت نصیب نے نہ صرف علوم ظاہری سے آراستہ و پیراستہ کیا بلکہ ان کی باطنی تربیت بھی فرمائی اور وہ اعلیٰ ترین مقامات سے حامل اور آنے والے لوگوں کے لئے روشنی قلب و نظر کے مینار بن گئے۔ اسلامی علوم کی اشاعت کے لئے خانقاہیں اور مدارس بھی حضرت نصیب نے تعمیر کئے۔ اور اپنے قلم سے فقہ اور سنت نبوی کے بارے میں کتب تصنیف فرمائیں۔ میرے خیال میں حضرت بابا نصیب کی سب سے بڑی کرامات یہی کارنامے ہیں، جنہیں دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت اور دوام حاصل ہے۔

حضرت نصیبؒ کی متاہل زندگی

اکثر صوفیا، عظام، اولیا اور ریشیانِ کرام کے بارے میں نادان عقیدت کیشوں نے

اس بات کو بہت رواج دیا ہے کہ حضرت نکاح اور خانگی زندگی سے متنفر تھے۔ علایق اور کسب وکار ترک کر کے جنگلوں اور غاروں میں عبادت وریاضت کرنا افضل سمجھتے تھے۔ یہ بات حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ سہروردی، کبروی، اور چشتی سلاسل کے بزرگ متاہل زندگی گزارتے بال بچے پیدا کرتے اور کسب وکار کرتے تھے۔ کشمیر کے ریشیان کرام کے سرخیل حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ انکے اکثر مُرید یا حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ ان کے فرزند میر سید محمد ہمدانیؒ، پھر حضرت سلطان العارفین شیخ مخدوم حمزہؒ، ان کے برادر ان کے خلفاء خصوصاً حضرت بابا داود خاکیؒ اور ان کے مریدین سب متاہل زندگی گزارتے تھے۔ ان کے بال بچے بھی ہوئے۔ کسب وکار بھی کرتے تھے۔ اور اپنی، اپنے اہل وعیال اور متعلقین کی کفالت کرتے تھے۔ نذر ونیاز سے ہمیشہ انہیں زبردست کراہت اور تنفر رہا۔ اس کی اکثر مثالیں، ہمیں انکے ملفوظات اور تذکروں میں ملتی ہیں۔ مثلاً بابا بانیدر "عیالمند" تھے۔ بابا حسن ریشی صدر و بہتر ریشیان عیش مقام۔ صاحب مال وفرزند وعیال "تھے۔ مُرید شیخ حمزہؒ تھے۔ اور "اکثر اوقات حضرت شیخ حمزہ بہ خانۂ او رفتی"۔[۹۹]

ظاہری تعلیم وتربیت کے حصول کے ساتھ ساتھ ہی حضرت نصیب سالک راہِ معرفت بھی ہوئے۔ جوانی کے ایام میں ہی ان کے والدین نے فرمانِ رسول اکرمؐ "النکاح من سنتی" کے تحت حضرت نصیب کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کردیا لیکن مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ، معمولی مدت کے بعد ہی حضرت نصیب کی زوجہ محترمہ عالم بقا کو سدھاریں جس کے بعد حضرت نصیب کے سیاحتی تبلیغی مشاغل میں اتنا اضافہ ہوا کہ انہیں آیندہ نکاح ثانی کے بارے میں سوچنے کا بھی موقعہ نہیں ملا۔ اور تجرید وتفرید کی زندگی سے انہیں خدمت دین کا جو وافر موقعہ ملا اُس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ طریقہ بہت مفید ہے۔ تاز ان عقیدت مندوں نے اُن پر یہ افترا باندھا ہے کہ نفقۂ نکاح سے لیکر وظیفۂ زوجگی کے ادا کرنے کے بغیر ہی، دوسرے ہی دن حضرت نصیب نے اپنی زوجہ

منکوحہ کو (بلا وجہ) طلاق دیدی۔ جبکہ حضرت خوب جانتے تھے کہ اللہ کے ہاں "ابغض الاشیاء" طلاق ہے۔[۶۸] اللہ کے حکم اور سنت رسولؐ سے علمائے حق اور اولیائے کرام' اس قسم کا مذاق نہیں کرتے تھے۔ یہ انکی شان کے خلاف تھا۔ ہاں اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ کچھ اولیاء اللہ اور ریشی حضرات عمر بھر مجرد رہے' لیکن اپنے مریدوں کو بے نکاح رہنے کی کوئی تلقین انہوں نے کبھی نہیں کی۔ خود حضرت شیخ نور الدین نے رہبانیت کی زندگی کی مذمت کی ہے اور مومنانہ گرہستی زندگی گزارنے کو حضرت رسول اکرمؐ کا طریقہ بتایا ہے۔[۶۹]

ذریعہ معاش

اولیائے کاملین اور صوفیائے واصلین کے ساتھ کسب معاش اور حصول آذوقہ حیات کے لئے کسب وہنر سے کوئی علاقہ نہ رکھنے کا انتساب نہ صرف غلط ہے' بلکہ نہایت ہی گمراہ کن نظریہ ہے۔ خود حضرت داود خاکیؒ' حضرت نصیبؒ' انکے شاگرد داود مشکواتیؒ کی تصنیفات اور دیگر تذکروں' ملفوظات اور تاریخ کی کتابوں سے اسبات کی بے شمار شہادتیں ملتی ہیں کہ بزرگان کرام مختلف علوم' فنون' حرفتوں' اور ہنروں میں ماہر تھے۔ اکثر مدرس تھے' بہت سے قرآن کریم' کتب احادیث اور دیگر ضروری کتابوں کی کتابت کرکے اپنی روزی کماتے تھے۔[۷۰] کچھ لوگ کاسب تھے اور اپنا گزارہ چلاتے تھے۔ نذر و نیاز ہرگز قبول نہیں کرتے تھے۔[۷۱] بہت سے بزرگ معماری اور نجاری کا کام کرتے تھے[۷۲] حتیٰ کہ بزرگوں کی بیویاں بھی کتابت کا کام کرتی تھیں۔[۷۳]

حضرت بابا نصیب نے ظاہری علوم و فنون کی تربیت پانے کے بعد درس و تدریس کا مقدس پیشہ اپنایا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کتابت کا کام بھی کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا' میر سعد اللہ شاہ آبادی' محمد اعظم دیدہ مری' پیر حسن کھویہامی' محی الدین مسکین سرائے بلی' اور خصوصاً بابا داود مشکواتی نے اپنی تصانیف میں سوانحی حالات کے ساتھ ایسے اصحاب کی ایک اچھی نمایاں تعداد کا تذکرہ کیا ہے جو براہ راست حضرت نصیب کے

شاگرد تھے، جنہیں سے اعلیٰ پایہ کے علامہ، فاضل، عالم اور ادیب، مصنف اور شاعر بھی تھے۔[75] میر سعد اللہ شاہ آبادی بانے حضرت نصیب کے شغلِ درس وتدریس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

بود مرا دب شیخ دین خاکی — داشت زو در سلوک چالاکی
بہ سلوک و بہ جذب آں کاملی — طالباں را رسانده در منزل
نیز جمعی ازو بہ علم اعلم — بہرہ خویشتن یافتہ اتم[76]

حضرتِ نصیبؒ معاصرین اور دیگر تذکرہ نگاروں کی نظر میں

حضرت نصیب اپنے تبحر علمی، فضیلت، صدق، فقر، استغنا اور تقویٰ، سخاوت و فیاضی، ایثار و قربانی، غربا و مساکین پروری اور بنی نوعِ انسانی کے لیے بے لوث محبت اور ہمدردی کی وجہ سے اپنے اکثر معاصرین سے ممتاز و افضل تھے۔ محمد اعظم دیدہ مری نے بلیغ انداز میں خوب لکھا ہے کہ "گوی سبقت از اکثر اقران خود ربوده"[77]

خواجہ خاوند محمود نقشبند (وفات ۱۱ رشعبان ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء، مدفن لاہور[78]) حضرت نصیب کے ہم عصر اور اعلیٰ پایہ کے بزرگ تھے۔ بابا داود مشکواتی کے ذریعہ حضرت نصیبؒ سے جب اُن کی ملاقات[79] ہوئی تو فرمایا "مانا دیده چو دل خوردی پنداشته بودیم چون بدیدیم دریائی کلانی مواج یافتیم"[80] حضرت خواجہ کی خانقاہ علمی اور روحانی مرکز کے طور پر مشہور تھی۔

آخوند ملا شاہ بدخشی (وفات ۱۰۷۲ھ۔ لاہور[81]) شہزادہ دارا شکوہ کے مرشد تھے۔ اپنے دل میں "شوقِ دیدن بابا نصیب از مدت" رکھتے تھے، جب ملاقات ہوئی تو حضرت ملا (محمد) شاہ بدخشیؒ نے حضرت نصیبؒ سے پوچھا "این کثرت ضدِ وحدت است" بابا نصیبؒ نے جواب دیا کہ "وحدت در کثرت است"[82] آخوند صاحب خود حضرت نصیبؒ کی ملاقات کو آئے۔ اس سے علم و فضل اور معرفت و سلوک میں

حضرت نصیبؒ کے علوئے مرتبت کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے علاوہ ان کے جلیل القدر معاصرین میں سربرآوردہ عالم و فاضل، شاعر و ادیب اور مختلف روحانی سلسلوں کے عالی مرتبت بزرگ بھی تھے۔ جن میں چند ایک یہ تھے۔ ملا محسن فانی، خواجہ حسن قاری اعبد میری مصنف راحتہ الطالبین، خواجہ اسحاق قاری مصنف چل چلائے عارفین، مولانا حاجی الوسی، مولوی شیخ دولت، ملا یوسف کادسو، خواجہ عبداللہ حافظ خواجہ قاضی اسماعیل، بابا حاجی بہرام، خواجہ بدیع الزمان بانڈے، ملا حسن کوچو، ملا یوسف چیک، قاضی عبداللہ ملا رفیا، خواجہ حبیب اللہ نوشہری، شیخ احمد چاگی مصنف سلطانیہ، مولانا میر افضل، بابا علی رینہ مصنف تذکرۃ العارفین، خواجہ بہرام مصنف تذکرۃ المرشدین، قاضی عزرا، مولوی جعفر مصنف رموز الطالبین، حضرت شیخ یعقوب صرفی، خواجہ طاہر رفیق، شیخ اسمٰعیل قادری، آخوند ملا کمال، خواجہ مسعود پانپوری، حاجی داود مشکی، حاجی وتہ بابا، شیخ محمد پارسا، شیخ موسیٰ کبروی، ملا حسین خباز، مولانا محسن آفاقی، خواجہ ابراہیم لولی ماہر خطاط، حاجی بہرام اعلیٰ پایہ کے خوشنویس وغیرہ ہے۔[۸۴]

مرزا حیدر دوغلت کی وفات کے سات سال بعد ۱۵۵۸ء میں حضرت نصیبؒ کی ولادت ہوئی۔ ۱۵۸۶ء میں جب شہنشاہ اکبر نے کشمیر پر یوسف شاہ چک کی حکومت سے اقتدار حاصل کیا، تو حضرت نصیب لگ بھگ ستائیس سال کی عمر کے تھے۔ اس عرصہ میں انہوں نے چک خاندان کی طوائف الملوکی، ان کی باہمی چپقلشیں، سازشیں اور جھگڑے بھی دیکھے اور پھر ان کا زوال بھی۔ اس کے بعد انہوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کا عہد حکومت بھی دیکھا۔ بہت سے مغل صوبیدار بھی دیکھے۔ لیکن وہ ہمیشہ شاہی درباروں اور امراء کی محفلوں سے دور رہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور انکی خدمت میں دعوت نامہ بھیجی۔ لیکن انہوں نے نہایت ہی متانت، استغنا اور شانِ فقر کے ساتھ اس دعوت کو قبول نہیں فرمایا۔ شہزادہ داراشکوہ اکثر دبستہ کشمیر آتے رہتے تھے، کبھی اپنے مرشد

شاہ ملا بدخشی کے پاس کبھی بھار ان تعمیر باغات کے سلسلے میں، لیکن حضرت نصیب نے
ان کی طرف کبھی التفات نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں بادشاہوں اور اُمرا کا خصوصیت
کے ساتھ کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ علمائے حق اور صوفیان عظام امرا، اور بادشاہوں کی
دریوزہ گری نہیں کرتے تھے۔ حضرت نصیب نے علمائے سو کی زبردست مذمت کی ہے۔[۸۴]
ان کے شاگرد بھی انہی کے طریقہ پر کاربند رہے۔ دارا شکوہ نے ان کے ایک شاگرد بابا صالح
(اچھ) کی خدمت میں زر سرخ و سفید کے دو خوان بطور نذر پیش کئے۔ بابا صالح نے منت و
سماجت کے بعد صرف تیس روپیہ اٹھائے، لیکن ہدیہ میں اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف
بھجوا دیا، یہ کہہ کر کہ "ہدیۂ قرآنِ مرا بہا نیست مگر قیمتم" ڈالدیا اور باقی ساری رقم رد کر کے
واپس کر دی تھی۔[۸۵]

تذکرہ نگاروں، مورخوں اور ملفوظ نویسوں نے حضرت نصیب کو زبردست خراج
عقیدت ادا کیا ہے۔ سب نے انہیں علامۂ عصر، مفسرِ قرآن، عالم بے بدل، فخرِ رازی، صاحبِ
عزت و احترام، مرشدِ کامل راہ سلوک و معرفت تسلیم کیا ہے، عوام نے انہیں ابوالفقراء
کا لقب دیا، جو بعد میں انکی کنیت بن گئی۔ معاصرین نے انہیں غازی کہا، جو انکی ہر دل عزیزی
کی شہادت ہے۔

بابا داود مشکواتی نے انہیں "شیخ شیخان" اور "ولی مادر زاد" کے القاب سے یاد
کیا ہے[۸۶] خوارق السالکین کے مصنف نے ان کا ذکر یوں کیا ہے ؎

شہنشاہِ سریرِ بے مثالی — شہِ برجِ کمالات و مقامات
سراسر مظہرِ نورِ الٰہی — گلِ باغِ عبادات و ریاضات[۸۷]

اور "شیخ وقت و پیر زمانہ و وحید العصر و در ورع و تقویٰ و زہد و معرفت یگانہ و در
طریقت صاحب تمکین و در ثابت صاحب وقار و در مجاہدہ بی قرین و در ریاضت بس
بزرگوار بود و در انواع علوم کامل و در اصناف اخلاق شامل، صحبت بسیار مشایخ

دریافتہ" اسرار الابرار" متوفیہ ۱۰۲۳ھ (الف)

میر سعد اللہ شاہ آبادی مصنف "باغِ سلیمان" نے بابا نصیب کے بارے میں لکھا ہے :-

آن زمان زاولیا و بہ ملت و کیش | بود بابا نصیب نائب پیش
شیخ علم و کامل و صوفی | ثانی بو حنیفہ کوفی
ہیچ جا لیش نہ منزل و نہ سرا | بدرا الوقت و ہم الفقرا
در زمانش خود از بنی آدم | بود شیخ المشائخ عالم
چون از سعی امرِ ملجا ساجد شد | دیدہ بانی مساجد شد
گشت تازہ بدین قند و زواج | ملکِ اسلام کا مرانج مراج [۸۸]

ایک صاحب انہیں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں :-

قایم اندازِ طریق سنت پیغمبری | دینِ احمد یافت از وے رتبۂ عالی تری
غازی و مجاہد و ترکِ دینِ احمد است | نور سیراب خاص باغ ملکِ سرمدا است
بر سرِ تختِ لدنی بادشاہِ امجد است | شیخ ما یعنی نصیب الدین ابوالفقرا لقب [۸۹]

بابا کمال مصنف نورنامہ نثری

حبیب خدا بود بابا نصیب | زعرفان و اسرارِ حق با نصیب
خرد مند و بیدار و ہشیار دل | ز گفتارِ او جان و دین آب و گل
فزون است از اندازہ اوصافِ او | بردن است از کسب اوصاف او [۹۰]

ملا بہاؤ الدین متو آنکی مدح یوں بیان فرماتے ہیں :-

اے بہا از کمالِ صدق و یقین | روئے دل کن سوئے نصیب الدین
غازی نفس کش بہ تیغِ محن | قطبِ حق غوثِ عہد شیخ زمن
وارثِ انبیا بہ علم و ادب | پاک دین پاک باد پاک نسب

در شریعت بہ علم و دانشش طاق	در طریقت یگانۂ آفاق
آفتاب ہدایہ نور دصفا	ہم ابوالوقت و ہم ابوالفقرا
سر گروہ مبارزان جہان	مفخرِ غازیان و تاجِ مہان
در دہی ہر کجا کہ جامی کرد	مسجد و خانقہ بنا میکرد[91]

خواجہ محمد اعظم دیدمری انہیں "عالم باعمل و مروج اہل علم" "ملجا و مآب غربا و بیچارگاں" کہتے ہیں[92] محی الدین مسکین انکو "از خلفای برجستۂ شرفنا کی حضرت شیخ داؤد خاکی" کے لقب سے ذکر کیا ہے[93]

حضرت نصیبؒ کے مرید و خلیفۂ خاص شیخ رفیق الدین المعروف حاجی بابا (متوفی ۱۰۸۹ھ مطابق ۱۶۷۹ء) کی اولاد میں سے مولوی محمد شمس الدین متخلص بہ مقبل (متوفی ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء) جو اعلیٰ پایہ کے عالم اور ادیب و شاعر اور صاحب تصانیف گزرے ہیں، نے بابا نصیب کی مدح اور مناقب بیان کرتے ہوئے انہیں "جمال بازِ عشقِ الٰہی" "بحرِ عرفان" "درّ الیقان" اور "رکنِ دین" کہا ہے اور ان کے سلسلہ سہروردیہ سے منسلک ہونے کی وجہ سے انہیں "نو گلِ بستانِ سعدیٔ شیراز" کہا ہے۔ کیوں کہ حضرت سعدیؒ شیرازیؒ جناب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید اور خلیفۂ خاص تھے۔[94]

حضرت نصیب کا سالِ ولادت

اپنی عمر کا گرانقدر حصہ تبلیغی سیاحت میں بسر کر کے حضرت نصیب پھر سرینگر میں کچھ عرصہ کے لئے قیام پذیر ہوئے۔ اور سب مشائخ اور درویشوں اور علمائے حق سے ملاقات کی اور فرمایا "کہ شاید باز رسیدن و دیدن ما نخواہد شد"[95] شہر سرینگر سے چل کر قصبہ بجبہارا میں اقامت گزین ہو گئے۔ اور یہیں پر تیرہ محرم الحرام ۱۰۴۷ھ مطابق ۱۶۳۷ء کو قمری حساب سے ۸۲ سال اور شمسی حساب سے اسی سال کی عمر میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔[96] انہوں نے اپنے مریدوں اور خلفا کو وصیت کی تھی کہ انہیں بعد

وفات خطیرۂ سلطان العارفین شیخ مخدوم حمزہؒ میں دفن کیا جائے، لیکن قصبہ کے لوگوں نے غلبہ کرکے مریدوں کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ آخر میں انہیں بجبہارا میں بروایت بابا داود مشکواتیؒ اس جگہ دفن کیا گیا۔ جہاں گزشتہ زمانے میں سلطان بادشاہ کا محل واقع تھا بجائے عمارت سلطان بادشاہ مقرر کردند[95] اس کی تصدیق محمود گامیؒ کی منقبت سے بھی ہوتی ہے۔ جو انہوں نے حضرت نصیبؒ کی مدح میں لکھی ہے۔ اقتباس:۔

تازہ کیاہ گو و رازہ دانہ آنگن سو یہ تراگس گلزار سین

خارہ خاشاک پُرہ اوس اپز سون یا حضرت بابا نصیبؒ[98]

(راجہ جہانگیر کا صحن جو خودرو جھاڑیوں سے اور خاروخاشاک سے اَٹا ہوا تھا اب تی تازگی کے ساتھ گل و گلزار میں تبدیل ہو گیا)

انکی وفات کی خبر وادی کے اطراف واکناف میں سرعت کے ساتھ پھیل گئی اور ہزاروں کی تعداد میں مریدین، خلفاء، شاگرد، معتقدین اور عوام قصبہ میں جمع ہو گئے۔ جہاں وہ نماز جنازہ اور فاتحہ خوانی میں شریک ہوئے۔ خلفاء و مریدین نے باہمی مشورت کرکے تیرہ محرم الحرام کو ہر سال اپنے مرشد کا عرس منانے کا فیصلہ کیا، اور "بیانگہ ڈہل" (ڈھول کی آواز کے ساتھ لوگوں کو عرس کے انعقاد کی اطلاع بہم پہنچانا طے پایا۔ جو مرورِ ایام کے ساتھ سوداگروں، میوہ فروشوں اور خوردہ فروشوں کے معاشی فائدے، اور روزگار کے وسیلے کے علاوہ بدعتی اور سماجی تفریح کی وجوہات کی بنا پر "دمبالی" یا "دُمالی" کی شکل اختیار کر گیا، جسمیں عاقل و بالغ مسلمان اوٹ پٹانگ طرح کی لغو اور بےہودہ، حرکتیں کرنے لگے۔ اور قرآن وسنت رسولؐ کے بالکل علی الرغم اسے عبادت کا درجہ دینے لگے۔

حضرت نصیبؒ کی تاریخ وفات انکے شاگرد اور قابل فخر مرید حضرت علامہ حیدر چرخی المعروف ہتنو نے "وَھُوَخَیرُ الصالحین" اور ان کے دوسرے برگزیدہ خلیفہ اور
۱۰۴۷ھ

شاگرد خواجہ محمد مومن چہیل نے "شیخ مومن" سے اخذ کی ہے [1] دوسری تاریخ پر "معنیٔ اضافی دلالت" رکھتا ہے۔ "والامتبادر ترکیب توصیفی است" [99] یہ خواجہ مومن نے بغداد میں اپنے برادر عبدالخالق کو اس وقت لکھ کے دیدی جب وہ کشمیر واپس آرہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ خواجہ مومن کو وہیں پر بعد میں اپنے مرشد کی وفات کا علم ہوا تھا۔ خواجہ محمد مومن بغداد ہی میں دفن ہیں۔ مولوی محمد جعفر مقبلؔ بیجبہاری نے خواجہ مومن کی تاریخ کو اپنے طور پر منظوم کیا ہے۔

فخرِ علمائے صاحبِ تمکین	شیخِ شیخاں جنابِ نصرالدین
جمعِ علمِ ظاہر و باطن	بادشاہی بملکِ دین ساکن
مرغِ روحش چو زین قفس پرواز	کرد سوئی مآب خود شد باز
سالِ تاریخِ وصل آن شہِ دین	"شیخ مومن" شنو بعد تمکین [100]

حضرت نصیبؔ کے ایک اور شاگرد خاص بابا داود مشکواتی اُن کی تاریخ وفات اسطرح لکھی ہے ؎

آن شاہِ ملک و دین برفتہ با احترام	افتادہ پیچ و تاب بہ ہر قلبِ خاص و عام
کردند ہم سر یش لبی اولیائے دین	گفتند قدسیاں کہ بیا "جنّت مقام" [101]

تعمیرِ روضۂ بابا نصیب

حضرت نصیبؔ کی قبر پر ایک چھوٹا سا روضہ انکے خلیفہ حاج بابا نے انکی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی تعمیر کرایا تھا، لیکن وہ رفتہ رفتہ خستہ ہوگیا، پھر حاج بابا (شیخ فتح الدین عبدالرحمان) کے فرزند بابا محمد زاہد نے ۱۱۲۷ھ مطابق ۱۷۱۵ء میں اپنی نگرانی میں روضہ کو نئے سرے سے

---

[1] خواجہ مومن کو بغداد میں اپنے مرشد کی وفات کی تاریخ اور سال سُننے میں یا تو غلطی ہوئی یا، یادداشت ذہن سے اُتر گئی تھی اسی لیے تاریخ وفات "شیخ مومن" کہہ کے ایک سال کم کردیا یعنی یہ ۱۰۴۶ھ ہوتا ہے جبکہ اصل ۱۰۴۷ھ ہے۔ [illegible]

وسیع و عریض کر کے تعمیر کیا۔ میر سعد اللہ شاہ آبادی نے اس واقعہ کو اپنی تصنیف میں اسطرح
بیان کر کے محفوظ کر لیا ہے ؎

خلفِ حاجی آن سراپا جود — بابا زاہد کہ بُد ز اہلِ شہود
روضۂ خاصِ شیخ نصر الدین — ساخت از نو بنائے خلد برین
روضۂ پاک یافت چوں بہشت — یکصد و یکہزار و بست و ہفت [102]

بابا محمد زاہد بیسویں ربیع الثانی ۱۱۳۰ھ (۱۱۲۷ھ) مطابق ۱۷۱۸ء میں وفات پا گئے [103]

حضرت نصیب کے شاگرد ظاہری و معنوی

بابا نصیب اگرچہ کسی جگہ مستقلاً قیام پذیر نہیں ہوئے۔ لیکن سفر و حضر میں ہی لاتعداد شاگرد، خلفاء، اور مریدان کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے جو مختلف دینی، تبلیغی، سماجی بہبود، معاشرتی اصلاح اور تعمیری کاموں میں ان کے معاون و مددگار خدمت گذار تھے۔ اس کے ساتھ وہ ان سے علوم ظاہری کا درس بھی لیتے تھے۔ انمیں جو سلوک و معرفت کی راہ پر چلنے والے تھے۔ وہ ان سے تزکیہ نفس اور انجلاء قلب کی تربیت بھی پاتے تھے۔ حضرت بابا اپنے شاگردوں کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم سے بہرہ ور کرتے تھے۔ علوم قرآنی، علوم حدیث فقہ، تجوید قرأت، حفظ کلام اللہ، ادب، شعر و شاعری، تصنیف و تالیف، فن کتابت کے کاموں وغیرہ میں ان سے سینکڑوں شاگرد فیض یاب ہوئے۔ اکثر کا تفصیلی تذکرہ، مورخ اور تذکرہ نگار محفوظ نہیں کر سکے۔ پھر بھی بہت سے اصحاب کا ذکر مختلف تذکروں اور تاریخ میں ملتا ہے۔ میر سعد اللہ کا کہنا ہے ؎

از مریدان او ولایت یاب — صد کس افزوں شدہ ز شیخ و شباب
نیز جمعی از وبہ علم اسلم — بہرۂ خویش یافتہ اتم [104]

رسالۂ "تحفۃ الاذکار" کے مصنف ابنِ شیخ حسن حضرت نصیب سے فیض یافتوں کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

یارب بہ آن قطب گزین بابا نصیب النسر شدین | ادام معروفش ببلین ہفت صد ولی از کاملان

بابا نصیب از کاملان بُد قطب اقطاب زمان | کو در ولایت خود میان اصحاب او چون اختران

ہفت صد ولی ز اصحاب او از شیخ وار ہم شما او | ممتاز شد در باب او از خاصگان و عاشقان

(فوٹو ۱۰۰۱ و فوٹو ۱۰۰۸)

چند نام ذیل میں درج ہیں۔

علامہ حیدر چرخی، علامہ داود مشکواتی، شمس الدین تائیک، شیخ شمس الدین، بابا شیخ شمس الدین، شیخ داود گنگی، شیخ حاجی حسن، مولوی یوسف، بابا صالح، شیخ صالح، شیخ درویش، حسن ڈالو، شیخ حسن تملُ، حاجی بہرام، شیخ مومن، شیخ شریف، شیخ فتح الدین حاجی بابا، شیخ ناصر جنگالی۔ بابا مظفر، شیخ حسین، شیخ حیدر، شیخ اسماعیل، شیخ عبداللہ گزیالی خواجہ علی الماس، خواجہ بابا لاری، بابا یوسف، شیخ دولت، شیخ یوسف تانی، شیخ موسیٰ، شیخ طاہر، شیخ بابا حاجی، بابا صادق، بابا عثمان، شیخ یعقوب، ملک کرزرینہ، ملک جوگی رینہ، محمد امین صوفی، میاں حسین چشتی، ملا فیروز شاہ، ملا نمک، ملا ذہنی، آخوند ملا طیب، خواجہ محمد مومن جہبل، خواجہ عبدالخالق جہبل، خواجہ ابوالقاسم، بابا سنگر ریشی، روپی ریشی، ملا محمد نذیم وغیرہ۔[۱۰۵]

ان اصحاب رشد و ہدایت میں سے کچھ نے تصنیفات و تالیفات کی طرف اچھی خاصی توجہ دی۔ چند ایک کا تذکرہ تبرکاً پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ حیدر چرخی، عرف نٹنو

در اوایل در خدمت حضرت بابا نصیب تعلیم علوم یافت "آخر میں" بہرہ اندوز صحبت قدوة المتاخرین شیخ عبدالحق دہلوی شد و بمراتب علیہ علم و عمل رسیدہ برا قران خود فائق گردید۔ در تجوید قرأت قرآن و التزام سنت سید انس و جان و سیر علم و عرفان برہان ایمان و ایقان بود در سال ہزار و پنجاہ و ہفت رحلت فرمود۔[۱۰۶]

علامہ بابا داود مشکواتی (وفات ۱۰۹۷ھ)

یہ حضرت ملک مسعود غوری کے فرزند تھے، اور انکا سلسلۂ نسب ضحاک تک پہنچتا ہے۔[107] علوم اسلامی اور علوم متداولہ میں اکتسابِ کمال کے بعد حضرت نصیب کی خدمت میں مشرف ہوئے اور "کسب علم باطنی نمودہ بدرجہ قرب و مرتبہ ولایت رسید"[108]۔ سفر و حضر میں اپنے مرشد کے ساتھ ہمیشہ رہے، ایک حیثیت سے اُن کے منشی دبیر، یا پرسنل سیکریٹری تھے، اُن کے ملفوظات قلمبند کرتے تھے۔ "طبع موزوں داشت[109]" و در سلوک و مقامات تا ابیات[110] عربی و فارسی دارد"[111] جنہیں "منہاج الرشی" (ریشیانِ کشمیر کی تعریف میں اسرار الابرار، در احوالِ مشائخ و سادات عالیات و ریشیانِ کشمیر) اور اسرار الاشجار (در تتبع کتاب منطق الطیر)، "زاد الفقرا یا تذکرہ ابو الفقرا" مشہور ہیں۔[112]

مولوی شیخ یوسف

حضرت نصیب کے خلیفہ تھے۔ "عالم و فاضل، صاحب تصانیف بود و اُصناف کشف داشت" ۱۰۸۹ھ میں وفات پائی۔[113]

شیخ شمس الدین

بابا نصیب کے سوتیلے (مادری) بھائی تھے۔ تبت کے سفر میں یہ بھی انکے ساتھ تھے۔ "توحید شہودی" کی طرف مائل تھے (اس سے حضرت شیخ احمد سرہندی کے کشمیر پر اثرات کا اظہار ہوتا ہے۔ شاد) ۱۰۶۵ھ میں وفات پائی۔ مدفن۔ در روضۂ بابا نصیب[114]

بابا شیخ شمس الدین

بابا نصیب کے حقیقی (عینی) بھائی تھے۔ انکی وفات کے بعد زینت بخشِ مسند ارشاد ہوئے۔ روضۂ نصیب میں دفن ہوئے۔[115]

شیخ داود لوہنی: پابندِ شریعت تھے، گوہن علاقے کے سارے باشندے انہی

کی تبلیغی کوششوں سے خلعتِ اسلام سے آراستہ ہو کر توحید پرست ہو گئے۔ ع[116]

بابا حاجی بہرامؒ

اپنے وقت کے مستند اور باکمال خوشنویس تھے۔ اپنی عمر درس و تدریس میں گزاری۔ خوشنویسی کے فن میں لاثانی تھے، ایک ہزار تنکہ کے عوض اپنے ہاتھ سے کتابت کیا ہوا قرآن شریف ہدیہ کرتے تھے۔ اور پھر اس ساری رقم کو خیرات کرتے تھے۔ ع[117]

حاجی بابلۓ لاریؒ

عالم و فاضل تھے، حضرت نصیب کی کتابوں کی تصحیح کرتے تھے۔ یعنی پروف ریڈر (مصحح) تھے۔ لار کے گاؤں ونده ہامہ میں شادی کی۔ ع[118]

مولوی شیخ دولتؒ

عالم و فاضل تھے۔ خواجہ عبداللہ حافظِ کلام اللہ تھے، خواجہ اسماعیل منصب قضا پر منصوب تھے۔ ع[119]

شیخ حاجی حسنؒ

حضرت نصیب کے چیدہ خلیفوں میں سے تھے، قرأت میں ماہر تھے اور حضرت نصیب کے پیش امام تھے۔ ع[120]

بابا صالحؒ

قرآن کریم کی کتابت کر کے روزی کماتے تھے۔ دارا شکوہ نے ایک ملاقات میں انہی کو زرِ سرخ و سفید کے دو خوان نذر کے طور پر پیش کیے، بہت منت کے بعد انہوں نے تیس روپیہ اٹھایا اور خوان میں "حمائل بہ خطِ خود" ڈال دیا۔ اور کہا کہ "ہدیۂ قرآن من ہمین است گرفتم" اور باقی رقم لوٹا دی۔ ع[121]

حاجی الحرمین بہرام نجارؒ

حضرت نصیب کے صاحب کشف و کرامات خلیفہ تھے۔ صایم الدہر اور قایم اللیل

تھے۔ تجرید کی زندگی پسند کی، بے انتہا متوکل اور متقی۔ نذر و نیاز اور ہدیہ ہرگز قبول نہیں کرتے تھے۔ پیدل حج کر کے آئے۔ حفیظ اللہ خان صوبیدار نے ایک خطیر رقم بطور نذر پیش کی۔ بڑی منت کے بعد صرف ایک روپیہ قبول فرمایا۔[۱۲۲]

شیخ مومن رحمۃ اللہ علیہ

پابند شریعت تھے، آخری عمر میں شادی کی اور شہر میں رہنے لگے، اللہ نے انہیں نیک اور صالح اولاد عطا کئے۔[۱۲۳]

حاجی بابا رحمۃ اللہ علیہ

شیخ منتج الدین عبدالرحمان (متوفی ۱۰۸۶ھ) حضرت نصیب کے خاص خلیفہ تھے اور متاہل زندگی گزارتے تھے۔ بابا نصیب رحمۃ اللہ علیہ کے فرماں بردار رفیق تھے۔ ان کے اکثر کام انہی کے ذریعہ ہوتے تھے اور وہ اکثر مریدوں کی تربیت حاجی بابا کو ہی سونپ دیتے تھے۔ مرشد کی پیروی میں وہ مختلف جگہوں میں بغرض تبلیغ گئے اور مساجد تعمیر کروائیں۔ وفات کے بعد خطیرۂ نصیب رحمۃ اللہ علیہ میں دفن ہوئے۔[۱۲۴]

بابا عبداللہ گنزریالی رحمۃ اللہ علیہ

بابا نصیب کے مرید تھے۔ انکی وفات کے بعد حاجی بابا کی خدمت میں رہ کر منازل سلوک و معرفت طے کئے۔ لاتعداد لوگ ان کی تبلیغ سے نورِ اسلام سے منور ہو گئے، مریدوں کی بڑی تعداد ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی تھی، مساجد غسل خانے، مسافر خانے بنوائے۔ وفات ۱۱۱۷ھ مدفن۔ گنزیال علاقہ اوتر، کمراز۔[۱۲۵]

محمد امین صوفی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت نصیب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد تھے، رفاہ عام کے کام میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ دو شادیاں کیں، اور صاحب اولاد ہو گئے۔ مرشد کی متابعت میں نزدیک اور دور و دراز علاقوں میں جا کر لوگوں کو علم دین سے بہرہ ور کرتے اور مساجد کی تعمیر کرتے تھے حضرت

شیخ عبدالاحد سرہندی سے بھی بیعت کر کے خطِ ارشاد حاصل کیا۔[126]

ملا ذہنی کشمیریؔ

"ذہنِ عالی و ذکای رشادست، فضل و کمالش از روم تا شام روشن، از روشن سوادانِ کتب نکتہ دانی است، کلیاتش بحرِ ناپیداکنارہ گوہر ہائے معانی لامع در آں جزائر جزائرِ افادہ"[127] "در عہد خود در فنِ سخندانی بی نظر بود"[128] اور "مہرِ اوجِ فصاحت و بلاغت و سخنوری بود"۔[129]

متقی عالم دین اور راہِ معرفت کے سالک تھے۔ حضرت نصیب کے محبوب مرید اور شاگرد تھے۔ اپنی تعلیقات ملاحظہ کے لئے ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ ان کے کلیات میں دس ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ چار طویل قصائد خلفاءِ اربعہؓ کی مدح میں لکھ کر بابا نصیب کی خدمت میں پیش کئے جو "مورد تحسین و عنایاتِ الیشان شد"[130] انکے شاگرد ملا محمد صالح ندیم وغیرہ انہی کے ذریعہ حضرت نصیب سے فیض یاب ہوئے۔

خواجہ محمد مومن جمیل غازیؔ (ولادت ۹۸۲ھ / ۱۵۷۵ء - وفات ۱۰۵۳ھ / ۱۶۴۴ء)

مکتب کی ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد کئی سال تک ملا جوہر نانت کے شاگرد رہے، پھر مولانا علامہ حیدر چرخی سے چھ سال تک مختلف فنون و علوم کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ علوم ظاہری میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بحرِ معرفت کی شناوری کا شوق دامنگیر ہوا تو تلاشِ مرشد کرتے کرتے اٹھائیس سال کی عمر میں فریضۂ حج انجام دے کر مدینہ منورہ میں روضۂ مبارک جناب رسالت مآب سے بشارت پائی کہ "تمہارا مرشد تمہارے وطن میں ہی ہے"۔ واپس آکر حضرت نصیب کے دامنِ فیض پناہ سے وابستہ ہو کر "بدرجۂ بلند رسیدہ۔ تا حیاتِ الیشان در خدمتِ الیشان بود"[131] انکا تخلص غازی تھا جسے پیر حسام الدین راشدی نے غلطی سے قاری لکھا ہے۔[132]

ملا طیب طاہرؔ حضرت نصیب کے شاگرد اور مرید تھے۔ ملا محمد خان

اُن کے پیر بھائی تھے حضرت نصیبؒ کی وفات کے بعد دنیا بے ثمر ہو گئے۔ حضرت نصیب کو اس طرح یاد کرتے ہیں :-

در غم دلدار چون شد مبتلایم یا نصیب
زیر بار فقر در بی برگ و نوایم یا نصیب

روز محنت یار ما بی مہری دلبر گم گشتہ ایم
در چہ عالم در چہ کاریم در چہ جایم یا نصیب

نیست از ابنای جنس من کسی چون من فقیر
آہ گر دایم چنین دارد خدایم یا نصیب

من کہ شاہان را بہ شہی دستگیری کردہ ام
ظاہر اگر یابی حال ہر گدایم یا نصیب

پیش ازین یاری نصیحت جہان نشنید کس چون بی نوا
این زمان ہرگز نگوید کس رسایم یا نصیب

● — ملفوظات حضرت نصیبؒ

اپنی تصانیف میں حضرت نصیبؒ نے حضور رسالت مآبؐ صحابۂ کرامؓ اور اولیائے کبار کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُن کے فصیح و بلیغ ارشادات بیان کئے ہیں، مثلاً خود اُن کے برجستہ کلمات، جملے اور ملفوظات بھی اُن کے قلم ادب پرور سے نثر تحریر میں آگئے ہیں۔ یہ چند ملفوظات اُن کی مختلف تصانیف سے جمع کئے گئے ہیں۔ ترجمہ سے اُن کا حسنِ بیان، بلاغت اور فصاحت مجروح ہو جائے گی :-

- زر اگر شیر مادر باشدی بر عارف کرم قند بودی۔
- اگرچہ مال دنیا بسیار است زر از ہمہ مردار است۔
- اگر در سخن ساحری از زر بودی ہیچ کس بہ مال فریفتہ نہ شدی و گوسالہ پرست نگشتی۔
- کیمیا نہ آنست کہ خاک را زر کند، آن پیشہ قارون است۔
کیمیا آنست کہ زر را خاک کند و آن کار موسیٰ در ہارون است۔
- اگر در دنیا زندہ بودندی این شور و شر بودی و اگر شور و شر بودی بازار سقر بودی۔
- آبادی دوزخ معصیت است و آبادی طاعت بہشت۔
- دنیا چون سایہ است، ہر چند مرد با سایۂ خود بدود ہرگز بہ سایہ نرسد و چون ...

دردستش نیاید چون از ان بگریزد او درپی او دود۔

- بے علم در راہ بی رسن در چاہ است ۔
- علم مانند دارو است کہ مرض جہل را دور کند، اما شرط پرہیز است ۔ کہ بسیار دارو ولیعہم پرہیز زہر قاتل گردد ۔
- شرف آدم بعلم و عمل است نہ بہ مال و حسب و نسب ۔
- عبادت ہر چند کہ سہو و نسیان است با این ہمہ مقبول رحمان است ۔
- بندہ اگر ضعیف و ذلیل است در مغفرت رب جلیل است ۔
- در شان ہر کرم حوصلہ نہ گنجد کہ کردار مردم را بہ سنجد ۔
- زبان کلید اخلاق است، ہر کرا بر زبان طعن است پنہان او پرلعن است ۔
- در پیش مرد دانی یک سخن کافی ۔
- مایہ درویش ریش است نہ ریشی کہ در پیش است ۔
- ریشی کہ نیشتر دوست است سرمایہ مغز و پوست است ۔
- درویش را نہ فرزند و درویش را نہ دل بند، درویش ہمہ آن اوست کہ او در جان ۔ اوست، درد او درمان اوست، "قطع" دیگر "ایمان اوست ۔
- فرزند اگرچہ صالح است دل بندی نہ صالح است ۔
- دنیا نہ جائے آسائش است بلکہ جای آزمایش است ۔
- دنیا سرائے ترک است و آدمی برائے مرگ است ۔
- دنیا چاہیست تاریک و راہیست باریک ۔[۱۲۴]

خواجہ امیر الدین پکھلیوالی (متوفی ۱۲۸۲ھ) نے اپنی مثنوی "تحفۂ محمدی" میں بابا نصیب کے یہ ملفوظ نقل کئے ہیں :

شیخ شیخاں لعیبت دین نمائی | آنکہ بردہ است گوئی جانبازی
گفت "دنیا نہ مال و نے زن شد | بہر حق ہر چہ نیست رہزن شد
رہزن تست ہر کہ دارد باز | مر ترا از خدا بہ بی انباز"
خوش بگفت این سخن ابو الفقراء | ذکر حق غفلت است عارف را [۱۳۵]

تصانیف بابا نصیب

بابا نصیب عربی، فارسی علوم و ادب کے ماہر تھے۔ اُن کی مادری زبان کشمیری تھی۔ لیکن تصنیف و تالیف کا کام انہوں نے عربی اور فارسی میں کیا۔ روایت ہے کہ نظم و نثر میں انہوں نے لگ بھگ پچاس کتابیں تحریر کی تھیں۔ نا اہل لوگوں نے انہیں محفوظ نہیں رکھا۔ اُن کی منظوم تصانیف اب بالکل نایاب ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کی اکثر کتابیں بد دیانت لوگوں نے اپنے کھاتے میں جمع کر دی ہوں گی۔ موجود تصانیف کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

تذکرہ مشائخ کشمیر

اس میں حضرت شیخ نور الدین ریشیؒ اور اُن کے مریدوں کے حالاتِ زندگی اور وادیٔ کشمیر میں تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں اُن کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں ریشیانِ کرام اور کشمیری ہندو پروہتوں اور برہمنوں کے درمیان مذہبی بحثوں اور مناظروں کی تفصیلات بھی درج ہیں۔ اس کے علاوہ اُس دور کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر بھی جستہ جستہ معلومات ملتی ہیں۔ جس سے اس تذکرہ کی افادیت اور تاریخی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔[۱۳۶]

مجموعہ در انساب مشائخ کشمیر

اس میں صدر الدین رینچن شاہ کے عہد سے لیکر سوسی رینہ کے عہد تک وادیٔ کشمیر میں اشاعتِ اسلام کی مفصل روئیداد درج ہے۔ لیکن اس دور کے سیاسی واقعات بھی

ضمناً بیان ہوئے ہیں۔ قدامت اور استناد کی وجہ یہ بہت ہی قیمتی دستاویز ہے۔[137]

نورنامہ

نورنامہ کے خطی نسخے بہت تعداد میں ہماری دسترس میں ہیں۔ محکمۂ ریسرچ کے شعبۂ مخطوطات میں اس کے سات نسخے ہیں۔[138] کلچرل اکادمی کی لائبریری میں بھی ایک دو مخطوطے شیخ نورالدین ریشی نامہ سمیت "گلشن الاولیاء" آتا ہے۔ دراصل حوالہ بالا کتب یعنی تذکرہ و تاریخ کشمیر الحاج محمد عمر ... تاریخ کشمیر کے بارے میں کچھ وثوق اور حتمیت کے ساتھ کوئی رائے نہیں دی جا سکتی ہے۔ البتہ کے نام کچھ لوگوں نے منسوب کیا ہے اور آج تک یہ زحمت کسی نے نہیں اٹھائی ہے کہ ان تمام نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ ہم مختلف کرنے چاہئے ہم معدودے نسخوں کے متون کی تصحیح و تنقیح کرکے کوئی مستند نسخہ مدون کیا جاتا۔ دراصل یہ افراد کا کام نہیں ہے۔ بلکہ یونیورسٹی جیسے اعلیٰ علمی مرکزوں کا کام ہے۔ جس کے لئے ہم دعائے توفیق کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔

نورناموں کے بارے میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ اپنی ضخیم تصنیف "کشمیر" (انگریزی: دو جلدیں) میں ڈاکٹر صوفی صاحب کسی سند، حوالہ یا روایت کے بغیر یہ بیان فرماتے ہیں کہ نورنامہ تو اصل میں سنسکرت زبان میں تھا۔ بابا نصیب نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔[139] بابا نصیب تو اللہ کو پیارے ہیں۔ معلوم ڈاکٹر صوفی کو کس نے بتایا کہ بابا نصیب سنسکرت زبان بھی جانتے تھے۔ اور سنسکرت زبان میں نورنامہ کس نے تحریر کیا تھا؟ اسی روایت کو عبدالحمید عرفانی نے "تذکرۂ پارسی سرایانِ کشمیر" میں آنکھ بند کرکے نقل کیا ہے۔[140] بابا نصیب کا ایک نورنامہ (محکمہ ریسرچ۔ نمبر شمار ۹۵) کسی حد تک تو مکمل ہے لیکن حضرت بابا نے کہیں بھی اس کا اظہار نہیں کیا ہے۔ کہ یہ نورنامہ سنسکرت کا ترجمہ ہے۔ بقیہ نسخے بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ مجھے ایسا حوالہ کہیں پر بھی نظر نہیں آیا۔ نہ ہی بابا داؤد مشکاتی نے ایسی کوئی اطلاع فراہم کی ہے۔

بہر حال ــــ نورنامہ حضرت شیخ نورالدین ریشی کی سوانح حیات ہے۔ جسے حضرت بابا نے وفات سے کوئی سولہ سال قبل تحریر فرمایا[1]۔ ہم نے تقریباً سب نسخوں کو دیکھا لیکن حوالہ جات کے لیے میں نے نمبر ۹۵ والے نسخے کو ہی بوجوہ ترجیح دی ہے۔ اس میں حضرت نورالدین ریشی کے چیدہ خلفاء کے علاوہ حضرت شیخ مخدوم حمزہؒ کے بارے میں حضرت بابا داؤد خاکی کے روایت کردہ ملفوظات بھی درج ہیں۔ اس کے مزید سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں بھی نہایت ہی اہم اور گرانقدر معلومات ملتے ہیں۔ جنکا اجمالی حوالہ اس آگاہی کے ساتھ درج کیا جاتا ہے کہ حضرت بابا الغیبؒ ان کے اولین اطلاع دہندہ اور منبط تحریر میں لانے والے ہیں۔ ان کی تردید معاصر شہادت اور مضبوط دلائل کے بغیر ناممکن اور نری عقیدت مندی ہوگی۔

۱۔ حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ موضع کیموہ میں "از قبلۂ پاسباناں" پیدا ہوئے۔[ص ۲]

۲۔ "برادران حضرت شیخ نورالدین پیشۂ خود کہ دزدی داشتند و ہنری دیگر نمی کردند شبی بہ نیتِ دزدی برآمدند و حضرت شیخ را ہمراہ گرفتند"[ص ۱۶]

۳۔ "یک دزدی وراہ زنی پیشۂ خود گزاشتہ درونِ جنگل نشستہ زاہد و عابد خواند و عبادت می کند و نامش نوندہ ریشی است"[ص ۱۲۲]

۴۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ روحانی طور کشمیر آئے اور کشمیر کی تعریف میں یہ عربی اشعار ارشاد فرمائے :۔

کانَ کشمیرِ وَسَنواکِنھَا	جنّاتُ عدنٍ ھِیَ لِلمُومنین
قدکتبَ اللہُ علیٰ بابِھَا	داخلھَا کانَ مِنَ الآمنینَ[ص]

---

[1] پروفیسر محب الحسن نے "کشمیر سلاطین کے عہد میں" (اردو) صفحہ ۲۱، ۲۲ پر نورنامہ کا سال تصنیف ۱۳۲۰-۱۳۳۱ دیا ہے، نہ معلوم یہ ہجری یا عیسوی۔ بہر حال دونوں حساب سے غلط ہے۔ جبکہ یہ ۱۰۲۳ھ یا ۱۰۳۱ھ ہونا چاہیے۔ شاد۔

مورخ حسن شاہ کھوئیہامی نے انہیں شہاب الدین سندی سے منسوب کیا ہے (جلد سوم صفحہ ۲۴۲)

۵. ریشی حضرات روزگار کمانے کے لئے کسب و کار کرتے تھے۔ تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت سوں نے آخر میں شادی کرکے باقاعدہ گرہستی زندگی گزاری اور بال بچے پیدا کیے۔ "کسب زراعت ہم از جملہ عبادت است" و مریدان خود را کسب و زراعت فرمود (بابا ہردی ریشی ص ۲۴۶) بابا یم ریشی صاحب عیال تھے۔ مندورا اور اپاہیچ ولی حاجی کو بھی شادی کرنے کا شوق ہوا تھا۔ (نور نامہ صفحہ ...)

۶. حضرت میر سید علی ہمدانی کی کشمیر میں آمد کے وقت حضرت شیخ نورالدین بہت بالغ عمر کے معلوم ہوتے تھے۔ حضرت میر نے لوگوں سے پوچھا "کہ درین شہر شخص مردی راہ سلوک آزمودہ و گوئی فقر بچوگان ارادت بسر بردہ و کلاہ درویشی بر سر نہادہ و خرقۂ تقویٰ در بر کردہ کیست؟ گفتند آری بارہا در آستانۂ چپارم دیدیم و بسیار بار باوی ملاقات گشتہ پرسیدیم کہ تو از کجائی؟ گفت کہ مرد گشتہ پیرم" گفتند یا امیر مردیست در جنگل نشستہ بہ عبادت خدا مشغول است کہ نندہ ریشی نام اوست" حضرت امیر فرمود "پس ہمان شخص است و پیش وے می باید رفت" پھر ملاقات ہوتی ہے اور مکالمہ بھی۔ ص ۱۵۹

۷. للہ دید اور حضرت شیخ نورالدین ریشی رح کے بارے میں جو قصے کہانیاں اور روایات رواج پا گئی ہیں، اُن کے خلاف اور تردید میں یہ اطلاع نور نامہ میں درج ہے:-

ایک دن للہ دید ی بجبہارا کے (نہ کہ پامپور کے۔ شاد) بت خانے میں داخل ہوئی تو مندر کے پروہت سدھ شرکنٹھ نے پوچھا کہ کیا کام ہے۔ للہ نے جواب دیا کہ میں پیشاب کرنا چاہتی ہوں۔ پروہت نے کہا کہ یہ ایشر کا گھر ہے۔ للہ نے سوال کیا کہ کوئی ایسی جگہ دکھاؤ جہاں ایشر نہ ہو۔ پھر مختلف باتیں ہوئیں۔ سدھ شر لاجواب ہوا اور برہمی

منت سے کہنے لگا کہ رہنمائی صحیح کہاں سے ملے گی۔ تو اس نے جواب دیا کہ پیسری است اورا شیخ نورالدین می گویند و بسیار عارف و کامل است بسیار مردمان از گمراہی بہ راہ آوردہ — برہمن بہ للہ دیوانہ التماس نمود کہ مرا پیش او ببر تا از برکت او ایمان بدست آرم — ہر دو بہ خدمت شیخ روانہ شدند و در ملازمت حضرت پیر رسیدند و از دیدار مشرف شدہ" پھر سدہ و شری کنٹھ حضرت شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں آتے ہیں۔ ص ۱۴۷ - ۱۶۵

۸۔ "یار" کے معنی ہیں "جائے کلاں ریاضت (یا ریاضت کے لئے بڑی جگہ) مثلاً "پنج یار کہ بزبانِ ہنودان (کشمیر — شاد) پنج تیرت نام یعنی پنج جائی کلاں ریاضت" ص ۱۹۵۔ "اول ہر چندران یار کہ در قصبہ بجبہارہ است دوم در دامالی کوہ حضرت سلیمان آن راشورا (شراہ) یار می نامند" ص ۱۹۶

۹۔ سُنیوں پر کشمیر کے شیعہ حکمرانوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے مسلمان سُنی ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے ص ۲۲۷، ص ۲۵۰، ص ۲۵۲ "رافضیان تا حدی غلبہ گشتند کہ مردمان از کثرت بیداد غربت گزیدند" ص ۲۵۷ موسم سرما کے آغاز میں جب پہلی برف باری ہوئی تو اس موقعہ پر خوشی منانے کے لئے ایک سُنی میر یعقوب کو پکڑ کر لے گئے اور اُس کا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں کاٹ گیا۔ بے چارا پھر کتابت کر کے روزی کماتا تھا۔ ص ۲۴۴

۱۰۔ "جو" کا لفظ نام کے ساتھ احترام کے طور پر اس دور میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ ص ۲۴۹

۱۱۔ قبرک (اصلی قبرغہ۔ ترکی لفظ ہے) مطلب پہلو، استخوان، پسلی، پہلو کی ہڈی اسی سے "قبرغہ" ضیافت بناتے ہیں۔ حضرت نصیب نے اسی معنی میں استعمال کیا ہے ص ۲۴۳

۱۲۔ کشمیری زبان میں بھی "علوم و ادب کی کتب" اور اُن سے اکتساب فیض کا رواج تھا۔ "ہمسایہ حیدر بٹ، ستی بٹ نام کا فری در علم کشمیری دانا بود" ص ۲۴۹

۱۳۔ مرزا حیدر دوغلت کو "شہید" کا خطاب دیا گیا ہے ص ۲۵۰ دوسری جگہ اس کا ذکر

یوں ہوا ہے۔ "چون مرزا حیدر کاشغری رحمۃ اللہ علیہ شہید شد، علمائے کشمیر دستِ ماتم بر سر نہادہ حیرت خوردند" ص ۲۵۲

۱۴۔ حضرت شیخ حمزہ مخدوم کے متعلق یہ اطلاع درج ہے:۔ "شیخ حمزہ ___ پدرش عثمان رینہ و جدش زیتی رینہ کہ سرِ آن قبیلہ خود کہ آن را "لون" می گویند" ص ۲۵۲

۱۵۔ حضرت بابا نصیب ولادت شیخ نورالدین کا سال ۷۷۹ھ (۱۳۷۸ء) تحریر کرتے ہیں۔ ولادت کے موقعہ پر لل دید کا اس کے پاس آنا۔ اور باقی کہانی اسمیں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر حضرت امیر بگفتۂ بابا نصیب حضرت نورالدین رشی سے اس وقت ملے جب وہ اچھے خاصے بزرگ تھے، تو حضرت امیر کی کشمیر میں پہلی تشریف آوری کس سال واقع ہوئی؟ ص ۹

۱۶۔ حضرت نصیب کو نور نامہ (تذکرہ) لکھنے کا خیال حضرت داؤد خاکی کی وفات کے بعد آیا۔ "کہ چوں تذکرہ ولایت و تذکرہ ہند مشہور و معروف است و در ولایت کشمیر نیز عزیزان فائض البرکات و مشہور الریاضات و کرامات گذشتہ اند ___ با وجود بزرگی و عبادت و ریاضت و عظمت حضرت عزیزان "تا حال" درویشان و بزرگان این جا در بیان وصف ایشان قلمی نتراشیدند و کاغذی بدست نگرفتند، اکنوں بہ امداد و رخصت باطن ہمہ بزرگان این دیار و محبانِ نیکو کردار تذکرۂ مفید و بیان حمیدہ نمودہ میشود" ص ۱-۲

۱۷۔ "سبب توبۂ نور العارفین ___ حضرت شیخ نورالدین ولی کشمیری این بود ___ مدتِ عمر حضرت شیخ "سی و دو سال" بہ غفلتِ دنیا "گذشتہ بعدہٗ خدائے تعالیٰ کرم و ہدایت نمود" ص ۹-۱۰

۱۸۔ حضرت شیخ کے کلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ہر کہ بہ شعر حضرت شیخ گوش ہوش دارد و مطالعہ نماید حاجت بہ کتاب دیدن نباشد کہ تمام عمرش کلام حضرت شیخ کفایت گردد بہ حصول رساند ___ و فقیر نیز کتب فارسی و عربی در مطالعہ خود آوردہ بود اما چنانکہ

کلام حضرت شیخ مراد او واثر کرد از تصوف دیگراں نیافتم "ص۴۰۵" اس سے ثابت ہوا کہ
حضرت نصیب کشمیری زبان بخوبی جانتے تھے۔

۱۹۔ حضرت شیخ کے بعد اور بابا نصیب کے عہد میں بھی کشمیری زبان میں لوگ شعر و
شاعری کرتے تھے "واگرچہ مردم شاعر از کشمیر بزبان خود شعرہا گفتہ اند نسبت بہ حضرت
شیخ کردہ اند..... ص۵

۲۰۔ حضرت امیرؒ نے اپنی طرف سے لوگوں کو اذن دیا تھا کہ مساجد میں اورادِ فتحیہ کو "بہ آواز
بلند خاص و عام خواندہ باشید" ص۴۴

۲۱۔ "سونت" (بہار) کی آمد کا عرس حضرت نصیب سے پہلے اور انکے عہد میں
بھی کشمیری باقاعدہ مناتے تھے۔ "وسونت کشمیری روزی را گویند کہ ایام بہار است و دراں
روز مردماں تماشا می کنند و شادی ہا بسیار و طعام ہائی لذیذ می پزند" ص۴۵

۲۱۔ اس میں حضرت ریشیؒ کا کلام بہت حد صاف لکھا ہوا ہے اور اچھی طرح سے
(معمولی غور و فکر کے بعد) پڑھا جا سکتا ہے۔ جس سے حضرت ریشی کے مطبوعہ کلام کے
متنوں کو درست کیا جا سکتا ہے اور کچھ نئی باتیں منظر عام پر آئیں گی۔ (سب حوالے
نمبر ۹۵، نسخہ سے ہیں)

۲۲۔ نورنامہ کا ایک ضخیم نسخہ کلچرل اکادمی کے ذخیرۂ مخطوطات میں موجود ہے۔ یہ
لگ بھگ نو سو ۹۰۰ صفحات پر مجلد ہے۔ یہ بھی ناقص الاول والآخر ہے۔ لیکن
دستیاب نورناموں سے یہ دوگنا ہے اور دیگر نورناموں کی مدد سے اسکو زیر نظر رکھ
کر ایک مکمل نورنامہ کی ترتیب و تدوین کی جا سکتی ہے۔ اس نسخہ میں حضرت نصیب
نے ریشی مسلک کی تفصیلی وضاحت نظم و نثر میں کی ہے۔ ریشی مسلک پر اسمیں تیس
اشعار کی ایک نظم بھی ہے۔ ضخیم ہونے کی وجہ سے یہ ایسی تفصیلات اور معلومات بھی
فراہم کرتا ہے، جو دیگر نسخوں میں مختصر یا کم ملتے ہیں۔ اِن خصوصیات نے اس نسخہ کو

اہم بنایا ہے۔

باباالنصیبؒ کی منظوم تصنیفات :۔

رسالۂ ضروریہ خورد

فقہی مسائل کو منظوم کرنے کا رواج بہت پہلے سے رہا ہے۔ حضرت شیخ نورالدینؒ نے کشمیری میں "صدوسی مسئلہ" یا "کاشرِ نامِ حق" اور بابا داؤد خاکیؒ نے رسالۂ ضروریہ (فقہ) کلان تصنیف کیا ہے۔ بابا النصیبؒ نے اختصار کے ساتھ مختلف موضوعات پر ایک منظوم رسالہ تصنیف کیا۔ اسمیں فرائضِ سنّت، مستحبات، ناقضِ ومکروہاتِ وضو، بیانِ استنجا، فرائض وسنّتِ غسل، موجباتِ غسل، فرائضِ تیمم، بیان نجاساتِ غلیظا، فرائض، سنت مستحبات، واجباتِ نماز، مفسدات ومکروہات نماز، بیان فرائض روزہ وغیرہ، یہ سب مسائل جامع انداز میں صرف پینسٹھ اشعار میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ رسالہ بابا داود خاکیؒ کے رسالہ ضروریہ کلان اور وردالمریدین کے ساتھ لاہور سے لاتعداد بار مولوی فقیراللہ تاجرِ کتب اور حاجی چراغ دین تاجرِ کتب کے ذریعہ طبع ہوکر شایع ہوا ہے۔ اس مثنوی نما رسالہ کی ابتدا اسطرح ہے ؎

حمدِ بے حد مر خداوند ودودِ ذوالمنن — آنکہ ذاتش نے عرض نے جوہر ونے جان وتن

صد درودِ پاک بر روحِ محمد مصطفٰے — بعدازاں بر آل وبر اصحاب آں شمس الضحیٰ

رسالہ ان اشعار پر ختم ہوتا ہے ؎

جامع ایں را الٰہی با جمیعِ مومناں — ہار ضائی خویش وایمان پیشِ حضرتؐ در رساں

صلّ سلّم یا الٰہی بر جمیع انبیا — بر شفیع المذنبینؐ وآل واصحاب ہدا

گفت لا احصی بدرگاہ تو ختم المرسلینؐ — کے تواند گفت عاجز حمد رب العالمین

فقہی مسائل میں ادق اور متعلق اصطلاحات کی وجہ سے رسالہ نہایت ہی مشکل بن گیا ہے اور عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہے۔ اس رسالے سے آسانی کے ساتھ اندازہ

لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت نصیب کو شعر و نظم گوئی پر کتنی ماہرانہ دسترس اور عبور و کمال حاصل تھا۔

کلیات۔ یا۔ دیوان

میری نظر سے آج تک حضرت نصیب کے کلام کے کسی مجموعہ دیوان، یا کلیات کے بارے میں کوئی حوالہ یا ایسے کسی مکمل یا نامکمل قلمی نسخہ کے سلسلے میں کوئی اطلاع دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ لیکن باوجود میرا اندازہ ہے کہ حضرت نصیب نے ضرور کوئی مجموعہ کلام مرتب کیا ہوگا۔ جو مرور ایام کے ساتھ یا تو بالکل ضائع ہوا ہے یا کسی صاحب نے اپنے کھاتے میں ڈالکر نام کمایا ہو۔ یہ واقعہ حضرت سید علی الہجویری (صاحب کشف المحجوب) کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ میرے اس اندازے کی شہادت کے لئے حضرت نصیب کا وہ کلام جو نعوت، مناجات، مناقب، رباعیات، غزلیات، قطعات، مثنوی (مشتمل بر حکایات) اور فردیات کی صورت میں مختلف تذکروں اور انکے نورنامہ میں ملتا ہے۔ صرف انہی دستیاب کردہ سرمایہ شعری اور ان کی نثری تصانیف کی بنیاد پر بھی ادب اور شعر و شاعری میں ان کا مقام اور مرتبہ متعین کیا جاسکتا ہے۔

نمونہ شاعری

مناجات

اللہ قدرتی تو رحمان تو سبحان تو   دائم تو قائم تو دنیا فانی باقی تو

یا ھو یا من ھو لا الٰہ الا ھو

اول تو آخر تو ظاہر تو باطن تو   حاضر تو ناظر تو دنیا فانی باقی تو

یا ھو یا من ھو لا الٰہ الا ھو

کافی تو وافی تو شافی تو ہادی تو   حقی تو پاکی تو دنیا فانی باقی تو

یا ھو یا من ھو لا الٰہ الا ھو

عرش از تو فرش از تو بحر از تو بر از تو
خلق از تو ملک از تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو

بخش از تو لطف از تو وہم از تو فہم از تو
علم از تو حلم از تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو

نور از تو نار از تو خاک از تو باد از تو
جسم از تو جان از تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو

ذکر از تو فکر از تو ذوق از تو شوق از تو
سوز از تو درد از تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو

خالق تو رازق تو قادر تو قاہر تو
دانا تو بینا تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو

جود از تو فیض از تو قرب از تو بعد از تو
عدل از تو فضل از تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو

مہر از تو ماہ از تو فقر از تو جاہ از تو
کوہ از تو کاہ از تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو

موت از تو فوت از تو حشر از تو نشر از تو
حور از تو قصر از تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو

نام از تو کام از تو خاص از تو عام از تو
صبح از تو شام از تو دنیا فانی باقی تو
یا ھو یا من ھو لا آلہ الا ھو ۱۴۲

شیخ محمد چشتی بادھو نے لکھا ہے کہ حضرت نصیب اپنی اس مناجات کو روزانہ بہ طور وظیفہ پڑھتے تھے۔

مناجات

ز شر نفس اماره نگه هم دار یا الله / هوای غیر خود کلی ز من بردار یا الله

کریما از کرم ما را بده توفیق از طاعت / مرا از لطف خود ضایع فرو مگذار یا الله

اگر چه پر گناهانم ترا غفار می دانم / به بخشا جرم و عصیانم توی غفار یا الله

ز سر تا پا گنه گارم حقیقت سخت بدکارم / نظر بر فضل تو دارم منم بے کار یا الله

نهال باغ ایمانم همیشه تازه تر گردد / به آب رحمتش پرور که گیرد بار یا الله

گواهی میدهم حقا که جز تو نیست معبودی / زبان با دل موافق کن برین گفتار یا الله

یکی گویم یکی دانم یکی در دل گره بستم / بدل تصدیق کردم وا ز زبان اقرار یا الله

جواب کلمه تلقین کن سوال گور چون پرسند / چو بی هوشی رسد آنجا کنی هشیار یا الله

در آن تنگی و تاریکی که اندر قبر می باشد / فراخی بخش روشن کن پر از انوار یا الله

ضعیفم حال من بنگر بکن از فضل بخشایش / گناهانم تو آمرزی به استغفار یا الله

انا العاصی کثیر الذنب فاغفر لی ذنوبی / و لیوم الحشر احشرنی مع الابرار یا الله

شکسته دل همی نالد بدرگاه تو نصر الدین
برآور رحمت فراوان کن کرم بسیار یا الله ع ۱۴۳۴

نعت

چند سوزم در فراقت یا محمد مصطفیٰ / کے به بینم من جمالت یا محمد مصطفیٰ

مظهر دنیا توئی تا چند باشم مبتلا / انتظارم تا قیامت یا محمد مصطفیٰ

صد هزاران هم چو من صد چاک کرده پیرهن / جان فشانان بر خاک رحمت یا محمد مصطفیٰ

شاهد و مشهود امت صاحب لولاک هم / از بدایت تا نهایت یا محمد مصطفیٰ

یا حبیبی یا رسولی هاشمی الابطحی / جان من بادا فدایت یا محمد مصطفیٰ

خاروزان در ملامت وز ابدان در مالکان خواست بوس رکابت یا محمد مصطفیٰ

عاشقان و تائبان و حاجیان و غازیان آمده بهر زیارت یا محمد مصطفیٰ

جاهلان و عاصیان و مذنبان و غافلان عاجزانند بهر شفاعت یا محمد مصطفیٰ

[illegible] گشتم سهو کردم بر تو من ندارم جز ندامت یا محمد مصطفیٰ

دیده گریان سینه بریان دل کباب از هجر تو چند گریم فی جالت یا محمد مصطفیٰ

شد لطیف از جان غلام بندگانت سربسر
از تو می خواهد هدایت یا محمد مصطفیٰ

نعت

مرحبا صلِّ علیٰ گویم ثنای مصطفیٰ صد سلام از ما به آل و اقربای مصطفیٰ

جمله عالم را رضای حق بود مقصود دل طرفه این بشنو که جوید حق رضای مصطفیٰ

مرده صد ساله می آید دوان لبیک گو از لب جان بخش گر آید ندای مصطفیٰ

حاجت کحل الجواهر نیست مارا ای طبیب توتیای چشم سازم خاک پای مصطفیٰ

مطلع الفجر است سیمای منور کالقمر لیلة القدر است زلف مشکسای مصطفیٰ

نام او یاسین و طٰهٰ یا جواهم از کوثر [illegible] سورهٔ انا فتحنا شد لوای مصطفیٰ

بود اسرار رضا [illegible] کاف و ها یا عین و صاد کس نشد آگاه از اسرار سوی مصطفیٰ

شد سرایر خلعت لولاک بالاتر [illegible] چون کند عزت [illegible] از قبای مصطفیٰ

قدسیان در لیلة المعراج فی قدم [illegible] [illegible] عالم گرد [illegible] برای مصطفیٰ

چون عروج [illegible] شد [illegible] در مقام قرب ربانی [illegible] جای مصطفیٰ

شد مقام [illegible] قاب قوسین بلکه ادنیٰ از آن کس بسوی حق [illegible] جز پای مصطفیٰ

گر منور [illegible] شب [illegible] آفتاب [illegible] روشنی از این هر دو گوهر از ضیای مصطفیٰ

مناقبِ چہار یارِ باصفا رضی

- خوش وقت آن کہ عاشقِ صدیقِ اکبرؓ است — در راہِ دین موافقِ صدیقِ اکبرؓ است
چون آفتاب روشن و چون صبح صادق است — ہر کو محبّ صادقِ صدیقِ اکبر است
آن کس کہ بود تقویٰ و تجرید کارِ او
ہم مونس پیمبرؐ و ہم یارِ غارِ اوؐ

- چون بست بہرِ دینِ محمدؐ میان عمرؓ — در ہم شکست گردنِ گردن کشان عمرؓ
بر باد رفت خرمنِ کفارِ خاکسار — چون برکشید خنجرِ آتش فشان عمرؓ
ہم آسمانِ دانش و ہم آفتابِ عدل — ہم خواجۂ پیمبرؐ آخر زمان عمرؓ
آن کو بہ تیغ، شرعِ نبیؐ آشکار کرد
بنیادِ دین بہ بازوے دین آشکار کرد

- شمعی کہ روشن است شبستانِ جانِ او — نورِ دلِ روشنِ عثمانؓ باحیاست
تا دامنِ قیامت و تا روزِ رستخیز — دستِ امید و دامنِ عثمانؓ باحیاست
خصمِ خداؐ و خصمِ رسولِؐ خدا استؐ او — اے بی حیا کہ دشمنِ عثمانِ باحیاست

- - - - - - - - - -

- - - - - - - - - -

- سلطانِ اولیاء و شہِ اصفیا علیؓ — برگزیدہ محترم بحرم کبریا علیؓ
مشعل فروزِ مشعلِ دین ذوالفقارِ او — چابک سوارِ معرکۂ لافتیٰ علیؓ
آنکس کہ حلم و علم و سخا ختم شد براو — عم زادۂ پیمبر و شیرِ خدا علیؓ ۱۴۶

- - - - - - - - - -

- - - - - - - - - -

روز محشر پیش داور انبیاء و اولیاء — میکند ہر یک شفاعت در قفای مصطفیٰ
ثانی اثنین اذ هما فی الغار صدیق است و بس — از سر ایمای حضرت شد بجای مصطفیٰ
از ید فاروق اعظم فتح شد عجم و عراق — حامی دین نبی شد از عطای مصطفیٰ
جامع القرآن ذی النورین عثمان غنی — صاحب جود و سخا شد از حیای مصطفیٰ
غیر فرّار و کرّار لیث الله حیدر است — فتح خیبر را نموده مرتضای مصطفیٰ
داده اند حسنین آن سبطین از صدق و صفا — تن به تقدیر خدا در جدال فدای مصطفیٰ
تا قیامت نعت احمد کند در زبان — جنت الفردوس یابم از جزای مصطفیٰ

ای شہ عرب و عجم کن یک نگاہی بر لغیب
آرزومند است در کشمیر گدای مصطفیٰ

نعت

ای جمیل الشیم سلام علیک — وی رفیع الامم سلام علیک
وصف اخلاق تو کلام خدا است — ای جمیل الشیم سلام علیک
در کلام قدیم حق فرمود — از لعمرک قسم سلام علیک
شاہ ملکوت جبرئیل امین — بوده است از خدم سلام علیک
شب اسرا است اطلس گردون — کمترین خیم سلام علیک
تخم مسموم زیر دندان گفت — که منم پر ز سم سلام علیک
گشته نالان ستون ز ہجران ات — دیده اشک پر ز نم سلام علیک
از دو عالم نگاه دار مرا — از غموم و الم سلام علیک
صدق و عدل و حیا و جود و سخا — خلفا را اتم سلام علیک

سایہ کن لغیب را در حشر
زیر عالی علم سلام علیک ۱۲۵

مدح خلفاء راشدینؓ

تریاق در دهان رسولؐ آفرید حق — صدیق را چه غم بود از زهر جان گزا

آن یار غار و سید و صدیقؓ نامور — مجموعهٔ فضایل و گنجینهٔ صفا

مردان قدم به صحبت یاران نهاده‌اند — لیکن نه همچنان که تو در کام اژدها

یار بود آنکه مال و تن و جان فدا نمود — طے کرده راه عشق نبیؐ از سر وفا

دیگر عمرؓ که لایق پیغمبری بدی — گر خواجهٔ رسلؐ نه بدی ختم انبیاء

سالار خیل خانهٔ دین صاحب رسولؐ — سردفتر خدای پرستان بی ریا

خاصان حق همیشه بلیت کشیده‌اند — زین ره گذر به اوج مکان یافتند جا

کس را چه زور و زهره که وصف علیؑ کند — جبار در مناقب او گفت هل أتی

دیباچهٔ مروت و سلطان معرفت — لشکرکش فتوت و سلطان اتقیا علیہ

مدح حضرت شیخ نورالدین ریشی رح

بادشاه دین و دنیا شیخ نورالدین ولی — سرگروه اهل عقبی شیخ نورالدین ولی

شاه باز لامکان و شاه سوار کن فکان — مظهر اسرار مولیٰ شیخ نورالدین ولی

عالم علم لدنی سالم از شهوات نفس — هادم لذات دنیا شیخ نورالدین ولی

در شریعت ذوالکمال و در طریقت بی نظیر — در حقیقت بود دانا شیخ نورالدین ولی

وارث الفقر فخری حارث اسلام و دین — فارس میدان تقوی شیخ نورالدین ولی

در عبادت در ریاضت گوی برد از اولیاء — آشنای بحر معنی شیخ نورالدین ولی

کاخ موهومات هستی منهدم کرد از کمال — شاخ کش بر عرش اعلیٰ شیخ نورالدین ولی

در کرامات و خوارق مشتهر در شرق و غرب — مصدر الطاف اخفیٰ شیخ نورالدین ولی

خطهٔ کشمیر گلشن از جمال حسن او — نورافشان چون خور و ماه شیخ نورالدین ولی

تا مُکن در ماندگان دم ملجاءِ کشمیریان — خستہ دل را مُداوا شیخ نورالدین ولی

مُردگان را زندگانی از دمِ جان بخشِ او — مرگدایان را کند شاہ شیخ نورالدین ولی ۱۴۸

× —— ×

شیخ نورالدین کہ نور از خاکِ او آید برون

فیضِ گوناگوں زِ روحِ پاکِ او آید برون ع ۱۴۹

مدحِ حضرت شیخ مخدوم حمزہؒ

اے آفتابِ حسنِ حق ضیا یک پرتوے افگن مرا — مردہ دلم زندہ نما یا شیخ حمزہ پیرِ ما

تا ہم تو خوانم بر زبان ذکرِ تو خواہم ہر زمان — درگاہِ تو کہف الامان یا شیخ حمزہ پیرِ ما

ما را چہ غم از دشمنان باشد چو تو من سائبان — ہم مشفق و ہم مہربان یا شیخ حمزہ پیرِ ما

از حادثاتِ این زمان از بس کہ در ضیق آمدم — راہِ خلاصی وا نما یا شیخ حمزہ پیرِ ما

مسند نشینِ سروران ہم صحبتِ پیغمبران — ای دست گیرِ بے کسان یا شیخ حمزہ پیرِ ما

از نورِ حق پُر کن دلم سر سبز گردان حاصلم — آسان شود ہر مشکلم یا شیخ حمزہ پیرِ ما

صد ہا مریدِ خاصگان بودند ترا اندر جہان — ای شاہ بازِ لامکان یا شیخ حمزہ پیرِ ما

ہر کس مریدِ تو شود بی شک بہ جنت در رود — رحمت برا و بی حد بود یا شیخ حمزہ پیرِ ما

از لطف احسان کن نظر سوئے نعیبِ بے ہنر — بر خاکسارِ خود نگر یا شیخ حمزہ پیرِ ما

اے غم زدا اے پر غمان دے رہنمائے گم رہان — اے دستگیرِ بیکسان یا شیخ حمزہ پیرِ ما

آمد گدائے بر درت مسکین نعیبِ چاکرت

امید دارد مغفرت یا شیخ حمزہ پیرِ ما

ع ۱۵۰

(اقتباس)

غزل

نه تن تنها به راهت دادم ای دوست
به جان در خدمتت استادم ای دوست

جگر پر درد دل صد پاره گشته
سر خود بر درت بنهادم ای دوست

پئی دیدار جانان هم چو مجنون
به هر دم ناله و فریادم ای دوست

برای دیدن دیدار شیرین
گرفته کوه چون فرهادم ای دوست

اگر بختم بباشد رویت ببینم
به جنت در جویت مردن شادم ای دوست

وفا خواهی جفا کش ای نسیبا
وفایت پیشه هر آدم ای دوست ع۱۵۱



مردم از نادیدن روی حبیب
زنده گردم گرچه بینم من قریب

بی قرار و بی وطن از بهر یار
نیست در عالم کسی چون من غریب

از فراق یار جانم سوختم
ناله دارم زان سبب چون عندلیب

دردمندم عاجز و بی چاره ام
چاره درد مرا کن یا طبیب

گر درون پرده ما را نیست راه
با تو بنشینم بغیرها یا رقیب

از رضای دوست رنج و راحتی
هر چه آید گیر بر سر ای نسیب ع۱۵۲

نظم

چه بندی دل درین دنیا که روزی چند مهمانی
چو تو ناگه مرگ پیش آید خوری آن دم پشیمانی

مکن اندیشه کن در دل دیگر چون تو در دنیا
کجا رفتند آن یاران که بودند مونس جانی

ببین ای مایل دنیا کجا شد آدم و حوا
کجا شد شیث پیغمبر کجا شد نوح طوفانی

کجا شد لوطؑ و ذکریاؑ کجا یونسؑ کجا یحییؑ — کجا الیاسؑ شد دیگر کجا ایوبؑ کرمانی

کجا شد ابن آذر آن براہیمؑ خلیل اللہ — کجا اسحاقؑ و اسمعیلؑ و آل یعقوبؑ کنعانی

کجا شد یوسف مصری کجا داودؑ شاہنشاہ — کجا آن سطوت شاہی کجا تخت سلیمانی

کجا موسیٰؑ و ہارونؑ شد کجا شد عیسیٰؑ مریم — کجا نمرود و قارون شد کجا فرعون و ہامانی

کجا آن سرور عالمؐ کجا اصحاب خاصانش — کجا آن چار یارانش کہ دین را کرد چوپانی

کجا شد دُرۃ التیجان آن حسنؓ و حسینؓ او — ہمہ با خاک شد آخر بہ حکم حق سبحانی

چہ پنداری تو ای غافل کہ خواہی ماند در دنیا — الا برخیز و سامان کن برای حق سبحانی

نبینی تو اشان ساعت کہ در گور تو در دہ — عزیزان جملہ باز آیند تو تنہا اندران مانی

نیاری یاد از مردن کہ وقت مرگ در پیش است — چہ مغروری درین دنیا مگر مردن نمیدانی

بیا نار قیامت چون شود شور و شغب پیدا — نمی دانی چہ عذر آری در آن بازار حیرانی

مکن غفلت مکن غفلت بکن توبہ بکن توبہ — نصیحت می کنم بشنو اگر مرد مسلمانی

زبردستی مکن با کس مرنجان زیر دستان را — چو ناگہ وقت مرگ آید ہمی دانم کہ در مانی

نصیب الدین نمی دانی اجل البتہ در پیش است
غم روز قیامت خور کہ چندین قصہ می خوانی ۱۵۳

رباعیات

پیری چو بہ من رسید و عقلم کم شد
دستم بہ عصا رسید و پشتم خم شد
دو آئینہ داشتم دو جہاں می دیدم
زنگار گرفت و روشنائی کم شد ۱۵۴

یارب دل من بہ معرفت دانا کن
چشم بہ جمال مصطفےؐ بینا کن
روزی کہ چو لالہ سر بر آرم از خاک
در روضہ منور مرا ماوا کن ۱۵۵

ای راحتِ روحِ دردمنداں از تو　　آسایشِ جانِ مستمنداں از تو
بلبل سخن از حمدِ تو گوید شب و روز　　کہ گُلِ نوخاستہ خنداں از تو ع۱۵۶

گر ملکِ تو شام تا یمن خواہد بود　　وز سرحدِ روم تا ختن خواہد بود
آن روز کزین جہاں کنی عزمِ سفر　　ہم راہِ تو چند گز کفن خواہد بود ع۱۵۷

ہر چند کہ ما گنہ گاریم ہمہ　　واز کردۂ خویش شرمساریم ہمہ
چوں فضلِ خدا جابہ جامی بینم　　از رحمتِ او امیدواریم ہمہ ع۱۵۸

ای فقرِ تو نورِ ارباب نیاز　　خرم ز بہارِ خاطرت گلشنِ راز
یکدم نظری بر منِ مسکین انداز　　باشد کہ براو حقیقت عدم ز مجاز ع۱۵۹

آئینۂ ذاتِ حق چو درویشانند　　از ہر جہتی قبلۂ ما ایشانند
نگرم نرسد بگردِ ایشاں ہرگز　　زاں رو کہ نسبی بزرگ ایشانند ع۱۶۰

قطعات

اندروں از طعام خالی دار　　تا درو نورِ معرفت بینی
تہی از حکمتی بہ علتِ آن　　کہ پُری از طعام تا بینی ع۱۶۱

مجردی بہ حقیقت عظیم سلطنتیست　　ز من شنو تو و آزادِ خویش بندہ مساز
ہمای قطرۂ شہوت کہ خاک بر سرِ آن　　اسیرِ زن نتواں شد بہ سال ہای دراز ع۱۶۲

تو آن شاہی کہ بر ایوانِ وحدت　　کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبی مستمندی بر در آید　　در آید یا ازین در باز گردد ع۱۶۳

فردیات

عمر بہ خوشنودیِ دل ہا گزار　　تا ز تو خوشنود شود کردگار ع۱۶۴

؎ رحمت به مذهبی که در او عام رحمت است	لعنت به مذهبی که مدارش به لعنت است	۱۶۵
؎ مرگ بنگر تا چه راه مشکل است	کاندرین راه گوماول منزل است	۱۶۶
؎ گر بود از تلخیٔ مرگت خبر	جان شیرینت شود زیر و زبر	۱۶۷
؎ چرا می رانی از کوئی خود ای دوست	مرا راهی نما سوئے خود ای دوست	
مرا تا کے فریب رنج دلبری	که پیچان ماندم زین گنج داری	۱۶۸

مثنویات

دلا چون وعده کردی در وفائی — ز تنگ چشمی نشاید بی وفائی

چرا کردی فراموشی به این هوش — که موعودی چرا کردی فراموش

چرا چندی درین ویرانه گشتی — به مرداری چرا پروانه گشتی

تو بودی صاحب انوار ارواح — تو بودی کاشف اسرار ارواح

تو بودی هم نشین از اهل عرفان — نبوده دامنت را گرد عصیان

نبوده کار تو، این کار غفلت — نبوده حرص و طمع و در تو غفلت

نبودی مرکب این نفس مردار — نگردی پای مال دیو مکار

بحکم قادر قیوم و دانا — شدی سیار ملک ناتوانا

قدم از دایره چون بر کشیدی — بعزمال پدر اندر کشیدی

زخلوت گاه چله پائی بیرون — بیک قطره شدی از جائی بیرون

به بطن مادرت راجائے کردند — که زنجیر تنت در پای کردند

تو جائی تاریکی چون آزمودی — زبان ناکشی را بر کشودی

خداوندا به بین حال من زار — رهائی ده مرا از بند این دار

که دیدم رحمتی بی جرم و عصیان — بفریادم برس یارب زعفران

چو از بندِ چنین زندان بر آییم | به عشرتگاهِ دنیارا در آییم
بغیر از حق پرستی را نشاید | که از من غیرِ حق چیزی نیاید
زننگی رختِ مخلص چون تو بردی | بپائی و سرِ عجب راهی نوردی
بدنیا چون قدم ارزان نمودی | زن و فرزند شغلِ خود نمودی
پرستش را ز خود کردی فراموش | به نفسِ بد چرا گشتی هم آغوش
زن و فرزند و مال و جاه بگذار | چو خاکے بر سرِ این راه بگذار
به همت خاک را همه زر فشانی | بچشمِ عرحق خاکستر فشانی

حکایتِ شیخ نورالدین ریشیؒ و کافران

شیخ کرده بر لبِ دریا گزر | چند کافری نمودند در نظر
آب از دریا بگیرند هر دو کف | بر فشانند جیب و راست از هر طرف
شیخ پرسیده ز ایشان این چه کار | می نماید از شما در روزگار
هیچ سودی می نماید زین شما | هیچ مقصد می بر آید زین شما
کافران گفتند نفع ما ازین | آنچه اندر دینِ ما باشد به بین
می رسد روحانِ مارا نفع آب | سبز خواهد گشت ایشان هم سراب
شیخ گفتا این همه از احمقی | گشت رسمی از شما دینِ شقی
گرسنگی و تشنگی از مرده دور | کے بابِ زنده ناکرده سرور
پیشِ عاقل کے نماید راست این | سیر گردد تشنه از آب چنین
کافران گشتند عاجز از جواب | یک جوابش را نکردند با صواب
التجا بردند بر او ایشان همه | آنچه بوده التماسِ شان همه
شیخ! فرما خود، تو یک راهی مرا | از چه باشد نفع ارواحِ مرا

شیخ فرمودہ کہ این راہِ ضلال کرد باید ترک از باہِ ملال
گرسنہ باید سیر گردد تشنہ ہم تاکہ گردد روح تشنہ سیر ہم [۱۷]

حضرت نقیب اپنے ہم عصروں میں زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی وجہ سے ممتاز حیثیت تو رکھتے ہی تھے، اپنی وفات کے بعد بھی وہ ظاہری اور روحانی لحاظ سے مرجع خاص و عام رہے۔ ان کی تصنیفات، اور مصنفین کے برعکس، تذکرہ نویسوں، مورخوں اور ملفوظات لکھنے والوں کے لئے اہم ترین مآخذ بن گئیں۔ بابا داؤد مشکواتی، میر سعداللہ شاہ آبادی، بابا کمال لشتی وغیرہ وغیرہ نے اپنے تذکروں اور تاریخ میں حضرت نقیب کے بہت سے اشعار، اقوال، اقتباسات اور ملفوظات درج کرکے محفوظ کرلئے ہیں۔ اسی طرح مورخ محمد اعظم دیدہ مری، محی الدین مسکین سرائے بلی اور پیر حسن شاہ کھویہامی نے بھی اپنی تاریخیں مرتب کرتے وقت حضرت نقیب کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے۔ سید عبداللہ ہمدانی وغیرہ نے اپنی تالیف "الدوائر و بحر الانساب" میں جہانگیر کے دعوتی خط کے جواب میں حضرت نقیب کا مکمل منظوم مکتوب محفوظ کرکے ان کی پاکیزہ سیرت اور متوکلانہ زندگی کا ایک اہم اور روشن ترین پہلو اجاگر کیا ہے، ملا عبدالوہاب شائق نے اپنی تصنیف ریشی نامہ کی بنیاد حضرت نقیب کے نورنامہ میں درج روایات و واقعات پر ہی رکھی ہے۔ شائق نے بار بار ان سے روایت کی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

نقیبِ لبیب ستودہ سیر چنیں دادہ در نورنامہ خبر (۶ ب)
رقم کردہ آن راویٔ معتبر نقیبِ لبیب ستودہ سیر (۱۴ ب)
روایت رقم کردہ بابا نقیب زِ گلزارِ رضوان بیاورد طیب (۲۰ ب)
ز اربابِ عرفان حکایت شنو ز بابا نقیب ایں روایت شنو (۲۳-۱)
بیاں می کند راویٔ معتبر نقیبِ لبیب فرشتہ سیر (۳۸-۱)
رقم کردہ بابا نقیبِ ولی زِ گلزارِ فردوس آورد طیب (۴۶-۱)

روایت چنیں کرد بابا نصیب | کہ از علم ِ ورین آمدہ بانصیب (۵۴-ب)
حکایت رقم کرد بابا نصیب | در آن 'نورنامہ' کتاب ِعجیب (۶۶-ا)
روایت چنیں کرد آن نامدار | نصیب ِلبیب معارف مدار (۷۴-ا)
روایت کند راوی نامدار | نصیب ِطبیب ولایت مدار (۲۷-ا)

وغیرہ وغیرہ

موجودہ دور کی تاریخ نویسی میں سماجی، معاشی، اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ جن سے عام لوگوں کی زندگی کے بارے میں مطالعہ کرکے کسی دور کی تاریخ کے سارے پہلو واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔ اس تناظر میں حضرت نصیب کی تصنیفات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ نورناموں کے براہ راست مطالعہ کی بناء پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کشمیر کی تاریخ لکھنے والوں نے ایسے ذخیرہ ہائے معلومات کا سنجیدگی اور صبر و استقامت کے ساتھ کوئی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اِدھر اُدھر کے حوالہ جات اور سیاق و سباق کو مُثلہ کرکے اکثر دلوں نے اقتباسات نقل کرکے غلط نتائج اخذ کئے ہیں۔

موجودہ دور میں ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اپنی گرانقدر تصنیف "کشیر" اور استاذی پروفیسر محب الحسن نے "کشمیر سلاطین کے عہد میں" کی تیاری میں حضرت بابا نصیب کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ اب بھی بہت سے خطی مسودات اور نادر و نایاب کتب مختلف اصحاب علم کے ذاتی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ لیکن کسی بھی ادارے کو ان کو حاصل کرکے محفوظ رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں منتشر انکو تو دل ہوتا ہے سی پارہ[171]

ماخذ و حوالہ جات

؎۱ بیاضِ خطی؛ ذاتی نسخہ ؎۲ زاد الفقرا خطی و اسرار الابرار خطی فولیو نمبر ۲۲۳-ا

؎۳ کلام و آثار مقبول خطی (ذاتی نسخہ) ؎۴ سلطانی (متو) نسخہ خطی ص۵۵ ذاتی

؎۵ تاریخ اعظمی ص۱۴۲، تاریخ کبیر مسکین ص۱۸۷ و ص۱۸۸، ؎۶،۷ تاریخ کبیر ص۱۹۵، ص۲۶۶

؎۸ تاریخ اعظمی ص۱۴۶ ؎۹ ایضاً ص۱۴۳-۱۴۲

؎۱۰ ایضاً ص۱۴۲، ص۱۴۳، ص۱۴۶ ؎۱۱،۱۲،۱۳،۱۴۔ تاریخ کبیر ص۱۶۵

؎۱۵ نورنامہ (ریسرچ لائبریری) ص۱ ؎۱۶ تاریخ اعظمی ص۱۴۲

؎۱۷،۱۸ بیاضِ محمود گامی خطی، نسخہ ذاتی، منقبت بابا نصیب "۱۲، ماہ ربیع الاول بروز عرس حضرت بابا نصیب، درمن بابا گفتہ شد ۱۲۱۱ھ"

؎۱۹ نورنامہ۔ بہت سی مثالیں ملتی ہیں ؎۲۰۔ زاد الفقرا خطی

؎۲۱ بیاضِ محمود گامی خطی ؎۲۲ کلیات عبدالاحد ناظم۔ مرتبہ غلام محمد شاد

؎۲۳،۲۴ تاریخ اعظمی ص۱۴۲ ؎۲۵ نورنامہ (ریسرچ لائبریری) ص۲۵۵

؎۲۶ نورنامہ ص۲۹۳ ؎۲۷ ایضاً ص۲۸۸، و ص۲۸۹

؎۲۸،۲۹ ایضاً ص۲۵۴ ؎۳۰ سلطانی ص۹۰

؎۳۱ نورنامہ ص۲۵۳ ؎۳۲ نورنامہ ص۲۵۰

؎۳۳ ایضاً ص۲۸۹ ؎۳۴ ایضاً ص۲۲۳

؎۳۵ تاریخ کبیر ص۱۸۷ و نورنامہ ص۲۹۷ ؎۳۶ نورنامہ ص۲۴۵

؎۳۷ تاریخ کبیر ص۱۹۶ و تاریخ حسن ۲۱۲/۳ جلد ؎۳۸ ایضاً ص۱۹۳

؎۳۹ نورنامہ فولیو ۱ ؎۴۰۔ باغ سلیمان ص۱۸۷-ب و ص۱۸۸-ا و کلام و آثار مقبول خطی (ذاتی)

؎۴۱ نورنامہ (ریسرچ) ص۴ ؎۴۲ باغ سلیمان ص۱۸۷-ب و ص۱۸۸-ا

؎۴۳ سلطانی ص۵۵ (نسخہ ذاتی خطی) ؎۴۴ نورنامہ نثری بابا کمال خطی ص۵۴

۴۵ زادالفقرا خطی ۴۶ سلطانی خطی ص ۵۵ (نسخۂ ذاتی)

۴۷ زادالفقرا خطی ۴۸ تاریخ اعظمی ص ۱۴۲

۴۹ تاریخ کبیر ص ۱۸۷ ۵۰ بیاض محمود گامی خطی (نسخۂ ذاتی)

۵۱ سلطانی خطی (نسخہ ذاتی) ص ۵۵ ۵۲ ایضاً ص ۱۴

۵۳ الدوائر و بحر الانساب مرتبہ سید عبداللہ ہمدانی و حافظ عبدالسلام بانڈے نسخہ خطی

۵۴، ۵۵ ایضاً ۵۶ تاریخ کبیر ۱۸۸ و تاریخ اعظمی ص ۱۴۲ و تاریخ حسن ۲۰۹/۳

۵۷ سلطانی ص ۵۹ (نسخہ ذاتی) ۵۸ تاریخ کبیر ص ۱۸۸

۵۹ بیاض خطی (نسخہ ذاتی) ۶۰ سلطانی ص ۵۶ (نسخۂ ذاتی)

۶۱ تاریخ اعظمی ص ۱۸۲، تاریخ کبیر ۱۸۸، سلطانی ص ۵۵-۵۶ (نسخہ ذاتی)

۶۲ سلطانی ص ۵۶، تاریخ اعظمی ص ۱۸۲ ۶۳ الدوائر و بحر الانساب خطی

۶۴ وردالمریدین بابا داود خاکی مطبوعہ ص ۱۷ و اسرار الابرار بمبر ۱۲۷۶ خطی (ریسرچ لائبریری)

فولیو ۱۰ ب ۶۵ کشمیر بعہد سلاطین (محب الحسن) ص ۴۹-۴۸ ۳

۶۶، ۶۷ نورنامہ نصیب خطی (کلچرل اکادمی) ص ۶۸-۲۶۵

۶۸ نورنامہ نصیب (ریسرچ) ص ۷۵-۱۸۴ ۶۹ نورنامہ ایضاً ص ۲۴۹

۷۰ قرآن کریم "البغض الاشیاء عندی الطلاق"

۷۱ کلیات شیخ العالم۔ مطبوعہ اکادمی

۷۲ نورنامہ (ریسرچ) ص ۳۴۶ و تاریخ اعظمی ص ۱۴۶ و تاریخ حسن ص ۱۸۳-۱۸۲ او ص ۲۱۷

۷۳ نورنامہ (نسخہ ریسرچ لائبریری) ص ۳۴۲ ۷۴ ایضاً ص ۳۷۳-۳۷۴ و تاریخ اعظمی ص ۱۸۲

۷۵ تاریخ اعظمی ص ۱۸۶ ۷۶ باغ سلیمان ص ۱۸۵-الف و ۱۸۶-ب (خطی)

۷۷ تاریخ اعظمی ص ۱۴۲ ۷۸ تاریخ حسن ص ۵۹ جلد سوم

۷۹ تاریخ اعظمی ص ۱۴۶ ۸۰ اسرار الابرار ص ۱۴۹ فولیو ب

۸۱ تاریخ حسن ص ۲۶۱ (جلد سوم) ۸۲ تاریخ اعظمی ص ۱۸۱

۸۳ تاریخ حسن ص ۲۳۰-۱۷۹ (جلد سوم) تاریخ اعظمی ص ۱۴۷ و ۱۴۸ وغیرہ تاریخ کبیر ص ۱۶۱، ص ۱۷۶، ص ۱۹۱، ص ۲۰۰ وغیرہ

۸۴ نور نامۂ لصیب (ریسرچ) ص ۱۸۶-۱۸۴ ۸۵ تاریخ اعظمی ص ۱۴۶

۸۶ زاد الفقرا خطی ۸۷ خوارق السالکین (تاریخ ہادی) ص ۱۷۳ ۱

۸۸ باغ سلیمان خطی ص ۱۸۵ ب و ص ۱۸۸/۱ ۸۹ بیاض خطی (نسخہ ذاتی)

۹۰ نور نامہ نثری بابا کمال ریشی ص ۱۹۱-۱ ۹۱ سلطانی خطی ص ۵۵ (نسخہ ذاتی)

۹۲ تاریخ اعظمی ص ۱۴۲ ۹۳ تاریخ کبیر ص ۱۸۷

۹۴ کلام و آثار محمد جعفر مقبل (نسخہ ہائے خطی ذاتی)

۹۵، ۹۶، ۹۷ تاریخ اعظمی ص ۱۴۲ و حاشیہ ص ۱۴۶

۹۸ بیاض محمود گامی خطی (نسخہ ذاتی) ۹۹ تاریخ اعظمی ص ۱۴۲

۱۰۰ کلام و آثار مقبل (خطی ذاتی) ۱۰۱ زاد الفقرا خطی

۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴ باغ سلیمان خطی ص

۱۰۵ تاریخ حسن جلد سوم ص ۲۵۰-۲۳۶ وغیرہ و تاریخ اعظمی و تاریخ کبیر مختلف صفحات

۱۰۶ تاریخ اعظمی ص ۱۴۵-۱۴۳ ۱۰۷-۱۰۸ تاریخ کبیر ص ۲۱۷

۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱ تاریخ اعظمی ص ۱۷۶ ۱۱۲ الیضاً ص ۱۴۶ برحاشیہ

۱۱۳ تاریخ اعظمی ص ۱۴۶ و تاریخ حسن ص ۲۳۸/۳

۱۱۴ تاریخ اعظمی ص ۱۴۶ ۱۱۵ الیضاً ص ۱۴۳ ۱۱۶ تاریخ حسن ص ۲۳۸/۳

۱۱۷ الیضاً ص ۲۱۷ ۱۱۸ تاریخ کبیر ص ۲۰۰ و تاریخ حسن ص ۲۴۶

۱۱۹ تاریخ کبیر ص ۱۹۱ ۱۲۰ تاریخ حسن ص ۲۳۸

۱۲۱ تاریخ اعظمی ص ۱۴۶ ۱۲۲ تاریخ حسن ص ۲۴۰

۱۲۳ ایضاً ص ۱۴۱ ۱۲۴ ایضاً ص ۱۴۲

۱۲۵ تاریخ کبیر ص ۲۲۵ و تاریخ اعظمی ص ۲۰۴ و ص ۲۲۹ و تاریخ حسن ص ۲۴۹

۱۲۶ تاریخ کبیر ص ۲۰۳ ۱۲۷ تذکرۂ شعرای کشمیر (محمد اسلم سالم) مع حواشی از پیر حسام الدین راشدی ص ۹۹ (لاہور)

۱۲۸ تاریخ اعظمی ص ۱۴۹ ۱۲۹ تاریخ کبیر ص ۳۳۲

۱۳۰ تاریخ اعظمی ص ۱۲۹ ۱۳۱ ایضاً ص ۱۵۸، ۱۵۹، تاریخ کبیر ص ۱۹۵، ۱۹۶

۱۳۲ تذکرہ شعرای کشمیر حصہ سیوم مرتبہ حسام الدین راشدی ص ۱۲۲۶ (اقبال اکادمی۔ لاہور)

۱۳۳ دیوان نصیب خطی برگ ۹ ۱۳۴ نورنامۂ نصیب (اکادمی) فولیو ۱۰۱، و نورنامۂ ریسرچ ص ۱۵۸

۱۳۵ مثنوی تحفۂ محمدی۔ ص ۴۴ و ص ۹۰ مطبع نولکشور لکھنؤ

۱۳۶، ۱۳۷ کشمیر سلاطین کے عہد میں" محب الحسن ص ۲۱

۱۳۸ محکمہ ریسرچ اینڈ لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں بابا نصیب کے نورنامے کے مندرجہ ذیل نمبر ہاے کے تحت یہ نسخے ہیں ۵۳، ۶۱۱/۳، ۲۰۹۳، ۲۲۹۵/۵ ۲۸۶۴/۶ اور ۲۲۱۵/۷۔ میں نے ۲۲۹۵ نمبر کو استعمال کے لیے ترجیح دی ہے۔

۱۳۹ کشمیر۔ حصہ دوم، ص ۵۰۱، ص ۴۷۶ ۱۴۰ تذکرۂ پارسی سرایان کشمیر ص ۱۵۷ (چاپ اول تہران ۱۳۳۵ھ) ۱۴۱ رسالۂ ضروریہ خورد مطبوعہ لاہور ص ۱۳-۱۰

۱۴۲ کنز السالکین از شیخ محمد چشتی رادھو نسخۂ خطی (ذاتی)

۱۴۳ اوراق منتشر خطی (ذاتی) مملوکہ مقالہ نگار ۱۴۴ ایضاً مملوکہ مقالہ نگار

۱۴۵ بیاض خطی ذاتی ۱۴۶ بیاض خطی ذاتی

۱۴۷ ایضاً ۱۴۸ بر نسخۂ خطی نقل بدست محمد خضر مقبلی۔ نسخہ ذاتی

۱۴۹ نورنامۂ (ریسرچ) ص ۳، اکادمی فولیو ۹۸۹

ع۱۵۰ نسخہ ذاتی خطی و نسخہ ریاض الاسلام شمارہ ع۲۹۸۵ (ریسرچ)
ع۱۵۱،۱۵۲ ۔ از "الدائرہ بحر الانساب" سید عبداللہ میلانی و حافظ عبدالسلام بانڈے
نسخہ خطی ذاتی ع۱۵۳ از تلف و کرم خوردہ ورق ہا محفوظ در کتب خانہ
ذاتی پروفیسر غلام محمد شاد۔ ع۱۵۴ ریاض الاسلام [illegible] شمارہ ع۲۹۸۵ (ریسرچ)
ع۱۵۵ نورنامہ نصیب ص۔ (ریسرچ) ع۱۵۶ نورنامہ نصیب (نسخہ [illegible]) فلیوز ع۱
ع۱۵۷ نورنامہ نصیب ص۱۵۶ (") ع۱۵۸ نورنامہ (ریسرچ) ص۲۲۵

ع۱۵۹ نورنامہ (ریسرچ) ص۶۱ — ع۱۶۰ نورنامہ (") ص۵۹
ع۱۶۱ نورنامہ (") ص۲۸۵ — ع۱۶۲ نورنامہ (") ص۱۸۹
ع۱۶۳ نورنامہ (") ص۲۷۷-۷۸ — ع۱۶۴ نورنامہ (") ص۲۸۵
ع۱۶۵ نورنامہ (") ص۔ — ع۱۶۶،۱۶۷ منقول از نورنامہ نثری ایڈیشن کمال بکس ص۔
ع۱۶۸ نورنامہ (") ص۱۸۱ — ع۱۶۹ نورنامہ (نسخہ [illegible] ریسرچ) ص۱۰۷، ص۱۰۸
ع۱۷۰ نورنامہ (") ص۱۲۲ — ع۱۷۱ شعر علامہ اقبال بعد تصرف خفیف۔



پروفیسر محمد ابراہیم

حضرت بابا داوٗد ریشیؒ

سرزمین کشمیر کے مروجہ روحانی سلاسل میں سلسلۂ ریشیہ کشمیر کا خالص اپنا سلسلہ ہے، جبکہ باقی دیگر سلاسل یعنی سلسلۂ کبرویہ ہمدانیہ، قادریہ، سہروردیہ، چشتیہ، نقشبندیہ، شطاریہ اور اویسیہ بیرونی درآمد ہیں۔ سلسلۂ ریشیہ پر کشمیر کے ماضی اور اُس کے تمدن کی گہری چھاپ ہے۔ یہ سلسلہ اُس وقت بھی موجود تھا جب کشمیر کی جنت آئین سرزمین انوارِ اسلام سے منور نہ ہوئی تھی۔ سلسلۂ ریشیہ یقیناً تصوف و عرفان کے میدان میں ایک بے بہا اور قابلِ فخر اضافہ ہے۔

کچھ محققین نے ریشی کا ماخذ عربی لفظ ریش بمعنی جانوروں اور پرندوں کے پر یا بال قرار دیا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کی ہے "یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوآتکم وریشا" (اے اولادِ آدم ہم نے تم پر لباس اُتارا اور تمہارے لئے چوپایوں سے بال اُتارے تاکہ تمہاری شرمگاہوں کو چھپائیں)۔ اس کے حق میں ان محققوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور

بحث کو طول دیا ہے، مگر یہ سب کچھ لفظ ریشی کو عربی ظاہر کرنے میں کھینچا تانی اور زور زبردستی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ ریشی کا ماخذ سنسکرت زبان کا لفظ رِکھی ہے جو لفظ ریشی کا مخرّب اور عوامی محاورہ ہے۔ "رِکھی" کے معنی محافظ یا رکھوالے کے ہیں۔ یہ لوگ جب حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ اور آپ کے فرزندِ دلبند میر سیّد محمد ہمدانی قدس سرّہما کی مساعی سے داخلِ اسلام ہوئے تو اپنے قدیمی نام پر برقرار رہے۔ اس امر کی تائید ابو محمد حاجی محی الدین احمدی مسکین سرائے بلی کے درجِ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے۔ رقمطراز ہیں:

"لفظ ریشی از رکھی است کہ در اصطلاحِ سنسکرت تارکِ دنیا و مشغول بیادِ خدا را گویند، وآنکہ این لفظ را عربی یا فارسی قرار دادہ است در آں تاویلات نمودہ و پے باصلیت نبردہ است، و مع ہٰذا ایں لفظ در زبانِ کشمیری مستعمل است و زبانِ کشمیر از لغات والسنہ کثیر مُرکب است، و چونکہ دریں خطہ زبانِ سنسکرت مُروّج بود، بنا بریں لغایت حال ہم اکثر الفاظ بر السنہ ساکنانِ ایں دیار جاری است۔"

● — (ریشی کا لفظ "رِکھی" سے ہے۔ سنسکرت میں رِکھی تارکِ دنیا کو کہتے ہیں۔ ریشی یادِ خدا میں مصروف ہوتا ہے اور جو شخص اس لفظ کو عربی قرار دیتا ہے، وہ تاویلات (اپنا خود ساختہ مطلب نکالنا) کے ذریعہ اس کی اصلیت کو نہ پہنچ سکا ہے۔ تاہم یہ لفظ کشمیری زبان میں مستعمل ہے اور کشمیری زبان مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے۔ چونکہ اس خطہ میں سنسکرت زبان رائج تھی، اس لئے تا حال اس زبان کے بیشتر الفاظ اس ملک کے اکثر باشندوں کی زبان پر جاری ہیں)

جیسا کہ اقتباس بالا سے معلوم ہوا کہ ریشی چونکہ تارک الدنیا عابد و مرتاض تھا اور لذائذ

دنیوی سے صرف ساگ پات پر بسر اوقات کیا کرتا تھا۔ قیدِ ازدواج و تاہّل سے آزاد تھا۔ اس لئے گذشتہ مصنّفینِ کشمیر کے طبقہ ریشیان کے مدّاح اور ثنا خوان ہیں۔ آئینِ اکبری میں علّامہ ابوالفضل کا اِن کے متعلق خیال ہے کہ:

"یہ لوگ مادی لذائذ و آرام سے یکسو ہیں، ساگ پات پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ عوام سے الگ تھلگ کوہ و بیابان اور غار اِن کے مسکن ہیں۔ شادی بیاہ کے بندھنوں سے مطلق آزاد ہیں۔ میوے اور سایہ دار درخت لگاتے ہیں اور خود ان سے استفادہ نہیں کرتے"۔

غالباً ریشیانِ کرام کے انہی انسانی صفات کے بموجب کشمیر کا ہر تذکرہ نگار اِن کی تعریف و توصیف میں رطب اللّسان ہے۔ یوں تو کشمیر کے ریشیانِ کرام کی مجموعی تعداد ۱۷۱ یا اس سے زیادہ ہے تاہم اس مقالہ میں حضرت شیخ داؤد ریشیؒ المعروف بہ بتہ مول پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

شیخ داؤد ریشیؒ المعروف بہ بتہ مول وڈیارن پُل کے قریب، جو موضع پانپور میں ہے شیخ شنگلی بٹ کے یہاں متولّد ہوئے تھے۔ تاریخ نگار آپ کے سالِ ولادت اور طفولیّت کی زندگی کے متعلق یکسر خاموش ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ آغاز میں آپ حد سے زیادہ گوشۂ گمنامی میں تھے۔ شروع شروع میں تھنہ سے نمک لاکر فروخت کیا کرتے تھے۔ تھنہ منڈی راجوری سے پندرہ میل شمال میں پہاڑوں کی گود میں واقع ہے۔ سورن کوٹ سے براستہ بفلیاز اس کی مسافت دس میل مشرق میں ہے۔ قدیم زمانہ میں تھنہ نمک کی منڈی کی حیثیت سے مشہور تھا، مگر اب یہاں ماسوائے چند دکانوں کے اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ علاوہ نمک کی درآمد کے کاشتکاری اور زراعت بھی کیا کرتے تھے۔ یہ زراعت قصبۂ پانپور میں تھی جہاں آپ کی آبائی زمین تھی۔ ایسا اس حدیث شریف کے کے بموجب کیا کرتے تھے جس میں ارشاد نبوی ہے: اُطْلُبُوا الرِّزْقَ مِنْ خَبَايَا الْأَرْضِ

•— (رزق زمین کی پوشیدگیوں سے حاصل کرو۔)

حضرت شیخ داؤد ریشیؒ کا عہد روحانیت اور خدا طلبی کا عہد تھا۔ صوفیاء اور مشائخ کی کثرت کے باعث عامۃ الناس صفائی قلب اور باطن میں مصروف تھے۔ اس ماحول سے حضرت شیخؒ بھی الگ تھلگ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لئے اپنے دور کے مشہور بزرگ خواجہ یوسف کانجہؒ کے دامنِ عاطفت میں ہاتھ ڈالا۔ خواجہ یوسف وقت کے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ انہیں کے توسط سے بعد ازاں جناب اللہ داد ریشیؒ سے ارادت پیدا کرلی تھی۔ اللہ داد ریشی بابا زین الدین ریشی اشٹ مقامی (موجودہ عیش مقام) کے جو شیخ نورالدین ولیؒ کے خلیفۂ دوم تھے، معتقد اور ارادت مند تھے۔ تقویٰ اور ورع میں آپ کا ثانی کوئی نہ تھا۔ عبادت و ریاضت مشغلۂ حیات تھا۔ بتہ مول صاحبؒ اگرچہ علوم ظاہریہ سے بالکل کورے تھے تاہم علم لدُنّی (خدائی علم) سے بہت کچھ پالیا تھا۔ بتہ مول صاحبؒ روحانی فیوض و برکات کے باعث بہت سے اہلِ کمال بزرگ پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ آپ کے اوصاف کا صحیح اندازہ کسی فارسی شاعر کے اِن اشعار سے ہوسکتا ہے ؎

کردہ جا بر فرازِ مسندِ عرش	ہمچو شاہان بملک امجدِ فرش
بود، دادہ قدم بہ درویشی	عابد و شیخ و عارف و ریشی
قائم اللیل در صفا ورزی	صائم الدہر در کشا ورزی
شہرۂ خود را بہ "بتہ مالو" کرد	بود در نان دہی یگانۂ فرد

•— (بادشاہوں کی طرح بزرگی کے ملک میں بچھونا ڈال کر تکیہ گاہ عرش پر جگہ بنائی تھی۔ عابد و شیخ، عارف اور ریشی ہونے کے باعث درویشی میں قدم رکھ دیا تھا۔ باوجود کھیتی باڑی میں مصروف ہونے کے دائمی روزہ دار تھے اور صفائی قلب سے شب زندہ دار، محتاجوں کو روٹی دینے میں منفرد تھے، اسی لئے "بتہ مول" .... کے لقب

سے خود کو مشہور کیا تھا)۔

مشہور ہے کہ ایک برس مشیت الٰہی سے کشمیر میں خشک سالی رونما ہوگئی۔ لوگ بھوک سے حیران و پریشان تھے۔ اس موقع پر شیخ داؤد ریشی رحمۃ اللہ علیہ اپنی زراعت سے پتلا یعنی پچدار کھانا جس کو کشمیری میں "اُدگرہ" کہتے ہیں، ایک مٹّی کے برتن میں تیار کرتے تھے۔ بعدازاں کھیت کے راستہ پر بیٹھ کر صبح سے شام تک عام و خاص کو دیتے تھے۔ اُدگرہ میں دودھ کی آمیزش ہوتی تھی۔ باوجود تقسیم ذاتِ باری کی قدرتِ کاملہ سے کھانے میں مطلق کمی واقع نہ ہوتی تھی۔ لوگوں میں مُفت کھانا تقسیم کرنے کے باعث آپ "بتہ مول" سے جو عرفِ عام میں "بٹہ مالو" ہوگیا ہے، مشہور ہوئے ہیں۔

آپ کے "بٹہ مول" کہے جانے کی ایک اور وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ کشمیر میں حضرت شیخ داؤد ریشیؒ کے معتقدین میں علاوہ مسلمانوں کے ایک کثیر تعداد بٹّوں یعنی کشمیری پنڈتوں کی بھی تھی یا یہ کہ اُن کا تعلق کشمیر کے قبیلہ "بٹ" سے تھا، اس لئے "بٹہ مول" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ تاہم پہلا سبب عام اور متداول ہے۔

دوسرے بزرگانِ دین کی طرح حضرت بتہ مولؒ سے بھی کئی کشف و کرامات منسوب ہیں۔

● **ابدال کا بٹہ مالو کی خدمت میں آنا**۔ اَبدال جمع بَدل کی اصطلاحِ صوفیہ میں اللہ تعالیٰ کے وہ لوگ ہیں جن کی بدولت اللہ تعالیٰ دنیا کو قائم و دائم رکھتا ہے۔ ان کی کل تعداد ستّر ہے اور ان میں سے چالیسؔ صرف مُلکِ شام رہتے ہیں اور باقی تیسؔ تمام عالم میں منتشر ہیں۔ ان میں سے جب کوئی ایک مرجاتا ہے، تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اور یہی وجہ اُن کے اَبدال کہنے کی ہے۔ قیامت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اَبدال ملکِ شام سے اُٹھیں گے۔ اَبدال مجاز نہیں ہیں کہ وہ اہلِ دنیا سے اپنا تعارف تعارف کردائیں۔ صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں بود و باش رکھتے ہیں۔

●— (مشکوٰۃ شریف، کتاب ۳۴، فصل ۳)

ابدال کے متعلق اِس تعارفی نوٹ کے بعد جاننا چاہیئے کہ ایک دن ایک شخص بابا داؤدؒ (بٹہ مالو) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ حضور میرا مالک مجھے اپنے فرائض سے سبکدوش کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے سفارش کی ضرورت ہے۔ فرمایا بہت خوب بعدازاں نووارد جب رخصت ہو گیا تو حاضرین اجنبی کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ جواب دیا۔ نووارد ابدال تھا اور اس علاقہ کی زراعت اس کی نگہداشت میں ہے۔ چونکہ ادائیگیٔ خدمت میں قدرے تساہل ہو گیا تھا لہٰذا معزول کر دیا گیا تھا۔ اب میرے پاس بحالی کی سفارش کے لئے آیا ہے۔

● — **برف پگھلانا** :۔ ایک دفعہ دھان کی فصل پر برفباری ہو گئی تھی۔ کسان اس صورتِ حال سے بیحد گھبرائے ہوئے تھے۔ شیخ بابا داؤد ریشیؒ کی خدمت میں آکر ملتجی ہوئے کہ اِس آفتِ ناگہانی سے چھٹکارا دلائیے، ورنہ زیست مشکل ہو جائے گی۔ فرمایا جاؤ میں خدا سے مانگوں گا۔ کسان اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ زمین اتنی پُرتپش ہو چکی ہے کہ برف کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا ہے۔

● — **شیطان کا عاجز ہونا** :۔ شیخ محمد مراد ٹنگ[1] کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت بتہ مول صاحب کی خدمتِ اقدس میں حاضر تھا کہ ناگاہ ایک صوفی وضع آدمی آپ کے پاس آیا۔ بتہ مالو صاحب دیکھتے ہی بولے، ایبہ کاک یعنی شیطان آگیا ہے۔ شیطان آداب بجالایا۔ آپ بولے "یہ مسکین (یعنی میں) تیرے مکر سے ابھی تک رہائی نہ پا سکا ہے"۔ شیطان نے آنکھ مارتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "دیکھئے کیا کہتے ہیں"۔ شیخ داؤدؒ فوراً بول اُٹھے۔ "یہ مردِ فقیر کیا جانے کہ تیرے مکر و فریب سے کتنے بڑے بڑے لوگ عاجز آچکے ہیں"۔ بعدازاں حضرت شیخؒ نے نماز کا اشارہ کیا۔

● — **روپی ریشی کا گوشت کھانا** :۔ روپی ریشی کا بیان ہے کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ

---

[1] متوفی ۱۷ رجب ۱۱۳۰ھ (جمعرات ۵ جون ۱۷۱۸ء)

کہ حضرت بابا داؤد ریشیؒ المعروف بہ "بتہ مول" اپنے مرشد کے پاس قصبہ بیج بہاڑہ تشریف تشریف لے گئے ہیں، تو بارادۂ ملاقات آپ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ اثنائے راہ میں بیگاری میں پکڑ لیا گیا۔ بڑی مشکل سے چھوٹ کر جب آپ سے ملاقی ہوا تو تمام کیفیت بیان کر دی۔ اسی دوران کھانا لایا گیا اور چونکہ گوشت ساتھ تھا اس لئے تناول سے اجتناب کیا۔ بتہ مول صاحبؒ بولے "آج ہماری خاطر کھا لو۔ آئندہ کیلئے احتراز برتنا"۔ یہ سن کر پہلی بار گوشت کھا لیا حالانکہ اس سے پہلے دائمی طور پر گوشت سے محترز تھا۔

● ۔ مکان سوزی کی اطلاع :۔ ایک مرتبہ شیخ بزرگوار حجامت کراتے کراتے کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ حجام نے کہا "حضرت خیر تو ہے"۔ فرمایا۔ "ہاں فلاں محلے میں کچھ مکانات آگ کی لپیٹ میں ہیں۔ جا اور گھر کی حفاظت کر"۔ حجام جب گھر لوٹا تو وہی کچھ ماجرا دیکھا جو جناب شیخ نے دورانِ حجامت زبانِ مبارک سے فرمایا تھا۔

● ۔ ڈبّے سے سانپ نکالنا :۔ ایک دفعہ چند کینہ پروروں نے سانپ کا ایک بچّہ ڈبے میں بند کر دیا۔ محبّین حضرت شیخؒ کے پاس آئے اور شکایت کی۔ آپ نے فرمایا۔ "اچھا ہم تمہارے جوتوں کی حفاظت کے لئے ابھی آتے ہیں"۔ ادھر حضرت شیخؒ نے دروازہ پر محبّوں کے جوتے سنبھالے۔ اُدھر مُلّا دو پیادہ نام کا ایک ذہین آدمی ایک جوتا اُٹھا کر تخت شاہ پر لے گیا۔ حاسدین نے جب یہ دیکھا تو ایک دو تھپڑ مُلّا کے مُنہ پر رسید کئے۔ بعد ازاں مُلّا نے وہ ڈبّا نکالا جس میں مخالفین نے سنپولیا بند کر دیا تھا۔ حاسدوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بتاؤ اس میں کیا ہے؟" وہ بولے "جوتوں کا محافظ دروازہ پر ہے، وہی بتائے گا"۔ اسی اثنا میں شیخ داؤدؒ تشریف فرما ہوئے اور آستین جھٹک کر سنپولیا باہر نکال دیا۔ حاضرین لرزہ براندام ہو گئے اور کیفیت دریافت کی۔ فرمایا کہ دامو... نام کا ایک مشہور ٹیلہ ہے جو سانپ اور بچھوؤں

کا مسکن ہے، وہاں ایک سپنی (ناگن) کے دو بچے اُس کے پاس سے چلے گئے ہیں
ناگن اُن کے غم میں تین دن سے نڈھال ہے۔ اس ماجرے کے بیان کے بعد سپنولیا
خوش خوش اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ کسی فارسی شاعر نے اس واقعہ کو یوں منظوم کیا ہے ؎

چوں زن شہ جہاں بشوہر خویش	حیلۂ رفض بر گرفت بہ پیش
بچۂ مار حقّہ در کردند	مفتیاں جملہ پیش خود بُردند
شیخ داؤد آنکہ غرق شہود	سرورِ عارفاں و مصدرِ وجود
گفتہ اند اے تو مقتدا مارا	وارہاں زین عذاب تو مارا
مضطر از حیلہ ہائے ناپاکان	آمدیم اے تو رہبر پاکان
شیخ فرمود بہر پاپوشان	آیم و پاسدارم از ایشان
چوں زدر کفش ہا زپا کردند	زیر در شیخ بود بسپردند
بود مُلّا دو پیادہ ملّائے	صاحبِ عقل و علم و خوش رائے
کفشِ خود بُرد زیر تخت شہاں	جمع آنجائے رافضان بجہان
از سر خشم و رفض و قہر درشت	سوئے مُلّا زدند یک دو مشت
ایں چہ فہم است و عقل و رائے و ہنر	کفش بُردی بہ تخت شاہِ زیر
گفت از خوفِ رہزنان اینجا	ہمچو گر گند مردمان اینجا
بعد ازاں حُقّہ کہ مار درون	بود زر لفت مہر، کرد برون
بسوئے مفتیانِ شہر چنیں	اندریں چیست گفت از سرِ کیں
داعئ کفش ہائے ما بیرون	ہست گوید کہ چیست حُقّہ درون
شیخ کاں شاہبازِ عرشِ برین	آستین وانمود از سرِ دین
افعی منگر دِ حُقّہ می گردید	لرزہ اُفتادہ آنکہ اورا دید
چوں حسودان بچشم خود دیدند	حالِ اُفعی ز شیخ پرسیدند

شیخِ دین گفت دام دار شہود | یک گروہ کہ نامِ او مشہود
مسکنِ مار اندران گشتہ است | عقرب و حیّہ دشت در دشت است

دور افتاد بچّہ دو زین مار | بہر شان از سہ روز زار و نزار
شُد روان زود سوئے مادرِ خویش | بچّۂ مار را بہ مادرِ خویش

٥ ۔ (مخالفین نے بادشاہ کی بیوی کی طرح مکر و فریب اختیار کرکے ڈبّے میں ایک سانپ بند کر دیا۔ مفتیوں کو بھی ساتھ مِلا لیا۔ بعد ازاں غرقِ شہود حضرت شیخ داؤدؒ کے پاس آکر بولے۔ "آپ ہمارے مقتدا ہیں، ہمیں اس عذاب سے چھٹکارا دلائیے۔ ہم مجبوراً آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں"۔ شیخ نے کہا۔ "اچھا میں تمہارے جوتوں کی حفاظت اور رکھوالی کے لئے آتا ہوں"۔ چنانچہ ان لوگوں نے جوتے دروازہ پر پیروں سے نکال دیئے اور شیخ کی تحویل میں دیدیئے۔ اسی اثنا میں مُلّا دو پیادہ نام کا ایک ذہین اور زیرک انسان اپنا جوتا اُٹھا کر لے آیا اور اُسے شاہی تخت کے نیچے رکھدیا۔ یہ دیکھ کر مخالفین سخت برافروختہ ہوئے اور ایک دو تھپّڑ اس کی طرف چلائے۔ مُلّا بولا "چوروں اور ڈاکوؤں کے خوف سے اپنے جوتے یہاں لایا ہوں" بعد ازاں مُلّا نے مہر کردہ ڈِبّا مفتیوں کے روبرو کرتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ اس میں کیا ہے؟" وہ بولے۔ "ہماری جوتیوں کا پاسبان دروازہ پر ہے، وہی بتلائے گا"۔ ابھی اسی گفتگو میں تھے کہ شیخؒ نے آستین جھٹکی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ڈِبّے کے اردگرد ایک سانپ گھوم رہا ہے۔ سب کے سب لرزہ براندام ہوگئے۔ حاسد جب سانپ کی کیفیت دریافت کرنے پر مصر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ یہاں سے کچھ دور دامودر نام کا ایک ٹیلہ

لہ دامودر ٹیلہ جس کو کشمیری میں دامودر وُڈر کہتے ہیں، سرینگر سے پانچ کوس کے فاصلہ پر (بقیہ صفحہ ۲۰۱ پر)

ہے۔ یہ ٹیلہ سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن ہے۔ وہیں کی ایک ناگن کے دو بچے اس سے جدا ہو چکے ہیں۔ وہ ان کی تلاش میں دو تین روز سے سرگرداں اور پریشان ہے۔ بعد ازاں بچہ تیزی سے اپنی ماں کی جانب روانہ ہو گیا۔)

حضرت شیخ داؤد ریشی عرف "بٹہ مول" کے مرید شیخ نور محمد پروانہ کے بموجب جناب "بٹہ مول" صاحب خرقِ عادات و کرامات میں سلطان العارفین حضرت شیخ مخدوم حمزہ کی طرح نامی گرامی تھے، البتہ آپ کے روحانی کمالات تفصیل سے قلم بند ہونے سے رہ گئے ہیں۔

آخر کار خطۂ کشمیر کی یہ نامی گرامی ہستی ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء یا ۱۶۶۰ء میں بعہدِ شہنشاہِ ہند محی الدین اورنگ زیب عالمگیر واصل بخدا ہو کر اپنی قیام گاہ یعنی موجودہ بٹہ مالو سرینگر، کشمیر میں دفن ہوئی۔ بعد از مرگ آپ کی روحانیت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ علاقہ آپ ہی کے نام پر "بٹہ مالو" مشہور ہے۔ گویا دوستان بظاہر اگرچہ فانی ہیں، لیکن در حقیقت باقی باللہ ہیں ؎

خاصگانِ حق بظاہر مردہ اند　　　لیک در باطن چو بینی زندہ اند

(حق کے خاص لوگ گو کہ بادیٔ النظر میں مردہ ہیں، لیکن چشمِ حقیقت بین میں زندہ ہیں)

روایت ہے کہ مُلّا محسن خوش نویس موت کے بعد آپ کا مادۂ تاریخ سوچنے لگے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) بطرفِ جنوب پرگنۂ اچھ میں واقع ہے۔ طول سات میل اور عرض دو میل ہے۔ یہ ٹیلہ ہر طرف سے الگ تھلگ ہے۔ اس کے وسط میں بہت سے نشیب اور ڈھلوان ہیں۔ یہ ٹیلہ بے آب و گیاہ ہے۔ ہندو اساطیر (LEGENDS) کے مطابق راجہ دامودر دوم نے جو ۱۳۰۲ قبل مسیح ہوا ہے۔ یہاں دمودر نام کا ایک شہر آباد کیا تھا۔ یہ راجہ دو برہمنوں کی بددعا سے سانپ ہو گیا تھا اور اسی کریوہ (ٹیلہ) پر پھرا کرتا تھا۔ اسی راجہ کے نام پر یہ کریوہ دمودر کہلاتا ہے۔ (تاریخ حسن جلد اول)

اُسی دوران نیند نے غلبہ کر لیا۔ شیخ داؤدؒ "بتہ مولؒ" صاحب خواب میں مُتشکّل ہو کر بولے محُسن کیوں سر درد اُٹھاتا ہے۔ میری تاریخ وفات حروف غ ع غ ۱۰۷۰ ہے جو بحالتِ حیات میری زبان سے نکلی ہے۔

حضرت شیخ داؤد ریشیؒ المعروف بہ بتہ مول صاحبؒ ارشاد پیرِ روشن ضمیر تھے۔ عینِ حیات میں کئی ایک بزرگ ارادت مند اور خلیفہ بہم پہنچا لئے تھے۔ ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

● **مُلّا محُسن خوش نویس** :۔ مُلّا محمد مرادؔ زرّیں قلم کے چھوٹے بھائی تھے۔ والد اگرچہ تاجرِ نامدار تھے تاہم دونوں بھائیوں نے خوش نویسی اور خطّاطی کا پیشہ اختیار کر کے دنیائے فنونِ لطیفہ میں نام پیدا کیا تھا۔ روایت کے مطابق جن شاہی عمارات و باغات کے کتبہ جات مُلّا محمد مرادؔ کے قلم سے اُن کی بے وقت وفات کے باعث باقی رہ گئے تھے۔ مُلّا محُسن خوش نویس نے ہو بہو بھائی کے قلم کی طرح اُن کی تکمیل کی تھی۔ بڑے بھائی کی طرح مُلّا محُسن "شیریں قلم" کے خطاب سے سرفراز تھے۔ تاہم خطّاطی اور خوشنویسی کی طرح معنوی شغل سے بھی فارغ نہ تھے۔ اس سلسلے میں نہ صرف حضرت شیخؒ "بتہ مول" سے روحانی فیض کا اکتساب کیا تھا بلکہ ان کے خلفائے برجستہ میں آپ کا شمار تھا۔ مُلّا محُسن "شیریں قلم" کی تاریخِ وفات مشخّص نہ ہو سکی ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ آپ کا وصال مرشد کی وفات یعنی ۱۰۷۰ھ کے بعد ہی ہوا ہے۔ حضرت بتہ مول صاحبؒ بعد از مرگ خواب میں مُلّا محُسن خوش نویس سے ہم کلام ہوئے تھے جیسا کہ متذکرہ صدر واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

● **روپی ریشی** :۔ موضع کوچھ مولہ پرگنہ اولر کے باشندے تھے۔ ابتدا میں ابوالفقرا بابا نصیب الدین غازیؒ متوفی بروز اتوار، ۱۳ محرم الحرام ۱۰۴۷ھ (۲۸ مئی ۱۶۳۷ء) سے ارادت تھی، مگر اُن کی وفات پر بتہ مول صاحبؒ کی جانب رجوع ہو گئے تھے۔ ابتدا میں

اویسی تھے۔ اپنے گاؤں کوچھ مولہ میں برلب چشمہ ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ بعد از وفات اُسی میں مدفن پایا تھا۔

● **ہلمت ریشی** :- بتہ مول صاحبؒ کے خلیفۂ خاص تھے۔ عبادات و ریاضات میں ظاہر شریعت کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ موضع ہومہامہ (بارہمولہ) میں ایک ٹیلہ کے دامن میں ایک غار بنائی تھی، اسی میں رہائش تھی۔ یہیں پر ایک مسجد اور باغیچہ بھی تعمیر کیا تھا۔ مولانا جمال الدین سیالکوٹی کے فرزند قاضی ابوالقاسم آپ کے مخلص تھے اور خصوصی طور پر مُلاقات کے لئے آیا کرتے تھے۔ وفات پاکر برسرِ راہ دفن ہوئے۔ سالِ وفات اور دیگر کوائف زندگی دستیاب نہ ہوسکے۔

● **ریشی نور محمد پروانہ** :- یہ بھی حضرت ریشی داؤد بٹہ مالو صاحبؒ کے خلیفۂ خاص تھے۔ تاہم وقت کے ایک اور بزرگ میاں محمد امین دار فتحکدل متوفی ۱۱ رمضان المبارک ۱۰۹۹ھ (سنیچر ۳۰ جون ۱۶۸۸ء) سے بھی اعتقاد تھا۔ ریشی نور محمد کا بیان ہے کہ ابتدا میں شوقِ خدا طلبی کے سلسلے میں اخوند مُلا شاہ کی خدمت میں دوڑا۔ وہ بولے "نور محمد جب تک تمہارا جوتا ذوقِ خدا طلبی میں پارہ پارہ نہ ہو تب تک کوشش بے سود ہے"۔ یہ سُن کر بے حد تردُد ہوا لہٰذا حضرت ریشی بتہ مولؒ کی خدمت میں آیا۔ وہ بولے "نور محمد تیرا جوتا ابھی پھٹا نہیں ہے' درست ہے۔ ابھی یہاں کس لئے آیا ہے۔ یہ سن کر اعتقاد بڑھ گیا۔ چنانچہ وقت کے دیگر مشائخ کے یہاں آمد و رفت بند کرکے صرف آپ کا دامن پکڑ لیا۔ ریشی نور محمد پروانہ کے بقول حضرت ریشی داؤد بتہ مول صاحبؒ تجرید و تفرید میں یگانۂ روزگار تھے۔ ہمیشہ تارکِ نوم اور مواظبِ صوم تھے۔ چالیس برس تک نیند کے لئے زمین پر پہلو نہ رکھا تھا۔ ریشی نور محمد پروانہ مرشد کی وفات پر آپ کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ خود بتہ مول صاحبؒ اپنے دورانِ حیات میں مریدوں کی تربیت اور ارشاد ریشی نور محمد پروانہ کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ ریشی نور محمد جذبِ قلوب میں منفرد اور لاثانی تھے۔ ۴ ماہِ شعبان المعظم ۱۰۸۵ھ (سنیچر وار

۲۴ اکتوبر ۱۶۷۷ء) میں وفات پاکر محلہ اٹھم، سرینگر میں نہر ژونٹھ کول کے دائیں کنارے اپنے مکان کے متصل دفن ہوئے۔ "خادم الاحرار" مادہ تاریخِ وفات ہے۔

● **مُلّا زین الدین** :۔ مُلّا شمس الدین پال ہمدرس جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفی کشمیریؒ کی اولاد سے تھے۔ حضرت شیخ داؤد ریشی بٹہ مول صاحبؒ کے دست حق پرست پر تائب ہو کر بقیہ تمام عمر عبادات و ریاضات میں بسر کر دی تھی۔ وفات پاکر محلہ باغبان پورہ کی مسجد کے صحن میں آخری آرام گاہ پائی۔ آپ شاعر بھی تھے اور یہ رباعی آپ سے یادگار ہے ؎

دمبدم دست و رو چہ می شوئی   آبِ جوئی و آب می جوئی
نقشِ اللہ از رخت پیداست   تو چہ در بند ذکرِ یاہوئی

● ۔۔ (ہر گھڑی ہاتھ اور مُنہ کیا دھوتا ہے۔ نہر بہتے ہوئے پانی کا متلاشی ہے تیرے چہرے سے نقشِ اللہ ہویدا ہے، اِس لئے "یاہو" کے ذکر کی کیا ضرورت ہے؟)

● **ترش ریشی** :۔ ابتداء میں غیر مسلم تھے۔ حضرت شیخ نورالدین ولی قدس سرہ کے اشارۂ غیبی سے حضرت شیخ داؤد "بٹہ مول"ؒ کے دستِ حق پرست پر خلعتِ اسلام سے مشرّف ہوئے تھے۔ بالآخر ریاضاتِ شاقّہ کی بدولت ولیٔ کامل ہو گئے تھے محلہ وانٹہ پورہ میں مدفن پایا۔ آپ کے دیگر مشخصات پردۂ خفا میں ہیں۔

● **مُمہ بٹ** :۔ حضرت شیخ داؤد ریشی بٹہ مالوؒ کے فرزندِ ارجمند تھے۔ روحانیت کی تحصیل والدِ بزرگوار سے کی تھی۔ موضع پانپور میں کاشتکاری کیا کرتے تھے۔ بالآخر ریاضات کے ذریعہ صاحبِ کشف و کرامات ہو گئے تھے۔ انتقال پر والدِ بزرگوار کے مزار میں دائمی آرام گاہ پائی۔ ● ۔۔ (تحائف الابرار فی ذکر الاولیا الاخیار صفحہ ۲۹)

● **عاشور بیگ** :۔ آپ کا تعلق بھی حضرت بٹہ مالوؒ کے مریدانِ باصفا میں تھا۔ خطِ ارشاد (دوسروں کی تربیت و ہدایت کا اجازت نامہ) حضرت بٹہ مالو صاحبؒ کے

خلیفۂ خاص حضرت نور محمد پروانہؒ سے حاصل کیا تھا۔ نور محمد پروانہؒ کے دیگر مریدین ریشی عبدالشکورؒ، ریشی عبدالرحیم دری بلی، ریشی نجم الدین المعروف بہ نجی بھائی اور ریشی محمد صادق تھے۔ یہ چاروں کے چاروں بزرگ صاحبانِ دل اور روشن ضمیر تھے۔ تمام عمر طالبین کے اِفادہ اور تربیت میں بسر کردی۔

• ـــ (تحائف الابرار فی ذکر الاولیا ء الاخیار صـ۲۴۱)

آستانِ بٹہ مالو صاحب امیرا کدل، سرینگر، کشمیر سے بطرف جنوب دو کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔ دیگر آستانوں کی طرح یہ آستان یک منزلہ ہے۔ اس کی چھت جو کشمیری عرف عام میں "بام" کہلاتی ہے، چینی بودھ وہاروں کے طرز پر مخروطی اور پلیٹ دار ہے۔ یہ طرزِ تعمیر کشمیر کا خالص اپنا ہے اور اس وقت سے مروّج ہے جب کشمیر پر راجگانِ کشمیر کی حکومت تھی اور مذہباً اُن کا تعلق بُدھ مت سے تھا۔ آستان کا مینار عمودی ہے اور خالص چوبی ہے جس کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی گیلریاں ہیں۔ مینار کی بلندی اندازاً ایک سو فٹ ہے۔ آستان کی چار دیواری کے عین وسط میں کسی قدر بطرف مغرب فرش سے ایک گز بلند حضرت ریشی داؤد ریشی بٹہ مولؒ کی ضریحِ مبارک ہے۔ یہ ضریح سبز چادر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ آستان کا دروازہ منقّش لکڑی کا ہے جس پر یہ تاریخی قطعہ منظوم ہے ؎

سالِ تاریخِ دفاتش ہاتفی داد الہامی مرا از بہرِ آن
ریشیِ مومن باسرِ اخلاص گفت "بٹہ مالو کردہ ماوادر جنان"
۱۰۶۹ھ

• ـــ (فرشتۂ غیبی ہاتف نے آپ کی تاریخِ وفات مجھے الہام کی۔ اس نے یعنی ہاتفی نے از روئے خلوص "بٹہ مالو کردہ ماوادر جنان"۔ ' بٹہ مالو نے جنّت میں ٹھکانہ بنالیا'۔ کہا ہے۔)

آستانِ بٹہ مالو کی موجودہ تعمیر کم و بیش ایک سو برس پُرانی ہے۔ یہ ایک مخیّر شخص جو حضرت ریشیؒ کا محب و معتقد تھا، کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کا نام عمر خان تھا۔ یہ شخص آستان کے

احاطہ میں مدفون ہے۔ قبر پر کتبہ نہ ہونے کے سبب خیال ہے کہ یہ شخص اندازاً ۷۵ برس پہلے کشمیر میں ہوا ہے۔

پچاس فٹ کے فاصلے پر بطرف مغرب خانقاہ بٹہ مول کا لنگر خانہ ہے۔ کسی وقت یہ جگہ محتاجوں کے لئے بطور لنگر خانہ استعمال ہوتی تھی، مگر اِس وقت یہاں اس قسم کی کوئی بات نظر نہیں آتی ہے۔ البتہ بحیثیت تاریخی عمارت کے اس کی اہمیت ضرور ہے۔ خیال ہے کہ یہ لنگر خانہ خود حضرت بٹہ مالو صاحب کے عہد کا ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ حقیقتِ حال زیادہ جانتا ہے۔

آستانۂ بٹہ مالو چرار شریف میں آستان حضرت شیخ نورالدین نورانی علیہ الرحمۃ کے نمونہ پر اینٹوں اور لکڑی سے اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ ایک ردّا اینٹوں کا اور اُن کے اوپر ایک ردّا دو فٹ لمبی لکڑی کا ہے۔ کشمیر میں یہ طرزِ تعمیر قبل از اسلام رائج تھا۔ اب کشمیر میں چند ہی آستانے اس نمونے کے رہ گئے ہیں۔[1]

۱۸۹۰ء کے گیزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ (GAZETTEER OF KASHMIR & LADAKH) کے مطابق بٹہ مالو سرینگر، کشمیر کا ایک مضافاتی گاؤں تھا اور اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ شمال مغرب کی جانب ایک وسیع رقبہ تھا جہاں مہاراجگانِ ریاست جموں وکشمیر کے سپاہیوں کو قواعد سکھائی جاتی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں دودھ گنگا پر جس کے متصل بٹہ مالو کا آستانہ ہے، ایک پُل تھا۔



---

[1] مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "کاشر انسائیکلوپیڈیا" جلد۔۱ مطبوعہ جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی

پروفیسر مولوی محمد ابراہیم

حضرت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ

حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خواجہ ابراہیم گانی کے فرزند تھے۔ آپ کے خاندان کا شمار سرزمینِ کشمیر کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ خواجہ حبیب اللہ عطار قدس سرہٗ کے والدِ بزرگوار آپ کی صغر سنی ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ اس لئے علوم ظاہریہ سے مستفید نہ ہو سکے تھے۔ ابتدا میں حضرت خواجہ یعقوب دار سے ارادت تھی اور ان کے بعد شاہ قاسم حقانی کے، جب وہ سفرِ حج سے کشمیر لوٹے تھے، مرید ہو گئے تھے۔ خواجہ یعقوب دار ملک ریگی دار کی اولاد سے تھے۔ شاہ قاسم حقانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ وقت کے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ بالآخر اپنے خادم کے ساتھ ۱۱ صفر ۱۰۳۰ھ میں وفات پا کر محلہ سازہ گری پورہ میں محوِ آرام ہوئے۔ کسی نے بطور تعمیہ آپ کی تاریخ وفات میں کہا ہے۔

بلبلِ دل ز باغ سر زدہ گفت   "ہادیٔ دہر خواجہ یعقوب"[۱]

۱؎ بحساب حروف جمل "ہادیٔ دہر خواجہ یعقوب" کے اعداد ۱۰۳۲ ہوتے ہیں اور جب ان سے لفظ "باغ" کی "ب" کے دو عدد منہا کر دئے جائیں تو ۱۰۳۰ کا عدد باقی رہتا ہے اور یہی عدد بلحاظ سنہ ہجری آپ کا سال وفات ہے۔

(دل کی بلبل نے باغ کا سر یعنی "ب" کا شکر "ہادیٔ دہر خواجہ یعقوب" کہا) ۔۔۔

خواجہ حبیب اللہ خواجہ یعقوب دار کے بیس برس یا اُس سے قبل کی عمر میں مرید ہوئے تھے۔ روایت ہے کہ خواجہ حبیب اللہ عطار بیس برس کی عمر میں چیچک کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ خواجہ یعقوب دار نے جب مرید کی اس بیماری کو دیکھا، تو جذبہ سے اسے خود میں کھینچ لیا جس کے باعث آپ کا تمام جسم نیلا پڑ گیا۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ میرا وقت پہنچ چکا ہے، کون ہے جو میری ہمراہی کریگا۔ ایک خادم بولا کہ میں، چنانچہ مرید اور مرشد دونوں بیک وقت فوت ہو کر ایک ہی قبر میں دو لحدوں کے درمیان دفن ہوئے۔

خواجہ یعقوب دار کی وفات کے بعد شاہ قاسم حقانی نے خواجہ حبیب اللہ عطار کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا، اور جب شاہ صاحب کا وقت اخیر پہنچا، تو فرمایا میں جو کچھ بھی رکھتا ہوں اُس کے تین حصے کرتا ہوں۔ دو حصے خواجہ حبیب اللہ عطار کو اور ایک حصہ اپنے فرزند شاہ قطب الدین کو دیتا ہوں۔ اس وصیت کے ساتھ شاہ قاسم حقانی ۲۹، ماہ ربیع الثانی ۱۰۳۴ھ (پیر ۹، فروری ۱۶۲۴ء) میں وفات پا کر محلہ علاؤ الدین پورہ (ملک انگن) میں سپرد خاک ہوئے۔

درحقیقت خواجہ حبیب اللہ عطار دو نسبتی بزرگ تھے۔ ایک جانب حضرت خواجہ یعقوب دار علیہ الرحمۃ سے اعتقاد تھا اور دوسری جانب شاہ قاسم حقانیؒ کے محرم اسرار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ موخر الذکر مرشد کی وفات کے بعد سجادۂ ارشاد پر اُن کی جگہ متمکن ہوئے اور اہل عالم کو راہ ہدایت دکھائی۔

○ — نقل ہے کہ خواجہ حبیب اللہ عطار کا ایک مُرید لاہور گیا ہوا تھا۔ اُسکی والدہ ایک روز آپ کی خدمت میں آکر ملتجی ہوئی کہ وہ بیٹے کے فراق میں سخت مضطرب ہے۔ خواجہ کو عورت کی حالت پر ترس آیا۔ فی الفور مرید کو راتوں رات اپنی سواری کے خاص

گھوڑے پر سوار کر کے، محلہ کی مسجد میں پہنچا دیا۔ ماں بیٹے کی اس قدر جلد واپسی پر خوشی سے پھولے نہ سمائی۔

۔ اسی طرح ایک شخص کی بیٹی لاپتہ تھی۔ وہ جناب خواجہ کی خدمت اقدس میں آکر اسکی واپسی کا طلبگار ہوا۔ فرمایا جا دریا پہ تلاش کر۔ تعمیل ارشاد میں شخص مذکور جب دریا پر گیا، تو بیٹی کو دریا کے کنارے پڑا ہوا پایا۔ جب سبب پوچھا گیا تو بولی مجھے بوڑھی ماں کے دودھ نے پکڑ کر فلاں گھاٹ پر ڈال دیا تھا۔ نقل ہے کہ بابا عبدالنبی جو اُس وقت کے مشایخ اور اہل دل سے تھے، اُن کا طریقہ تھا کہ قطب ربانی محبوب سبحانی میر سید علی ہمدانی قدس سرہ کے یوم وفات کے موقعہ پر مشایخ و علماء کی ضیافت کیا کرتے تھے۔ حسب دستور انہوں نے ماہ ذی الحجہ میں ایک عالیشان ضیافت کا انتظام کیا جس میں علاوہ عمائدین شہر کے حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار بھی مدعو تھے۔ یہ دعوت مفتی شہر محمد سلطان مانجی کو بھی تھی۔ مفتی محمد سلطان مانجی بابا عبدالنبی کا مرید تھا۔ مفتی کے آتے ہی حاضرین مجلس تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ خواجہ حبیب اللہ عطار جو بالعموم مراقبہ اور استغراق میں رہا کرتے تھے تعظیم نہ بجا لا سکے۔ یہ امر مولوی کے دل میں حضرت خواجہ سے بغض و عناد کا باعث ہو گیا۔ اسی دوران کسی مسئلہ پر اہل مجلس کے مابین گفتگو چل پڑی اور جناب خواجہ جو بغور سن رہے تھے، مسئلہ کا جواب باصواب دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ امر مفتی کی آتش غضب بھڑکانے کا باعث بن گیا چنانچہ جھنجھلاہٹ سے بول اٹھا کہ اَن پڑھ آدمی کو کیا حق ہے کہ وہ اہل علم کی مجلس میں کچھ بولے۔ اُس کے لئے سکوت ہی زیبا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس گفتگو سے مفتی محمد سلطان مانجی کا حضرت خواجہ پہ براہ راست حملہ تھا جو یقیناً ایک اُمّی (اَن پڑھ) تھے۔ اُس کے جواب میں حضرت خواجہ یہ کہکر مجلس سے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ یہاں نفاق کی بو آتی ہے۔ یہ کیفیت دیکھکر میزبان اور اہل ضیافت سراسیمہ اور پریشان ہو گئے۔ بڑی منت اور سماجت کے بعد حضرت خواجہ کو اپنی جگہ پر

بٹھایا۔ اسی دوران کسی آدمی نے حضرت خواجہ سے کہا کہ مولوی حاضرین مجلس سے کہہ رہا ہے کہ اس شخص نے چونکہ مجھے منافق کہا ہے اس لئے گواہ رہو کہ کل عدالت میں اس کا وہی انجام ہوگا جو منصور حلاج[۱] کا بغداد میں ہوا تھا۔ حضرت خواجہ نے اس وقت بقول صاحب مثنوی بحر العرفان شیخ مرزا اکمل الدین بیگ خان بدخشی یہ الفاظ کہے تھے۔

چشم دارم کہ ہم درین محفل	قہر حق می شود بروئے نازل
مولوی گر بعلم مغرور است	تا بحق واصل راہ بس دور است
گر منم جانشین درویشان	مولوی مست حوالۂ ایشان

(میں امید رکھتا ہوں کہ اسی محفل میں اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا۔ اگر مولوی علم پر مغرور (گھمنڈی) ہے تو حق تک اس کا راستہ بہت دور ہے یعنی وہاں تک پہنچنے کی امید نہیں ہے۔ اگر میں درویشوں کا خلیفہ ہوں تو یقیناً مولوی ان کی تحویل میں ہے)۔

روایت ہے کہ جب ابھی مفتی اور دیگر اہل مجلس کھانے میں ہی مصروف تھے کہ مولوی زبردست ابکائی (قے) کا شکار ہوگیا اور ساتھ ہی فالج کا شکار ہوگیا۔ اٹھا کر

۱؎ حلاج دھنیا (روئی کا دھنکنے والا) اور لقب حسین بن منصور کا جس نے اَنَا الحق و لیس فی جبتی الا اللہ و انا اغرقت قوم نوح و اہلکت عاد و ثمود (میں حق ہوں اور میری گدڑی میں صرف اللہ ہے اور میں نوح کی قوم کا ڈبونے والا اور عاد اور ثمود کا ہلاک کرنے والا ہوں) کہا تھا اور جس کی پاداش میں قید خانہ اور پھر خلیفہ مقتدر باللہ کے وزیر حامد بن عباس کے حکم سے پہلے ہزار کوڑے مار کر ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور پھر آگ میں جلا کر سر کو بغداد کے پل پر لٹکا دیا گیا تھا۔ منصور کے قتل کا واقعہ ۳۰۹ھ (۹۱۸ء) میں وقوع پذیر ہوا۔ امام ابو حامد غزالی نے منصور حلاج کے مذکورہ قول کو فرط محبت اور عشق حقیقی پر مبنی قرار دیا ہے ---- (۳۱۰)

لوگ گھر لے گئے۔ اطبّا علاج و معالجہ سے قاصر ہو گئے۔ بالآخر کچھ لوگ مفتی کو جناب خواجہ کی خدمت میں لاکر طالب رحم ہوئے۔ خواجہ کو رحم آیا اور خدا سے دعا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی کی زبان جو فالج سے بند ہو گئی تھی، دوبارہ کھل گئی۔ اس دوران مفتی کی زبان سے جو الفاظ نکلے، وہ یہ تھے کہ جو علم میں نے پڑھا ہے، وہ قیمت میں ایک جَو کے برابر بھی نہیں تھا۔ خواجہ نے فرمایا جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ توبہ کیجئے شاید کہ ایمان سلامت رہ سکے۔ توبہ استغفار کے بعد دوبارہ زبان بندی ہو گئی۔ ابھی لوگ راستہ ہی میں تھے کہ مفتی سفر آخرت اختیار کر گیا۔ [illegible] ہوا سے تمام اعضا سرد ہو چکے تھے۔ غسل دیتے وقت لوگوں نے ہر چند چاہا کہ ہاتھ پاؤں کھل جائیں، مگر کھل نہ سکے [1]۔

● ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواجہ حبیب اللہ عطار قُدِّسَ سِرُّہٗ کوہِ ماران پر گوشہ نشین تھے۔ کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر جلوہ گر ہو کر فرمانے لگے اے ہمارے حبیب تیری پسند ہماری پسند ہے، "ہر کہ افتاد قبولِ تو قبولم افتاد"۔

فرمایا کہ اوراد تحیہ کبرویہ کے ورد کے دوران جب میں اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا شَفِیْعَ الْمُذْنِبِیْنَ (اے گناہوں کے سفارش کنندہ آپ پر درود (رحمت) اور سلامتی ہو) پر پہنچا تو دیدار رسول صلعم سے مشرف ہوا۔ فرمایا اے حبیب تیری زبان سے یہ کلمہ مجھے بہت پسند ہے۔ تب سے یہ کلمہ علی الدوام (ہمیشہ) تین بار تکرار کرتا ہوں (دہراتا ہوں)۔

● ۔ ایک روز کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آیا مُلّا شاہ [2] بڑے تھے یا مُلّا طیّب؟

---

[1] صوفیہ اور علمائے ظاہر کی ایک دوسرے سے ٹھنی رہتی ہے۔ چنانچہ مفتی محمد سلطان اور خواجہ حبیب اللہ عطار کا یہ واقعہ اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے۔ [2] نام ملا شاہ محمد یا محمد شاہ تھا۔ ملا عبد احمد قاضی ارک بدخشاں کے فرزند تھے ۱۰۲۳ھ میں کابل کے راستے لاہور آئے اور حضرت میاں میر کے مرید ہوئے۔ مرشد کی وفات کے بعد مستقل طور سے کشمیر میں رہنے لگے تھے۔ یہ سکونت کوہ ماران کی جنوبی ڈھلوان پر تھی۔ ۱۰۷۲ھ میں فوت ہو گئے۔ "وا ملا شاہ وحید جان" تاریخ وفات ہے۔

یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب مُلا شاہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ حضرت خواجہ اس سوال سے ناخوش ہوئے۔ فرمایا! "میں کیا جانوں، اُن سے جا کر پوچھو"۔ یہ مرد گھر پہنچتے ہی انتقال کر گیا۔

● ۔ ایک دن شوگم بابا پانپوری نے خواجہ حبیب اللہ عطار کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ حضرت شاہ قاسم حقانیؒ ایک باکمال اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ افسوس ہے کہ آپ اُن کی صحبت سے بہت کم مستفید ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ شاہ قاسم حقانی ۲۹ ربیع الثانی ۱۰۲۳ھ میں فوت ہو چکے تھے، جبکہ آپ کے مرشد اوّل خواجہ یعقوب دار ۱۰۰۳ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے تھے اور اسطرح خواجہ حبیب اللہ عطار شاہ قاسم حقانی کی خدمت میں جو آپ کے دوسرے مرشد تھے صرف تین سال کا عرصہ پا چکے تھے۔ بہر کیف یہ سنکر حضرت خواجہ بولے۔ "تم لوگ نہیں جانتے کہ جب ایک شمع دوسری شمع سے ملتی ہے، تو فوراً روشن ہو جاتی ہے اور یہی کیفیت میری ہے۔"

● اکثر مریض آپ کی خدمت میں آکر طالب شفا ہوا کرتے تھے۔ آپ ان کا علاج مخالف اشیا سے کیا کرتے تھے۔ ایک روز ایک شخص خواجہ کی خدمت میں آکر بولا یا حضرت میری نبض دیکھیے۔ جھنجھلاہٹ سے کہا میں طبیب نہیں ہوں۔ بیمار کو یہاں سے لے جاؤ۔ مریض شکستہ خاطر گھر لوٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد حاضرین سے دریافت کیا کہ یہ بیمار کس محلہ کا رہنے والا تھا۔ کہتے ہیں کہ مریض ابھی راہ ہی میں تھا کہ دم توڑ گیا۔ جب آپ کو اطلاع ملی تو فرمایا کہ میں اس کے ماتھے سے سمجھ گیا تھا کہ موت اس کے تعاقب میں ہے۔ میں گھبرایا کہ کہیں یہیں دم نہ توڑ دے۔ اس لئے خود سے دور کرنے کا حکم دیدیا۔

● ۔ خواجہ عبدالرحیم گانی آپ کا ہم قبیلہ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کا پڑوسی بھی تھا۔ اس کا شاداب سائے گھیرے ہوتا تھا۔ خواجہ عبدالرحیم گانی نے عام شاہراہ کا ایک بڑا حصہ مکان

کے گھر میں داخل کر سکے، پھر ایک عام شاہ راہ پر نصب کر دیا تھا۔ جناب خواجہ اس حرکت سے مانع ہوئے اور دلیل شرعی سے بھی اس کے فعل کو نادرست قرار دیا، مگر خواجہ عبدالرحیم نے من مانی کرتے ہوئے آپ کی ایک نہ سنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دروازہ ایک رات ناپید ہوگیا۔ اور باوجود تلاش بسیار کے بھی ہاتھ نہ آسکا۔

٭

شیخ عبدالرحیم صوفی حضرت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کا مرید باصفا تھا۔ تمام عمر اس نے خواجہ کی خدمت کی تھی۔ جس وقت شاہ جہاں بادشاہ وارد کشمیر ہوا اس وقت ایک آدمی نے جعفر خان کے محل خاص کی تعریف و توصیف کچھ اس انداز میں کی کہ بادشاہ کے دل میں اس کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ مگر تعریف کنندہ شخص کو اسی وقت عارضہ جگر پیش آگیا۔ بڑا مضطرب ہوا۔ خواجہ عبدالرحیم گانی جو روسائے شہر تھے بولے کہ حضرت خواجہ کے جاہ و جلال کے پیش نظر انہیں یہاں آنے کی تکلیف نہیں دی جاسکتی۔ چنانچہ شخص مذکور جو نہی خواجہ کے روبرو آیا اور ان کی نظر اس پر پڑی، فوراً بھلا چنگا ہوگیا۔

٭

خواجہ حسین آپ کے معتقدین سے تھا۔ ایک موقع پر اہل خانہ سے پوچھا کہ سالن کیا ہے۔ وہ بولے مچھلی۔ یہ سنتے ہی حالت غیر ہوگئی، گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور بارہ مسجد (قدیم بارہ مر) کی راہ پر جو اہل کشمیر کے مقابر کے متصل ہے، بیٹھ گئے۔ جس آدمی پر بھی نظر ڈالتے، وہ بے ہوش اور وارفتہ ہو جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ راہ عبور و مرور مسدود ہوگئی۔ یہ کیفیت جب خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کے گوش گزار ہوئی تو فرمایا اُسے زنجیر کر کے یہاں لے آؤ۔ بعد ازاں مسجد کے حجرہ میں قید کر دیا۔ پھر قوال بلوا کر گانے کا حکم دیا جس سے خواجہ حسین پورے چالیس دنوں تک کیفیت وجد و حال میں تھے۔ خواجہ نے انگشت مبارک آنکھوں پہ پھیر دی جس سے خواجہ حسین باہوش ہوگئے۔ بعد ازاں خواجہ نے انہیں اپنے باغ کی نگرانی پر بھیج دیا۔

یہ باغ موضع دردہ پورہ میں تھا۔ پھر سیر و سیاحت کا حکم دیا۔ جس سے مزاج اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

•۔ آپ کے مرید خواجہ یوسف کا بیان ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب جب وارد کشمیر ہوا، تو بعض فقرا، کی خود زیارت کی اور بعض کو روبرو طلب کیا۔ آنجناب (خواجہ حبیب اللہ عطارؒ) کو بھی پیغام بھیجا کہ یہاں آئیں یا مجھے حکم دیجیئے کہ میں آؤں۔ خواجہ بولے شہنشاہ کی آمد خالی از شہرت نہیں ہے اور شہرت آفت ہے اور اس فرمان کی رو سے بھی کہ بئسَ الفَقِیرُ عَلٰی بابِ الاَمِیرِ (امیر کے دروازہ پر فقیر کی موجودگی بری ہے) بادشاہ کے پاس جانے سے انکاری ہوگئے۔ بالآخر خواجہ عبدالرحیم گانی کے اصرار پر آپ بادشاہ کے حضور جانے پر راضی ہوگئے۔ اُدھر انہی خواجہ عبدالرحیم نے خواجہ یوسف کو اس بات پر رضامند کیا کہ ایک روز وہ حضرت خواجہ کو جھیل ڈل کی سیر پر ہمراہ لے جائیں اور نماز عصر اُس چبوترے پر ادا کریں۔ جو شاہی چنار کے نام سے مشہور ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خواجہ عبدالرحیم بادشاہ کے حضور آ کر بولے کہ فلاں روز ... نماز عصر شاہی چنار میں ادا کریں گے۔ بادشاہ نے بموجب اس مقولے کہ نِعمَ الاَمِیرُ عَلٰی بَابِ الفَقِیرِ (امیر فقیر کے دروازہ پر اچھا لگتا ہے) نماز عصر آپ کے ساتھ پڑھی پھر مجلس طویل ہوگئی۔ بادشاہ نے پوچھا نمازیں کتنی ادا کرتے ہو؟ فرمایا پینتیس (۳۵) رکعات۔ بادشاہ بولے میرا سوال نوافل کے بارے میں ہے۔ فرمایا میرے اور میرے معشوق کے مابین ایک معاہدہ ہے اس لئے نہیں چاہتا کہ کوئی اس پر واقف ہو۔ پھر پوچھا نیند کتنی کرتے ہو۔ فرمایا عشاء کے بعد سوتا ہوں اور جب اٹھاتا ہے اُٹھتا ہوں۔ پوچھا کیا کھاتے ہو۔ فرمایا جو مل جائے۔ پھر کہا بیت المال سے کچھ قبول کیجیئے؟ کہا کہ آنحضرتؐ کو انسان اور فرشتے کے مابین اختیار دیا گیا تھا۔ اس پر آپ نے کہا تھا کہ اگر انسان بنوں گا تو جو چیز میسر دستیاب ہوگی اس پر صابر و شاکر ہونگا اور فرشتہ ہونے پر دونوں فضیلتوں سے محروم رہوں گا۔ لہذا

متابعتِ رسولؐ ضروری ہے۔ بادشاہ سونے چاندی کا ہدیہ لایا۔ خواجہ بولے میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔ نا ہی اپنی ذات کو اتنا با امانت پاتا ہوں کہ دوسروں پر خرچ کروں۔ اخیر پر شہنشاہ نے دست جاہی فرمایا کہ الطاف کریمیہ اللہ مفسدوں کو پسند کرتا ہے۔

بعد ازاں اورنگ زیب نے سیف خان کو حکم دیا کہ یہ سونا خواجہ یوسف کو دیدے۔ وہ بولے جو چیز میرے پیرو مرشد نے نہیں لی اسکی قبولیت مجھ پر حرام ہے۔ سیف خاں خواجہ حبیب اللہ عطار سے مخاطب ہو کر بولا کہ خادم کو حکم دیجئے کہ وہ یہ سونا قبول کرے۔ اس پر خواجہ غصے سے بولے جو چیز مجھے منظور نہیں وہ خادم لیکر کیا کرلیگا۔ سیف خاں بادشاہ کی کشتی میں آیا اور کہنے لگا یہ شخص دیوانہ ہے جو سلطانی تحفے سے منکر ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا جو شخص خانماں سے گزر چکا ہو اُسے میری اور تیری کیا پرواہ ہوگی۔



● ـ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ کشمیر میں قحط کے دوران میں ایک روز نوشہرہ کو بغرض سیر جارہا تھا کہ راستے میں ایک نانبائی کی دکان پر آرام کیا۔ جب ہوش آیا تو جو روٹی بغل میں تھی وہ گر پڑی اور ایک کتا بطور پاسبان دوسرے کتے کو روک رہا تھا۔ میں نے روٹی سے کچھ تناول کیا اور کچھ کتے کو ڈال دی۔ اسی اثنا میں ایک سیاح آگیا جس کے ہمراہ ایک بے ریش تھا۔ سیاح پوچھنے لگا کشمیر میں حبیب اللہ نامی کوئی درویش ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ اِن دنوں خواجہ حبیب اللہ نوشہری بقید حیات تھے۔ اثنائے راہ میں سیاح پوچھنے لگا کہ حبیب اللہ اَن پڑھ ہے یا عالم؟ میں نے کہا عالم ہے۔ پھر پوچھا یتیم ہے یا والدین زندہ ہیں۔ میں نے کہا والدین والا ہے۔ وہ بولا یہ شخص میرا مقصود نہیں ہے۔ پھر پوچھا تیرا نام کیا ہے۔ میں نے کہا حبیب۔ کہا والدین کو جانتے ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ پوچھا کچھ پڑھا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ سیاح ایک چیخ کے ساتھ اچھلا اور زمین سے چند گز اوپر چلا گیا۔ پھر بولا جناب سرورِ عالمؐ نے مجھے مکہ سے تیری تلاش میں روانہ کیا ہے۔ میرا نام شیخ جمال الدین ہے اور یہ میری بیوی

ہے کہ از روئے الفت میں اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ تین روز میں طے مکان کے ذریعہ مکہ معظمہ سے نکلا ہوں۔ سیاح یہ کہکر عازم کوہ ماران ہوا۔ مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ پھر تخت سلیمان (شنکر آچاریہ) کا اشارہ کیا۔ گھاٹ پر پہنچکر کشتی کے کرایہ سے حیران تھا۔ پھر خود ہی بولا مجھے کشتی کی احتیاج نہیں ہے۔ دائیں ہاتھ سے میرا ہاتھ اور بائیں سے عورت کا ہاتھ پکڑا پھر کہا آنکھیں بند کر۔ ہم دونوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک لمحہ کے بعد آنکھیں کھولنے پر ہم تخت سلیمان پر تھے۔ یہاں سے ہر گوٗ بھاگ کی مفصل سیر کے بعد ہم اپنے مکان پر لوٹ گئے میرے پاس صرف ایک چھری تھی۔ چاہا کہ رہن رکھکر آپ کی دعوت کروں۔ شیخ جلال الدین کرامت سے میرا ارادہ بھانپ گیا۔ بولا جا ہر روز بقدر ضرورت خلاف حجرۂ مبیں فلاں دیگ سے چاول نکالتا رہ۔ یہ کھانا اُس وقت تک نکلتا رہے گا۔ جب تک دیگ یعنی ہانڈی کے اندر تیری نظر نہ پڑے گی۔ برسوں اسی طرح دیگچی سے کھانا نکالتا رہا کہ از روئے غلطی دیگچی میں نظر ڈالدی۔ اُس روز سے کھانا نکلنا بند ہو گیا۔ دوسرے دن شیخ کو میں نے طریقہ کبرویہ میں اجازت دیدی اور وہ مع اہلیہ کے مجھ سے رخصت ہو گئے۔

— حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار کے مرید باصفا حضرت مرزا کمال الدین بیگ خان بدخشی کا بیان ہے کہ جناب خواجہ دیدہ مرہ کے گاؤں میں صاحب باغ تھے۔ اس باغ میں ایک غار تھا جہاں ابتدائے سلوک میں گوشہ نشین ہوئے تھے۔ بعد میں آپ کا ایک مرید بھی اس غار میں بیٹھا تھا۔ ایک روز یہ مرید خدمت بابرکت میں آکر عرض پرداز ہوا کہ ایک درویش باغ پر قابض ہو کر اس غار میں رہنے لگا ہے اور چونکہ اکثر لوگ اُسکی طرف متوجہ ہیں، اس لئے درویش کا اخراج ضروری ہے۔ آپنے کہا مرزا محمد کامل سے کہو کہ وہ اس درویش کو یہاں سے نکالدے۔ وہ بولے ظاہری طاقت سے نکالوں یا باطنی قوت سے۔ فرمایا ہمارا کام ظاہر سے نہیں ہے۔ اس پر مرزا کامل نے اپنے مرشد خواجہ حبیب اللہ عطار کے ایما پر بھڑوں کے چھتہ کے ذریعہ خلوتی درویش کو باغ سے نکال باہر کر دیا۔

انہی مرزا اکمل الدین بیگ خاں بدخشی کا بیان ہے کہ ایک دن شاہ جیو کی خدمت گل دمنبو کی کیاری میں پانی دے رہا تھا۔ اس حالت میں دیکھ کر آپ بیحد مسرور ہوئے اور ایک بات زبان پہ لا کر فرمایا سنا۔ میں نے کہا حضور نہیں۔ اس پر منہ پہ ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا اب سنو۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میری قوتِ سامعہ یک لخت بند ہو گئی۔ اندر سے ایک ترنم اٹھنے لگا جسکی کیفیت ناقابلِ فراموش تھی۔ اسی واقعہ کا اظہار مرزا صاحب نے تقیۂ مخبر الاسرار میں اسطرح کیا ہے:

رگ رگم نغمہ سرا گشت چو موسیقار است — تار قانون مرا زخمہ زن است استادم
گوشم آلنوا است نہ بر مدح و نہ بر قدح کسے — ہر کہ ہر چیز بمن گوید ازان آزادم
بلکہ از جملۂ اشیا شنوم آن تسبیح — تو مپندار کہ کرم بس شنوا افتادم
ہست بے حرف کلامیکہ مرا می خوانند — گوشِ حس گوشِ دل آنرا بہ شنیدن دادم
ہست آن نغمہ مرا از ہمہ اعضا بنوا — از تنی گوید و ہر لحظہ کند فریادم
پیش تو غمزدہ خاموشم و اما از درون — شور و غوغا ام و بر گوشِ کسے نفتادم

ترجمہ

(میری رگ رگ موسیقار (باجہ) کی طرح نغمہ سرا ہے گویا میرا استاد ساز پر مضراب مار رہا ہے۔ میرا کان ادھر لگا ہے، کسی کی تعریف اور برائی پر نہیں۔ میں ہر اس چیز سے آزاد ہوں جو کوئی شخص مجھ سے کہے۔ میں تمام اشیاء سے تسبیح سنتا ہوں، یہ مت سمجھو کہ میں بہرا ہوں۔ بلکہ بہت سننے والا واقع ہوا ہوں۔ جس کلام سے وہ مجھے پکارتے ہیں وہ بے حرف ہے، اسکو میں احساس اور دل کے کان سے سنتا ہوں۔ وہ نغمہ میرے ایک ایک عضو میں آواز دے رہا ہے اور ہر گھڑی لوٹنے کی آواز دیتا ہے۔ میں تیرے روبرو غمزدہ اور خاموش ہوں، مگر دل میں وہ شور و غوغا ہے جو کسی کے کان میں نہیں پڑا ہے۔

۵ - نیز مرزا اکمل الدین بیگ خاں بدخشی کا بیان ہے کہ ایک رات میں تہجد کی نماز کے لئے

اٹھکر گھاٹ کی جانب روانہ ہوا۔ دریا کے کنارہ ادبیر' ادبیر کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھا کوئی شخص طالب پیر ہے۔ اُس کے پاس گیا اور کہا کہ کل میرے ساتھ آنا تاکہ تجھے مرشد کے پاس پہنچا دوں۔ یہ سنتے ہی وہ شخص یک لخت غائب ہو گیا۔ دوسرے دن علی الصباح خدمتِ مرشد میں گیا۔ چھوٹتے ہی فرمانے لگے کہ رات ایک جن رو رہا تھا اور اگر حفاظت مرشد نہ ہوتی تو کچھ کا کچھ کر ڈالتا۔ آئندہ جب تک مرغے کی آواز کان میں نہ آئے' تب تک حجرہ سے قدم باہر نہ نکالنا۔

● — مرزا محمد کامل بیگ رقمطراز ہیں کہ حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار نے مجھے فرمایا کہ جو بات خواجہ فریدالدین عطار اور مولوی قدس سرّہ کو دی گئی ہے' وہ مجھے بھی عطا کی گئی ہے۔ دوسرے روز قلمدان' کاغذ اور دوات لانا کہ کچھ لکھدوں اور طالبین مستفید ہوں۔ چنانچہ حسبِ ارشاد قلمدان لیکر حاضر خدمت ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جناب خواجہ مراقبے میں ہیں۔ پھر سر اُٹھا کر فرمایا کہ یہ کام مشقت سے خالی نہیں ہے۔ جو مجھے عطا ہوا ہے' وہ تجھے بخشتا ہوں۔ انشاء اللہ اس کا نتیجہ جلد ہی ظاہر ہوگا' چنانچہ ایسا ہی ہوا' اور وہ یوں کہ خواجہ کی وفات کے بعد جب میں ایک موضع میں وارد ہوا تو جناب حضرت خواجہ نمودار ہوئے۔ ایک جزو سپید سے ہاتھ میں تھا۔ میں نے پوچھا حضور یہ کیا ہے؟ کہنے لگے تیری کتاب بحرالعرفان ہے۔ یہ کہکر پانچ مصرعے پڑھے: حمد للّٰہ حامد محمود قوت و فعل خویش را معبود

از جمال و جلال خود مشحون کرد چون را پدید خود بیچون جلوہ گر ذاتش از صفات آمد

(حامد اور محمود خدا کی تعریف جو اپنی قوت اور فعل کے باعث قابلِ عبادت ہے۔ حسن اور قہر سے بھرپور ہے' اُس نے مثل کو پیدا کیا' مگر خود بے مثل ہے۔ اس کی ذات صفات سے روشن ہے)۔

یہ پانچ مصرعے ذہن میں تھے کہ چھٹا مصرعہ یوں القا ہوا: این صفات دلیلِ ذات آمد (یہ صفات دلیلِ ذات (اللہ تعالیٰ) ہیں۔ بعد میں حضرت خواجہ کے فیضان سے اسی ہزار

ابیات منظوم ہوگئے۔ حق یہ ہے کہ مثنوی بحرالعرفان انوارِ شریعت، اسرارِ حقیقت اور انوارِ طریقت میں بے مثال ہے۔ ملا عبدالوہاب نوری گنائی نے "عین العرفان" میں اس مثنوی کی یوں تعریف کی ہے:

مرشد من کہ یافت فصلِ خطاب	کرد تصنیف چار جلد کتاب
بحرِ عرفان نہاد آن را نام	فیض بخش ہمہ چہ خاص چہ عام
عاقلان را ازو ست عیش و طرب	ہزل و تعظیم و اکتساب و ادب
عاشقان را ازو فنائے وجود	عارفان را حضور بزمِ شہود

ترجمہ

(میرے مرشد جنہوں نے حق کو باطل سے جدا کرنے کا لقب پایا ہے، انہوں نے چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس کا نام بحرِ عرفان رکھا ہے۔ جو خاص و عام کیلئے فیض بخش ہے۔ عقلا، اُس سے عیش و طرب، ٹھٹھا، تعظیم اور ادب حاصل کرتے ہیں، جبکہ عشاق کو وجود کی فنا اور عرفا، کو محفلِ مشاہدہ میں حضور ہوتا ہے)

یہ امر کہ بحرالعرفان کس کی ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا کہ جناب مرزا اکمل الدین بیگ خاں کے ایک مُرید نے، ایک رات خانقاہ معلیٰ میں بحالت خواب دیکھا کہ اُس کے اوپر بحرالعرفان کی ایک جلد ہے کہ ناگاہ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ اور مولانا جلال الدین رونما ہوئے۔ پوچھا یہ کیا کتاب ہے؟ میں نے عرض کیا میرے مرشد کی کتاب بحرالعرفان ہے۔ دونوں نے کہا یہ کتاب ہم نے اُسکو دی ہے۔

٭

٭ــ خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کے مرید تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک روز جناب خواجہ نے مجھے یَا وَاحِدُ کا وِرد فرمایا اور کہا کہ آج خلوت میں بیٹھو۔ میں نے کہا کہاں بیٹھوں؟ فرمایا زینہ کدل کے پل پر۔ رات کو کیا دیکھتا ہوں کہ انواع و اقسام کے حیوانات مثلاً گیدڑ، بندر،

سوٗر، چیتا، کتا، بلی اور چوہا پیش نظر ہیں۔ کبھی کبھار کوئی انسان صورت بھی نظر آتی تھی۔ دوسرے روز جناب خواجہ کی خدمت اقدس میں ماجرا بیان کیا۔ فرمایا روز قیامت مخلوق کا حشر انہیں صورتوں میں ہوگا۔ جسکی جو صفت ہے یعنی شہوانی، غضبانی، درندگی، اور ملکی، وہ اسی میں محشور ہوگا۔

● حضرت خواجہ کی وفات حسرت آیات

فتحات کبرویہ کے مؤلف ملا عبدالوہاب لوری گنائی کی دادی حضرت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کی منکوحہ تھیں۔ اُن کا بیان ہے کہ میاں خواجہ کی آخری بیماری میں اپنے حجرہ میں بیٹھی تھی کہ اچانک خوشبو نمودار ہوئی اور پھر خوبرو جوان فوج در فوج حاضر ہوکر خواجہ کو تعظیم بجالاکر دوبارہ غائب ہوگئے۔ آپ کی زوجہ کا بیان ہے کہ میں نے پوچھا یہ کون لوگ تھے؟ فرمایا میرے مقبول سالک جو میرے استقبال کے لئے آئے تھے۔ یہ کہا اور واصل بحق ہوگئے۔ حضرت خواجہ کا سانحۂ وفات ۲ رجب المرجب ۱۰۸۰ھ (منگل ۲۶ نومبر ۱۶۶۹ء) میں پیش آیا۔ بوقت وفات آپ ستر برس کے تھے۔ محلہ قطب الدین پورہ میں آپ کا مزار محل زیارت خاص و عام ہے۔

نقل ہے کہ جب حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار گنائی رحمۃ اللہ علیہ کا وقت اخیر آپہنچا تو اُن کے مرید صادق مرزا اکمل الدین بیگ خان بدخشی نے اُن سے پوچھا تھا کہ وہ حضرت کے بعد کس کے پاس جائیں گے۔ اس پر خواجہ غصہ سے بولے تھے کہ محمد کامل خان تو میرا تمام سرمایہ لے جاچکا ہے، اس سے آگے کیا چاہتا ہے۔ یہ بات تجھے مشائخ شہر سے بخوبی معلوم ہو جائے گی۔



محمد طیب کاملی

حضرت شیخ اکمل الدین کامل بیگ خان بدخشی رحمۃ اللہ علیہ

آنجناب ارض کشمیر کے مایہ ناز سپوت اور وادی گلپوش کے اکابر صوفیائے کرام میں ممتاز صوفی بزرگ ہیں۔ اسکے علاوہ موصوف ایک ممتاز ادیب، عالم، شریعت و طریقت کے رموز شناس اور بلند مرتبہ فصیح بلیغ شاعر ہیں۔ آپکے آبا کرام کا اصلی وطن مألوف تاشقند ہے۔ وہاں سے وہ بدخشاں اور بدخشاں سے برصغیر ہند میں اکبر جلال الدین کے زمانہ میں تشریف لائے ہیں۔ آپ کے جد بزرگوار ملک محمد بیگخاں شاہ جہاں کے وقت میں کشمیر کے دیوان (میر منشی، CHIEF SECRETARY) تھے۔ ان کے فرزند ملک عادل خان کشمیر میں مستقل سکونت پذیر ہوئے۔ حضرت شیخ عبدالوہاب نوری رح حضرت میرزا سے فیض یافتہ ان کے ہمعصر بزرگ سے آپ اپنی مشہور تاریخی تصنیف الفتحات الکبرویہ[1] میں تحریر فرماتے ہیں:۔

[1] فتحات کبرویہ حضرت شیخ عبدالوہاب نوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ یہ مشائخ کبرویہ اور حضرات ریشیہ کا مستند تذکرہ ہے۔ اسی میں حضرت شیخ اکمل کے حالات تفصیلاً درج ہیں۔

"شیخ اکمل الدین محمد کامل البدخشی جداعلیٰ، ایشاں ملک محمد خان از تاشکند
ہجرت نمودہ در بدخشاں متوطن گشت۔ وسبب لقب بدخشی ایشاں ہانست۔
پس ہندوستان آمدہ۔ در عہد سلطان اکبر جلال الدین دیوان صوبہ کشمیر شدہ
بود۔ بنابران دراںجا وفات یافت۔ واولادو احفاد ایشان درمیان خطہ
سکونت گرفتہ" (قلمی نسخہ صفحہ ۲۹)۔

●۔ (شیخ اکمل الدین کے جداعلیٰ ملک محمد خان تاشقند سے، ہجرت کرکے
بدخشان تشریف لائے موصوف کے نام کے ساتھ بدخشی کا لفظ اسی وجہ سے
ملا ہوا ہے۔ وہاں سے موصوف ہندوستان تشریف لائے سلطان جلال الدین
اکبر کے عہد حکومت میں ملک محمد خان صوبہ کشمیر کے دیوان (میر منشی،
CHIEF SECRETARY) مقرر ہوئے۔ وہ ہندوستان میں ہی وفات
پائے اور آپکے اولادو احفاد وہاں ہی سکونت پذیر ہوئے)۔

صاحب تحایف الابرار مورخ الحاجی محی الدین المتخلص بہ مسکین یوں لکھتے ہیں:

"شیخ مرزا اکمل الدین کامل بیگخان بدخشی فرزندار جمند میرزا عادل خان ابن
میرزا ملک محمد خان بدخشی است وایں ملک محمد از اولادان سلطان
خواجہ احمد یسوی علوی ترکستانی بود قدس اللہ سرہ واز تاشکند، ہجرت کردہ
در شہر بدخشان نزول نمودہ است و در زمان اکبر جلال الدین پادشاہ
در ہند آمدہ ملازم حضور شد و بمدتی دیوان صوبہ کشمیر بود فرزندش میرزا
عادل خان بکشمیر آمدہ توطن فرمود و فرزند دلبند سعادت ہو پیوندش
حضرت میرزا اکمل الدین در حالت طفولیت بنظر فیض اثر از حضرت
خواجہ حبیب اللہ عطار قدس سرہ فائز گشتہ"

●۔ (تحائف الابرار صفحہ ۲۲۲ - ۲۲۳)

●۔ (حضرت شیخ اکمل الدین کامل بیگخان بدخشی قدس سرہ حضرت مرزا عادل خان
کے فرزند وہ میرزا ملک محمد خان کے فرزند ہیں۔ ملک محمد خان حضرت

سلطان خواجہ احمد لیسوی علوی ترکستانی کی اولاد سے ہیں۔ موصوف نے تاشقند سے ہجرت کرکے شہر بدخشان میں سکونت اختیار کی تھی۔ سلطان اکبر جلال الدین کے زمانہ میں آپ کے جد بزرگوار ہندوستان تشریف لائے اور سرکاری ملازمت اختیار کی۔ آپ کے یعنی ملک محمد خان کے فرزند عادل خان کشمیر تشریف لائے اور یہاں ہی سکونت اختیار کی اور یہیں اپنا وطن بنایا۔ ان کے فرزند ارجمند حضرت شیخ اکمل الدین کامل بیگخان بدخشی بچپن میں حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار رحمۃ اللہ علیہ کی نظر کیمیا اثر سے فیضیاب ہوئے)۔

کشمیر کی مشہور تاریخ، تاریخ حسن (جلد سوئم) الموسوم بہ تذکرۃ الاولیا صفحہ ۲۰۲، ۲۰۳ میں اسی طرح یہ عبارت تقریباً درج ہے۔ غرض آپ اصلاً تاشقند کے رہنے والے تھے پھر آپ کے آباؤ اجداد نے وہاں سے بدخشاں ہجرت کی تھی، پھر بدخشاں سے اکبر جلال الدین کے زمانہ میں آپ کے جد بزرگوار ہندوستان تشریف لائے اور وہاں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہوئے یعنی ریاست جموں و کشمیر کے میر منشی کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ پھر آپ کے بیٹے جناب عادل خان کشمیر تشریف لائے اور یہاں مستقل طور سکونت اختیار کی۔ صاحب فتحات الکبرویہ نے آگے لکھا ہے کہ مرزا عادل خان کو ایک فرزند ارجمند قدرت کی طرف سے عطا ہوا اس وقت ہندوستان کے تخت شاہی پر سلطان شہاب الدین شاہ جہاں براجمان تھا۔ مرزا عادل خان کو بادشاہ کے ساتھ اپنے باپ کے اثر ورسوخ کے علاوہ اپنے والد نسبتی کے ذریعہ شاہی خاندان کے ساتھ رسائی تھی۔ موصوف کے والد نسبتی شاہ جہاں کے خاص درباری تھے۔ انکی وساطت سے میرزا عادل خان کے فرزند نہایت معصومیت میں شاہ جہاں کے دربار میں پہنچے۔ شاہ جہاں اپنے وقت کا سخن سنج، سخن شناس تھا اور فارسی زبان کا تجربہ کار ادیب بھی۔ اسکے علاوہ علما، اور صلحار کا بڑا دلدادہ تھا۔ شاہ جہاں نے اس معصوم بچے کا نام مرزا عادل خان خود تجویز کیا۔ اس نے موصوف کا نام کامل رکھا۔ یہی نام ان کے والد نے آپ کے لئے قبول کیا۔ اور یہی آپ کا نام رکھا گیا۔ آگے چل کر زمانہ نے قدرت کا کرشمہ دیکھا کہ موصوف اسی نام پر پورا پورا اُتر کر اور آگے بڑھے، کامل سے اکمل کا نام پایا۔ یہ

٭ آپ کا سال ولادت ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء ہے۔

نام یا لقب ایسی برگزیدہ ہستی سے پایا جس کی زبان اللہ کی زبان تھی۔ ولی کامل کی زبان اصلاً زبان خدا ہوتی ہے جیسا کہ عارف رومی فرماتے ہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اپنے نام اور لقب کے بارے میں مجز الاسرار میں خود فرماتے ہیں ؎

کامل ام شاہ جہاں نام نہادہ آنروز

کا اندریں دار فنا کرد خدا میلادم

اکمل الدین لقبم کرد زاحسان مرشد

زانکہ بسیار خاک درِ او افتادہ ام

● ۔ (میری ولادت کے دنوں میں شاہ جہاں نے میرا نام "کامل" رکھا اور اکمل الدین میرا لقب ہے۔ یہ ایک عطائی نام ہے جو مجھے اپنے مرشد کامل نے عنایت فرمایا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ میں اکثر زمانہ میں ان کی صحبتِ بابرکت سے فیضیاب ہوتا رہا۔ ع[1])

لقب کے بارے میں جملہ مورخوں نے آپ ہی کے کلام سے استدلال کیا ہے بالاتفاق یہی بات کہی ہے کہ آپ سلطان العارفین حضرت شیخ احمد یسوی کے اولاد و احفاد سے ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں ؎

اصل جدم بود بہ ترکستان

خواجہ احمد جدِ جد من دان

● ۔ (میرے اصلی یعنی جد صحیح حضرت خواجہ سلطان احمد یسوی ہیں۔ یہ ترکستان کے باشندے ہیں۔")

بحوالہ نفحات الانس حضرت سلطان خواجہ احمد یسوی علوی ہیں۔ اس لئے حضرت میرزا بھی سادات

ع[1] اگرچہ شعر کے نفس ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا نام اسی دن رکھا گیا ہے جس دن آپ تولد ہوئے لیکن عقلاً یہ بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ نام سات دن کے اندر اندر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ولادت ہی کے دن شاہ جہاں جیسے بادشاہ کے پاس پہنچنا محال نظر آتا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ہوا ہو۔ حضرت کا مقصد آنروز کا مطلب مطلق زمانہ ولادت ہوگا۔ اسلئے ترجمہ اسی طرح کیا گیا۔

علویہ سے ہیں۔ حضرت میرزا کے تعلق سے ہم یہاں حضرت سلطان خواجہ احمد لیسوی کے بارے میں چند سطور عام قارئین کو ان کے ساتھ تعارف کرانے کی غرض سے لکھتے ہیں۔

سلطان خواجہ احمد لیسوی

موصوف سلسلہ صدیقیہ کے مشہور بزرگ، صاحب الواہب الجزیلہ والمقامات الجلیلہ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی المتوفی ۵۳۵ھ کے برگزیدہ خلیفہ ہیں۔ ان کے علاوہ آنجناب کے مشہور ترین خلفا میں خواجہ عبداللہ برقی، خواجہ حسن اندقی اور صمۃ العرفا، جناب حضرت سلطان عبدالخالق غجدوانی رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین ہیں۔ ان بزرگ ترین خلفا میں سے حضرت سلطان خواجہ احمد لیسوی کا مقام زیادہ ارفع تھا کیونکہ حضرت سلطان خواجہ احمد لیسوی اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ یوسف ہمدانیؒ کی وفات کے بعد ہرات سے ترکستان تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت خواجہ یوسف ہمدانی قدس سرہٗ کے جملہ برگزیدہ طالبوں کو حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت تک خواجہ یوسف ہمدانی جملہ خلفا اور طالب خواجہ احمد کی طرف رجوع کرتے تھے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنجناب جملہ خلفا میں برگزیدہ تھے۔ چنانچہ مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

"چوں خواجہ احمد لیسوی عزیمت بسوئے ترکستان کرد جمیع یاران را بمتابعت خواجہ عبدالخالق غجدوانی دلالت کرد و ہمچنین است در رسالہ بعضی از متاخران مشائخ ایں خاندان۔

● ۔ (حضرت سلطان خواجہ احمد لیسوی نے جب ترکستان جانے کا ارادہ کیا انہوں نے اپنے تمام حلقۂ ارادت کو حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی متابعت کرنے کی تلقین کی حضرات نقشبندیہ متاخرین مشائخ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے بعض رسائل میں ایسا ہی درج ہے)

● ۔ (نفحات قلمی نسخہ صفحہ ۳۰۳)

ترکستان میں آپ نے ہدایت و دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہاں آپ کے سلسلہ کا نام سلسلۂ لیسویہ پڑا۔ یہیں حضرت میرزا کے جد بزرگوار ہیں جنکے ساتھ آپ کا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ اہم شوال

کو ہم اپنے خاندان میں ان کا عرسِ مبارک مناتے ہیں۔ اُس دن مخصوص جگہ پر ایک عجیب و غریب مجلسِ ذکر منعقد ہوا کرتی ہے۔ ان کے اذکار و اوراد میں آج بھی اس درجہ اثر اور جاذبیت نظر آتی ہے کہ انسان دیکھکر محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ حضرت خواجۂ ما خواجہ بزرگ بہاؤ الدین مشکلکشای بخاری قدس سرہ کے ترکی مشائخ میں حضرت شیخ قثم ترکی ہیں۔ موصوف حضرت خواجہ یسوی ہی کے طریقۂ سلوک سے تھے۔ اسطرح حضرت خواجہ مشکلکشا کو حضرت شیخ عبدالخالق غجدوانی رح اور حضرت شیخ سلطان خواجہ احمد یسوی دونوں کے فیوضات نصیب ہوئے۔ لہٰذا حضرت خواجہ قدس سرہ کی ذات بابرکت مجمع البحرین ہوئی۔ اسطرح حضرت شیخ اکمل کا خاندانی یا آبائی سلسلہ طریقت نقشبندی تھا۔ حضرت مرزا کو بھی سلسلہ خواجگان کے ساتھ والہانہ عقیدت ہے جیساکہ آپ کی منقبت سے ظاہر ہے جو آپ نے سلسلہ خواجگاں پر لکھی ہے۔[1] پھر یہ سلسلہ آنجناب کو اپنے پیر و مرشد کے ذریعہ سے بھی حاصل ہوا ہے۔ اسکا بیان آگے آئے گا۔

---

[1] حضرت شیخ اکمل نے سلسلہ خواجگان عالیشان رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی منقبت میں ایک فارسی قصیدہ لکھا ہے اسکے چند اشعار ایک قلمی نسخہ سے اسطرح منقول ہیں:۔

از بخارا گشت پیدا مشرقِ خورشید جان — مرأۃ الصافی کہ انجا روی جاناں شد عیان

شاہبازِ کرد طیراں از مکان تا لامکان — شہسوار شد ہویدا بردہ گوئی از میان

مفلسم شاہا رسان بر عز تمکین جادہ ام — بخت من شوریدہ است امانامت دادہ ام

سایہ دار افتادہ ام بر خاک راہ خواجگان — زان برافرازم کلہ را بر سر ہفت آسمان

من غلام بارگاہ شاہ قصر عارفان

من گدائے داغدار شاہ قصر عارفان

چشم را جان است جان را جنبش دو رکار کو — چشمۂ دل ہست جوششہا را انوار کو

ایں زبان بعد زمان شد صحبت اخیار کو — سید مشکلکشا علویؒ عطار کو

پارسا و چرخی و خواجۂ احرار کو — خواجہ باقی شیخ احمد معدن اسرار کو

من غلام بارگاہ شاہ قصر عارفان

من گدائے داغدار شاہ قصر عارفان

ہوش و ردم بایدو لپشت قدم زیر نظر — از خودی خویش گر خواہی بیابی تو گذر

(باقی اگلے صفحے پر

آپ کے حالات حضرت شیخ عبدالوہاب نوری المتوفی ۱۱۸۶ھ اپنی مشہور تصنیف الفتحات الکبرویہ میں تحریر فرماتے ہیں ع[۱]

"ولبعد چندی عادل خان مذکور رخت حیات از سرای فانی کشیدہ ایشانرا یتیم گذاشت و مادر حضرت ایشان شوہر دیگر خواست و لعم متعہد و متکفل احوال ایشان شد از لبس ایشانرا اتباع بسنن جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم حاصل بود و حکمت حکیم علی الاطلاق چنان اقتضا کرد حالتِ صبا ہم بی تبعیت آن سرور نباشد"۔

● ــــ (کچھ مختصر مدت کے بعد آپ کے والد عادل خان نے وفات پائی آپکی والدہ محترمہ نے دوسری شادی کی اس لئے باپ کے بعد آپ کا کفیل مُربّی آپ کا چچا ہوا۔ آپ کا عم بزرگوار خود پابند سنت تھا اس لئے بچپن ہی سے آپ کو سنت پر چلنے کی تربیت دی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ آپ بچپن سے ہی پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے سنہری دائرے میں رہیں۔)

اللہ تبارک و تعالےٰ کا فضل خاص حضرت میرزا کے شامل حال رہا کہ پندرہ سال کی قلیل مدت میں آپ نے مروّجہ ظاہری علوم میں مہارت حاصل کی جن میں تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ علوم شامل ہیں اسکے بعد صاحب فتحات کبروّیہ کی تحریر کے مطابق پندرہ سال کی عمر میں آپ اپنے

(بقیہ حاشیہ) از بہارِ معرفت قلبِ صنوبر را ثمر | خلوتت در انجمن باشد سفر اندر مقر
این گہر جز خاندانِ خواجۂ والا گہر | می نیابی گر بجد جہد جوئی بحر و بر

من غلامِ بارگاہ شاہ قیصر عارفان
من گدائے داغدارِ شاہ قیصر عارفان ●●

ع[۱] فتحات کبروّیہ مؤلفہ حضرت شیخ عبدالوہاب نوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ اکمل الدین کامل بیگ خان بدخشی کے حالات پر معتبر اور مستند تذکرہ ہے کیونکہ شیخ عبدالوہاب آپ کے ہمعصر بزرگ ہیں اور مسلّمہ متقی اور پرہیزگار ہیں۔ ان کے بیانات قابل اعتماد اور مستند ہیں۔

شیخ و مربی حضرت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۰۸۰ھ کی صحبت بابرکت میں پہنچے۔ تیرہ سال تو پہلے ان کی خدمت میں رہ کر انکی خدمت گزاری کی اور اُن کے باطنی فیوضات سے مستفیض ہوئے۔ انہیں ابتدائی معصومیت کے زمانہ میں (TENDER IN-FANCY) حضرت خواجہ نے آپ کو دیکھا تھا اور ان کا نام دریافت کیا تھا اور ارشاد فرمایا تھا کہ رسم باسمیٰ سے حقیقتاً یہ میرا فرزند ہے اور میرا نام (یعنی میرا منصب اور میرا سلسلۂ طریقت) زندہ کرے گا۔ صاحب فتحات کے بغیر دیگر مؤرخین مثلاً تاریخ حسن اور تحالیف الابرار میں درج ہے کہ آپ بارہ سال کی عمر میں ہی اپنے مرشدِ کامل کی خدمت میں پہنچے۔ صاحب فتحات کبرویہ کے تصریحات یہ ہیں :۔

"یکے از ثقات گفتہ کہ روزی خدمت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ ایشانرا بردوش پدر رضاعی دید، پرسید کہ ایں پسر کیست وی از حسب ونسب آبای حضرت ایشان بیان نمودہ گفت کہ نامش کامل خانست خدمت خواجہ فرمود کہ ایں پسر معنوی من است و میدانم کہ نام مرا زندہ خواہد گذاشت برطبق نفس اَلْاَسْمَاءُ تَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مسمیٰ مطابق رسم خواہد بود۔

پس ارشاد مآبی سن یا نزدہ رسید واز علوم دینی بہرہ مند شد۔ شی ایشانرا تبدیل احوالی شدہ طرفہ سوزش سوتی پدید آمد و نار عشقی از کانون سینہ ایشان شعلہ کشید روز در قلق و اضطراب، شب در بیقراری و التہاب۔

چوں پدر رضاعی ایشان مرید خواجہ بود از ینحال بعرض ایشان رسانید امر باحضار شد ارشاد مآبی گفتہ ہیں کہ ایشانرا دیدم تسکین دل خود حاصل نمودہ دانستم کہ علاج دردِ من پیش ایشان خواہد بود تا مدت سیزدہ سال و نہ ماہ ملازم آن دولتخانہ بودند"۔

● ــــ (ایک معتبر راوی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ نے حضرت مرزا کو بچپن میں اپنے رضاعی باپ کے کندھے پر دیکھا۔ آپ نے ان کے پدر رضاعی سے (اس) بچے کے حسب ونسب اور نام کے

بارے میں استفسار کیا۔ جواباً آپ کے پدر رضاعی نے تفصیلات بتاتے ہوئے ان کا نام (کامل خان) بھی بتایا۔ حضرت خواجہ نے فرمایا یہ میرا فرزند معنوی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مرا نام زندہ رکھیگا چونکہ نام عموماً موسوم کی ذات کے مطابق آسمان سے اُترتے ہیں۔ اس کا نام بھی ایسا ہی ہے اپنے نام کے مطابق اسکا عمل اور اسکی زندگی ہوگی۔

جب حضرت میرزا پندرہ سال کی عمر کو پہنچے اور دینی علوم کی تکمیل کی ایک رات ان کی حالت معمول سے تبدیل ہوگئی ان پر عشق الہٰی غالب ہوا اور معمول کی زندگی سے نسبتاً زیادہ اثر انداز ہوگیا۔ یہ نہایت قلق و اضطراب میں پڑ گئے۔

چونکہ آپ کا پدرِ رضاعی حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ کا مرید تھا اس لئے آپکو اُن کی خدمت میں لایا۔ حضرت میرزا کا کہنا ہے جوں ہی وہ حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ کی خدمت میں پہنچے ان کو تسکین ہوئی اور شوریدگی کی حالت دور ہونے لگی۔ حضرت میرزا فرماتے ہیں کہ میں نے سمجھا کہ دراصل میرے درد کا علاج اُن ہی کی صحبتِ بابرکت میں ہے۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں تیرہ سال نو ماہ رہا۔)

● — (الفتحات الکبرویہ قلمی نسخہ صفحہ ۲۶۰-۲۶۱)

اس لمبی مدت کے دوران آپ نے اپنے مرشد مُربی کے حکم کی تعمیل میں ہندوستان کے کئی علاقوں کا مسلسل سفر کیا۔ تین سال اس سفر میں صرف کئے۔ تین سال کے بعد واپس وطن تشریف لائے۔

"درہمان اثنا بامر ایشان سفر ہندوستان اختیار نمودہ سہ سال بدالنظرف بودند دروزۂ عاشقی درانجا ادا نمودند بعد سہ سال دوبار خدمت خواجہ بر ایشان متجلی شدہ فرمودند من منتظرم زود بیا ہمان ساعت بازمراجعت فرمودند بقیہ عمر در خدمت خواجہ ماند بعدہ پنجاہ سال بر مسند ارشاد تمکن داشت" ۔صفحہ ۲۶۱

● — (اسی دوران اپنے پیر طریقت کے ارشاد کی تعمیل میں آپ نے

ہندوستان کا سفر کیا تین سال وہاں گزارے اور عاشقی کے روزے
وہاں گزارے تین سال کے بعد آپ کو حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ دوبارہ
جلوہ گر ہوئے اور فرمایا جلدی وطن واپس آؤ۔ چنانچہ آپ تین سال کے
بعد واپس تشریف لائے۔ حضرت خواجہ کی خدمت میں برابر اسوقت تک
رہے۔ جب تک وہ اس دنیا میں تشریف فرما تھے۔ حضرت خواجہ کے
بعد (۵۰) پچاس سال دنیا میں رہ کر مسند دعوت ارشاد پر جلوہ افگن رہے)

حضرت خواجہ کا مختصر تعارف

حضرت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ اپنے وقت کے ممتاز اور برگزیدہ صوفی بزرگ تھے
آپ نے اولاً بچپن میں مرشد ابرار حضرت یعقوب دارولیؒ سے فیض پایا اور پھر ثانیاً حاجی الحرمین
الشریفین حضرت شاہ قاسم حقانی قدس سرہ کے مستقل ممتاز خلیفہ بنے۔ اسکے علاوہ آپ نے میاں میر
لاہوری قدس سرہ حضرت جمال الدین بال جہی قدس سرہما سے سلسلہ قادریہ میں فیض حاصل کیا۔
حضرت محبوب الودود خواجہ مسعود پانپوریؒ سے سلسلہ سہروردیہ [illegible] فیوضات کئے۔ سلسلہ
نقشبندیہ کئی طریقوں سے آپ کو عنایت ہوا ہے۔ ان میں سے حضرت آخوند ملا شاہ کد اسے
بھی آپ نے یہ سلسلہ عالیہ حاصل کیا ہے۔ مگر حضرت شیخ نوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے منظومہ
سلسلہ طریقت نقشبندیہ میں حضرت شاہ قاسم حقانی سے حاصل شدہ سلسلہ عالیہ حضرات خواجگان
عالیشان رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین کو ترجیح دی ہے۔ اسکے علاوہ حضرت خواجہ یہ اس
سلسلہ طریقت میں مرخص اور مجاز تھے۔ کئی سلسلوں کا ذکر مع مشایخ آں سلسلہ عالیہ حضرت
شیخ نوری نے فتحات میں تفصیلاً کیا ہے۔ ان میں سلسلہ کبرویہ، سلسلہ قادریہ، سلسلہ سہروردیہ، سلسلہ
نقشبندیہ، سلسلہ چشتیہ ہیں۔ حضرت مرزا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر سلسلہ میں مجاز تھے۔*

* حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار قدس سرہ کے چند معصر بزرگان دین کے اسماء گرامی یہ ہیں:

ابو الفقراء حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ المتوفی ۱۰۴۷ھ
عارف باللہ خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ المتوفی ۱۰۲۷ھ
حضرت بابا اسماعیل قادریؒ المتوفی ۱۰۴۷ھ
میر علی قادریؒ المتوفی ۱۰۷۰ھ

(باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت میرزا کو خلعت خلافت

حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ نے تیرہ سال کی خدمت گذاری کے بعد حضرت مرزا کو اپنا خلیفہ بنایا اور ان کو خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا جسکا ذکر خود حضرت شیخ کامل ان الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

پیرِ من مرشدِ دین شیخ حبیب اللہ ذات	گفت او خرقۂ دین حضرت قاسم دادم
خرقہ بخشید مرا، حضرت ایشاں زکرم	بہر ارشاد بہر سلسلہ رخصت دادم
برگزید او زکرم بر سرایں گفتہ مرا	من ہم از ہمت او بر سر آن ارشادم
گفت پیغمبر دین شیخ مرا چندیں بار	ہر کہ افتاد قبولِ تو قبول افتادم

("مجمع الاسرار") —●

●— میرے پیر و مربی حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار ہیں انہوں نے فرمایا کہ ان کے مرشد حضرت شاہ قاسم حقانی ہیں۔ حضرت خواجہ نے مری تربیت کی اور اس درجہ پر پہنچا دیا۔ انہوں نے مجھ پر مہربانی فرمائی کہ خلعت خلافت سے نوازا اور مجھے ہر سلسلۂ طریقت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اسکے ساتھ ساتھ ہر سلسلہ میں بیعت و ارشاد کا اختیار بھی عطا فرمایا۔ اس قسم کی اجازت و ارشاد سے انہوں نے مری عزت افزائی کی۔ میں اسی مرشد کامل کی باطنی امداد اور فیوضات کی

شیخ بابا داوٗد مشکواتی رح	المتوفی ۱۰۹۷ھ
شیخ داوٗد رح (بتہ مالو)	المتوفی ۱۱۰۷ھ
شیخ محمد چشتی رح عرف رادھو	المتوفی ۱۱۲۶ھ
شیخ مراد نقشبندی رح المعروف ٹنگ	المتوفی ۱۱۶۱ھ
خواجہ عبداللہ بخاری رح	المتوفی ۱۱۸۱ھ

اسکے علاوہ یہاں کافی تعداد میں بزرگان دین موجود تھے۔ ان دنوں وادی گلپوش میں باغ معرفت کے پرکشش دلکش گلاب ہر طرف موجود تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جو حضرت میر محمد ہمدانی علیہ الرحمۃ کے اس دور کی عکاسی کرتا ہے جس دور میں وہ یہاں وادی مرغزار میں تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں اپنے رفقاء کرام کے ساتھ منہمک تھے اور وادی کشمیر اولیاء کرام اور علماء اسلام کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔

بدولت اس عظیم منصب پر فائز المرام ہوں۔ میرے مرشد کو کئی بار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلوہ گر ہوئے اور ان کو ارشاد فرمایا "جسکو آپ قبول کرینگے وہ مجھے بھی قبول ہے"۔

یہاں حضرت مرزا نے فرمایا کہ "پیر کامل نے مجھے ہر سلسلۂ طریقت کی اجازت مرحمت فرمائی اس سے مراد ہر وہ سلسلہ طریقت ہو سکتا ہے جسکے مجاز خود پیر طریقت حضرت خواجہ تھے جنکا تفصیلی ذکر حضرت شیخ نوری نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے مثلاً کبروی، قادری، نقشبندی، سہروردی، اویسی، چشتی دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہر سلسلہ طریقت جو اگرچہ بیشمار ہیں تاہم چودہ[۱۴] سلسلے مشہور ہیں۔ اُن تمام سلاسل کی اجازت مجھے بخشی گئی۔ میرے نزدیک پہلی تفسیر قابل ترجیح ہے۔ حضرت خواجہ نے ۲، رجب ۱۰۸۰ھ کو وفات پائی اسکے بعد حضرت شیخ اکمل پچاس سال تک مسند ارشاد پر فائز رہے۔ اسطرح آپ نے ۲۹، ذی الحجہ ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی ــــ آگے اس کا ذکر ہوگا۔

حضرت مرزا کی مختلف الجہات شخصیت

حضرت شیخ اکمل الدین مرزا محمد کامل بیگ خان بدخشی رحمۃ اللہ علیہ کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف وہ بلند پایہ جامع السلاسل صوفی بزرگ تھے۔ دوسری طرف وہ اپنے زمانہ میں ممتاز ادیب، شاعر اور مصلح تھے۔ وہ معرفت، خداشناسی، دین اور دینی احکام کے پوشیدہ غامض حکمتوں سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ ان کو منکشف کرنیکی اُن میں پوری پوری صلاحیت تھی اور آپ کے کلام سے پتہ چلتا ہے وہ قدرت کے پوشیدہ رازوں کو مخاطب کے حسب استعداد فہم و فراست ظاہر کرنے کے لئے مولوی رومی علیہ الرحمتہ کی طرح ماذون تھے۔

من حیث الصوفی

ایک صوفی بزرگ ہونے کی حیثیت سے آپ اپنے مرشد کیطرف سے مسند ارشاد پر برابر پچاس سال تک براجمان تھے۔ اس طویل عرصے میں آپ نے انگنت فرزندانِ توحید کی راہ حق میں رہنمائی کی اور ان کو منزل مراد ملی۔ کئی سعادت مند فرخندہ فال افراد کو خلعت خلافت بھی نصیب ہوئی ان میں سے

ف حضرت مرزا اپنے زمانے کے معروف خطاط بھی تھے۔ نسخ و نستعلیق دونوں پر یکساں مہارت و دسترس رکھتے تھے۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا "اوراد فتحیہ" کا ایک قلمی نسخہ اکادمی کے گنجینۂ نوادرات میں موجود ہے۔ ــ (ایڈیٹر)

- حضرت شیخ نعمت اللہ کلو المتوفیٰ ۱۱ ذیلقعد ۱۱۴۹ھ ؎
- حاجی الحرمین الشریفین عبدالسلام دار المتوفیٰ ۱۲ ربیع الاول ۱۱۷۲ھ ؎
- مرزا فرہاد بیگ المتوفیٰ ۱۱۵۶ھ ؎

○ — (؎ ، ؎ ، ؎ بحوالہ اسرار الاخیار)

وارث رتبۂ ابوالجناب حضرت شیخ عبدالوہاب المعروف بہ نوری المتوفی ۱۱ ربیع الثانی ۱۱۸۶ھ
اِن کے علاوہ خواجہ قایم الدین تیلو، خواجہ مقیم (جو صاحب اسرار الاخیار کی تحقیق کے مطابق فرزند حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار رحمۃ اللہ تھے) شیخ عطار اور، ملا عبدالعزیز، خواجہ ابوالفتح بابا، مولانا نورالدین اور خواجہ حیات ہیں (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔)

حضرت میرزا قدس سرہ نہایت پختہ، کامل اور منتہی صوفی بزرگ تھے اور ہر ایک سلسلۂ طریقت میں اپنے مرشد کامل خواجہ حبیب اللہ عطار رحمۃ اللہ علیہ سے مُرخص اور مجاز تھے۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی فرمایا ہے

خرقہ بخشید مرا حضرت ایشان زکرم   بہر ارشاد بہر سلسلہ رخصت دادم
برگزیداو زکرم بر سرایں گفتہ مرا   من ہم از ہمت او بر سر ایں ارشادم

اپنے مرشد کامل کی وفات کے بعد حضرت میرزا نے کسی شیخِ وقت کسی اور صوفی کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اسکی بنیادی وجہ یہ تھی آپکی تربیت نہایت پختہ اور ہر سلسلہ میں اس قدر مضبوط اور تسلی بخش تھی کہ آپ کو حضرت خواجہ کی وفات کے بعد کسی بزرگ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس سے حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار قدس سرہ کی عظمت، رفعت اور اعلیٰ درجۂ ولایت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں "فتحات کبرویہ" میں مندرج یہ واقعہ قابل غور ہے۔:

"دہم فرمودند کہ چوں وقت حضرت خواجہ بآخر رسید عرض نمودم کہ بعد از حضرتت پیش کہ میروم، بلغضب تمام فرمودند کہ آنچہ داشتم بتو دادم حالا چہ میخواہی پیش مشائخ شہر برو کہ صورت کار معلوم خواہی کرد بہان بود کہ بعد وفات ایشان بعشق حجازی مقید شدم وبقصد استخلاص از ان زیارت

ہمہ مشائخ نمودم معلوم کردم کہ ہیچکس بقاعدہ مکملانہ کہ طریق ما بدان مربوط است سلوک نکردہ است و عجائب بسیار دوان مشہود گشتہ۔"

● — (حضرت میرزا نے فرمایا جب حضرت خواجہ قدس سرہ کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو میں نے انکی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کی وفات کے بعد میں رہنمائی کی غرض سے کس کے پاس جاؤں؟ یہ سنکر آپ بہت مشتعل ہوئے اور نہایت غصّے میں آکر فرمایا کہ جو کچھ مرے پاس تھا میں نے وہ تجھکو دیدیا اب تم کیا چاہتے ہو؟ شہر کے اور بزرگوں کے پاس جاؤ، تم پر صورت حال واضح ہو جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی وفات کے بعد میں عشق مجازی میں مبتلا ہوا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے میں شہر کے ہر ایک مجاز بزرگ کے پاس چلا گیا۔ مجھ پر واضح ہوا کہ کوئی بھی بزرگ بطریق اکمل اُس طریقہ سے سلوک کے منازل طے نہ کر چکا تھا جسطرح میں اپنے شیخ مُربّی کی بدولت کر چکا تھا)

اس واقعہ سے حضرت خواجہ کی فضیلت اپنے جملہ ہمعصر بزرگوں پر واضح ہو جاتی ہے۔ عشق مجازی میں مبتلا ہونا اگرچہ حضرت میرزا کے لئے ایک کٹھن آزمائش تھی۔ مگر دوسری طرف ان کے لئے یہ ایک رحمت تھی، بایں وجہ کہ اس سے ان پر اپنے شیخ مرشد علیہ الرحمۃ کی عظیم المرتبت شخصیت واضح ہو گئی جنکا وجود حضرت میرزا کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک بیش بہا نعمت تھی جسکا احساس حضرت میرزا کو اس ابتلائے ناگہانی سے ہوا۔ اس لئے یہ حضرت میرزا کے لئے مصیبت نہیں بلکہ مصیبت کی صورت میں ایک رحمت تھی "وعسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم" اس نعمت عظمیٰ کا تذکرہ حضرت میرزا علیہ الرحمۃ اپنے ادبی اور علمی شاہکار "مخزن الاسرار" میں اسطرح کرتے ہیں ؎

مرگ چہ زندگی است کہ پایانش نیست	دولتِ بود، خدا داد کہ مرشد دادم
انگہان گفت شبے مرگ نہ خواہی ہیہات	در زمان مردم، مردانہ بہ رہ افتادم

● — موت کیسی اچھی زندگی ہے کہ اسکی گہرائی اور دوام میں انقطاع نہیں۔ اللہ تبارک وتعالےٰ

کی مجھ پر بہت بڑی نعمت تھی کہ اُس نے مجھے راہبر عطا فرمایا جس نے مجھے اس راز سے واقف کر کے میدان عمل میں ڈال دیا۔ یہاں موت کا مقصد موت طبعی نہیں ہے۔ بلکہ اس مادی زندگی میں اپنے نفس امارہ اور اسکے خواہشات کو مارنا ہے اور اُس پر پوری قوت کے ساتھ سوار ہونا ہے اور زندگی کے دوران ہی اپنے اندر ایسی کیفیت پیدا کرنا ہے جو طبعی موت کے وقوع سے انسان میں پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دفعتہً انہی جملہ خواہشات (نفس امّارہ) سے آزاد ہو جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد گرامی "مُوتوا قبل ان تموتوا" "مرنے سے پہلے مر جاؤ" کا یہی مقصد ہے یہی حصول ولایت کے لئے پہلی شرط ہے۔ حضرت میرزاؒ اس شعر میں یہی فرماتے ہیں اس موت سے مجھے اصلی زندگی ملی اس لئے یہ مرگ کسقدر حسین اور عمیق ہے کہ یہ ابدی زندگی کا وسیلہ ہے مگر یہ مرشد کامل کے بغیر میسر نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے اللہ کا فضل شاملِ حال رہا اُس نے مرشد کامل عطا فرمایا۔ یہ دوسرا شعر اس عمیق حقیقت کی کما حقہ وضاحت کرتا ہے کہ ایک رات مجھے اپنے مرشد نے فرمایا کہ مرنے کے بغیر راستہ نہیں پاؤ گے۔ اسی وقت میں مر گیا پھر نہایت دلیری کے ساتھ وصول کے راستہ پر گامزن ہُوا۔

ان دونوں شعروں میں حضرت میرزا اپنے مرشد کامل کا وجود اپنے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک عظیم نعمت سمجھتے ہیں تو دوسری طرف سلوک کے دو اہم ضرورتیں ہم پر واضح کرتے ہیں (۱) مرشد کامل کی رہبری۔ (۲) مرگِ اختیاری کہ اپنے نفس امّارہ اور اسکے جملہ تقاضوں سے من وعن دستبردار ہونا۔ جب یہ صفت سالک میں پیدا ہو جائے وہ بلا تاخیر اپنے مقصد "وصال" کی عظیم نعمت سے سرفراز ہو جائے گا۔ چونکہ حضرت میرزا علیہ الرحمتہ وصول الا اللہ کی بے مثال نعمت خداوندی سے سرفراز ہوئے ـــ اسکا مزہ آپ نے چکھا ـــ اس پُر مسرت لذت کو پا کر سالکوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ مرگِ اختیاری مرگ نہیں ہے بلکہ دائمی پُر مسرت زندگی کا پہلا زینہ ہے۔ مرگ کے ساتھ زندگی کا استعمال کرنا علم معانی میں ایک صنعت ہے۔ دوسری طرف اس ترکیب کے استعمال سے سالک کے حوصلے بڑھائے تاکہ اُسکو معلوم ہو جائے کہ سختی کے بعد دائمی آرام ہے۔

حضرت میرزاؒ "ولایت" علم معرفت کے بحر ذخار تھے۔ اس حقیقت پر اُن کی تصانیف اور ان کا کلام شاہد ہے۔ اسکے علاوہ اپنے مرشد کامل کی طرف سے عطا شدہ خطابات آپکی

گہری حقیقت شناسی کا پتہ دیتے ہیں، جنکا مختصر تذکرہ آگے آئیگا۔ اسکے باوجود آپ کبھی بھی شریعت کے دائرے سے باہر نہیں نکلے نہ کبھی اپنے کلام میں مستی کی حالت میں بھی، کوئی ایسی بات فرمائی جو کسی طریقے سے شریعت کے کسی حکم سے متصادم ہو۔ یہی آپکی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے اور مری نظر میں آپ کے اولوالعزم ولیِ کامل ہونیکی نشانی ہے۔ مرشدِ کامل نے آپ کو اکمل فرمایا۔ شاید اسکی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ میں نہایت ربط ضبط اور اسرار و حقائق غامضہ پر دسترس ہونے کے باوجود ان کے اظہار پر پیغمبرانہ ضبط تھا اور شریعت مصطفویؐ پر پوری عقیدت کے ساتھ نہ صرف خود علے الدّوام عامل تھے بلکہ اپنے مسترشدین کو بھی شدت کے ساتھ اسکی تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ "بحر العرفان" میں آپ ارشاد فرماتے ہیں ؎

تو طریقت رہ شریعت کن	سیر در عالم حقیقت کن
روز و شب پاسِ شرع باید داشت	چشم بر اصل و فرع باید داشت ؏

۰۔ (بحر العرفان ج ۱ ص ۱۹۳)

عموماً جملہ اولیاء کبار اور اصحاب السلاسل کا طریقہ یہی رہا ہے۔ محبوب سبحانی شیخ سید عبد القادر جیلانی قدس سرہ کا مفاتح الغیب، غنیۃ الطالبین، حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا عوارف المعارف، حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کا ذخیرۃ الملوک، مکتوبات، رسالہ حل مشکل، رسالہ دہ قاعدہ اور اوراد فتحیہ، حضرت خواجۂ بزرگ محمد بن محمد مشکلکشای بخاری قدس سرہ کی رباعیات اسی طریقۂ مالوفہ کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتی ہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پُر اسرار واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے سورۃ النجم میں نہایت دلکش انداز میں صاحب المعراج حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی "مازاغ البصر وما طغیٰ" کہ دوران معراج آنجنابؐ نے جن حیرت انگیز

۰۔ (تم پر لازم ہے کہ شریعت کے احکام پر پابندی کرنے کے طریقے سے تم سلوک کی منازل طے کروگے۔ اسی طریقے سے تم عالم حقیقت کی سیر کرو۔ رات دن شرعی احکام اور نصوص کا خیال رکھنا چاہیئے اصل اور فرع پر پوری نظر رکھنا لازمی ہے۔)

عجائب قدرت الٰہیہ کا مشاہدہ کیا آپکی نظر اپنے اصلی مقصد سے نہیں ہٹی اور نہ ہی آپ نے اپنے دائرہ سے تجاوز کیا۔ یعنی آپ برابر دائرہ عبودیت میں رہے اور نظر اپنے حقیقی محبوب (ذات پاک حضرت اللہ جل جلالہ) پر جمی رہی۔ یہی پیغمبر اسلامؐ کی گہرائی، دانش اور کمالِ قرب کی ایک واضح دلیل ہے۔ یہی صفت اپنی استعدادِ ولایت کے مطابق حضرت میرزاؒ کی ذات بابرکت میں پائی جاتی ہے۔ میرے نزدیک اسی صفت کا وجود آپکی بڑائی اور عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔

حضرت میرزا نے علیہ الرحمتہ نے "بحر العرفان" میں آگے اسی حقیقت کے پیش نظر سالکوں کو آگاہ کیا ہے کہ شریعت ہی وہ محبوب طریقہ ہے جس سے سالک اپنے سلوک پر چلکر اپنی منزل مقصود سے ہمکنار ہو سکے گا۔ آپ نے فرمایا ؎

• نفع بر اہل مذہب و دین کن	سنت مصطفٰے خود آئین کن
• اوّل دین، آخر دین این است	آنچہ مقصود حق بود این است
• شرع دین است، دین بحق واصل	باش شارع کہ حق شود حاصل
• نیست جز شرع ہیچ راہے راہ	ای موحد ز شرع حق میخواہ
• تو ز من، من ز تو، ہمی جویم	تو مرا، من ترا ہمی گویم
• کہ سنت مصطفٰی کہ دین این است	ہر کہ دیندار، اینش آئین است

•۔ (بحر العرفان ،ج ۱)

شعر نمبر ۱ میں "اہل مذہب" کا مطلب دین کے سربراہ اور ائمہ طریقت ہیں۔ یہاں مرشدوں، مربیوں کے علاوہ دین حق کے واعظین اور مبلغین کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنا اپنا مسلک اپنا اپنا مفوضہ کام شریعت کے قوانین و احکام کے مطابق انجام دیتے رہیں جسطرح سربراہان طریقت انجام دیتے رہے ہیں۔

غرض طریقت میں شریعت پر پابند رہنا ولی کے لئے کمال ولایت کی دلیل ہے اسمیں شک نہیں ہے کہ ایک فقیر سلوک میں حیران کن منازل سے گزرتا ہے وہ ایسے مقامات پر بھی پہنچتا ہے جہاں بے شمار فیوضاتِ ربانی سے وہ مستفیض ہوتا رہتا ہے۔ اِن سے مست اور سرشار ہو جاتا

ہے۔ انسان کبھی یہاں اپنی عقل کھو دیتا ہے۔ ایسا کلام بھی کرتا ہے جو بہ ظاہر عقل کے خلاف ہوتا ہے اور شرعی حدود و قیود سے باہر ہوتا ہے۔ اسی کو اصطلاح میں شطح کہتے ہیں مگر فقیر کی یہ حالت عارضی ہوتی ہے۔ وہ اس سے پھر ہوش میں آتا ہے۔ شرعی نکتۂ نظر سے یہ کلام معتبر نہیں ہے، نہ اس پر عمل ہے مگر فقیر کا کمال یہ ہے کہ وہ مستی میں بھی شرعی عقل اور ہوش کو قائم رکھے چنانچہ نفحات الانس کے حواشی میں در حالات حضرت سلطان بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ مرقوم ہے :-

"کہ عارف از مستیٔ شراب شہود گویدرعونت درو ی ظاہر گردد و لبظاہر علم مخالفت نماید مگر جنید ابو الوقت بود نہ ابن الوقت بر حال امیر بود نہ اسیر، مستی با ہوشیاری جمع داشتہ ازان در قول خود قدح نگذاشتہ پس مقبول بایں فرق گشتہ و مشہور بہ سید الطائفہ گشتہ کشف را تابع علم ساختہ و دیگر چو اطاعت در امر ہنی سبب ظہور حال و کشف است سبب را بزرگ داشت و لبسبب دست ازان نکشیدہ "

•— (نفحات الانس قلمی نسخہ صت ۴۵)

•— (عارف بعض اوقات شہود صفات میں اسقدر مست ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے۔ اسمیں نتیجتاً رعونت پیدا ہو جاتی ہے اور فعلاً یا قولاً عام شرعی ربط و ضبط کے خلاف جاتا ہے۔ مگر سید الطائفہ حضرت شیخ جنید بغدادی قدس سرہ کو کبھی ایسی حالت نہیں ہوئی ہے۔ اُن کو اپنے ہمو قتم حالات میں اپنے ہوش و حواس پر قابو رہتا تھا اسی وجہ سے ان کو ابو الوقت کہا جاتا ہے۔ (یعنی اپنے ہنگامی حالات پر قابو رکھنے والے) اس لیے یہ اپنے حالات پر امیر (غالب) تھے وہ حالات کے اسیر نہیں بنتے تھے۔ مستی میں آپ کی ہوشیاری قائم رہتی تھی اسوجہ سے اپنے پیچھے کوئی ایسا قول نہیں چھوڑا جس سے وہ ہدفِ تنقید بن سکتے۔ اسی وجہ سے وہ اصحاب سلوک اور علماء کے حلقوں دونوں میں منظور نظر

ہوکر سید الطائفہ کا لقب پاگئے۔ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے کشف کو علم کا تابع بنادیا)۔

یہاں نفحات الانس جیسی عظیم متداول کتاب کے اس حواشیہ اقتباس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ صحو کو سُکر پر بہر صورت ترجیح ہے۔ حضرت میرزاؒ پر یہ صفتِ جنیدی علے التمام موجود تھی۔ جہاں وہ ارضِ کشمیر پر حضرت جنید کیطرح جامع السلاسل شخصیت کے مالک تھے وہاں اس صفتِ جنید سے وہ بطریقِ اکمل موصوف تھے جیسا کہ میں نے واضح کردیا کہ میرے نزدیک یہ بھی آپکو اکمل الدین کا لقب ملنے کی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ آپ کا مستند تذکرہ فتحات کبرویہ مرتبہ و مؤلفہ حضرت شیخ نوری علیہ الرحمۃ جو آپ کے برگزیدہ خلیفہ ہیں، واضح کرتے ہیں کہ شیخ اکمل مستی کو نقص سمجھتے تھے۔ چنانچہ شیخ نوری رح فرماتے ہیں:۔

"چوں محو فنا غلبہ آمد بالکل از لباس بشریت برآمدم دران اثنا العنایت جانب فقیر فرمودند کہ مرید صاحب سکر لایق سجادۂ شیخی نیست۔ ہوش دار سکر خود را بصحو بدل کن کہ با تو کار دارم۔"

● ــــ (فتحات کبرویہ در حالت حضرت میرزاؒ)

● ــــ (جب مجھ پر محو اور فنا نے غلبہ کیا (یعنی مجھ سے از خود مری ہستی اور میرا وجود گم ہوگیا) میں بشریت کے لباس سے نکلکر عجیب و غریب حالت میں پڑگیا۔ یہ حقیقت بھانپ کر آنحضرت نے میری طرف نہایت پُر شفقت نگاہیں ڈالکر فرمایا۔ مست و مدہوش مرید سجادہ نشینی کے لایق نہیں ہے۔ خبردار سکر کو صحو میں تبدیل کرڈالو کیونکہ مجھے تیرے ساتھ کچھ اہم کام ہے یعنی تجھ پر تبلیغ دعوت کی ذمہ داری خلعت ارشاد سے ڈالنے والا ہوں۔ سکر و مستی اسکے خلاف ہے یعنی خلعتِ ارشاد کے تقاضے سکر و مستی کی حالت میں پورے نہیں ہوسکتے ہیں)۔

حضرت ارشاد مآبی شیخ اکمل الدین کامل بیگ خان بدخشی قدس سرہ کے برگزیدہ خلیفہ حضرت

شیخ نعمت اللہ الملقب بہ غیاث الدین المتوفی ۲۱، ماہ ذوالقعدہ ۱۱۴۹ھ کو درگاہ اکملیہ سے ابوالوقت کا خطاب ملا ہے۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موصوف کو اکثر بارگاہ ایزدی سے تجلیات ذاتی وصفاتی کا انعام و اکرام ہوتا تھا مگر موصوف اپنے ہوش و حواس ان مافوق البشریت لمحات میں قائم رکھتے تھے یہ صلاحیت اُن کی ذات عالی درجات میں حد درجہ موجود تھی۔ اس صلاحیت اور اس ممتاز صفت پر شیخ اکمل نے آپکو ابوالوقت کا خطاب عطا فرمایا۔

اس بحث کا خلاصہ یہی ہے کہ حضرت میرزاؒ وصول کی اعلیٰ منازل پر فائز ہونے کے باوجود شریعت کے ہر لحاظ سے پابند تھے۔ کبھی بھی آپ کو مشاہدات و تجلیات ذاتی یا صفاتی مستفیض ہونے کے دوران شرعاً کوئی لغزش نہ ہوئی یہی وہ خصوصیت ہے جو آپ کے کمال ولایت پر دال ہے اور کشمیر میں جنید ثانیؒ کہنے کی حقدار بناتی ہے۔ علامہ شیخ داؤد خاکیؒ اپنے پیر و مرشد سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومی قدس سرہ کے اوصاف جمیلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مشہور قصیدہ "ورد المریدین" میں فرماتے ہیں۔:

او شریعت راست ناصر در طریقت مجتہد   بہر اسرار حقیقت صدر او مصدر شد است[۵]

حضرت میرزا بحیثیت شاعر و مصنف

اللہ تبارک و تعالےٰ نے حضرت میرزاؒ کو اپنی گوناگوں عنایات سے نوازا تھا۔ بچپن ہی میں علوم و فنون کا حصول۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی عشق الٰہی کا سوز و گداز موجزن ہونا اور اسی دوران بارگاہ ایزدی کی سب سے بڑی نعمت ایک ایسے مرشد کامل کا ملنا ہے جو اپنے عہد کے ممتاز مادرزاد ولی اور جملہ سلاسل میں مجاز، جو بارگاہ رسالتؐ میں اسقدر محبوب کہ جناب ولایت مآب حضرت شیخ جمال الدین کو حکم ہوا کہ کشمیر خود بذات تشریف لے جاکر سلسلہ قادریہ میں حضرت خواجہ کی تربیت کریں۔ اسپنے وقت کے ثانی غوث الاعظم جناب میاں میر قادری لاہوریؒ

---

[۵] وہ شریعت کے مددگار اور طریقت میں مجتہد ہیں۔ حقیقت کے اسرار و غوامض کیلئے آپ کا سینۂ مبارک ایک عمیق چشمہ ہے۔

سے کے چہیتے، محبوب اور ممتاز مجذوب[1] خلیفہ ہیں جنکا اسم گرامی حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار قدس سرہ ہے ان گوناگوں عنایات ربانی کے علاوہ بارگاہ صمدیت سے آپ کو شعر و سخن کا دلکش ملکہ عطا ہوا تھا جس سے اصحاب مذاق برابر اسوقت سے آجتک لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

بحر العرفان

یعنی علم عرفان کا سمندر۔ واقعی یہ کتاب اسم با مسمی[2] ہے۔ یہ حضرت میرزا کی ایک شاندار تصنیف ہے جو ۸۰ ہزار ابیات پر مشتمل، فارسی زبان میں ایک ادبی شاہکار ہے۔ دوسری طرف شریعت، طریقت حقیقت، خداشناسی، خداپرستی، عشق حقیقی، عشق مجازی کے دقیق فوائد و اسرار، دنیا و مافیہا کی بے ثباتی و دیگر ہمچو قسم موضوعات کی توضیحات پر ایک مدلل کتاب ہے۔ شیخ اکمل نے یہ کتاب حضرت مولانا شیخ جلال الدین رومی کی شہرۂ آفاق مثنوی کے طرز پر لکھی ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ نے دین کی حقیقتیں، معرفت کی رازداری کی باریکیاں، خداشناسی کے فوائد، دین کے دقیق اسرار و غوامض نہایت شیریں لہجہ و انداز میں دلربا امثلہ سے اپنی مثنوی میں واضح کئے ہیں، مثلاً ؎

کار پاکان را قیاس از خود مگیر	گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر
شیر آن باشد کہ مردم را خورد	شیر آن باشد کہ مردم را درد
جملہ عالم زین سبب گمراہ شد	کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
ہر دو گوں زنبور خوردند از یک محل	لیک زین شد نیش و زاں دیگر عسل
این خورد گردد پلیدی زو جدا	وان خورد گردد ہمہ نور خدا
ہر دو نے خوردند از یک آب خور	آن یکے خالی وزآن پُر از شکر

عہ[1] مجذوب کا مطلب یہاں اصطلاحی نہیں ہے بلکہ لغوی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جنکو روحانی طور باطنی طریقہ سے حضرت میاں میر نے اپنی طرف کشش کرکے لاہور کیطرف رخ کرنے کے لئے آمادہ کیا اور وہاں کھینچ لایا تاکہ اُن کے فیوضات سے حضرت خواجہ کسب فیض کریں اور اُن کے رشد و ہدایت سے استفادہ کرسکیں۔

عہ[2] بحر العرفان کا لغوی معنی علم معرفت کا بحر بیکراں ہے۔ واقعی یہ کتاب ایسے ہی مضامین پر مشتمل ہے۔ اسمیں خدای لایزال کی پہچان کے طریقے اور ان کے قواعد، ان قواعد کی توضیحات میں بزرگان سلف کے مستند واقعات درج ہیں۔ ان کے مطالعے سے ایک صاحب ہدایت راستہ پاکر زندگی کے حقیقی مقصد کو پاتا ہے۔

اولیاراہست قدرت از الہٰ تیر جستہ باز آرندش ز راہ

علامہ رومی علیہ الرحمۃ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ انبیاء کرام اور اولیاء عظام بنی نوع انسان کے اعلیٰ اور منتخب افراد ہیں۔ نتیجتاً ان عالی درجات حضرات کے خصائص بھی عام انسانوں سے جدا اور اولیٰ ہیں۔ اگرچہ شکل وصورت اور دیگر جسمانی لوازمات میں وہ عام انسانوں کی طرح نظر آتے ہیں مگر ان کی حقیقت اور ان کے خصائص جداگانہ ہیں۔ مگر عام آدمی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کیونکہ یہ اس کی سمجھ سے بعید ہے۔ اب اس حقیقت کو عام انسانوں کے ذہنوں میں اتارنے کے لئے مولانا ٹھوس مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

پاک لوگوں کے کام کو اپنے آپ پر قیاس مت کرو۔ دیکھو تمہاری حقیقت اور ان کی حقیقت جدا جدا ہے جسطرح لغوی زبان میں شیر اور شیر لکھنے میں بالکل ایک ہیں مگر ان کی حقیقیں جدا جدا ہیں۔ شیر (دودھ) انسان کے لئے ایک مقوّی غذا ہے اور شیر ایک حیوان مفترس ہے جو لوگوں کو کھاتا ہے اسی طرح زنبور اور نحل ایک ہی ساخت کے دو جاندار پرندے ہیں، دونوں پر لفظ زنبور صادق آتا ہے۔ دونوں ایک ہی باغ میں پلتے ہیں مگر ایک سے زہر اور دوسرے سے عسل نکلتا ہے۔ پہلی چیز انسان کے لئے سم قاتل ہے اور دوسری (شہد) نہ صرف غذا ہے بلکہ تمام مرضوں کے لئے شفا ہے۔

نَے کو دیکھو ایک ہی زمین میں ہوتی ہیں، ایک ہی آب وہوا میں اُگتی ہیں مگر خاصیت جدا جدا ہے ایک نَے کھوکھلی ہوتی ہے جو بنسری بنانے کے کام آتی ہے دوسری نَے ٹھوس ہوتی ہے اُس سے شکر نکلتا ہے وہ انسان کے لئے غذا ہے۔ پس جس طرح ایک ہی جنس دو افراد ایکدوسرے سے اپنے اپنے خواص میں مختلف ہیں اور ایک دوسرے پر منفعت کے لحاظ سے درجہ رکھتے ہیں اسی طرح یہ حقیقت بھی بجائے خود مسلمہ ہے کہ انسان سارے کے سارے ایک دوسرے سے شکل وشمائل میں ملتے جلتے ہیں۔ مگر ان کی باطنی حقیقیں جدا جدا ہیں۔

پھر مولانا اس حقیقت کو اپنی ان ٹھوس مادی توضیحات پر منطبق کر کے بالا استدلال فرماتے ہیں سے

اولیا را ہست قوت از الٰہ   تیر جستہ باز آرندش ز راہ

اس لئے اولیائے کاملین پر طاقت اللہ کی طرف سے مخصوص ودیعت ہے کہ وہ چھوڑے ہوئے تیر یا بندوق سے نکلی ہوئی گولی کو اپنے راستے سے ہٹا کر واپس لا سکتے ہیں۔

یہی طرز عمل حضرت شیخ اکمل نے بھی بحر العرفان میں اپنایا ہے۔ وہ باطنی حقائق کی توضیحات دیتے ہیں پھر نہایت حسین انداز سے ان حقائق کو قاری کے ذہن میں اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

ہست فرروعۂ تو دل با جان   تخم ذکر خدا درو افشاں

آنچہ کارند روید آخر کار   بہر کارندۂ خود آردبار

گر زمین پاک نیست برندید   بید ہرگز رطب ثمر نہ دید

ے (بحر العرفان جلد اول صفحہ ۱۸۲)

فرماتے ہیں جسطرح ایک کاشتکار زرعی زمین میں بیج بوتا ہے پھر اُسکا پھل کھاتا ہے۔ اسی طرح تمہاری زمین تمہارا خود اپنا دل اور اپنی جان ہے۔ تم اس اپنی زرعی زمین میں اللہ تبارک وتعالےٰ کے ذکر کا بیج بوتے جاؤ۔ جو کچھ اس زرعی زمین میں بویا جائے وہ اپنے کاشتکار کے لئے ثمرہ لے آتا ہے۔ مگر شرط ہے کہ زمین پہلے اسکے لئے تیار کی جائے جسطرح کاشتکار کرتے ہیں۔ وہ اسکو پہلے جوتتے ہیں، پھر پانی دیتے ہیں، اسمیں نمی پیدا کرتے ہیں۔ اگر زمین پہلے تیار نہ کی جائے وہ بیج بو کر بھی پھل نہیں دے سکتی ہے۔ مثلاً بید ؏ کے درخت سے کبھی رطب (ایک خاص قسم کا کھجور) نہیں نکلتے ہیں۔

پس زمین وجود کن تیار   بعد ازاں تخم حق درو میکار

پاک و صاف از ہمہ چو کردی طین   تخم ہا خوشہ ہا دہد شیریں

شو بہ ذکر خفی کنوں مشغول   تا شود مرأت دلت مصقول

اندر آئینہ ات نماید روی   ہر چہ جوئندہ را تو از ہر سوئے

تخم اللہ در دلت میکار   زاں بروید شجر خود از دیار

؏ رطب ثمر نہ دہد اسکا مطلب یہ ہے کہ ہر بیج کا ثمرہ اسی بیج کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا اس زرعی زمین کو زراعت کے لئے تیار کرتے وقت اخلاص فی العمل کا خیال رکھا جائے کیونکہ اگر خلوص میں کھوٹ ہوگی تو اسکی مثال ایسی ہے کہ تم بید کے درخت بو کر اُس سے یہ توقع رکھتے ہو کہ اسکا پھل رطب (رسیلا کھجور) ہوگا۔ وہ آئین قدرت کے خلاف ہے۔ اسی طرح اس روحانی زرعی زمین میں بھی کھوٹ کر کے بیج ڈالدیں پھر میٹھے پھل کی توقع رکھیں۔

پھر فرماتے ہیں کاشتکار جسطرح اپنی زرعی سے زمین کوڑا کرکٹ دور پھینکتا ہے ۔ اسی بحرالعرفان پڑھنے والے تم بھی اپنے وجود سے اوصاف مذمومہ کوڑا کرکٹ کی طرح دور پھینکو۔ تمہارے باطنی وجود کا کوڑا کرکٹ حرص، حسد، غضب، شہوت، بخل، تکبر، سُوء خلق و دیگر ہمہ قسم کی بُری خصلتیں ہیں۔ جب تک کوڑا کرکٹ زمین میں موجود ہوگا یہ اچھی فصل دینے سے رہ جائے گی۔ اسی طرح باطنی وجود میں یہ خصائلِ رذیلہ لذیذ ثمر حاصل ہونے سے مانع ہیں۔ پس باطنی زرعی زمین (دل اور جان) کو ان چیزوں سے پاک کرکے اسمیں یادِ حق کا بیج بو جاؤ اسکے لئے ذکرِ خفی کا بیج مناسب ہے۔ تمہارے دل کو اس سے صیقل ہوگا اور جس محبوب کو تم ڈھونڈتے ہو اسکی تجلی اسی دل سے تمہیں جلوہ گر ہوگی۔ آگے تم "اللہ اللہ" اپنے دل سے کرتے جاؤ اسکا درخت اور اسکے لذیذ میوے تم خود کھاؤ گے اور لذّتِ ذکر کو خود محسوس کرتے جاؤ گے۔ سلوک میں اسکے لئے دو لفظ مستعمل ہیں (۱) تخلیہ (اپنے وجود کو خصائلِ ذمیمہ سے پاک کرنا) (۲) تحلیہ (اپنے قلب میں ذکرِ حق کی تخم ریزی کرنا اور اوصافِ حمیدہ سے اپنے آپ کو مزین کرنا) حضرت میرزا آگے چلکر اسی موضوع کی تفصیلات بتاتے ہیں۔

مثنوی مولانا رومیؒ اور بحرالعرفان میں کچھ خفیف فرق

یہاں یہ نکتہ بالاختصار نہایت قابلِ ذکر ہے کہ علامہ مولانا جلال الدینؒ کا موضوعِ سخن ساری مثنوی میں ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ دین کے اسرار و غوامض ہم پر واضح کرتے ہیں اور قرآن و حدیث کا حسنِ معنوی نکھارتے ہیں۔ اسکی توضیحات میں علامہ احادیث صحیحہ اور غیر صحیحہ اور مستند نیز غیر مستند قصص و حکایات دونوں بیان فرماتے ہیں۔ ان کا موضوعِ سخن نہ نفسِ حدیث ہے نہ قصص بلکہ ان کے ذریعے سے اپنی بات کو واضح کرنا ہے۔ برخلاف محدث اور مورخ کے بالترتیب ان کے ہاں نفسِ حدیث اور نفسِ واقعہ موضوعِ سخن ہیں اس لئے اُن کی صحت کی طرف ان کی خاص توجہ مرکوز ہوتی ہے وہ اسکا پورا پورا اہتمام کرتے ہیں اور ان علمائے کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مساعی جمیلہ کا ثمرہ ہمارے سامنے مستند کتبِ حدیث اور مستند کتبِ سیر و تاریخ کی صورت میں ہیں۔ مگر پند و نصائح کے میدان میں شعراء اور مضمون نگاروں نے صحت اور عدمِ صحت کی طرف کم توجہ دی ہے۔ انہوں نے اعلیٰ اخلاق اور کردار سازی کی طرف زیادہ توجہ مرکوز کی ہے۔ مثلاً حضرت شیخ سعدی شیرازی کی گلستان، بوستان مولانا رومی کی مثنوی و دیگر ہمہ قسم تصنیفات میں واقعات کے استناد اور صحت کی طرف توجہ کم ہے اور ان کا موضوعِ سخن ہدایت اور احکامِ شریعت، اسوۂ حسنہ حضرت رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کو اور ان کے محاسن کو قاری کے دل و دماغ میں ذہن نشین کرنے کی طرف زیادہ توجہ

دی گئی ہے۔

مگر حضرت شیخ اکمل رحمۃ اللہ علیہ نے اسی موضوع پر مثنوی بحرالعرفان لکھی اور اقرار کیا کہ مجھے سلف صالحین حضرت مولانا جلال الدین رومی اور علامہ حضرت شیخ فریدالدین عطار علیہما الرحمۃ والرضوان کی مدد شاملِ حال ہے اور واضح کیا میں شاگرد ہوں اور وہ استاد، میں مرید ہوں اور وہ مرشد ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی مثنوی بحرالعرفان میں انہوں نے احادیث مردیہ کی صحت کا خاص خیال رکھا۔ عموماً ایسے احادیث طیبہ اپنی کتاب میں درج کئے جو کسی نہ کسی مستند حدیث کی کتاب میں کسی قابل اعتماد روایت سے درج ہوئے ہیں۔ غریب، ضعیف روایات سے اجتناب کیا۔ اسی طرح انہوں نے واقعات کو بھی تاریخی لحاظ سے دیکھا۔ غیر معقول اور غیر معتمد قصص اور حکایات کو کسی جگہ اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی ہے۔ یہاں اس پر زیادہ بات کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت کیونکہ بحرالعرفان کی جلد سوئم زیر طبع ہے اُسکے دیباچہ میں اس موضوع پر گفتگو حسب ضرورت ہوگی۔

الغرض "بحرالعرفان" کا وہی موضوع ہے جو پندنامۂ حضرت مولانا شیخ فریدالدین عطار قدس سرہ اور جو مثنوی حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ البتہ حضرت میرزاؒ نے "بحرالعرفان" میں اس موضوع کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ دراصل حضرت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ اور ان کے مشائخ کرام کی باطنی عنایت حضرت میرزاؒ کو نصیب ہوئی ہے کہ انہوں نے اس عظیم کتاب کو تالیف فرمایا۔ اسکا ذکر تفصیلاً حضرت شیخ عبدالوہاب نوری نے فتحات کبرویہ میں کیا ہے۔

"بحرالعرفان" کے علاوہ آپ نے کئی اولیاء کبار کی تعریف میں قصائد و مناقب لکھے ہیں اور کئی غزلیات بھی۔ آپ نے ایک منظوم رسالہ المسمیٰ "مخزن الاسرار" تصنیف کیا ہے۔ یہ ۲۷۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ میر سید محترم لاہوری نقشبندی نے اسکی منظوم شرح لکھی ہے۔ یہ شرح بحوالہ تمہید "بحرالعرفان" (جلد اول) بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آپ نے کشمیری میں بھی کچھ غزلیں لکھی ہیں۔ ایک غزل کا حوالہ اسی تمہید میں موجود ہے۔ (تمہید بحرالعرفان ج ۱ صفحہ ۸)

مخزن الاسرار کے علاوہ آپ کی غزلوں میں سے مجھے آپکی یہ غزل بہت عزیز ہے جسکے ابتدائی شعر یہ ہیں:

ہستی من ز من بدر، کرد کہ کرد یار کرد — محو خودم بیک نظر، کرد کہ کرد یار کرد

ساز جہت ذات اُو ہست دو کون صفات اُو — مظہر خیر و شر دگر، کرد کہ کرد یار کرد

بودہ ام اصل جان جاں، منبع فیض کن فکان — باز مرا دربدر بہ در، کرد کہ کرد یار کرد

اکمل از این غزل کہ گفت کرد عیاں بہ ہفت — بروے ازیں جہاں خبر، کرد کہ کرد یار کرد

صوفیانِ کرام کے ہاں ابن عربی کے بعد سے دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ ایک ہے وحدتِ وجود اور دوسرا وحدتِ شہود اسکی تعبیر ان الفاظ سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہمہ اوست یا ہمہ از اوست حضرت میرزا کی اس غزل کے پیشِ نظر جسکے چند شعر اوپر لکھے گئے، اور بحرالعرفان کے پہلے چند اشعار* کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں لکھ رہا ہوں کہ حضرت میرزا علیہ رحمۃ وحدت وجود کے قائل نظر آرہے ہیں اگرچہ انہوں نے اپنے کلام میں کسی جگہ تصریحاً اسکی وضاحت نہیں کی ہے۔ چونکہ یہ ایک مختصر مقالہ ہے یہاں ہمچو قسم تصوف کے پیچیدہ مسائل کو زیر بحث لانے کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔

البتہ "مخبرالاسرار" سے چند اشعار یہاں میں نقل کرتا ہوں تاکہ یہ مضمون پڑھنے والوں پر واضح ہوجائے کہ آخر سلوک کس چیز کا نام ہے؟ حقیقی تصوف اور حقیقی فقر کا مطلب کیا ہے؟ شریعت اور سلوک بالفاظ دیگر شریعت و طریقت میں کسقدر امتزاج ہے؟ بزرگان دین اور سلف صالحین رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی سوانح حیات اور ان کی خود نوشت نگارشات سے اگر نہ سیکھے تو پھر اس سے بڑھکر قرآن و سنت کی تشریحات کے لئے کونسا بڑا ذریعہ ہے جس سے ہم فلاح دارین حاصل کرنے کے لئے کسب فیوضات کرسکیں:-

۱۔ خرقہ پوشید مرا حضرت ایشان زکرم
ہست ایں رابطہ در کسوتیہ بنیادم

۲۔ جانشین کرد بسجادہ مرا ایں مرشد
بہر ارشاد بہر سلسلہ رخصت دادم

۳۔ گفت پیغمبر دین شیخ مرا چندیں بار
ہر کہ افتاد قبول تو قبول افتادم

۴۔ پیر باعقل شدہ متفق و میکردند
سوی عرفان و خداوندی او ارشادم

---

* بحرالعرفان کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:-

حمد للہ حامد و محمود	قوت فعل خویش را معبود
از جمال و جلال خود مشحون	کرد چونہا پدید خود بیچون
جلوہ گر ذاتش از صفات آمد	ایں صفتہا دلیل ذات آمد
[illegible]	[illegible]

۵. سنتُ شرحِ محمدؐ کہ بے محموداست
آنطرف شورت فکریمی افتادم

۶. ہم زحالاتِ عزیزان سلف درارقام
بمطالع کہ ہمی آمد و دل میدادم

۷. عاقبت آرند مرشد نور اذکار
دیو من گشت مسلمان ومبارکبادم

۸. ہر کدورات و ملالت کہ بہ پیشم آمد
از نظرِ شیخ ہمی کرد دران امدادم

۹. رغبت طاعت حق بیش ازانم شد
دل بامید کرم ہای خدا میدادم

۱۰. گنج عزلت کہ بود مملکت ہفت اقلیم
ہمت فقر درو حکم امارت دادم

۱. ۰۔(حضرت خواجہ قدس سرہ نے خرقۂ خلافت پہنایا اور مری بنیاد سلسلہ کبرویہ پر قائم ہے۔)

۲. ۰۔حضرت خواجہؒ نے اپنے سجادہ پر بٹھایا اور اپنا جانشین مقرر کیا اسکے بعد انہوں نے مجھے بر سلسلہ طریقت میں رہبری کرنیکی اجازت مرحمت فرمائی۔ (اس سے واضح ہے حضرت میرزا بر سلسلہ طریقت میں حضرت جنید بغدادیؒ کیطرح مجاز تھے۔ یہ آپکی امتیازی خصوصیت ہے)

۳. ۰۔(پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار جلوہ گر ہو کر میرے بزرگوار کو ارشاد فرمایا " جو تیرے دربار میں قبول ہے وہ مجھے بھی قبول ہے "۔ (نتیجتاً جو رسول اللہؐ کو قبول ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کو بھی قبول ہے)

۴. ۰۔(میرے مرشد عقل کے ساتھ متفق ہو کر معقول طریقہ سے راہبری کرنے لگے۔ حق شناسی کی طرف انہوں نے میری رہنمائی کی۔)

(نکتہ) حضرت شیخ اکمل کے اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ میرے مرشد عالیجاہ نے میری رہنمائی سلوک کی منازل طے کرنے میں شریعت کے دائرے میں کی یہی

اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی حاصل کرنے کا مضبوط اور معقول طریقہ ہے۔ شریعت سے باہر کوئی طریقہ نہ معقول ہوسکتا ہے نہ ثمرآور۔

۵۔ ۰۔ (سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ عمل) اور شریعت محمدیؐ نہایت قابل تعریف ہیں۔ میں نے ان دونوں چیزوں پر غور و فکر کیا اور راستہ پایا۔)

۶۔ ۰۔ (اسی طرح بزرگان سلف رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات جو قلمبند ہوچکے تھے میں نے غور سے اُن کا مطالعہ کیا اور میں نے اپنا دل و دماغ اسکی طرف مکمل طور پر متوجہ کیا۔)

۷۔ ۰۔ (آخرکار مرشدِ کامل سے جو اذکار میں نے اخذ کئے تھے مرشد کامل کی توجہات سے ان کی روشنی ظاہر ہوئی۔ اسکی مدد سے میرا دیو (نفس) مسلمان ہوگیا اور میرا تابع ہوا میں اُسکی غلامی سے آزاد ہوا یہ ایک مبارک فال تھا۔)

۸۔ ۰۔ (جو تکلیف یا دقت مجھے سامنے آئی پر مرشد کی نظر کیمیا اثر سے میں نے وہ تکلیف دور کردی بات واضح ہوگئی کہ طریقت میں مرشد کے بغیر مقصد کو پہنچنا ناممکن ہے۔)

۹۔ ۰۔ (جب نفسِ کافر مسلمان ہوا میری طبیعت اللہ کی فرمانبرداری کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب ہوگئی اسطرح اللہ سے بے شمار فیوضات کی امید وابستہ کی۔)

۱۰۔ ۰۔ (تنہائی ایک خزانہ ہے جو سات براعظموں کی حکومت ملنے سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ اسکی مدد سے میں نے اپنی پوری ہمت فقیری کی حکومت ملنے پر صرف کردی۔)

ان اشعار میں حضرت شیخ اکمل علیہ الرحمۃ نے جن باتوں کو صراحتاً بیان فرمایا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

- طریقت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے اپنے مرشد کامل سے مرخص اور ماذون ہونا لازمی ہے۔ اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کی خلعت کا حصول اپنے مرشد سے لازمی ہے۔ سالک کو بھی چاہیئے کہ وہ کسب فیوضات ایسے ہی بزرگ سے کرے جو صاحب ارشاد ہو۔
- جو اپنے مرشد کی بارگاہ میں مقبول اور منظور ہے وہ اللہ اور اُسکے رسولؐ کے ہاں بھی مقبول ہوسکتا ہے۔ حضرت خواجہ قدس سرہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اُن کو

ارشاد ہوا جو بھی آپ کے ہاں منظور نظر ہے وہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی منظور ہے۔

- شریعت پر گامزن ہو کر طریقت میں قدم رکھنا نہایت مستحسن ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے آسان اور پختہ راستہ ہے۔ یہی عقل کا بھی تقاضا ہے اور نقل بھی اسکی تائید کر رہا ہے۔

- طریقت میں ماذون اور مجاز مربّی کا ہونا سالک کے لئے ضروری ہے۔ چاہے سالک مجذوب سالک ہو (جیسا کہ عموماً اویسی حضرات ہوتے ہیں) یا سالک مجذوب۔ اوّل الذکر حضرات کو بھی بعد میں مرشد ظاہری کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ جیسا کہ حضرت شیخ نورالدین ریشی قدس سرہ کو حضرت سید میر محمد ہمدانی رح کی طرف اور حضرت بابا ہردریشی رح کو سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کرنا پڑا۔

- طے منازل اور اوراد و اذکار پر مواظبت قائم کرنے کے لئے اعانت مرشد لازمی ہے۔ یہ نعمت مرشد کی توجہات سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اسکے علاوہ بزرگان سلف کے حالات کا مطالعہ کرنا بھی اس راستے میں یہ سعادت حاصل ہونے کے لئے مددگار ثابت ہوتا ہے۔

- حضرت رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عمل اور اُن کی شریعت میں حقیقی طریقت ہے یعنی طریقت کے تمام فیوضات ان ہی دو چیزوں میں مضمر ہیں مگر ان پر عمل کرنا اسوقت تک ناممکن ہے جب تک "نفس" جو انسان کے ساتھ ایک بڑا شیطانِ کافر ہے، مسلمان ہو جائے۔ انسان کی شرعی عقل کا غلام، تابعدار نہ بن جائے۔ یہ کثرتِ اذکار، کثرت نوافل اور سب سے زیادہ مرشد توجہات سے مسلمان ہو سکتا ہے۔ جب یہ مسلمان ہو جائے وہی ایک باایمان انسان کے لئے سب سے زیادہ خوشی کا مقام ہے۔ یہی کامیابی اور رستگاری کی بنیادی کلید ہے۔

- ابتدائی ایام میں خلوت (لوگوں سے الگ تھلگ رہنا) اس راہ میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جب سالک اس منزل میں پختہ ہو جاتا ہے تو اسکو خلوت در انجمن کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے یعنی لوگوں میں مصروف عمل رہ کر وہ حقیقتاً اُن سے الگ ہو کر اپنے مولیٰ سے ہمکلام ہوتا ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ میں یہی صفت انکشاف کا درجہ رکھتی ہے اور سلسلۂ طریقت میں اس صفت کا ہونا محمود ہے اور اسکا فقدان سالک میں نقصان دہ ہے۔

حضرت میرزاؒ نے "بحر العرفان" میں بھی اِن اہم نکات کی طرف مطالعہ کرنے والوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ چنانچہ بحر العرفان کا جسقدر حصہ اسوقت تک چھپا ہے اور جن خوش نصیب فرزندانِ توحید نے اسکا مطالعہ کیا ہوگا۔ ان سے یہ بات مخفی نہیں ہے۔

ان متذکرہ صدر مختصراً پیش کردہ امور کو ملحوظ نظر رکھکر بحر العرفان کے چند اشعار استشہاداً پیش کئے جارہے ہیں تاکہ طالب علم کا ذہن صاف ہو جائے اور کسی قسم کی الجھن کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

سلسلہ بگسل خدا میجو
تا نمایندت راہ از ہر سو

•۔ (سلسلوں کے بندھنوں میں مت پڑو۔ تم اللہ کی ذات ستودہ صفات کو ڈھونڈو جب تمہاری چاہ پختہ ہوگی ہر طرف سے آپکو راستہ دکھایا جائیگا یعنی پھر تمام سلسلے تمہیں مل سکینگے۔)

گر نہ اعمال صالح است بہ مرد
ناز بر حسن غیر نتواں کرد

•۔ (اگر تمہارے پاس اس راستے میں اعمال صالح کا ذخیرہ نہ ہوگا دوسروں کے جمال اور اعمال پر فخر مت کرو۔ یعنی اپنے اسلاف یا دوستوں کے اعمال صالحہ پر ناز مت کرو۔ خود کچھ کمانے کی کوشش کرو۔)

آن عزیزاں کہ حق پرستانند
ہیچ بہ غیر ازیں نہ پندارند

•۔ (وہ خوش نصیب لوگ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو چاہتے ہیں اور اُنکی بندگی

ؒ ان دو شعروں کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور کا ایک مجسمہ ہیں۔ اُن کا نور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ستودہ صفات سے ہے۔ آپ ہی کے نور سے اللہ تک رسائی ہو سکتی ہے اور کائنات و ما فیہا کے پوشیدہ حقائق منکشف ہو سکتے ہیں۔ یہ بالکل قرآن و حدیث کے مطابق ہے
وَمَن یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَد اَطَاعَ اللہ ۔ (القرآن)

کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے بہتر کسی چیز کو نہیں سمجھتے ہیں۔ یعنی ان کی زندگی کی لذت اور نشاط اللہ ہی سے ہے اور اسکی ذکر میں ہے)

نشاط مجلسم اللہ اللہ سرور محفلم اللہ اللہ

دمبدم در فنای خود کوشند

جام عرفان حق ہمی نوشند

•۔ (یہ لوگ ہمیشہ اپنی ہستی مٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور معرفت کا جام پینے میں رات دن لگے رہتے ہیں۔ اسی میں اپنی زندگی کی لذت محسوس کرتے ہیں۔)

زبدۂ نور، نور محمود است

از جمالش خدا مشہود است

•۔ (چنا ہوا نور، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ہے۔ اُن ہی کے نور سے اللہ کی ذات ستودہ صفات جلوہ گر ہے۔)

گشت ازیں نور، در تجلی ذات

زان تجلی بدید موجودات

•۔(اسی نور محمدی کی روشنی میں اللہ کی ذات ستودہ دیکھی جا سکتی ہے اور اسی تجلی ذات سے جملہ موجودات کی حقیقت انسان پر واضح ہو سکتی ہے (یا آدمی کے سامنے آسکتی ہے) اس کا مطلب یہ ہے جو اللہ تک رسائی کرنے کا متمنی ہوگا۔ اُنکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب نور، کسب فیوضات کرنا لازمی ہیں۔ یہ فیوضات اطاعت رسول ؐ سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں پھر سالک نورِ وحدت تک پہنچ سکتا ہے۔

ہر کہ دیدار مصطفیٰ ؐ را دید

او دراں جلوۂ خدا را دید

•۔(جس نے جناب سرور کائنات محمد مصطفیٰ ؐ اکو دیکھا اُس نے یقیناً ان کی ذات بابرکت میں اللہ کا جلوہ دیکھا ہوگا۔)

شد یقین ہرچہ مصطفیٰ ؐ گوید

از زبانش بما خدا گوید

•۔ (اس سے یہ بات یقیناً ثابت ہو جاتی ہے کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دراصل وہ آپکی زبان سے اللہ تعالےٰ ہمیں بتا رہا ہے۔)

یافت زیں لجۂ عارف آگاہ

معنی لا الٰہ الا اللہ

•۔ (اس حقیقت کو سمجھ کر ایک عارف کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مقصد پاتا ہے اور اُس سے آگاہ ہو جاتا ہے۔)

ہر کہ ایں بسحر گفت وانکس خود

برد بر عالم حقیقت راہ

•۔ (جس شخص نے اس حقیقت کو سمجھ کر اس کلمۂ حق کو سحر کے وقت پڑھا وہ حقیقت کی منزل تک ضرور پہنچ جائے گا۔ یہاں اس شعر میں ضمناً بوقت سحر کلمۂ شریف پڑھنے کی فضیلت بیان فرمائی اور اس پر مواظبت کرنے والے کے لئے معرفت سے فیضیاب ہونے کی امید قوی ہے۔)

گر بجوئی بشرع میجوئیش

تابع سنت رسول اللہؐ

•۔ (اگر اللہ کو ڈھونڈنا ہے تو اُسکو شریعت کے راستے ڈھونڈو۔ یعنی شریعت عمل پیرا ہو کر ڈھونڈو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت شریف اور اُن کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر ڈھونڈو کر پانے کا یہی پختہ راستہ ہے۔)

بحرالعرفان و دیگر قصائد و غزلوں میں حضرت میرزا قدس سرہ نے طالب علم کو دنیا کی حقیقت دنیا و ما فیہا کی بے ثباتی، نفسِ امارہ کی ضرر رسانی نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی پہچان، خدا پرستی، خدا پرستی کے فوائد عشقِ حقیقی کی منزل، دائمی زندگی اور اسکے حصول کے طریقے وغیرہ ہمچو قسم دیگر موضوعات معہ امثلہ سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بزرگان سلف کی طرح آپ کا انداز بیان ناصحانہ اور مشفقانہ رہا ہے۔ دوران مطالعہ پتہ چلتا ہے کہ ناصح بجائے خود عامل بھی ہے عارف بھی۔ ان حقائق سے بالعلم اور بالمشاہدہ واقف ہے۔ اس لئے کلام نہایت اثر انداز ہے۔

خلاصہ کلام

بحرالعرفان، یا مثنوی حضرت علامہ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ اور عارفانہ کلام یا

دیگر کتب و رسائل، جو بزرگان دین اور علمار کرام نے اس باب میں لکھتے ہیں کو پڑھنے سے یہی بات واضح ہوجاتی جو علامہ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر) جلد اول سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں لکھی ہے :-

- واما الخاصة فالكرامة عندهم العناية الإلهية التي وهبتهم التوفيق والقوة حتى خرقوا عوائد لنفسهم ۔
- اجل الكرامة واعظمها التلذذ بالطاعات في الخلوات والجلوات مراعات الانفاس مع الله حفظ الآداب في تلقي الواردات في الاوقات والرضاء عن الله تبارك وتعالى في جميع الحالات وان اكمل المطالب الهداية في الدين لان الله تعالى ختم الكلام في الفاتحة على طلب الهداية من العبد حيث قال "اهدنا الصراط المستقيم" وهذا دال على ان جنة المعرفة خير من جنة النعيم ۔
- ۔ (تفسیر کبیر ج اصفحہ ۲۵۸، مطبوعہ مصر اورینٹل کالج لائبریری)
- خاص لوگوں (بزرگان دین صلحائے امت، ہدایت یافتہ دانشوروں) کے نزدیک کرامت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ کی طرف سے ایسی توفیق اور قوت عنایت ہوجائے جسکی مدد سے وہ اپنے نفس کے عام عادات بدل کر اللہ اور رسول کی اطاعت میں اپنی قوت پر صرف کریں۔
- سب سے بڑی کرامت خلوت اور انجمن میں اللہ کی اطاعت اور عبادات میں فیوض لذت محسوس کرے گا۔ اور ہر حال میں وہ پاس انفاس رکھیگا۔ اسکے ساتھ مختلف اوقات میں واردات فیوضات ربانی کو ادب اور وقار کے ساتھ پائیگا اور اپنے مولےٰ ذات پاک حضرت مالک لایزال سے ہر حال میں راضی رہیگا۔ چاہے وہ مومن مصیبت میں ہو یا راحت میں ۔ اللہ کے نزدیک مومن کا کامل ترین مقصد ہدایت فی الدین ہونا چاہیئے ۔ اللہ تعالےٰ نے سورۂ فاتحہ میں عبد کیطرف سے طلب ہدایت پر کلام کو ختم کیا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے ۔ "اِهدنا الصراط المستقیم" (اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا) یہ اس بات پر دال ہے کہ معرفت کی جنت نعمت

سائے گوناگوں سے بھری پڑی جنت سے بلند و برتر ہے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں واضح کیا گیا حضرت شیخ اکمل الدین کامل بیگخان بدخشی اپنے وقت کے نہایت ممتاز بلند و برتر صوفی بزرگ، عالم دین، نکتہ سنج، شاعر اور عابد تھے آپ کے خلفاء کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ خلیفوں کے خلیفے لاتعداد ہیں حضرت حاجی عبدالسلام قلندر، حضرت فاروق صاحب، حضرت محمد اعظم صاحب سوکال پوری کے ہزاروں خلیفے، شاگرد ہیں۔ کئی حضرات انہیں سے مجذوب تھے۔ کشمیر میں ان ہی حضرات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ان ہی کے فیوضات یہاں کے جملہ صوفی شعراء کرام اور قلندروں وغیرہ کو عموماً ملے ہیں جو مختلف رنگوں میں مشہور ہوئے ہیں۔

اس ممتاز صوفی بزرگ، سرزمین کشمیر کے مایہ ناز سپوت نے ۲۹، ذی الحجہ ۱۱۳۱ھ مطابق یکم نومبر ۱۷۱۹ء[1] اتوار کو وفات پائی اور آج تک آپ کا روضۂ اطہر مرجع خاص و عام ہے[2]۔

---

[1] سالِ وفات ۱۱۳۱ھ/۱۸-۱۷۱۷ء (مطابق، کاشُر انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۱۔ مطبوعہ کلچرل اکادمی)

[2] آپؒ کا روضہ سری نگر میں علمگری بازار اور حول کے درمیان سڑک کے بائیں کنارے واقع ہے۔ اسی کی مناسبت سے پورے علاقے کو "مرزِ کامل صاٮٔبُن" کہا جاتا ہے۔ روضہ شریف کے احاطے میں شاہ نعمت اللہ کلو۔ خواجہ قائم الدین پتلو اور شہزادہ خانم بھی آسودہ ہیں۔ آپ کا آستانہ عالیہ خواجہ قائم الدین پتلو نے آنجنابؒ کے واصل بحق ہونے کے تقریباً دو سال بعد ۱۱۳۳ھ/۲۰-۱۷۱۷ء تعمیر کروایا۔ اس کے شمال کی جانب ایک مسجد بھی بنوائی جو حال ہی میں پھر سے تعمیر کی گئی ہے۔ روضہ شریف کی لمبائی لمبائی ۵۷ فٹ اور چوڑائی ۲۷، فٹ ہے۔ جس میں جنوب کی جانب بالادری (جو اب نور خانہ کہلاتی ہے) میں شیشے لگے ہیں۔ اس کی اندرونی چھت کو ختم بند سے مزین کیا گیا ہے۔ آستانۂ عالیہ پر عام زیارتوں کی طرح کوئی گنبد یا برج نہیں ہے۔

— کاشُر انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۱۔
(مطبوعہ کلچرل اکادمی) —●— (ادارہ)

آپکی تاریخ وفات پر وقت کے کئی بزرگوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں ؎

دریغا پیر کامل بحر عرفان | طراوت بخش بزم اہل ایقان
گزشت از ماہ حج چوں بست نہ روز | بہ یک شنبہ شد او فردوس افروز
بسوئے گلشن جنت روان شد | ز ہجرش چشم جان گوہر فشان شد
بمژگان گوہر تاریخ سفتم | ز عالم پیر کامل رفت گفتم

۱۱۳۱ھ

— (از خواجہ اعظم دیدمریؒ)

●

بہر تاریخ وصالش بے الف گفتا خرد | پیر کامل بحر عرفان اکمل اہل کمال

(۱۱۳۱ھ)

— (از ملا عبدالرسول بینواؔ)

●

"ز عالم پیر کامل رفت"

۱۱۳۱ھ

آپکی تربت مبارک پر یہ تاریخ کندہ ہے

ای کامل اکمل مقدس | تاریخ تو خاتم کمل بس

۱۱۳۱ھ

شاید حضرت شیخ عبدالوہاب نوری کا ہے۔

●

ارجو من اللہ تبارک وتعالیٰ ان یتقبل منی ھٰذہ الھدیۃ ۔ التی کتبتھا فی حالات الشیخ الکامل الاکمل من صمیم القلب بکمال الشوق والمحبۃ اسأل اللہ تعالیٰ ان یحشرنی تحت الوایۃ یوم القیٰمۃ وفی ھٰذہ الحیواۃ الماویہ یوفقنی علی متابعتہم ۔







Printed at : **J.K. Offset Printers**, 315, Jama Masjid, Delhi-6

Phones : 3279852, 3267633, Fax : 011-3237241